موبی ڈک
ناول
تصنیف: ہرمن میلول

موبی ڈک

ناول

موبی ڈک

ناول

امریکا کا عظیم ترین ادبی شاہکار

تصنیف : — ہرمن میلول

ترجمہ : — محمد حسن عسکری

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ◉ کراچی

تعارف

"موبی ڈک" کا شمار امریکا کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے اور بعض نقادوں کی نظر میں تو یہ امریکا کا عظیم ترین ناول ہے۔ "موبی ڈک" خراج تحسین اپنے اس وصف کی وجہ سے وصول کرتا ہے کہ اس میں چشم دید حیرت انگیز واقعات اور حوادث کے پس منظر پر ایک ایسے کردار کی تصویر کھینچی گئی ہے جو غیر فانی ہے۔

"موبی ڈک" کا مصنف ہرمن میلول عین شباب میں کلرکی اور معلمی کے خشک پیشے کو چھوڑ کر ایک تجارتی جہاز پر کیبن بوائے بھرتی ہو گیا کیونکہ اسے نامعلوم دنیائیں اور ان دیکھی چیزیں دیکھنے کا شوق تھا اور جب یہ شوق اس جہاز پر پورا نہ ہوا تو وہیل کا شکار کرنے والے ایک جہاز پر ملازمت کر لی اور پھر اس کی سختیوں سے گھبرایا تو سمندر میں چھلانگ مار دی اور تیر کر بحرالکاہل کے جزائر مارکوئیسا پر جا ٹھہرا جہاں آدم خوروں میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد ان جزیروں اور ان کے عجیب باشندوں سے جی بھر گیا تو ایک آسٹریلوی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کو گھومنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ ایک جہاز میں بغاوت بھی کرا دی اور خود اس کا سرغنہ بن گیا۔ اسی طرح جس جہاز سے بھاگا اس کے کپتان نے تلاش شروع کی تو جان چھڑانے کے لیے ایک امریکی جنگی جہاز پر ملازمت کر لی۔ پھر یہ زندگی بھی ترک کر دی اور بوسٹن میں بیٹھ کر اپنے مشاہدات و تجربات پر مبنی ناول لکھنے لگا۔

دلچسپ ترین افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو چونکہ اس ناول کے سب واقعات مصنف پر گزر چکے تھے اس لیے اس کا ہر لفظ دلچسپ اور ولولہ انگیز بن گیا یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۱ء سے لے کر اب تک امریکا کا کوئی اور ناول اس کی ہمسری نہیں کر سکا اور کچھ اوپر سو برس کے عرصے میں تنقید اسے بار بار خراج عقیدت ادا کرتی رہی ہے۔

اس ناول میں زندہ رہنے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت ہے، اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۱ء تک کے دور میں میلول کی شہرت اور مقبولیت تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن موجودہ صدی کے ربع اول میں "موبی ڈک" نے اپنے مصنف کو ایک بار پھر اس بلند مقام پر پہنچایا کہ نقاد اسے امریکا کا ادبی نابغہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کی غیر فانی کشش کا ایک اور راز یہ بھی ہے کہ "موبی ڈک" ایک ایسے غیر معمولی انسان کی داستان ہے جس کا جذبۂ انتقام دیوانگی کی حد کو پہنچ گیا تھا اور صرف موت اس جذبے کو ختم کر سکی۔

اس کا مرکزی کردار کپتان اہاب، موبی ڈک کو ڈھونڈ نکالنے اور اسے ہلاک کرنے کے مقصد سے کرۂ ارض کا چکر کاٹنا شروع کرتا ہے۔ وہ جہازیوں سے وعدہ کرتا ہے کہ جو جہازی سب سے پہلے سفید وہیل کو دیکھے اسے سونے کا ایک سکہ انعام دے گا اور ان سے وعدہ لیتا ہے کہ وہ اس مہم میں اس کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ راستے میں کئی اور وہیلیں ہاتھ آئیں اور ان کا روغن نکال کر پیپوں میں بند کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ روغن ایک خطیر دولت تھا اور جہاز کے مالک یہ روغن فروخت کر کے دولت

کام چاہتے تھے اس لیے اس کی حفاظت انتہائی ضروری تھی مگر جب روغن چکنے لگا تو اہاب جہاز روک کر پیپوں کے سوراخ بند کرنے کی درخواستوں کے باوجود اس پر آمادہ نہ ہوا محض اس لیے کہ موبی ڈک کے تعاقب کی لار ٹوٹ جائے گی۔ وہ اس پر بضد رہا کہ خواہ سارا روغن بہہ جائے مگر سفر جاری رہے چنانچہ اس جس ماتحت نے جہاز روکنے پر اصرار کیا اسے بندوق دکھا کر بھگا دیا۔ آگے چل کر ایک اور جہاز ملا جس کے کپتان نے بتایا کہ موبی ڈک میری ایک کشتی لے گئی ہے جس پر میرا بیٹا سوار ہے اور اس غریب کی عمر صرف بارہ برس کی ہے۔ اس نے اہاب سے گڑگڑا کر درخواست کی کہ مجھے اپنا جہاز عاریتاً برائے تلاش دے دو مگر اہاب نے اپنا جہاز اس کے حوالے نہ کیا کیونکہ اس طرح وہ خود موبی ڈک سے انتقام لینے سے محروم ہو جاتا۔ اس پر جنون انتقام اتنی شدت سے طاری تھا کہ اپنی جیتی بیوی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر موبی ڈک کو ہلاک کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ جب اسے صلاح دی گئی کہ یہ ہولناک سفر ترک کر دے تو جواب میں کہا کہ موبی ڈک سے انتقام لینا اب میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور فرض ہے۔ دوران سفر میں اسے موبی ڈک کا پتا چل گیا اور اہاب کا اس سے تین مرتبہ مقابلہ بھی ہوا مگر وہ اسے ہلاک نہ کر سکا اور آخری مقابلے میں خود ہی اس کا شکار ہو گیا۔ میلول نے اس کے اسی جنون انتقام کی تصویر اپنے مشاہدات و تجربات کے پس منظر پر کھینچ دی اور اس نے موبی ڈک کو ایک غیر فانی ناول بنا دیا۔

باب - ۱

پرچھائیاں

میرا نام اسمٰعیل رکھئے۔ اور اس بات کی پرواہ نہ کیجئے کہ یہ قصہ کب کا ہے۔ چند سال ہوئے میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ رہی اور خشکی پر کوئی ایسی چیز تھی بھی نہیں جس سے مجھے لگاؤ ہو۔ میں نے سوچا لاؤ لگے ہاتھوں سمندر کی سیر ہی کر لیں۔ مزاج کی سوداویت دُور کرنے اور دورانِ خون کو ٹھیک رکھنے کا میرے پاس یہی نسخہ ہے۔ جب کبھی میں اپنا یہ حال دیکھتا ہوں کہ چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے، روح پڑے پڑے بس گئی اور اب پھپھوندی لگنے والی ہے، چلتے چلتے خواہ مخواہ تابوت کی دکانوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں، جو بھی جنازہ سامنے آئے اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں اور خاص طور سے جب میرے دماغ کو اتنی گرمی چڑھ جاتی ہے کہ اگر میرے اخلاقی اصول مجھے نہ روکیں تو میں دیدہ و دانستہ سڑک پر جا کے بااہتمام بلیغ لوگوں کے سر سے ہیٹ چھیننا شروع کر دوں ——— تو بس یہ دیکھ کر میں سمجھ لیتا ہوں کہ سمندر کی سیر کا وقت آ گیا، بلکہ جتنی جلدی چل پڑوں اتنا ہی اچھا۔ لوگ اپنے گولی مار لیتے ہیں، میرا مسلک یہی ہے۔ کیٹو نے ایک فلسفیانہ تقریر جھاڑنے کے بعد اپنے تلوار گھونپ لی تھی، میں چپ چاپ جہاز میں سوار ہو لیتا ہوں۔ یہ کوئی ایسے تعجب کی بات بھی نہیں، چاہے انہیں خبر نہ ہو، لیکن کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی حد تک سبھی لوگ سمندر کے متعلق یہی جذبات رکھتے ہیں جو میں رکھتا ہوں۔

اب یہی آپ کا شہر مین ہیٹن ہے۔ دنیا سے الگ تھلگ، چاروں طرف گودیاں ہی گودیاں جیسے بحر ہند میں جزیروں کے گرد مونگے کی چٹانوں کا حلقہ، جدھر بھی نظر دوڑائیے تجارت کا دریا موجزن۔ اس شہر میں دائیں مڑیے چاہے بائیں، آپ کو ہر سڑک پانی کی طرف لے جائے گی۔ آبادی کے بالکل آخری سرے پر توپ خانہ ہے۔ ذرا وہاں چلئے، پانی کا دور دور تک پتا نہ ہو گا، لیکن آپ کے دیکھتے دیکھتے سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگے گی اور لہریں آ آ کے اس قدیم اور شاندار عمارت کے پیروں پر ٹکرانے لگیں گی۔ ملاحظہ تو فرمائیے پانی کا تماشا دیکھنے کے لیے کتنی خلقت جمع ہے۔

اتوار کو تیسرے پہر کے وقت جب فضا پر غنودگی طاری ہو، شہر کا ایک چکر تو لگائیے۔ کورلیئرز ہک سے کوئنٹیز سلپ جائیے، پھر وہاں سے وائٹ ہال ہوتے ہوئے شمال کی طرف چلئے۔ آپ نے کیا دیکھا! بولئے! ——— شہر کے چاروں طرف ہزاروں انسان پہرے داروں کی طرح اپنی اپنی جگہ بت بنے کھڑے ہیں اور سمندر کے خوابوں میں غرق ہیں۔ کسی نے لٹھوں سے ٹیک لگا رکھی ہے، کوئی کھمبے پر چڑھ کے بیٹھا ہے، کچھ لوگ چین سے آئے ہوئے جہازوں کے پشتوں پر سے جھانک رہے ہیں، کچھ لوگ بادبانوں کی رسیوں پر جا ٹنگے ہیں جیسے سمندر کو اور بھی اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن یہ سب کے سب خشکی پر رہنے والے لوگ ہیں، ہفتہ بھر اینٹ اور گارے کی عمارتوں میں پڑے گلا کیے ہیں۔ کوئی اپنے تختے پر جکڑا رہا ہے، کسی کو بسولے نے پکڑے رکھا ہے، کوئی میز سے چپکا رہا ہے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ ہرے بھرے کھیت کیا غارت ہو گئے؟

یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟

ارے، ادھر تو دیکھیے! ابھی تو اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ ان کا بھی رُخ سیدھے پانی کی طرف ہے، معلوم ہوتا ہے وہ غوطے لگانے کی فکر میں ہیں۔ عجیب بات ہے، جب تک خشکی کے خاتمے پہ نہ پہنچ جائیں ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ سلنے والے گوداموں کے سائے میں، سمندر کے کنارے کھڑے ہونے سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا نہیں۔ یہ تو پانی کے جتنے قریب جا سکیں اتنے قریب جانا ضرور ہے، بس ایک بات ہے کہ پانی میں گرنے نہ پائیں۔ دیکھیے پرا جمائے کھڑے ہیں، میلوں تک یہی نظر آ رہے ہیں۔ اور مزا یہ کہ یہ سب کے سب سمندر سے دور رہنے والے۔ گلی کوچوں میں سے نکل کے آ رہے ہیں، سڑکوں پر سے، خیابانوں میں سے ـــــ شمال سے، جنوب سے، مشرق سے، مغرب سے۔ لیکن یہاں پہنچ کے سب ایک ہو جاتے ہیں۔ ذرا مجھے بتائیے تو سہی، ان جہازوں کی گھڑیوں میں جو مقناطیسی سوئیاں لگی ہیں کیا یہ سب ان کے اثر سے کھنچے چلے آتے ہیں؟

اچھا اور سنیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دیہات میں ہیں، اور یہ جھیلوں کا علاقہ ہے، آپ جس پگڈنڈی پہ چاہیں چلیں، سو لئے آپ کبھی گھاٹی میں جا پہنچیں گے اور اپنے آپ کو ایک چشمے کے کنارے کھڑا پائیں گے۔ یہ تو جادو کا سا کھیل ہے کہ کوئی آدمی کیسا ہی خود فراموش کیوں نہ ہو اور اپنے خیالوں میں کتنا ہی کھویا کیوں نہ رہتا ہو ـــــ اُسے بس سیدھا کھڑا کر دیجیے اور ایک قدم چلا دیجیے، وہ آپ کو ادھر کے پانی کے پاس پہنچائے گا ہاں، شرط یہ ہے کہ اس علاقے میں پانی ہو۔ اگر امریکہ کے صحرائے اعظم میں آپ کو کبھی پیاس لگے اور آپ کے قافلے میں کوئی فلسفہ چھانٹنے والا پروفیسر موجود ہو تو یہ ترکیب آزما دیکھیے۔ ہاں یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ پانی اور غور و فکر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اب دیکھیے، یہ ایک مصور ہے۔ وہ ایک وادی کے انتہائی خواب آلود، انتہائی طمانیت بخش، انتہائی سکون انگیز، انتہائی دلفریب اور رومانی منظر کی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ بتائیے وہ خاص طور سے کون سی چیز استعمال کرے گا؟ اس کے پاس درخت بھی موجود ہیں، ہر ایک کا تنا اندر سے کھوکھلا ہے، بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کوئی راہب اپنی صلیب لیے وہاں چھپا بیٹھا ہو۔ یہاں سے وہاں تک مرغزار پھیلا ہے، بھیڑیں سو رہی ہیں، سامنے کی جھونپڑی سے دھواں اونگھتا ہوا اوپر اٹھ رہا ہے۔ دور جنگل کی گہرائیوں میں ایک پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی چلی جا رہی ہے اور نیلے پہاڑوں کی چوٹیوں میں پہنچ کے غائب ہو جاتی ہے۔ فضا پر ایک محویت طاری ہے، صنوبر کی آہیں چرواہے کے سر پر پتیوں کی طرح گر رہی ہیں لیکن اگر چرواہے کی نظریں سامنے والے دلفریب چشمے پر لگی نہ رہ گئی ہوتیں تو یہ ساری چیزیں مصور کے ذرا بھی کام نہ آتیں۔ کبھی جون کے مہینے میں گھاس کے میدانوں کی سیر کیجیے کہ میلوں تک آپ کو گھٹنے گھٹنے جنگلی پھولوں کے درمیان چلنا پڑے گا۔ بتائیے اس منظر میں کس چیز کی کمی ہے؟ ـــــ پانی کی ـــــ یہاں آپ کو پانی کی ایک بوند نہیں ملے گی! اگر آبشار نیاگرا میں پانی کے بجائے ریت بھرا ہوتا تو کیا آپ ہزاروں میل چل کے اسے دیکھنے جاتے؟ وہ ایک مفلس شاعر کا قصہ ہے کہ اسے ایک دم سے بہت سارا پیسہ مل گیا۔ ضرورت تو تھی اسے کوٹ کی لیکن وہ اس مخمصے میں پڑ گیا کہ روپے سے یہ کام نکالوں یا پیدل چل کے ساحل کی سیر کر آؤں۔ آخر اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ ہر تندرست لڑکا جس کی روح بھی توانا ہو اور جسے بھی کبھی نہ کبھی وقت

سمندر کے سفر کے لیے کیوں بے تاب ہو جاتا ہے؟ آپ خود اپنے آپ ہی کو دیکھیے۔ جب آپ نے پہلی بار سمندر کا سفر کیا ہے اور آپ کو پہلی دفعہ بتایا گیا کہ اب جہاز پر سے خشکی نظر نہیں آ رہی تو آپ کو اپنے اندر ایک پُراسرار قسم کا ارتعاش کیوں محسوس ہوا! قدیم ایرانی سمندر کو مقدس کیوں سمجھتے تھے؟ یونانیوں نے سمندر کے لیے ایک الگ دیوتا کیوں رکھا تھا اور اسے زیوس کا بھائی کیوں کہتے تھے؟ یقیناً یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان باتوں میں کوئی معنی ہی نہ ہوں۔ اور ان سے بھی گہری معنویت نارسی سس کے قصے میں ہے۔ اسے چشمے کے اندر ایک حسین اور اذیت انگیز عکس نظر آیا۔ جب وہ اسے پکڑ نہ سکا تو پانی میں کود کے ڈوب مرا۔ لیکن یہی عکس خود ہمیں سارے دریاؤں اور سمندروں میں نظر آتا ہے۔ یہ زندگی کی روح کا عکس ہے جسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا۔ اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ جب میری آنکھیں دھندلا سی جاتی ہیں اور مجھے اپنے پھیپھڑوں کی فکر پڑ جاتی ہے تو میں سمندر کے سفر پہ روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھیے کہ میں مسافر کی حیثیت سے جاتا ہوں۔ مسافر بن کے جانے کے لیے تو آدمی کے پاس بٹوہ ہونا چاہیے اور اگر بٹوے کے اندر کچھ بھی نہ ہو تو اس میں اور چیتھڑے میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ مسافر لوگ تو سمندر میں پہنچ کے بیمار پڑ جاتے ہیں ——— چڑچڑے بن جاتے ہیں ——— رات کو سو نہیں سکتے ——— عام طور سے انھیں سفر میں زیادہ مزا نہیں آتا۔ نہیں، میں مسافر کی حیثیت سے کبھی نہیں جاتا۔ یوں تو کھایت جہازی تو میں بھی ہوں، لیکن میں کپتان یا باورچی بن کے بھی نہیں جاتا۔ ان عہدوں کی عزت اور شان و شوکت انھی کو مبارک رہے جنھیں یہ چیزیں پسند ہیں۔ رہا میں، تو مجھے ہر طرح کی شریفانہ اور قابلِ عزت سرگرمیوں اور آزمائشوں سے نفرت ہے۔ یہاں اپنے آپ کو ہی نہیں سنبھالا جاتا، جہازوں اور کشتیوں کی خبرگیری کس سے ہو گی! البتہ یہ مانتا ہوں کہ باورچی بن کے جانے میں خاصی شان ہے، کیونکہ جہاز میں باورچی ایک طرح کا افسر ہوتا ہے لیکن نہ معلوم کیا بات ہے، مجھے مرغیاں بھوننے کا شوق کبھی نہیں ہوا۔ ہاں، جب مرغی بھن جائے، گھی فراخ دلی سے ڈالا گیا ہو اور نمک مرچ بھی ٹھیک ہو تو اس کا احترام مجھ سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ قدیم مصری تو بھنے ہوئے بگلوں اور دریائی گھوڑوں کو پوجتے تھے، جبھی تو ان کے زبردست باورچی خانوں میں یعنی اہرام کے اندر ان جانوروں کی حنوط شدہ لاشیں نظر آتی ہیں۔

نہیں، میں تو جب کبھی سمندر پہ جاتا ہوں، معمولی ملاح کی حیثیت سے۔ کبھی ٹھیک مستول کے سامنے ڈٹا ہوا ہوں، کبھی جہاز کے پچھلے حصے میں اتر گیا ہوں، کبھی اگلے سرے پہ جا چڑھا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ وہاں لوگ مجھ پہ حکم تو چلاتے ہیں اور مجھے بلّیوں پر اس طرح پھدکنا پڑتا ہے جیسے چراگاہ میں ٹڈا۔ شروع شروع میں یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی۔ اس میں ایک ہتک سی محسوس ہوتی ہے۔ اگر آدمی کسی پرانے خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اور بھی زیادہ، بلکہ سب سے زیادہ تو اس وقت جب تارکول کی بالٹی میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے آدمی دیہات میں مدرس کی حیثیت سے بادشاہی کر چکا ہو اور بڑے سے بڑے لڑکے اس کے رعب سے کانپتے رہے ہوں۔ یقین جانیے، مدرس رہنے کے بعد آدمی ملاح بنے تو یہ بڑا زبردست انقلاب ہوتا ہے اور اسے مسکراتے ہوئے برداشت کر لے جانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نے رواقی فلسفیوں سے بہت کچھ اخذ کیا ہو لیکن آہستہ آہستہ یہ بات بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی کھڑا بڈھا کپتان مجھے جہاز کے عرشہ صاف کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس میں کیا ہے! اس میں کونسی بڑی توہین ہے؛ یعنی اگر عہدنامہ جدید کے حساب سے دیکھا جائے تو اگر میں اس بڈھے کا یہ حکم نہایت احترام کے ساتھ فوراً بجا لاتا ہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں حضرت جبرئیل کی نظروں میں گر جاؤں گا؟ ذرا یہ تو بتایئے کہ غلام کون نہیں ہوتا؟ خیر بڈھے کپتان مجھ پر کتنا ہی حکم چلائیں اور میری کتنی ہی ٹھکائی کریں لیکن مجھے تو یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ سب ٹھیک ہی تو ہے کبھی نہ کسی طرح ہر آدمی پر یہی گزرتی ہے —— جسمانی طریقے سے، یا مابعد الطبیعاتی طریقے سے سہی، ساری کائنات میں ادھر دیکھو یہی ٹھکائی چل رہی ہے چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ایک دوسرے کے کندھے سہلائیں اور صبر سے کام لیں۔

پھر میں سمندر پر ایک اور وجہ سے بھی ملاح بن کے جاتا ہوں۔ مجھے اپنی تکلیف کی اجرت مل جاتی ہے، کسی مسافر کو تو میں نے سنا نہیں ایک پائی ملی ہو۔ اس کے برخلاف مسافروں کو تو الٹے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ پیسے دینے اور پیسے لینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ باغِ جنت کے ان دو چوروں کی بدولت ہمیں جتنی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں ان میں یہ پیسے دینے کا کام سب سے ناخوشگوار ہے لیکن پیسے لینا! بھلا اس کا مقابلہ کون سی چیز کر سکتی ہے! لوگ جس شائستگی کے پیسے لیتے ہیں اسے دیکھ کر واقعی تعجب ہوتا ہے کیونکہ ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں ساری برائیوں کی جڑ پیسہ ہے اور پیسے والا کسی طرح بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہائے، ہم بھی کس خوشی کے ساتھ جہنم میں جانے کو تیار ہو جاتے ہیں!

ملاح بن کے جانے کی آخری وجہ یہ ہے کہ سامنے والے عرشے پر ہوا بہت صاف ہوتی ہے اور وہاں ورزش بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ جیسا دنیا میں ہوتا ہے، اسی طرح جہاز پر بھی ہوائیں پیچھے کے بجائے سامنے کی طرف سے زیادہ آتی ہیں (البتہ جب آپ فیثا غورث کے مقولے کی خلاف ورزی کریں) چنانچہ جب سے تو عرشے کے جہازیوں کے پاس آتی ہے اور پچھلی طرف کپتان کے پاس پہنچتے پہنچتے باسی ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ہوا میں پہلے میں نے سانس لیا مگر دراصل ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہت سی دوسری چیزوں میں بھی عوام اپنے رہنماؤں سے آگے رہتے ہیں اور ان بیچاروں کو شبہ تک نہیں ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ میں تو ہر دفعہ تجارتی جہازوں پر ملاح بن کے جاتا تھا پھر اس دفعہ وہیل مچھلی کے شکار کو جانے کی کیسے سوجھی؟ تقدیر نے میرے اوپر ایک چوکیدار تعینات کر رکھا ہے میں اسے دیکھ تو نہیں سکتا مگر وہ برابر میری نگرانی کرتا ہے۔ خفیہ طور سے میرے ساتھ ساتھ پھرتا ہے اور نہ معلوم کس طرح میرے افعال و اعمال بھی اس کے اختیار میں ہیں —— اس سوال کا جواب بس ایک ہی دے سکتا ہے۔ دل میرا اس سفر پر جانا بہت پہلے مقدر ہو چکا تھا اور قسمت نے اسے بھی اپنے زبردست تماشے کے پروگرام میں داخل کر لیا تھا۔ یوں تو اور بھی بڑے بڑے کھیل تھے لیکن بیچ میں ایک مختصر سا ناٹک یہ بھی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے اس حصے کی عبارت کچھ یوں ہوگی

امریکہ کے صدارت کے لیے زبردست مقابلہ

ایک شخص اسمٰعیل وہیل کے شکار کو نکلتا ہے

افغانستان میں خونریز جنگ

اس تماشے کا انتظام قسمت کی دیویوں کے ہاتھ میں ہے۔ انھوں نے کسی کو تو المیہ کا شاندار ہیرو بنایا، کسی کو طربیہ میں مختصر اور آسان سا کام دیا، کسی کو مزاحیہ کھیل میں جھونک دیا، لیکن میرے حصے میں وہیل کے شکار کا سفر ہی کام آیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن اب مجھے وہ سارے حالات یاد آ رہے ہیں تو میرا خیال ہے کہ میں ان تحریکات اور مقاصد کو تھوڑا بہت سمجھ چلا ہوں جو بڑی چالاکی سے مختلف لباسوں میں میرے سامنے پیش کیے گئے اور مجھے یہ کھیل کھیلنے کی ترغیب دلائی گئی۔ پھر ساتھ ہی مجھے اس خوش فہمی میں بھی مبتلا رکھا گیا کہ میں نے یہ انتخاب سوچ سمجھ کر اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے کیا ہے۔

ان تحریکات میں سب سے بڑی چیز تو خود وہیل جیسی زبردست مچھلی کا مرعوب کن تصور ہی تھا۔ اس ہولناک دیوقامت اور پُراسرار مخلوق کا خیال آتے ہی میں ہمہ تن اشتیاق بن جاتا تھا۔ پھر وہ دور دراز اور وحشت ناک سمندر تھے جہاں وہیل اپنا جزیرے کے برابر پھیلا ڈیل لیے گھوما کرتی تھی۔ خود اس مچھلی کی طرف سے لاحق ہونے والے بے نام خطرات تھے جن سے کوئی چارہ نہیں مل سکتا تھا۔ سفر کے بے شمار مناظر اور عجائب و غرائب تھے ——— ان سب چیزوں نے میرے دل میں اس مہم کی خواہش پیدا کر ہی دی۔ اور لوگوں پر شاید ان ترغیبات کا کوئی اثر نہ ہوتا، لیکن میرا حال یہ ہے کہ جو چیزیں مجھ سے دُور ہیں ان کی لگن مجھے ذرا چین نہیں لینے دیتی۔ مجھے تو یہ شوق ہے کہ جن سمندروں میں جانا منع ہے وہاں سفر کروں اور وحشیوں کے ملک دیکھوں۔ جو چیزیں اچھی ہیں ان سے بھی میں بے تعلق نہیں ہوتا، لیکن جو چیز خوفناک یا قابلِ نفرت ہوتی ہے میں بڑی جلدی دیکھتا ہوں، بلکہ اگر لوگ مجھے اجازت دیں تو میں اس سے یارانہ گانٹھ لوں کیونکہ آدمی جس جگہ مقیم ہو وہاں کے رہنے والے سے صلح صفائی رکھنی چاہیے۔

غرض ان باتوں کے پیشِ نظر مجھے یہ موا ایک نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ عجائبات کی دنیا کا دروازہ کھل گیا اور جن تخیلات نے مجھے یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا اُن کے ذریعے میری روح کی گہرائیوں میں وہیلوں کے جلوس کے جلوس تیر تیر کے آنے لگے اور ان میں سے تقریباً ہر جلوس کے درمیان ایک عظیم الشان اور نقاب پوش عفریت نما مچھلی تھی جیسے ہوا میں کوئی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی۔

باب - ۲

دری کا تھیلا

میں نے دو ایک قمیص پہنے پرانے دری کے تھیلے میں بھریں اسے بغل میں دبایا اور کیپ ہیورن اور بحر الکاہل کی طرف چل پڑا۔ میں نے آج جہاں شہر میں پیر پھوڑ کر بیٹھے سوچا تھا اسی طرح نیو بیڈفرڈ جا پہنچا۔ دسمبر کا زمانہ اور سنیچر کی رات تھی۔ یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ نانٹکٹ جانے والی کشتی روانہ ہو چکی ہے اور اب پیر سے پہلے وہاں کسی طرح بھی نہیں پہنچا جا سکتا۔

دو چار ہی جو وہیل کے شکار کی تکلیفوں اور عذابوں کے رسیا ہوتے ہیں شروع ہی میں نیو بیڈفرڈ کے قریب ٹھیرتے ہیں پھر جہاں سے اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ اس لیے میں بتا دوں کہ میرا ارادہ اس قسم کا ذرا بھی نہ تھا۔ کیونکہ میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں نانٹکٹ والے جہاز کے سوا کسی اور جہاز میں سفر نہیں کروں گا۔ قصہ یہ ہے کہ اس پرانے مشہور جزیرے کی ہر چیز میں ایک لطافت آمیز شور برپا ہو گیا تھا جسے میں بے انتہا پسند کرتا تھا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ کچھ دن سے وہیل کے شکار کا سارا کاروبار آہستہ آہستہ نیو بیڈفرڈ کے پاس آ گیا ہے اور اس معاملے میں بیچارا نانٹکٹ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ لیکن یہ شہر تو نقل ہے۔ اس کی اصل نانٹکٹ ہے۔ یہ گویا اس قرطاجنہ کا شہر طائر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں امریکہ کی پہلی مردہ وہیل کنارے پر لائی گئی تھی۔ یہیں کے قدیم باشندے سرخ رنگ دیسی لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر اس بحری عفریت کا پیچھا کرنے نانٹکٹ ہی سے تو چلے تھے اور کہاں سے ہو اور یہاں بار دار ہی گیروں کا وہ سب سے پہلا جہاز بھی تو یہیں سے روانہ ہوا تھا۔ روایت ہے کہ ان لوگوں نے اپنے جہاز میں باہر سے لا کر پتھر بھر لیے تھے جنہیں وہیل پر پھینک پھینک کے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جو اتنے قریب آ گئے یا نہیں کہ جہاز کے کنارے پر کھڑے ہو کر برچھے استعمال کر سکیں۔

ابھی مجھے ایک دن اور دو راتیں نیو بیڈفرڈ میں گزارنی تھیں۔ اس سے پہلے مجھے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے جہاز نہیں مل سکتا تھا چنانچہ مجھے فکر پڑ گئی کہ اس دوران میں کھانے پینے اور سونے کا کیا انتظام کروں۔ موسم کی حالت دیکھ کر میں سہا جاتا تھا۔ سردی کے مارے دانت بجنے لگے تھے۔ رات بالکل اندھیری، ویران اور بے رنگ تھی۔ پھر اس شہر میں ایک بھی واقف کار نہ تھا۔ میں نے اس پریشانی میں ساری جیبیں کھنگال ڈالیں مگر چاندی کے دو چار سکوں سے زیادہ اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں تھیلا کندھے پر رکھے ایک ویران سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا شمال کے اندھیرے کا مقابلہ جنوب کی تاریکی سے کر رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ دیکھو اسمٰعیل تم سمجھدار آدمی ہو جہاں کہیں بھی جاؤ اور رات بسر کرنے کے لیے جو بھی ٹھکانا ڈھونڈو پہلے پہلے پوچھ لینا اور زیادہ حیثیت میں نہ آنا۔

جھجکتے جھجکتے قدموں سے میں سڑکوں کو ناپنے لگا اور ایک سرائے کے پاس سے گزرا جس پر ضرب کے نشان کی صورت میں دو برچھے بنے ہوئے تھے۔ یہاں بڑی چہل پہل تھی۔ مگر پیسے بھی اتنے ہی خرچ ہوتے۔ آگے چلا تو کشادہ اور چمکیلی دار سرائے

کی طرح شریر کھڑکیوں سے ایسی گرم اور تیز روشنی نکل رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا مکان کے سامنے جما ہوا سارا برف پگھل کے رہ گیا۔ باقی ہر طرف دس دس انچ گہرا برف جما پڑا تھا اور چہرہ کا سخت کھڑا سا لگنے لگا تھا۔ برف کی کھڑکیوں سے میرا پیر گرا تو مجھے چیخوف کا وڈوم یاد آ جاتا کیونکہ میرے جوتے میری اتنی مدت بھلا چکے تھے کہ اب ان کا حال پتلا تھا۔ میں دم بھر کے لیے رنگ کے سڑک پر روشنی کا منظر دیکھنے اور سرائے میں گلاسوں کی کھنکھناہٹ سننے لگا، پھر سوچا کر یہاں بھی بڑی چہل پہل ہے۔ مگر ہے یہ بھی بہت گراں۔ آخر یہ سرائے کا اشتہار، سُننے بھر ہی چل پڑو، دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ، تمھارے پیچھے پرانے جوتے لوگوں کا راستہ روک رہے ہیں۔ چنانچہ میں چل پڑا۔ اب کے میں خود بخود ان سڑکوں پر ہو لیا جو مجھے پانی کی طرف سے جا رہی تھیں کیونکہ اس قسم کی سرائیں وہیں ہو سکتی تھیں جن میں رونق چاہے اتنی نہ ہو، مگر سستی بے حد ہوں۔

کیا سنسان اور وحشت ناک سڑکیں تھیں! دونوں طرف مکان نہیں بلکہ اندھیرے کے ڈھیر سے رکھے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ موم بتی سی جلتی نظر آجاتی تھی، جیسے کسی مقبرے میں چراغ ٹمٹما رہا ہو۔ آج ہفتے کا آخری دن تھا۔ وقت بھی کچھ زیادہ نہ ہوا تھا لیکن اس محلے میں منادی تھا نہ آدم زاد۔ رستے میں ایک چوڑی سی نیچی عمارت کے اندر سے دھندلی دھندلی روشنی نکلتی دکھائی دی۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا جیسے ہر خاص و عام کو اندر آنے کی اجازت ہو۔ عمارت پر ایک بے اعتنائی سی طاری تھی جیسے یہ جگہ عام لوگوں کے استعمال کے لیے ہو۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک صندوق سے جا ٹکرایا، جو شاید راکھ بھری تھی۔ اس ٹھوکر سے اتنی راکھ اڑی کہ میرا دم گھٹنے لگا اور میں نے دل میں کہا کہ ارے، کہیں یہ شہر عمورہ کی راکھ تو نہیں ہے جس پر خدا کا غضب نازل ہوا تھا؟ پہلی سرائے پر ریچھ بنے ہوئے تھے، دوسری پر گرداب مچھلی، اس سرائے کا نشان ہو گا آدمیوں کو پھانسنے کا جال۔ بہرحال میں ٹھٹھک گیا۔ اندر سے ایک اونچی آواز آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں آگے بڑھا اور ایک دوسرا دروازہ کھولا جو اندر کی طرف تھا۔

یہاں پہنچ کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے توفت میں تخت کی پرجا ہو رہی ہو۔ کوئی سو دو سو کالے کالے چہرے اپنی اپنی قطاروں میں مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ان سے آگے ایک کالا بھجنگ موت کا فرشتہ منبر پر چڑھا ہوا ایک کتاب کو دو دستوں سے پیٹ رہا تھا۔ یہ حبشیوں کا گرجا تھا اور وعظ کی تقریر کا موضوع تھا "جہنم کی تاریکی اور وہاں کی آہ و زاریاں"۔ میں بھاگ کھڑا ہوا اور بولا کہ ارے اشتہار بل! اس سرائے میں جو تفریحات میسر آتی ہیں وہ بڑی غضب کی ہیں۔ آخر ہے نا آدمیوں کو پھانسنے کا جال!

میں پھر چل پڑا اور آخر بندرگاہ کے قریب پہنچ کر ایک دھیمی سی روشنی نظر آئی اور ہوا میں ایک وحشت ناک چرچراہٹ سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا تو پتا چلا کہ دروازے پر ایک تختہ جھول رہا ہے جس پر سفید رنگ سے کچھ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک مدھم سی تصویر تھی جس میں فوارے کی پھوار سیدھی اوپر کی طرف جا رہی تھی اور نیچے یہ عبارت لکھی تھی ——— "فوارہ مچھلی والی سرائے ——— پیٹر کوفن"۔

فوارہ مچھلی! ——— کوفن ——— یعنی تابوت! میں نے سوچا کہ شگون تو بہت برا ہے۔ لیکن سنا ہے کہ

یورپ میں یہ وہم بہت ہی عام ہے اور غالباً یہ شخص پیرس ہی سے آکے یہاں بسا ہے۔ چونکہ روشنی بہت ہی ہلکی تھی کچھ کم اس وقت یہ جگہ بالکل خاموش اور پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ یہ تو تھا چھوٹا کاٹیج کا مکان ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی جلے ہوئے شہر کے کھنڈروں میں سے اٹھا کے اسے یہاں لے آئے ہوں، اور جھولتے ہوئے تختے کی چرچراہٹ سے الاس ٹپک رہا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ یہیں یہ سرائے بڑی سستی ہوگی اور یہاں قہوہ بھی اچھا ملے گا۔

یہ مکان بہت ہی عجیب و غریب قسم کا تھا۔ دقیانوسی، آخر میں کھمرں کی دیوار، ایک طرف کو جھکا ہوا جیسے فالج مار گیا ہو۔ یہ ایک ویران جگہ بالکل کنارے پہ واقع تھا جہاں طوفانی ہوا یورکلون اتنا شور و غل مچاتی تھی کہ بچارے پرانے مکان کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے چاروں طرف بھی پہنچایا ہوگا۔ بہر حال اگر آدمی اپنے گھر میں بیٹھا ہو اور سوتے سمے انگیٹھی پر پاؤں سے آگ تاپ رہا ہو تو اس کے لیے یہ ہوا بھی بڑی فرحت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ایک بڑا پرانا مصنف ہے جس کی کتابیں اب کہیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتیں، بس میرے پاس ایک ہی جلد ہے۔ وہ لکھتا ہے ——— "جس طوفانی ہوا کو یورکلون کہتے ہیں اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہوئے اس بات سے بہت بڑا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے شیشے کی کھڑکی میں سے دیکھ رہے ہیں جہاں سارا کہرا باہر کی طرف ہے، یا بے کواڑوں کی کھڑکی میں سے جہاں کہرا دونوں طرف ہے اور جس کی مرمت بس موت کا فرشتہ ہی کرے تو کرے۔" مجھے یہ عبارت یاد آئی تو میں نے سوچا واقعی ٹھیک ہے، بڈھے منشی! تیری بات پکی ہے۔ ہاں، یہ آنکھیں کھڑکیاں ہیں اور میرا یہ جسم مکان ہے۔ مگر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کی دراڑوں اور سوراخوں کی مرمت ہی نہیں کی گئی، اور کچھ نہیں تو یہاں وہاں چیتھڑے ہی ٹھونس دیے جاتے۔ لیکن اب تو وقت گزر گیا۔ اب ان چیزوں کو ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات مکمل ہو چکی، چھت کی پاٹ بھی بن گئی اور جو بچا کھچا مسالہ تھا وہ بھی لاکھوں برس ہوئے یہاں سے ہٹ گیا۔ بچارا العزر کھڑے کو تکیہ بنائے سڑک پر پڑا ہے، سردی کے مارے اس کے دانت بج رہے ہیں، کپکپی ایسی چھوٹی ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے تک الگ ہوئے جا رہے ہیں۔ چاہے وہ چیتھڑے اٹھا کے اپنے کانوں میں ٹھونس لے اور منہ میں ڈاٹ لگائے، مگر طوفانی ہوا السن کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس کے برخلاف دولت مند آدمی اپنی سرخ ریشمی عبا پہنے بیٹھا ہے، جب وہ بستر میں پہنچا تو اسے اور بھی سرخ عبا ملی، وہ کہہ رہا ہے ——— "ارے، یورکلون سے گھبراتے ہو! ہونہہ! کیسی ٹھنڈی رات ہے کیا نفیس کہرا پڑ رہا ہے! وہ دیکھو، آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہیں، فضا میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں!" لوگ ایشیائی ملکوں کے موسم گرما کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، کہتے ہیں وہاں کے چمن سدا بہار ہوتے ہیں۔ لیکن میں تو بس اتنی حرارت کا طلب گار ہوں کہ میرے پاس کوئلے ہوں اور میں اپنی گرمیاں خود ہی پیدا کر لوں۔

لیکن العزر کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟ اس کے ہاتھ سردی سے نیلے پڑ چکے ہیں۔ کیا وہ انھیں اوپر اٹھا کے آسمان کی پھلجھڑیوں سے گرم کر سکتا ہے؟ کیا اس کا جی نہ چاہے گا کہ میں یہاں کے بجائے سماٹرا میں ہوتا؟

کیا دوڑ کے لگاؤں؟ اس سے تو بہتر ہے میں چلا استر پہ جا کے لمبا لمبا لیٹ جاؤں۔ ہاں، اس جاڑے پالے سے بچنے کے لیے تو وہ بستر میں بھی جانے کو راضی ہو جائے گا۔

اگر کوئی برف کا پانی بنتے بنتے شرق الہند کے جزیروں میں آٹھیرے تو یہ واقعی عجیب بات ہوگی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت ناک چیز یہ ہے کہ نقرو ایک امیر آدمی کے دروازے سے سامنے کھڑنجے پہ بے یار و مددگار پڑا ہے۔ جہاں تک اس امیر آدمی کا تعلق ہے تو وہ منجمد آہوں کے برفانی محل میں شہنشاہ کی طرح رہتا ہے۔ شراب خواری کے خلاف اس نے ایک انجمن بنا رکھی ہے جس کا وہ صدر ہے چنانچہ وہ چینیوں کے شیر گرم آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں پیتا۔

مگر اب یہ بکواس بند کرنی چاہیئے۔ ہم تو وہیل کے شکار کو جا رہے ہیں۔ ابھی اس کے بہت موقعے آئیں گے۔ ہمارے پیر سردی سے گلے جا رہے ہیں۔ لاؤ پیروں پر سے برف جھاڑ دیں اور اندر چل کے دیکھیں کہ یہ فوّارچل وال سرائے کس قسم کی ہے۔

فوارہ مچھلی والی سرائے

سرائے میں داخل ہوتے ہی ایک کچی چھت کی چوڑی اور یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ڈیوڑھی ملتی تھی جس کی دیواروں پر پرانے طرز کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر کسی ٹوٹے پھوٹے بیکار جہاز کے تختوں کا خیال آتا تھا۔ ایک طرف ایک بہت بڑی روغنی تصویر لگی تھی جو دھوئیں سے کالی پڑ کے بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ چونکہ تصویر پر روشنی کچھ آڑی ترچھی اور ناہموار سی پڑتی تھی اس لیے جب تک آپ اس کا باقاعدہ، بار بار اور محنت کے ساتھ مطالعہ نہ کریں اور اپنے ساتھ والوں کی رائے نہ پوچھیں یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ اس میں ہر طرف چیز بغیر کسی خاص وجہ کے سامنے ہی سامنے نظر آتے تھے چنانچہ اسے پہلی دفعہ دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا تھا کہ جن دنوں نیو انگلینڈ میں جادوگرنیاں ردکی گئی تھیں اس زمانے کے کسی حوصلہ مند اور نوجوان مصور نے مدہوش کر دینے والی سحر زدگی کے عالم میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ اس پر بار بار غور و خوض کرنے کے بعد خصوصاً ڈیوڑھی کے پچھلی طرف جو چھوٹی سی کھڑکی تھی اسے کھول کر، آخر آپ اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ یہ خیال مبالغہ آمیز سہی مگر کچھ ایسا بے بنیاد بھی نہیں۔

لیکن سب سے زیادہ الجھن میں ڈالنے والی چیز یہ تھی کہ ایک عجیب قسم کے سفید جھاگ پر سے بیچ میں سے دھندلی نیلے رنگ کی عمودی لکیریں تیر رہی تھیں اور ان کے اوپر تصویر کے بیچوں بیچ کوئی عظیم الجثہ اور لچک دار سی کالی کالی چیز منڈلا رہی تھی۔ غرض یہ تصویر کیا تھی ایک گھپلا تھا جس میں، نہ جانے کیا کیا بلا بھر رکھا تھا کہ اعصابی مزاج کا آدمی دیکھے تو پاگل ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود تصویر میں کچھ ایسی مبہم، بے نام اور بعید از قیاس رفعت تھی کہ دیکھنے والے کی نظریں اس پر گڑ کے رہ جاتی تھیں یہاں تک کہ وہ بے اختیار دل میں یہ عہد کر لیتا تھا کہ میں اس بے مثال تصویر کے معنی دریافت کر کے رہوں گا۔ پھر آدمی کے ذہن میں طرح طرح کے نفیس لیکن گمراہ کن خیالات گزرنے لگتے تھے —— یہ بحیرۂ سیاہ میں رات کے وقت طوفان کا منظر ہے —— یہ چاروں عناصر کی غیر فطری جنگ ہے —— جلے ہوئے جنگل کا افق ہے —— قطب شمالی میں جاڑے کا سین ہے —— وقت کے منجمد دریا کی برف ٹوٹ رہی ہے۔ لیکن تصویر کے بیچ میں کوئی ایسی ہیبت ناک چیز تھی جس کے سامنے یہ سارے گمان باطل ہو کے رہ جاتے تھے۔ اگر اس کا پتا چل جائے تو باقی سب آسان تھا۔ لیکن ٹھہریے تو سہی۔ کہیں یہ چیز ایک زبردست مچھلی سے تو مشابہ بہت نہیں لگتی؛ یہ بحری عفریت تو نہیں ہے؟

میں نے اس موضوع پر کئی معمر لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد مجموعی طور سے ان رایوں کی بنیاد پر اپنا ایک الگ نظریہ قائم کیا ہے۔ اس تصویر میں درحقیقت مصور نے یہ کچھ پیش کیا ہے —— ایک جہاز زبردست طوفان میں پھنس گیا ہے۔ آدھا تو بالکل پانی میں ڈوب چکا ہے۔ بس تین اکھڑے ہوئے مستول نظر آ رہے ہیں۔ ایک جھنجھلائی ہوئی وہیل جہاز کے دوسری طرف

چھلانگ جانے کی نیت سے ڈھولکی ڈھو ستونوں پر ٹنگ گئی ہے۔

دروازے کے سامنے والی دیوار پر بڑے خوفناک قسم کے برچھے اور بھالے ایک قطار میں لگے ہوئے تھے۔ بعض میں موٹے موٹے چمکدار دانتے جیسے ہاتھی دانت کا آرا، بعض میں انسانی بالوں کے پھندے لگے ہوئے۔ ایک برچھے کی شکل آرا سی لگی دیکھے ایک نہایت لمبا دستہ جو گھوم کر اس زین کی طرح بن گیا تھا جیسے لمبے بازوؤں والے کسان کی کٹائی سے گھاس میں پڑ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی لرز اٹھتا تھا اور یہ تعجب ہونے لگتا تھا کہ ایسا ہولناک اور خونخوار ہتھیار لے کے کون سا آدم خور وحشی انسانوں کو مولیوں کی طرح کاٹنے نکلا ہوگا۔ اس قطار میں کچھ ایسے ٹوٹے پھوٹے، زنگ آلود اور بگڑی شکل کے بھالے بھی رکھے تھے جو وہیل کے شکار میں کام آتے ہیں۔ پھر کچھ ہتھیار ایسے بھی تھے جن کی حیثیت تاریخی تھی۔ یہ بھالا ایک زمانے میں بہت لمبا و بالکل سیدھا تھا لیکن اب تو کسی طرح مڑ تڑ کے رہ گیا تھا۔ پچاس سال ہوئے ناظم حسین نے سورج نکلنے کے وقت سے لے کے سورج غروب ہونے تک اس بھالے سے چند وہیل مچھلیاں ماری تھیں۔ وہ برچھا اب تو کاگ نکالنے کے پیچ کی طرح لگتا ہے مگر جاوا کے سمندر میں ایک شکاری نے لے وہیل پر پھینک کے مارا تھا اور وہ اسے اپنے بدن میں لیے بھاگ گئی تھی پھر کئی سال بعد جا کے بلانکو کی لاش کے قریب ہاتھ آئی۔ سوئی آدمی کے بدن میں رہ جائے تو آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ برچھا داخل تو ہوا تھا دم کے پاس مگر اس نے پورے چالیس فٹ کی منزل ماری اور آخر مچھلی کے کوہان میں گڑا ہوا ملا۔

اس تاریک ڈیوڑھی سے آگے ڈاٹ والی نیچی سی چھت کا ایک راستہ ہے۔ یہاں ہر طرف آتش دان بنے ہوئے ہیں۔ غالباً پرانے زمانے میں یہ جگہ اس مکان کی سب سے بڑی بیچ ہوگی۔ اسی کو کانٹ چھانٹ کے راستہ بنا لیا گیا۔ اسی میں سے گزریں تو بڑا کمرہ ملتا ہے۔ یہ جگہ اور بھی تاریک ہے۔ چھت کے شہتیر اتنے بھاری بھرکم اور نیچے ہیں، اور فرش کے تختے پرانے پڑ کے ایسے بیٹھ گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہم کسی دیوانی جہاز کی کوٹھری میں کھڑے ہیں اور ایسے وقت کہ اندھیری رات ہے، جھکڑ چل رہا ہے اور یہ لنگر کے وقتوں کی بوسیدہ کشتی ڈگمگا رہی ہے۔ کمرے کے ایک طرف ایک لمبی اونچی سی الماری نما میز رکھی ہے جس پر پچکے ہوئے شیشے کے بکس پڑے ہیں۔ ان بکسوں میں گرد آلود نوادرات بند ہیں، جو دنیا کے کونے کونے سے لا کر جمع کیے گئے ہیں۔ دوسرے کونے سے ایک پُراسرار کوٹھری جھانک رہی ہے۔ یہ شراب خانہ ہے اور اسے بڑے ان گھڑ طریقے سے وہیل کے سر کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے بھی ہو، کمرے سے وہیل کے جبڑے کی زبردست محرابی ہڈی تو نظر آتی ہے۔ یہ اتنی چوڑی ہے کہ اس کے نیچے سے اچھی خاصی بگھی گزر سکتی ہے۔ کوٹھری کے اندر میلی کچیلی الماریاں رکھی ہیں جن میں پرانی بوتلیں، صراحیاں، قرابے چنے ہوئے ہیں۔ یونس بھی اندر وہاں ماہی شدہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ یہاں اس ہلاکت خیز جبڑے کے اندر بھی ٹھگنا ایک معتوب بڈھا اپنا بگڑیوں دار چہرہ لیے بلبلاتا پھرتا ہے اور ایسے لوگ جو نقدی گنتے ہیں۔ وہ جہازیوں کی گانٹھ کاٹتا ہے اور ان کے ہاتھ سرسام، ہذیان اور موت بیچتا ہے۔

جن گلاسوں میں یہ شخص اپنا زہر بھر بھر کے دیتا ہے وہ بڑے ہی بے ڈول ہیں۔ یہ ہوتے ہوتے گلاس بڑی چالاکی سے بنائے گئے ہیں۔ باہر سے تو بالکل گول ہیں مگر اندر سے ان کی شیشے کی سطح اوپر سے نیچے کی طرف تنگ ہوتے چلے جاتے

ہیں اور کئی میں بھی اسی قسم کا فریب ہے۔ ان چوکھٹوں نے شیشے میں جتنی لکیریں ایک دوسرے کے متوازی کھود رکھی ہیں اس نشان تک بھرو تو ایک پیسے دام ہوئے۔ آگے اس نشان تک بھرو تو ایک پیسہ اور۔ غرض اوپر سے گلاس تک اسی طرح حساب چلتا ہے۔ ایک شلنگ دیجیے اور پورا قدح غٹ غٹ چڑھا جائیے۔

میں اس جگہ داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک میز کے گرد کچھ نوجوان جواری بیٹھے ہیں اور مدھم سی روشنی میں گھٹیا شراب کے مختلف نمونوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میں سرائے کے مالک کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ مجھے کمرہ چاہیے۔ وہ بولا کہ اس وقت تو سرائے میں کسی دھرنے کو جگہ نہیں، کمرہ وَمرہ، ایک چارپائی تک خالی نہیں ملے گی۔ پھر کچھ سوچا اور اپنا ماتھا تھپ تھپاتے ہوئے کہنے لگا ——— ذرا ٹھیرو، اگر تمھیں کسی مچھیرے کے ساتھ ایک ہی کمبل میں سونا پڑے تو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ میرا خیال ہے تم وہیل کے شکار کو نکلے ہو، اگر ابھی سے ایسی باتوں کی عادت پڑ جائے تو اچھا ہی ہے۔"

میں نے کہا کہ مجھے کسی کے ساتھ ایک ہی پلنگ پہ سونا پسند نہیں، لیکن اگر مجبوراً یہ حرکت کرنی ہی پڑے تو پہلے یہ دیکھوں گا کہ وہ مچھیرا کون ہے۔ بہر حال اگر سرائے میں بالکل جگہ ہی نہیں اور اس مچھیرے میں بھی کوئی بات اعتراض کے قابل نہیں تو اس اجنبی شہر اور ایسے جاڑے پالے میں آدھی رات کو ادھر ادھر مارے پھرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ کسی بھلے کے ساتھ کسی معقول آدمی کے آدھے کمبل پر ہی قناعت کروں۔

"میری بھی یہی رائے ہے۔ اچھا، ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔ کھانا؟ ——— کھانا تو چاہیے نا؟ ابھی تیار ہوا جاتا ہے۔"

میں لکڑی کی ایک پرانی بنچ پر بیٹھ گیا جس پر توپ خانے کی بچوں کی طرح لوگوں نے یہاں سے وہاں تک طرح طرح کی تصویریں کھود رکھی تھیں۔ بنچ کے ایک سرے پر کوئی ملاح عجب حسرت کے عالم میں بیٹھا اپنے چاقو سے گھٹنوں کے درمیان بڑی محنت کے ساتھ نقش و نگار بنا رہا تھا۔ وہ سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز کا نقشہ کھینچنے کی فکر میں تھا لیکن مجھے تو ایسا لگا کہ اس سے یہ کام ہو نہیں رہا۔

آخر میں سے چار پانچ آدمیوں کا بلاوا آیا اور ہم کھانے کے لیے برابر والے کمرے میں پہنچے۔ ٹھنڈ کے مارے قطب شمالی کا سا حال ہو رہا تھا، کیونکہ کمرے میں آگ نہ تھی۔ سرائے کا مالک کہتا تھا میرے پاس اتنے پیسے ہی نہیں۔ بس دو بتیاں دھیمی دھیمی جل رہی تھیں جن کے گرد پگھلا ہوا موم اوپر سے نیچے تک جما ہوا تھا۔ ہم نے یہی غنیمت سمجھا کہ اپنے اپنے موٹے کوٹوں کے بٹن بند کریں اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں سے گرم گرم چائے کے پیالے اٹھا کے ہونٹوں سے لگائیں۔ مگر کھانا بڑے زور کا تھا۔ گوشت اور آلو تو خیر ہوتے ہی ہیں، حلوہ بھی تھا۔ واہ! رات کے کھانے میں حلوہ! ایک نوجوان جس نے سبز رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا، حلوے پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑا۔

سرائے والا کہنے لگا ——— یار، ذرا دیکھ کے کھاؤ، رات کو ایسے ایسے ڈراؤنے خواب دیکھو گے کہ نیند بھی اڑ جائے گی۔"

میں نے آہستہ سے کہا ——— کہیں یہی تو وہ مچھیرا نہیں ہے؟"

"ارے نہیں۔" سرائے والا ایسے بولا جیسے کوئی زبردست لطیفہ سنا رہا ہو۔

"وہ بھیڑیا ادکالا کلوٹا ہے۔ وہ حلوہ بھی نہیں کھاتا۔ انڈا تک نہیں لگاتا۔ بس بچا ہوا گوشت کھاتا ہے۔ اس پر تو وہ جان دیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جان دیتا ہے تو دینے دو۔ یہ بتاؤ کہ وہ بھیڑیا ہے کہاں؟ یہیں کہیں ہے؟"

"ابھی آیا جاتا ہے۔" جواب ملا۔

مجھے یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر کیا کروں۔ اس کالے کلوٹے "بھیڑیے" کی طرف سے میرے دل میں تجسس پیدا ہو چلا۔ بہرحال میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر ہم دونوں کو ایک ساتھ سونا ہی پڑا تو میں اسے پہلے کپڑے اتار کے لیٹ جانے دوں گا جب خود لیٹوں گا۔

کھانا ختم ہوا تو ہم سب پھر شراب خانے میں آ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ چلو، دوسروں کا تماشا ہی دیکھوں گا۔

اتنے میں باہر سے غل غپاڑے کی آواز آئی۔ سرائے والا چونک پڑا اور بولا ——

"یہ گریمپس جہاز کے لوگ ہیں۔ آج صبح میں نے اسے سمندر میں آتا دیکھا تھا۔ تین سال کے سفر کے بعد آیا ہے اور پورا جہاز بھرا ہوا ہے۔ آؤ، اب دنیا کی تازہ خبریں سننے کو ملیں گی۔"

ڈیوڑھی میں سے جہازی بوٹوں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ ایک دم سے دروازہ کھلا اور وحشی قسم کے جہازیوں کی پوری ٹولی اندر آ گئی۔ بالوں والے کوٹوں میں لپٹے ہوئے، سر کے گرد اونی مفلر لپیٹے، خستہ حال، برف کے ریزوں سے جمی ہوئی داڑھیاں۔ کل ملا کر بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے لیبراڈور کے ریچھ کہیں سے پھوٹ پڑے ہوں۔ وہ ابھی ابھی اپنی کشتی سے اترے تھے اور سیدھے اسی سرائے میں چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ وہ سیدھے ترو تازہ ہونے کے لیے شراب خانے میں پہنچے، اور وہاں کے مستعد بڈھے نے جھٹ پٹ ان کے پیالے بھر بھر کے بانٹنا شروع کر دیے۔ ایک جہازی نے شکایت کی کہ مجھے سخت زکام ہو گیا ہے۔ جونا نے فوراً شربت میں شیرہ ملا کے گھول بنایا اور قسم کھا کے کہا کہ چاہے پرانے سے پرانا زکام نزلہ ہو یا لیبراڈور کے ساحل پر جو ہو یا کسی برفانی جزیرے میں، سب کے لیے تیر بہدف ہے، ادھر پیا ادھر غائب۔

جہازی ابھی ابھی اترے ہوں تو بڑے سے بڑے عادت کے پینے والے جلدی میں آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوا۔ ذرا سے ذرا میں سرور گٹھ گئے اور تا تھیا تا تھیا ناچ شروع ہو گیا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کچھ الگ تھلگ سا رہتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ تو نہیں چاہتا کہ اس کی سنجیدگی سے اس کے ساتھیوں کا مزا کرکرا ہو، پھر بھی وہ دوسروں کی طرح دھما چوکڑی نہیں مچا رہا تھا۔ اس آدمی سے نہ جانے کیوں مجھے فوراً ہی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جہاں تک اس داستان کا تعلق ہے، اس شخص کی حیثیت کچھ ایسی نمایاں نہیں رہے گی لیکن سمندر کے دیوتاؤں کی مرضی یہی تھی کہ وہ جہاز میں میرا ساتھی بنے۔ لہٰذا یہ مناسب ہو گا کہ میں اس کا مختصر سا خاکہ پیش کر دوں۔ اس کا قد

چھوٹ سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگا۔ چوڑے چکلے کندھے، سینہ پُر، اُس کا اُس۔ اس کے جیسے کا آدمی میں نے ذرا کم ہی
دیکھا ہے۔ چہرہ دھوپ میں تپتے تپتے سنولا گیا تھا اور سفید سفید دانت اس کھال کی وجہ سے موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔
آنکھوں میں گہرے گہرے سائے تھے جن میں کچھ ایسی یادیں تیرتی تھیں جو شاید اُن کے لیے زیادہ خوشگوار نہ تھیں۔ اُس کی
آواز تو جیسے چیخ کر کہتی تھی کہ یہ امریکہ کے جنوبی علاقے کا باشندہ ہے۔ لیکن اُس کا جسم قد دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دیوقامت کے
لیے تو شاید پہاڑی لوگوں میں سے ہے۔ جب اُس کے ساتھیوں کی ہنگامہ بازی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ چپکے سے باہر کھسک لیا
اور اس کے بعد وہ مجھے پھر کہیں جہاز میں جا کے نظر آیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ اپنے ساتھیوں میں بہت مقبول تھا کیونکہ دو چار منٹ
بعد ہی لوگوں نے اُسے وہاں نہ پایا تو اُس کی ڈھنڈیا پڑ گئی اور سب کے سب چلانے لگے،

"بلکنگٹن! بلکنگٹن! اِدھر گیا ہے" اور پھر اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

اب نو بجا چاہتے تھے اور اتنے ادھم کے بعد کمرے میں جنت کی سی خاموشی اور سکون محسوس ہو رہا تھا۔ جہازیوں
کے اندر آنے سے ذرا پہلے مجھے ایک بچھڑے کی سی ترکیب سوجھ گئی تھی۔ اس وقت مجھے یہ چیز بڑی غنیمت معلوم ہوئی۔

ایک پلنگ پر دو آدمیوں کا سونا تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔ اور تو اور آدمی کو اپنے بھائی کے ساتھ بھی سونا پسند نہیں
ہوتا۔ خدا جانے بات کیا ہے لیکن لوگ چاہتے ہیں کہ جب سوئیں تو تخلیہ رہے اور جب ایک انجانے شہر اور انجانی سرائے
میں ایک انجانے اجنبی کے ساتھ سونے کا سوال آ پڑے تو ہزاروں ہی اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر میں تو جہازی آدمی ٹھیرا،
میں کسی اور کے ساتھ کیوں سوتا؟ آخر سبب؟ جس طرح ملک پر کوارے بادشاہ کسی اور کے ساتھ نہیں سوتے، یہ تو ٹھیک ہے
کہ جہازی سارے کے سارے ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں لیکن ہر ایک کے پاس الگ الگ بچھونا اور اپنا کمبل ہوتا ہے
اور ہر شخص اپنی کھال میں مست ہو کے سوتا ہے۔

اس بچھڑے کے متعلق میں نے جتنا سوچا، اُس کے ساتھ سونے کے خیال سے مجھے اتنی ہی ابکائی آنے لگی۔ آخر وہ بچھڑا
ہی تو تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اُس کے کپڑے چاہے کتنی ہی ہوں چاہے اُونی قمیص اور عمدہ کیا معنی، صاف ستھرے بھی نہ
ہوں گے۔ یہ سوچ کے مجھے جھرجھری آ گئی۔ پھر اب رات بھی ڈھل چلی تھی۔ یہ ذات شریف آتے ہی ہوں گے اور سیدھے بستر میں
گھسیں گے۔ فرض کیجیے وہ آدمی رات کو دھڑ سے آ کے میرے اوپر گرے تو مجھے کیا پتا چلے گا کہ یہ کس گندی موری سے
نکل کے آرہا ہے؟

میں نے سرائے کے مالک کو پکارا۔ "بھئی! میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں اُس بچھڑے کے ساتھ نہیں سوؤں گا۔
ذرا اس بنچ پر دیکھوں گا کہ یہ کیسی رہتی ہے۔"

"جیسا تمہارا جی چاہے کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ بنچ پر بچھانے کو کوئی تھیں میز پوش تک نہیں دے سکتا۔ یہ تختہ تو بالکل
کھردرا ہے۔" اُس نے لکڑی کی گرہوں اور گانٹھوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "اچھا ذرا ٹھیرو۔ اُدھر شراب خانے میں ایک بڑھئی کا رندہ
پڑا ہے۔ ذرا ٹھیرو، میں ابھی تمہارا انتظام کیے دیتا ہوں۔ دیکھنا کیسے آرام سے سوتے ہو۔" چنانچہ وہ رندہ اٹھا لایا پہلے تو

اپنے پرانے ریشمی رومال سے پنچ کی گرد جھاڑی پھر لنگوٹی جیسی کوئی چیز نکالی، رندے کے بیری سمری پر پھیلا کر اس کے چھلکے دائیں بائیں اڑنے لگے۔ یہاں تک کہ رندے کا پھل کھٹ سے ایک اینٹ کا ٹکڑا پر اپنا حرون کٹنے والا نہ تھی۔ سرائے والے کی کلائی میں بل پڑ آتے آتے رہ گئی۔ میں نے کہا خدا کے لیے بس کرو۔ میرے لیے تو یہ پنچ بھی خاصی نرم تھی پھر رندہ کرنے سے ہوتا بھی کیا ہے۔ دیوار کا تختہ ذرا ٹیڑھا ہی تو ہے رہا۔ سرائے والا پھر دانت کوس کے ٹھکرا دیا۔ کڑی کے چھلکے جھڑے۔ کمرے کے بیچ میں جو چٹی تھی اس میں پھینکے اور اپنے کام سے لگا۔ مجھے یوں ہی گرگر کے عالم میں چھوڑ گیا۔

میں نے جو پنچ کو ناپا تو پتا چلا کہ پورے فٹ بھر چھوٹی ہے۔ لیکن اس کا انتظام تو کرسی ملا کے ہو سکتا تھا۔ مگر جہاں چوڑائی میں ایک فٹ کی کمی تھی۔ کمرے میں بس ایک پنچ اور تھی اور وہ بھی رندہ کی ہوئی پنچ سے چار انچ اونچی۔ انھیں بھی جوڑ کے بچھانا ممکن نہ تھا۔ دیوار کے پاس تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ میں نے پنچ وہیں لمبی لمبی بچھادی بس آنا فانا صلہ چھوڑ کر میری کمر سما جائے۔ لیکن ابھی لیٹے دیر نہ ہوئی تھی کہ پتا چلا کہ کڑی کے نیچے سے ٹھنڈی برف ہوا آرہی ہے۔ چنانچہ یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہو سکتی تھی۔ اس دوسرے اور بھی کونے کھدرے دروازے میں سے ہوا کی ایک دوسری لہر آکے چل رہی تھی اور میں جگہ میں رات بسر کرنے کی سوچ رہا تھا اس کے قریب اچھے خاصے چھوٹے چھوٹے بگولے اٹھ رہے تھے۔

میں دل ہی دل میں پھیرے کو کوس رہا تھا۔ اتنے میں خیال آیا کہ پھیرو تو کیسی، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں پہلے سے کمرے پر قبضہ کروں، اندر سے کنڈی چڑھا کے اس کے پلنگ پر سو جاؤں اور چاہے وہ کتنا ہی دروازہ پیٹے ایک نہ سنوں؟ یہ ترکیب کچھ ایسی بری نہ تھی۔ لیکن اس پر دوبارہ غور کرنے کے بعد میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ کون جانے کل صبح کمرے سے باہر نکلوں تو پھیرا مجھ سے نپٹنے کو ڈیوڑھی میں تیار کھڑا ہو!

میں نے پھر چاروں طرف نظر دوڑائی اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ اگر کسی دوسرے کے ساتھ نہ سوؤں تو چھان کے ساتھ رات بسر کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں نے پھیرے کو دیکھا تک نہیں، بس خواہ مخواہ کی چڑ کے کیا معنی؟ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر اور انتظار کروں وہ اب آتا ہی ہوگا۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ کے اطمینان کروں گا۔ ابھی سے کیا خبر ہے شاید اس کا ساتھ ایسا برا نہ رہے۔

جو لوگ سرائے میں ٹھیرے ہوئے تھے وہ تو ایک ایک، دو دو کر کے آتے جا رہے تھے اور اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ رہے تھے۔ لیکن میرے والے پھیرے کا کوئی پتا نہ تھا۔

میں نے سرائے والے سے پوچھا — "یہ آدمی ہے کیا؟ کیا ہمیشہ اتنی ہی دیر میں آتا ہے؟ اب تو بارہ بجا چاہتے ہیں۔"

سرائے والے نے پھر اسی طرح بتیسی باہر نکال دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات پر ہنسی کئے چلا جا رہا ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں آتی نہیں۔ وہ کہنے لگا۔ نہیں۔ عام طور سے تو وہ سویرے ہی آجاتا ہے۔ سویرے سے سونا اور سویرے اٹھنا اس کا دستور ہے۔ صبح کے وقت خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں نا! لیکن آج رات وہ پھیری پہ نکلا تھا۔

جانے کہاں دیر ہو گئی۔ شاید اس کا سر بکا ہو گا۔" "اس کا سر بکا ہو گا؟ ــــ یہ کون سی کہانی شروع کر دی! مجھے کوئی گھامڑ سمجھا ہے؟" واقعی مجھے جلال آ گیا۔ "بس تم نے کہہ دیا اور میں نے یقین کر لیا۔ کیا تمھارا مطلب ہے کہ آج سنیچر کی رات کو یک اتوار کی صبح کو، یہ پورے شہر میں واقعی اپنا سر بیچنے لگا ہے؟"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" سرائے والے نے کہا۔ "اور میں نے تمھیں بتا دیا تھا کہ یہاں نہیں بکے گا منڈی پہلے ہی بھری پڑی ہے۔"

"کس چیز سے بھری پڑی ہے؟" میں نے چلا کے پوچھا۔

"سروں سے، اور کس سے؟ دنیا میں سر پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ہیں۔"

میں نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا ــــ "دیکھو بھئی، صاف صاف سن لو۔ اب یہ طوطا مینا کی کہانی ختم کرو۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں۔"

"سنو۔" اس نے ایک لکڑی نکالی اور دانتوں کے خلال بنانے لگا۔ "لیکن ایک بات بتائے دیتا ہوں اگر کہیں اس کچھیرے نے تمھیں اس کے سر کا ذکر اس بے ادبی سے کرتے سن لیا تو سمجھ لو پھر تمھاری خیر نہیں۔"

"ابھی میں اس کا سر توڑ ڈالوں گا۔" مجھے سرائے والے کی بکواس پر ایک دم سے پھر طیش آ گیا۔

"وہ تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے۔" سرائے والے نے کہا۔

"ٹوٹا ہوا ہے؟" میں بولا "تمھارا مطلب ہے واقعی ٹوٹا ہوا ہے؟"

"ہاں واقعی۔ شاید اسی وجہ سے تو بکتا نہیں۔"

میں اپنے اطمینان کے ساتھ اس کی طرف بڑھا جیسے برف کے طوفانوں میں پہاڑی چوٹی کھڑی رہتی ہے۔ "بس بھئی، اب یہ سلسلہ ختم ہو چکا۔ اب ہماری تمھاری دوستی ہو جانی چاہیے، اور فوراً کے فوراً میں نے تمھاری سرائے میں آ کے تم سے بستر مانگا۔ تم نے کہا کہ بس آدھا پلنگ مل سکتا ہے، باقی ایک کچھیرے کا ہے۔ میں نے اس شخص کو ابھی دیکھا تک نہیں اور تم اس کے بارے میں ایسی باتیں سنائے چلے جا رہے ہو کہ میں تو بالکل بھونچکا رہ گیا۔ سن سن کے خواہ مخواہ وحشت ہوتی ہے۔ کسی کے ساتھ سونے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس سے بڑا پالا پڑتا ہے اور وہ اپنا محرم راز ہے۔ تم مجھے اس آدمی کے ساتھ سلانا بھی چاہتے ہو اور میرے دل میں اس کی طرف سے تشویش بھی پیدا کر رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھیں جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہو، ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ یہ کچھیرا ہے کون، اور کیسا آدمی ہے اور اگر میں اس کے ساتھ سوؤں تو کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم نے سر بیچنے کا جو قصہ سنایا تھا اسے واپس لیجیے کہہ دو یہ سب مذاق تھا۔ اگر یہ بات سچی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ شخص بالکل پاگل ہے اور میں پاگل آدمی کے ساتھ سونے سے باز آیا۔ جناب! آپ بھی سن لیجیے۔ آپ جان بوجھ کر مجھے ایسے آدمی کے ساتھ سلانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ آپ سراسر قانون کی زد میں آتے ہیں اور آپ کے اوپر مقدمہ چل سکتا ہے۔"

"ہوں۔" سرائے والے نے ایک لمبا سانس بھر کے کہا: "یار تم تو بیچ مزاج کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کبھی کبھار غصہ آ جاتا ہے تو اور بات ہے۔ لیکن اس وقت تو تم نے پوری تقریر جھاڑ دی۔ خیر تو ذرا میرے کام کی بات سنو۔ جس بھیڑیے کی بات کر رہا ہوں وہ ابھی جنوب کے سمندروں سے واپس آیا ہے۔ نیوزی لینڈ میں اس نے بہت سے معرکے سر کر لیے تھے۔ تم جانتے ہو، ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ اس نے سارے کے سارے بیچ ڈالے ہیں، بس ایک رہ گیا ہے۔ اسی کو وہ آج رات بیچنے نکلا ہے۔ کیونکہ کل تو اتوار ہے۔ یہ بات ٹھیک رہتی کہ لوگ تو گرجا چلے جاتے اور وہ سڑکوں پر انسانوں کے سر بیچتا پھر رہا ہے۔ پچھلے اتوار کو اس کا یہی ارادہ تھا۔ وہ چار سر پیاز کے گٹھوں کی طرح رسی میں پرو کے نکلا ہی تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔"

اب یہ پہیلی میری سمجھ میں آئی اور پتا چلا کہ سرائے والا مجھے الو نہیں بنا رہا تھا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ جو شخص سنیچر کی رات کو باہر نکلے اور اتوار جیسے مقدس روز بھی مرے ہوئے کافروں کے سر بیچتا پھرے وہ آدم خور نہ ہوگا اور کیا ہوگا؟ ایسے شخص کے بارے میں کیا رائے قائم کروں؟

میں نے سرائے والے سے کہا ــــ "پھر تو بات صاف ہو گئی۔ یہ بھیڑیا تو بڑا خطرناک آدمی ہے۔"

"وہ پیسے تو برابر ادا کرتا ہے۔" مجھے جواب ملا۔ "خیر بھئی چھوڑو، پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مزے سے ٹانگیں پھیلا کے سوؤ۔ پلنگ بڑا اچھا ہے۔ جب ہمارا گٹھ بندھن ہوا تھا تو میں اور میری بیوی اسی پہ سوتے تھے۔ پلنگ کا چھپر ہے۔ دو کیا بھی ہوں تو کوئی بات نہیں۔ خوب لوٹے پوٹے پھرو۔ میں تمھیں بتاؤں جن دنوں ہم اسی پہ سوتے تھے میری بیوی سیم اور جونی دونوں کو پائینتی لٹاتی تھی۔ لیکن ایک دفعہ رات کو میں خواب دیکھتے دیکھتے ٹانگیں چلانے لگا اور بچارا سیم پلنگ کے پیچھے فرش پہ جا کے پڑا۔ بس خیریت ہوئی کہ اس کا بازو ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اس کے بعد بیوی بولی کہ اب یوں کام نہیں چلے گا۔ اچھا ادھر آؤ۔ میں تمھارے لیے روشنی کا بھی انتظام کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کے اس نے ایک موم بتی جلائی اور میری طرف بڑھا دی۔ وہ تو مجھے راستہ دکھانے کو تیار کھڑا تھا، اور میں عجب گومگو کے عالم میں تھا۔ اتنے میں اس کی نظر کونے والی گھڑی پر پڑی اور وہ ایکدم سے چیخ اٹھا۔ "لو اتوار شروع ہو گیا۔ آج رات وہ بھیڑیا نہیں آئے گا۔ اسے کوئی اور ٹھکانا مل گیا۔ چلو آ جاؤ۔ بس اب آ جاؤ۔ نہیں آؤ گے؟"

تھوڑی دیر تو میں نے غور کیا، پھر ہم دونوں زینے پر چڑھ لیے۔ اب میں ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ واقعی وہاں ایک جہازی پلنگ موجود تھا جس پر ایک دو نہیں، چار آدمی قطار لگا کے سو سکتے تھے۔

سرائے والے نے موم بتی ایک عجیب و غریب قسم کے صندوق پر رکھ دی جو بیچ کی میز کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور الماری کے بھی۔ "لیجیے جناب، اب آپ آرام سے سو جائیے۔ اچھا خدا حافظ۔" میں پلنگ کو دیکھ رہا تھا۔ پیچھے مڑا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

میں نے چادر الٹ دی اور پلنگ کے بستر کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کچھ ایسا نفیس سہی لیکن مجھے کوئی نقص بھی نظر نہیں

آیا بس کام پہلا ہو تھا۔ اب میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پلنگ اور صندوق کے علاوہ اس کمرے میں کوئی سامان نہ تھا بس چار دیواریں ہی دکھائی دے رہی تھیں ہاں، ایک بھدی سی الماری اور کھڑکی تھی اور آتش دان کے اوپر ایک آدمی کی شکل بنی ہوئی تھی جو وہیل کا شکار کھیل رہا تھا۔ یہ تصویر تھی تو کمرے ہی کی مگر اوپر سے کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ پھر کچھ ایسی چیزیں ادھر ادھر پڑی تھیں جن کا اس کمرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک ترنگھڑا تھا جسے کسی نے توڑ مروڑ کے کونے میں پھینک دیا تھا۔ ایک لمبا چوڑا سمندری تھیلا تھا جس میں مچھیرے کے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ اسے گویا بس کام ابدال سمجھیے۔ اسی طرح ہڈی کے بنے ہوئے مچھلی پکڑنے کے عجیب و غریب کانٹوں کا ایک پلندہ آتش دان کے اوپر رکھا تھا اور پلنگ کے سرہانے ایک لمبا سا برچھا کھڑا تھا۔

لیکن یہ صندوق پر کیا چیز ہے۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ روشنی کے قریب لے گیا، چھو کے دیکھا، سونگھا، غرض ہر ممکن تدبیر اختیار کی تاکہ اس کے بارے میں کوئی معقول رائے قائم کر سکوں۔ میں اس کی مثال کس چیز سے دوں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک بڑی سی چٹائی معلوم ہوتی تھی جس کے کناروں پر آرائش کے لیے چھوٹی چھوٹی گھنٹی بجتی ہوئی ٹکلیاں لگی ہوئی تھیں جیسے ریڈ انڈین لوگوں کے جوتوں میں چاروں طرف سیہ کے چوڑے دار کانٹے بھرے ہوتے ہیں۔ اس چٹائی کے عین بیچ ایک سوراخ یا چاک تھا جیسا آپ نے جنوبی امریکہ کے بارے میں دیکھا ہو گا۔ لیکن کیا یہ ممکن تھا کہ کوئی مچھیرا اتنی بیہودہ پوشاک پہنے اور چٹائی اوڑھے اور شریفوں کے شہر میں یہ حلیہ بنا کر دندناتا پھرے۔ میں نے اسے پہن کے دیکھا تو بوجھ کے مارے کمر ٹوٹنے لگی ایسا لگا جیسے کسی نے میرے اوپر پالان لاد دیا ہو۔ یہ تھوڑی سی گیلی بھی تھی۔ اوپر سے عجیب طرح لٹکتے ہوئے کچھ سیلی سیلی سی لگی جیسے کسی نے اسے بارش میں پہنا ہو۔ دیوار پر ایک آئینے کا ٹکڑا لگا ہوا تھا میں اسے پہنے پہنے آئینے کے پاس گیا تو وہ منظر دکھائی دیا جو عمر بھر نہ دیکھا تھا۔ میں نے چٹائی کو اتنی تیزی سے اتار کے پھینکا کہ گردن میں چک آ گیا۔

میں پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور سروں کی تجارت کرنے والے مچھیرے اور اس کی چٹائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر تو میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کے اوپر والا کوٹ اتار ڈالا۔ اور اسی فکر میں غرق کمرے کے بیچ بیچ جا کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے والا کوٹ بھی اتار دیا اور فقط قمیص پہنے پہنے سوچتا رہا۔ لیکن اس حالت میں سردی کے مارے دانت بجنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ سرائے والے نے کہا تھا مچھیرا آج رات بالکل نہیں آئے گا، کیونکہ اب دیر بہت ہو گئی۔ چنانچہ میں نے سب فکر چھوڑ دی۔ جوتا اور پتلون اتار کے دور پھینکا، بتی بجھا کے بستر میں گھس گیا اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا۔

نہ جانے توشک میں بھٹے بھرے تھے یا ٹوٹے ہوئے برتن بہر حال میں دیر تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند تھی کہ آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ خدا خدا کر کے ذرا آنکھ جھپکی اور میں اچھا خاصا خوابوں کی سرزمین کی طرف چل پڑا۔ اتنے میں باہر سے بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور کواڑوں کے نیچے سے روشنی کی ایک کرن کمرے میں داخل ہوتی نظر آئی۔

میں نے دل میں کہا اللہ خیر کرے یہی موذی مچھیرا ہے جو سر بیچتا پھرتا ہے لیکن میں چپکا پڑا رہا اور یہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ خود نہ بولے میں ایک لفظ نہ کہوں گا۔ ایک ہاتھ میں چراغ۔ دوسرے میں وہی نیوزی لینڈ والا سر لیے اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے پلنگ کی طرف دیکھا تک نہیں موم بتی مجھ سے کافی دور کونے میں فرش پر رکھ دی اور کمرے میں جو ذرا سا تھیلا پڑا تھا
اس کی ڈوری کی گرہیں کھولنے لگا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کی بے چینی ہو رہی تھی لیکن تھیلے کا منہ کھولتے ہوئے اس نے
اپنا منہ دوسری طرف ہی پھیرے رکھا۔ یہ کام ختم کر کے وہ دریچے کی طرف مڑا۔ تو یہ کیا منظر دیکھنے میں آیا ہے ایک عجیب چہرہ تھا۔
اس کا رنگ خوب گہرا سرخی مائل زرد تھا اور سارے منہ پر کالی کالی چوکور تختیاں سی چپکی ہوئی تھیں۔ ہاں! جو میں نے سوچا تھا وہی
نکلا۔ اپنا بستر کا ساتھی تو بڑا ہی خوفناک ہے۔ یہ ضرور کہیں لڑ چکا ہے۔ ابھی تو اس کے چہرے پر زخم لگے ہیں اور اب یہ سیدھا ڈاکٹر
کے یہاں سے آ رہا ہے۔ لیکن اتنے میں اس نے اتفاقاً روشنی کی طرف منہ پھیرا تو میں نے دیکھا کہ یہ چوکور چیزیں مرہم کے پھائے
تو ہیں نہیں۔ یہ تو کسی نہ کسی طرح کے دھبے تھے۔ پہلے تو کچھ پتا نہ چلا کہ انھیں کیا سمجھوں۔ پھر اصل بات کا تھوڑا سا اندازہ ہوا۔ مجھے
ایک سفید فام شخص کی کہانی یاد آئی۔ وہ بھی وہیل کا شکاری تھا اور اتفاق سے آدم خوروں میں جا پہنچا تھا۔ ان لوگوں نے اس کا
بدن گود کے نقش و نگار بنا دیے تھے۔ چنانچہ میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ بھی ملکوں ملکوں پھرا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی
واقعہ پیش آیا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس سے ہوتا ہی کیا ہے یہ تو اس کا ظاہر ہے۔ آدمی کی کھال کیسی بھی ہو، وہ اس کے
باوجود ایماندار ہو سکتا ہے لیکن اس کا رنگ تو انسانوں جیسا نہیں۔ یعنی اس حصے کا رنگ جو گودے ہوئے چوکور نشانوں سے
الگ اور ان کے بیچ کا تھا۔ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کروں۔ ممکن ہے گرم ملکوں کی دھوپ سے اس کا رنگ ایسا
ہو گیا ہو۔ لیکن یہ بات بھی سمجھنے میں نہیں آتی کہ سفید رنگ کا آدمی دھوپ میں جل بھن کے سرخی مائل زرد رنگ کا ہو جائے۔ بہر حال میں تو
جنوبی سمندروں کی طرف کبھی گیا نہیں تھا۔ شاید کھال پر وہاں کی دھوپ کا اثر اتنا ہی غیر معمولی ہوتا ہو۔ اچھا! میرے ذہن میں تو سب
خیالات بجلی کی طرح دوڑ رہے تھے اور پھر میری موجودگی سے اب تک بے خبر تھا۔ تھیلا ذرا مشکل سے کھلا۔ پھر اس کے اندر ہاتھ
ڈال کے کچھ ڈھونڈنے لگا اور اس میں سے ایک ٹوماہاک کی شکل کی کوئی چیز نکالی اور ایک سیل مچھلی کی بالوں دار کھال کا بٹوا۔ یہ دونوں
چیزیں تو اس نے کمرے کے بیچ میں پرانے صندوق پر رکھ دیں اور وہ نیوزی لینڈ والا خوفناک سر تھیلے میں ٹھونس دیا۔
جب اس نے اپنی بیور والی نئی ٹوپی اتاری تو میں حیرت کے مارے قریب قریب چیخ پڑا۔ اس کے سر پر بالوں کا نام و نشان تک
نہ تھا۔ بس ایک چھوٹی سی چوٹی تھی جس کی گرہ ماتھے پر جھول رہی تھی۔ اس کا سرخی مائل گنجا سر بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سڑی کھوپڑی۔ اگر یہ اجنبی
میرے اور دروازے کے درمیان کھڑا ہوا نہ ہوتا تو میں صاف بھاگ لیتا۔

اس حالت میں بھی میرا جی چاہا کہ کھڑکی میں سے نکل لوں۔ مگر یہ کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ میں بہت ڈرپوک تو نہیں ہوں لیکن میری
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بدوضع سروں کے سوداگر کے متعلق کیا رائے قائم کروں۔ خوف لاعلمی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اجنبی
کو دیکھ کر میں تو شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ صاف بات ہے۔ اس وقت مجھے تو ایسا ڈر لگ رہا تھا جیسے آدھی رات کو میرے کمرے میں
کوئی بھوت پریت گھس آیا ہو۔ میں تو اتنا خوف زدہ تھا کہ اس سے بات کرنے اور اس بات کا مطلب پوچھنے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔

اس دوران میں وہ اپنے کام سے لگا رہا۔ اور کپڑے اتارتا رہا۔ آخر اس کا سینہ اور بازو دکھائی دینے لگے۔ میں قسم کھا
کے کہتا ہوں، چہرے کی طرح بدن کے ان حصوں پر بھی ویسے ہی چوکور نشان بنے ہوئے تھے اور کمر بھی انھی داغوں سے بھری پڑی

تھی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کے آرہا ہے اور اس نے ابھی خاص مرہم کے پھاہوں کی قمیص پہن رکھی ہے اور تو اور اس کی آنکھیں بالکل ویسی گڑی ہوئی تھیں گویا کھجور کے چھوٹے چھوٹے درختوں پر سبز کاہی رنگ کے جھنڈے چڑھے ہوں۔ اب تو یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ یہ شخص کوئی کم بخت الگ ہے جو کسی جہاز میں بیٹھ کے جنوب کے سمندروں سے یہاں تہذیب یافتہ ملک میں چلا آیا ہے۔ یہ سوچ کر میں کانپ اٹھا۔ نہ صرف جنگلی ہے، بلکہ سر بیچتا پھرتا ہے۔ شاید یہ اس کے بھائیوں کے سر ہیں تک ہے اٹے میرا سر بھی آجائے اس کی گھاتی تو دیکھو!

لیکن مجھے کانپنے کپکپانے کی بھی مہلت نہ ملی۔ کیونکہ جنگلی نے اب ایک ایسا کام شروع کیا کہ میں اس میں بالکل ہی کھو گیا اور مجھے یقین آگیا کہ یہ شخص عیسائی تو ہو نہیں سکتا۔ اس نے اپنا بھاری بھرکم لبادہ اتار کے کرسی پر لٹکا دیا تھا۔ اب وہ جیکٹ لبادے کی جیبیں ٹٹولنے لگا اور آخر ایک چھوٹا سا عجیب و غریب اور بے ہنگم بت نکالا جس کی کمر پر کوبڑ تھا اور رنگ ایسا جیسے تین دن کے حبشی بچے کا۔ مجھے وہ حنوط شدہ سر یاد آرہا تھا چنانچہ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ بھی کسی بچے کی لاش ہے اور ایسے ہی کسی طریقے سے محفوظ کرلی گئی ہے۔ لیکن پھر دیکھا کہ اس میں لچک ذرا نہیں اور یہ روغن دار آبنوس کی طرح چمک رہا ہے۔ لہٰذا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لکڑی کے بت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور واقعی یہی بات نکلی۔ کیونکہ اب جنگلی آتش دان کے پاس پہنچا اور تختہ ہٹا کے اپنا چھوٹا سا کبڑا بت سلاخوں کے بیچ میں یوں رکھ دیا جیسے میز پر ہو۔ آتش دان کی اینٹیں اور اندر سے چمنی دھوئیں سے بالکل کالی ہو رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا کہ ایسے دیوتا کے لیے یہ استھان بہت ہی مناسب ہے۔

بت میری نظروں سے آدھا چھپا ہوا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ مجھے بے چینی سی ہو رہی ہے۔ پہلے تو اس آدمی نے اپنے لبادے کی جیب سے دو مٹھیاں بھر کے چھیپیاں نکالیں اور بڑی احتیاط سے بت کے سامنے رکھ دیں۔ پھر بسکٹ کا ٹکڑا اوپر سے ڈال کے چھیپیوں میں چراغ کی لو سے آگ لگا دی۔ چنانچہ اس کی گیاری دھڑ دھڑ جلنے لگی۔ وہ بار بار آگ کے اندر جھپٹا مارتا اور جلدی سے ہاتھ باہر کھینچ لیتا۔ اس کی انگلیاں بہر صورت بری طرح جھلسی ہوں گی آخر اس نے بسکٹ اچھال ہی لیا اور آگ بجھا کے اپنے دیوتا کو بھینٹ چڑھا دی۔ لیکن شاید اس کے دیوتا کو یہ روکھی سوکھی چیز پسند نہیں آئی۔ وہ اسی طرح منہ بنائے بیٹھا رہا۔ ان حرکتوں کے ساتھ ساتھ پجاری کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ غالباً وہ اپنی کوئی مناجات پڑھ رہا تھا اور اس عبادت کے دوران میں اس کا چہرہ بے طرح پھڑک رہا تھا۔ آخر اس نے گیاری بڑھا دی اور اپنے دیوتا کو بہت ہی بے ادبی کے ساتھ اٹھا کے جیب میں اس بے پروائی سے ٹھونس لیا جیسے شکاری مرے ہوئے تیتر کو تھیلے میں ڈال لیتا ہے۔

اس کی ان عجیب و غریب سرگرمیوں سے میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ اب مجھے یہ آثار دکھائی دیئے کہ وہ اپنی کارروائی ختم کر کے میرے پاس بستر میں گھسنے ہی والا ہے۔ میں بڑی دیر سے گم سم پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ میاں! کچھ کرنا ہے تو چراغ گل ہونے سے پہلے ہی کر لو ورنہ پھر بات گئی۔

لیکن میں یہی سوچتا رہ گیا کہ کروں کیا، یہ وقفہ بڑا مہلک ثابت ہوا۔ اس نے میز پر سے اپنی کلہاڑی اٹھا کے پہلے تو اس کے

سر کو اٹھا چکا تھا۔ پھر چراغ کے پاس لے جا کے اسے جھکایا اور دستہ منہ میں لے کر جھک جھک تمباکو کا دھواں اڑانے لگا۔ میری آنکھ بھی ادھر جھپکنے پائی تھی کہ چراغ گُل ہو گیا۔ اور یہ آدم خور جنگلی اپنی کلہاڑی ہونٹوں میں دبائے میرے پاس بستر میں آکر دراز کے سامنے میری چیخ نکل گئی۔ بے ساختہ میں ... وہ ہڑبڑا کے جنگلی حیران رہ گیا اور ایک دم سے غرّا کے مجھے ٹٹولنے لگا۔

میری زبان اس بری طرح لڑکھڑا رہی تھی کہ پتا نہیں میں نے کیا کہا، کیا نہیں۔ خیر میں تڑخک کے دُور ہٹ گیا اور دیوار سے چپک گیا۔ پھر گڑگڑا کے اس سے التجا کی کہ تم جو کوئی بھی ہو، خدا کے لیے خاموش رہو اور مجھے اٹھ کے چراغ جلا لینے دو۔ اس نے غرغر کر کے کچھ کہا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"کون ہو؟" آخر کار اس نے کہا۔ "بولتا نہیں، حرامی، مار دھاں،" اور جلتی ہوئی کلہاڑی اندھیرے میں میرے چاروں طرف لہرانے لگی۔

"سرائے والے! خدا کے لیے آؤ۔ پیٹر کوفن!" میں چیخنے چلانے لگا۔ "سرائے والے! چوکیدار! پیٹر کوفن! یا اللہ، کوئی بچائے گا!"

"بھول! بتا کون ہے، حرامی، مار دھاں!" جنگلی پھر غرّایا، گرم گرم کلہاڑی لہرائے جا رہی تھی اور تمباکو کی راکھ اس بری طرح بکھر رہی تھی کہ میں سمجھا اب بستر میں آگ لگی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اتنے میں سرائے والا چراغ ہاتھ میں لیے آپہنچا۔ میں بستر میں سے کود کے اس کی طرف لپکا۔

"ڈرو مت جی۔" وہ پھر اسی طرح دانت نکوس کے بولا۔ "کوئی کوئیگ شریف آدمی ہے۔ تمھارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔"

"دانت کیوں پھاڑ رہے ہو؟" میں نے چیخ کے کہا۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ یہ معقول پھر آدم خور ہے؟"

"میں سمجھا تم جانتے ہو۔ کہا نہیں تھا میں نے کہ وہ شہر میں سر بیچتا پھرتا ہے؟ خیر، اطمینان سے لیٹو اور سو جاؤ۔ کوئی کوئیگ، ادھر دیکھو — یہ تم، ہم، یہ تم ہو ٹھیک؟ — یہ آدمی یہاں سونا مانگتا۔ سمجھے؟"

"سمجھا۔" کوئی کوئیگ بستر پر بیٹھے بیٹھے دھواں اڑاتے ہوئے غرّایا۔

"لیٹ جاؤ۔" وہ کلہاڑی سے مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولا اور رضائی ایک طرف کو ہٹا دیا۔ اس کے انداز میں صرف شائستگی ہی نہیں بلکہ واقعی نرم دلی اور ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ میں تو کھڑے کا کھڑا مبہوت رہ گیا اور اسے تکنے لگا۔ اس کا بدن چاہے گُدا ہوا ہے، لیکن مجموعی طور سے وہ بڑا صاف ستھرا آدم خور تھا۔ اور اچھا خاصا لگتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ میں نے خواہ مخواہ ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ یہ بھی میری طرح کا انسان ہے۔ اگر مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے تو وہ بھی مجھ سے خوف زدہ ہوگا۔ بدمست عیسائی کے ساتھ سونے سے تو معقول آدم خور کے ساتھ سونا اچھا۔

میں نے سرائے والے سے کہا۔ "اس شخص سے کہو کہ یہ اپنی کلہاڑی یا حقہ یا جو چیز بھی ہے وہاں رکھ دے، میں تمباکو نہیں پیتا۔ پھر میں اس کے پاس لیٹ جاؤں گا۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ بستر پر کوئی آدمی میرے پاس لیٹ کے تمباکو پیئے۔ خطرناک چیز ہے۔ میں نے اپنا بیمہ بھی تو نہیں کرا رکھا۔"

کرنل کونینگ سے یہ بات کہی گئی تو اس نے فوراً مان لی۔ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے پھر لیٹنے کا اشارہ کیا اور ٹرنک
کے ایک طرف کو ہو گیا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری ٹانگ تک میرے جسم سے نہ لگنے پائے گی۔

میں نے سرائے والے سے کہا: "اچھا، خدا حافظ، اب تم جا سکتے ہو۔"

میں بستر پر لیٹ گیا اور ایسے اطمینان کے ساتھ سویا کہ عمر بھر میں کبھی نہ سویا تھا۔

لحاف

اگلے دن صبح سو کر اٹھا تو میں نے دیکھا کہ کوئی کویگ کا بازو مجھے پیار بھرے اور مشفقانہ انداز میں میرے اوپر رکھا ہے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے میں اس کی بیوی ہوں۔ لحاف گدڑی کی وضع کا تھا اور اس میں رنگ برنگ کے چوکور یا گول ٹکڑے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ ادھر اس شخص کے گورے گورے بازو پر نقش و نگار کی ایک اچھی خاصی جھنگل بھول بھلیاں بنی تھی جس کا ہر حصہ ایک الگ ہی رنگ کا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سمندر میں اس نے اپنا بازو کبھی دھوپ میں رکھا کبھی سائے میں اور آستین کبھی کھینچ اوپر چڑھائی کبھی کلائی تک چڑھا دی۔ اس کا بازو بھی بالکل گدڑی جیسا ایک ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی ہے تو اس وقت بازو کا کچھ حصہ لحاف کے اوپر تھا اور دونوں کے رنگ آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ واقعی میں ان دونوں میں تمیز نہ کر سکا۔ البتہ بوجھ اور دباؤ سے اندازہ ہوا کہ کوئی کویگ نے مجھے لپیٹا رکھا ہے۔

اس وقت میرے احساسات بھی کچھ عجیب و غریب قسم کے تھے۔ خیر میں بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں بچہ ہی تھا تو مجھے اسی سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا تھا۔ میں کبھی طے نہیں کر سکا کہ یہ حقیقت تھی یا محض خواب۔ وہ بات یوں ہوئی۔ میں نہ معلوم کس شرارت میں لگا ہوا تھا شاید چمنی کے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسا میں نے ایک چمنی صاف کرنے والے لڑکے کو دو چار دن پہلے کرتے دیکھا تھا۔ میری سوتیلی ماں ہر وقت کسی نہ کسی بات پہ مجھے سزا دیتی رہتی تھیں یا کھانا کھائے بغیر سونے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ٹانگیں پکڑ کے مجھے نیچے گھسیٹ لیا اور حالانکہ یہ ۲۱ جون یعنی سال کا سب سے لمبا دن تھا اور ابھی دن کے دو بجے تھے مگر ان کا آرڈر یہی تھا کہ جاؤ، جاکے سو رہو۔ میری تو جان نکل گئی۔ لیکن کرتا ہی کیا۔ کان دبائے چوتھی منزل پہ اپنے کمرے میں آ گیا اور آہستہ آہستہ کپڑے اتارنے لگا کہ تھوڑا سا وقت یوں ہی گزرے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بستر پہ جا بیٹھا۔

میں بیٹھا ہی دل میں کڑھ رہا تھا اور یہ حساب لگا رہا تھا کہ پورے سولہ گھنٹے گزرنے کے بعد کہیں جا کے مجھے آزادی نصیب ہوگی۔ یعنی مجھے سولہ گھنٹے بستر میں گزارنے تھے۔ اس خیال سے ہی میری تو کمر دکھنے لگی۔ ابھی اچھا خاصا دن تھا۔ کھڑکی میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ سڑک پہ گاڑیاں کھڑکھڑاتی چل رہی تھیں اور گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ میں لیٹا گھبرا رہا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے پہنے۔ جرابیں پہنے ویسے پاؤں نیچے جا کر سوتیلی ماں کو ڈھونڈا اور ان کے قدموں پر گر پڑا۔ رو رو کے ان سے درخواست کی کہ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں نے جو گڑبڑ کی ہے تو میرے خوب جوتیاں لگائیے مگر مجھ کو بستر پہ بیٹھے رہنے کی سزا نہ دیجیے۔ لیکن میری سوتیلی ماں بھی اول درجے کی فرض شناس تھیں۔ مجھے اپنے کمرے میں واپس جانا پڑا۔ کئی گھنٹے میں یوں ہی پڑا رہا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ اور اتنی شدید اذیت ہو رہی تھی کہ دس بیس تو پھر بھی بڑی سے بڑی مصیبتیں

میں بھی محسوس نہیں ہوئی۔ آخر میری آنکھ لگ گئی لیکن بے چینی بدستور قائم رہی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر جب آہستہ آہستہ
بیدار ہوا تو اس وقت بھی خوابوں میں غرق تھا۔ خیر آنکھیں کھول کے دیکھا تو پتا چلا کہ پہلے تو کمرے میں دھوپ آ رہی تھی لیکن اب اندھیرا
چھا گیا تھا۔ ایک دم سے مجھے ایسا لگا جیسے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ نظر کچھ بھی نہ آ رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا لیکن
معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی غیر انسانی ہاتھ آ گیا ہے۔ میرا بازو بستر سے نیچے لٹک رہا تھا اور یہ بے نام خاموش اور
ناقابلِ فہم ہستی یا صورت جس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا، پلنگ پر میرے پاس بیٹھا تھا۔ فی الفور سامنے چپکا چلا رہا معلوم ہوتا تھا
اتنی دیر میں صدیاں کی صدیاں گزر گئیں۔ ڈر کے مارے میں سُن ہو کے رہ گیا تھا اور میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اپنا ہاتھ کھینچ لوں لیکن تمام
عمر بھی سوچ رہا تھا کہ اگر میں ذرا بھی ہلا تو خوفناک طلسم ٹوٹ جانے کا نہیں۔ یہ کیفیت کتنی دیر میں ختم ہوئی لیکن صبح اٹھ کر یہ ہاتھ جیسے لاتی ذہن میں پکا یقین
میں اسی فکر میں پڑا رہا کہ یہ کیا اسرار تھا مگر خاک سمجھ میں نہ آیا۔ آج بھی جب اس واقعے کا خیال آ جاتا ہے تو ذہن چکرا جاتا ہوں۔

صبح آنکھ کھلتے پر اس جنگلی کوئی کویگ کا بازو اپنے اوپر رکھا دیکھ کر عجیب و غریب احساسات میرے اندر پیدا ہوئے
وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے یہ غیر انسانی ہاتھ پہلے ہاتھوں میں پکڑ کر پیدا ہوئے تھے۔ البتہ اب کی بار خوف اور دہشت کا عنصر کم تھا۔
غیر حواس بحال ہوئے تو پچھلی رات کے واقعات اپنی اصل شکل میں ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہ
صورتِ حال کتنی مضحکہ خیز ہے۔ میں نے اس کا بازو ہٹانے اور اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو
سو رہا تھا۔ اس نے مجھے اور بھی زور سے جکڑ لیا گویا ہم دونوں کو موت کے سوا کوئی اور طاقت ایک دوسرے سے جدا نہ کر
سکتی تھی۔ اب میں نے اسے جگانا چاہا اور پکارا۔ "کوئی کویگ!" لیکن جواب میں بس خراٹے سنائی دیئے۔ میری گردن ٹوٹی جا
رہی تھی گویا کسی نے اوپر سے جوا رکھ دیا ہو۔ میں ذرا کھسک کے کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے ایسا لگا جیسے ایک ہلکی سی خراش آ گئی ہو۔
لحاف اتار کے پھینکا تو معلوم ہوا کہ جنگلی کے پاس کلہاڑی اس طرح رکھی ہے جیسے کوئی جاوڑے کی شکل کا بچہ سو رہا ہو۔ میں نے
دل میں کہا اچھے پھنسے۔ پرایا گھر، کسی سے جان نہ پہچان۔ پھر دن کا وقت اور میں ایک آدم خور اور ایک کلہاڑی کے ساتھ بستر
پر لیٹا ہوں۔ "کوئی کویگ!۔۔۔ خدا کے واسطے اٹھ بیٹھو۔ کوئی کویگ!" جب میں بہت تڑپا اور پکار پکار کے اس سے کئی دفعہ کہا
کہ اپنے ہم جنس مرد سے دلہن کی طرح چپٹ جانا کتنی بری بات ہے تو آخر جواب میں ایک غراہٹ کی سی آواز آئی۔ پھر اس نے بازو
ہٹایا۔ اپنا سارا بدن ایسے جھٹکا جیسے کتا پانی میں سے نکل کے جھٹکتا ہے۔ اور تیر کی طرح تن کے سیدھا بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں مل مل کے
مجھے دیکھ رہا تھا۔ گویا اسے یاد ہی نہ آ رہا ہو کہ میں وہاں کیسے پہنچا۔ لیکن آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہوتا جا رہا تھا کہ وہ مجھے پہلے سے
جانتا ہے۔ ادھر میں پڑا اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اب میرے دل میں کوئی ایسا اندیشہ باقی نہ رہا تھا بلکہ میں تو بڑے اشتیاق اور
غور کے ساتھ اس عجیب و غریب شخص کا مشاہدہ کرنے میں مصروف تھا۔ آخر جب اپنے بستر کے ساتھی کی ذہنیت اس کی سمجھ میں آ
گئی اور گویا اس نے یہ حقیقت قبول کر لی تو وہ کود کے فرش پر کھڑا ہو گیا اور چند اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی آوازوں کے ذریعے مجھ
سے کہا کہ اگر تم چاہو تو پہلے میں کپڑے پہن لوں، پھر تمہیں کمرے میں اکیلا چھوڑ کے چلا جاؤں گا تاکہ بعد میں کپڑے پہنتے رہنا۔ میں نے
دل میں کہا اس موقع پر کوئی کویگ نے تو بڑی شائستگی دکھائی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ چاہے آپ کچھ بھی کہیں ان وحشیوں کے

مزاج میں ایک لطافت ہوتی ہے جو خوش خلق لوگوں کے خمیر میں ہے۔ ایسی اس معاملے میں خاص طور سے کوئی کو ٹینگ کی تعریف اس لیے کر رہا ہوں کہ اس نے تو میرے ساتھ اتنی مروت اور گیرداری کا سلوک کیا اور میں نے بڑی ہی بدتہذیبی کا ثبوت دیا۔ میں نے پلنگ پر پڑے پڑے تماشا دیکھا اور اس کی ایک ایک حرکت غور سے دیکھتا رہا۔ اس وقت میرا تجسس میری تربیت پر غالب آگیا تھا۔ آجکل کوئی کو ٹینگ جیسا آدمی روز روز دیکھنے کو ملتا نہیں۔ وہ اور اس کے طور طریقے اسی قابل تھے کہ انھیں غور سے دیکھا جائے۔

اس نے کپڑے سر کی طرف سے پہننے شروع کیے یعنی سب سے پہلے اپنی کھال کی ٹوپی اوڑھی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دوں ٹوپی بے حد بری تھی۔ پھر پتلون پہنے بغیر جوتے ڈھونڈ کے نکالے۔ خدا جانے اس کے کیا معنی تھے۔ خیر۔ اگلی حرکت اس نے یہ کی کہ جوتے ہاتھ میں سنبھالے، ٹوپی سر پر پڑی رہی، پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ اس کے ہانپنے اور کھانسنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے پیر جوتے میں ٹھونس رہا ہے۔ میں نے تو یہ کام سدا سے کبھی دیکھا نہ سنا کہ آدمی دوسروں کی نظر سے بچ کے جوتا پہنے۔ مگر بات یہ ہے کہ کوئی کو ٹینگ تو جیسی دور کی مخلوق تھا۔ پوری طرح جنگلی تو پوری طرح گنوار۔ اس کے اندر بس اتنی تہذیب آگئی تھی کہ اپنی شخصیت کا اظہار ایسے عجیب و غریب طریقے سے کرے۔ اس کی تعلیم بھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ وہ تو محض جاہل کتب تھا۔ اگر وہ تھوڑا بہت تہذیب یافتہ نہ ہوتا تو شاید جوتوں کی زحمت اس کی روح کو نہ دیتا۔ پھر وہ اگر بالکل وحشی نہ ہوتا تو جوتے پہننے کے لیے پلنگ کے نیچے گھسنے کا خیال تک نہ آتا۔ آخر کار جب وہ نمودار ہوا تو اس کی ٹوپی ٹیڑھی ہو کے آنکھوں پر آ رہی۔ اب وہ لنگڑا کے اور ہچکچا ہچکچا کے کمرے میں پھرنے لگا جیسے جوتا پہننے کی عادت نہ ہو۔ اس کے جوتے گائے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور بیچتے بیچتے ان میں شکنیں پڑ گئی تھیں۔ پھر اب بھی ٹھیک نہ تھی۔ صبح کے وقت ایسے جا سے باہر میں وہ انھیں پہن کے چلا تو جوتے کاٹنے لگے اور اس کی جان عذاب میں آگئی۔

کھڑکی پر کوئی پردہ نہ تھا۔ دھوپ بہت چڑھ چکی تھی۔ سامنے والے مکان سے یہ کمرہ اندر تک نظر آتا تھا۔ کوئی کو ٹینگ کے بدن پر ٹوپی اور جوتوں کے سوا ایک تار تک نہ تھا۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ کمرے میں گھستا تو وہ بڑا ہی چوتی لگ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اس کے ہاتھ پیر جوڑے کہ جلدی سے کپڑے پہن لو اور کہیں نہیں آخر کمرے کو ٹنکوں ہی چڑھا اور اس نے میری بات مان لی اور پھر منہ ہاتھ دھونے کے لیے بڑھا۔ صبح کے وقت ہر معقول آدمی اپنا منہ ضرور دھوتا ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس نے بس پیٹ، سینے، بازوؤں اور ہاتھوں کو دھو کر لی۔ اس کے بعد ساکٹ بیچ اور نیچے والی میز پر کھڑا ملک صابون کا ایک ٹکڑا اٹھا کے سر پر رگڑنے لگا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھوں یہ اپنا تحفہ کہاں رکھتا ہے۔ اب ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے پلنگ کی پائینتی سے برچھا اٹھایا۔ لکڑی کا لمبا سا دستہ لگ گیا۔ سب سے کہ اوپر سے غلاف اتار دیا۔ اسے اپنے جوتے کے اوپر رگڑ کے تیز کیا اور دیوار پہ جو آئینے کا ٹکڑا لگا ہوا تھا اس کے سامنے جا کے زور زور سے اپنے گال چھیلنے بلکہ کھرچنے لگا۔ میں نے سوچا، اس نے اپنے ہتھیار کا یہ استعمال خوب نکالا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ برچھا چھٹیں تو وہ کا شکار ہے اور اس کے پھل کے لیے لمبے لمبے کانٹے ہمیشہ خوب تیز رکھے جاتے ہیں۔

باقی کام اس نے بڑی جلدی کر لیے۔ پھر اپنے لمبے چوڑے کرتے میں لپٹا لپٹایا سپہ سالار کے عصا کی طرح اپنا برچھا ہلاتا، بڑے ٹھسے کے ساتھ باہر نکل گیا۔

باب - ۵

ناشتہ

میں نے بھی فوراً اس کی پیروی کی اور بیچ شراب خانے میں آکے جھونپڑے سرائے والے کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ سلام کیا، حالانکہ میرے بستر کے ساتھی کے معاملے میں وہ مجھ سے جنسی مذاق کر چکا تھا لیکن میرا دل اس کی طرف سے بالکل صاف تھا۔

قہقہہ بڑے غضب کی چیز ہے اور بہت نادر و کمیاب۔ افسوس کی بات تو یہی ہے۔ چنانچہ اگر آدمی کسی اور کے لیے ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیا کر سکے تو اسے بخل نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کام کے لیے تو اپنے آپ کو بڑی خوشی سے پیش کر دینا چاہیے۔ اگر کسی شخص میں کوئی ایسی بات ہو جس پر دوسرے کھل کھلا کے ہنس پڑیں تو یقین مانیے وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔

شراب خانے میں ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ کل رات بھی یہاں آئے تھے لیکن میں انہیں اچھی طرح دیکھ نہ سکا تھا۔ تقریباً سب کے سب وہیل مچھلی کے شکاری تھے۔

جہازوں کے چھوٹے بڑے افسر، بڑھئی، لوہار، ٹھٹیرے، برچھے باز۔ گٹھے گٹھے، گندمی رنگت، الجھی ہوئی ڈاڑھیاں، سر کے بال بڑھے ہوئے، صبح کے وقت گاؤن کے بجائے چھوٹے چھوٹے کوٹ چڑھائے بیٹھے تھے۔

آپ ان لوگوں کی شکل دیکھ کر ہی بتا سکتے تھے کہ کون سا آدمی کتنے دن سے خشکی پر ہے۔ مثلاً اس نوجوان کے ترو تازہ رخساروں کی رنگت ایسی ہے جیسے کوئی ناشپاتی دھوپ میں پڑے پڑے تپ گئی ہو۔ اس شخص کو ہندوستان کے سفر سے واپس آئے تین دن سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے۔ اس کے برابر والے آدمی کا رنگ کسی قدر ہلکا ہے۔ یہ شاید چندن کے پکے پکے درختوں کا فیضان ہے۔ ایک تیسرے آدمی کے رنگ میں گرم خطوں کی سیاہی مائل زردی ابھی تک باقی ہے لیکن اب کچھ سفیدی آچلی ہے۔ یہ شخص یقیناً ہفتوں سے خشکی پر رہا ہے۔ لیکن کوئی کوئیگ کا سا رخسار بھلا کس کا ہو سکتا تھا؟ اس پر تو رنگ برنگی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، اور بالکل اینڈیز کا مغربی ڈھلان سا لگتا تھا۔ ہر طرح کی آب و ہوا کے نمونے خط بہ خط ایک قطار میں نظر آرہے تھے۔

"چلو کھانا آگیا!" سرائے والے نے چوکھٹ سے دروازہ کھول کے پکارا، اور ہم سب ناشتے کے لیے اندر جا پہنچے۔

کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے دنیا کی سیر و سیاحت کی ہو انہیں علم مجلس خوب آجاتا ہے اور وہ کہیں کچھ گھبراتے نہیں۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ نیو انگلینڈ کا عظیم سیاح لیڈیارڈ اور اسکاٹ لینڈ کا سیاح منگو پارک۔ شاید یہ دو شخص مجلس میں آکے بالکل بچھ جاتے تھے۔ لیکن لیڈیارڈ نے کتوں کی گاڑی میں سائبیریا کا سفر طے کیا تھا، اور منگو پارک افریقہ کے جنگلی علاقے میں یکہ و تنہا اور خالی پیٹ چلا تھا۔ شاید اس قسم کا سفر شائستگی اور لطافت سیکھنے کا کوئی اچھا طریقہ نہیں۔ بہر حال ایسی چیزیں تو ہر جگہ ہی میسر آسکتی ہیں۔

یہاں مجھے یہ بات اس وجہ سے کہنی پڑی کہ جب ہم میز پر بیٹھ گئے اور میں انتظار کرنے لگا کہ اب یہ لوگ وہیل کے شکار کی بڑی مزیدار کہانیاں سنائیں گے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہر شخص منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ جی ہاں جناب۔ ان میں سے زیادہ لوگ تو ایسے جیدار تھے کہ بپھرے ہوئے سمندروں میں شرمائے بغیر بڑی بڑی وہیل مچھلیوں کی کمر پر جا سوار ہوتے تھے۔ بے باکی کی چوٹ اٹھاتے ہوئے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور آنکھ تک نہ جھپکائی تھی — حالانکہ یہ مچھلیاں ان کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ مگر یہ ہم پیشہ اور ہم مذاق لوگ یہاں کھانے کی میز پر بیٹھ کے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ جھینپ رہے تھے گویا چھوٹے موٹے کاشتکار ہوں جو ادھر اپنے گاؤں سے نکلے ہوں۔ ان شرمیلے ریچھوں، ان جھینپو شکاریوں کو دیکھ کر میں تو دنگ رہ گیا!

اب رہا کوئی کویگ۔ تو وہ بھی وہیں موجود تھا۔ اتفاقاً اُسے میز پر سب سے اونچی جگہ ملی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے ڈٹا بیٹھا تھا۔ یہ شخص کچھ ایسا مہذب تو نہیں کہہ سکتے۔ اس کا بڑے سے بڑا مداح بھی اس بات کا جواز پیش نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا برچھا ساتھ لیا تھا اور بے تمیزی بالائے طاق رکھ کے قاب میں سے گوشت کے ٹکڑے برچھا بڑھا بڑھا کر اٹھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ کسی بے کسی کا سر پھٹ جائے۔ بہرحال یہ حرکت وہ بڑے اطمینان کے ساتھ کر رہا تھا۔ پھر یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک جو بات بڑے اطمینان کے ساتھ کی جائے وہ مہذب اور شریفانہ ہوتی ہے۔

کوئی کویگ نے قہوے اور توس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس کی توجہ تو بھنے ہوئے گوشت پر مرکوز رہی۔ بہرحال یہاں ہمیں اس کی عجیب و غریب عادتوں کا بیان منظور نہیں۔ بس یہ بتانا کافی ہو گا کہ ناشتہ ختم ہو گیا تو اوروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑے کمرے میں چلا آیا اور اپنا کلہاڑی کی شکل کا پائپ جلا لیا۔ جب میں ٹہلنے کے لیے باہر نکلا ہوں تو وہ اپنی ٹوپی سر پر جمائے اطمینان کے ساتھ بیٹھا پائپ پی پی کے کھانا ہضم کر رہا تھا۔

پہلے تو ایک پچھلے خاصے شہر میں کسی رنگ برنگے عجیب و غریب آدمی کو معقول لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی لیکن نیویارک کی سڑکوں پر دن کے وقت ٹہلنے لگا تو یہ حیرت بڑی جلدی کافور ہو گئی۔

ہر بڑی بندرگاہ میں ساحل کے آس پاس والی سڑکوں پر آپ کو اکثر نہایت ہی بے ڈھنگے قسم کے لوگ دکھائی دیں گے جو نہ جانے کن کن ملکوں سے آئے ہوں گے۔ نیویارک کی سڑکوں پر شریف عورتیں افریقہ کے جہازرانوں کو اپنے شانہ بشانہ کھڑا دیکھ کر ڈر جاتی ہیں۔ لندن کی گلیوں میں ملایا اور جاوا وغیرہ کے لوگ نظر آتے ہیں اور بمبئی کے ساحل پر زندہ امریکیوں کو دیکھ کے مقامی لوگ اکثر سہم جاتے ہیں لیکن نیویارک کے سامنے تو سارا جہان گرد ہے۔ دوسری جگہوں میں تو آپ کو بس جہازی ہی نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر گھڑی چرچل اور آدم خور باتیں کرتے ملیں گے جن میں سے اکثر کو جسمانی مذہب کی بھانک رنگ ہوگی۔ جو آدمی اس شہر میں نیا نیا آیا ہو وہ انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

چینی، ٹونگا کا باور، ایروڈنگو، پیتن گیا کے لوگ اور طرح طرح کے وحشت زدہ جہازی تو خیر یہاں گھومتے ہی پھرتے ہیں اور کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا مگر بعض تماشے تو اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ ہر ہفتے درجنوں اور ترتیب شمار سے یہیں امارتی چھیلوں کے کاروبار میں روپیہ اور نام پیدا کرنے کی ہوس لے کر یہاں آتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے چوڑے اور چکلے کڑیل ہوتے ہیں۔ پہلے جنگلوں میں درخت کاٹتے تھے اب کلہاڑی پھینک کے چھیروں والا ریچھا اٹھا چاہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو بالکل ہی بدھو ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں گرے پڑے کے لگیں گے جیسے ابھی ان کی حالت ذرا نہ بدلی ہو۔ ذرا دیکھئے! اس گھر پہ وہ شخص کیسے اکڑ اکڑ کے چل رہا ہے۔ سر پہ کھال کی ٹوپی لمبے لمبے دامنوں والا کوٹ، کمر میں جانوروں کی کھال کی پیٹی، ڈاب میں بالشت بھر کا چاقو۔ یہ ایک اور صاحب چلے آ رہے ہیں۔ یہ ساتی میں جھگڑے جھگڑتے، اوپر سے آوازیں یا دو بھوتوں کی طرح لڑتا۔

شہری بانکا دیہاتی چھیلے کے مقابلے میں ذرا نہیں ٹھہر سکتا۔ میری مراد ان خالص دیہاتی چھیل چھبیلوں سے ہے جو کھیت کاٹتے ہیں تو یوں دستانے پہن کر کہ ہاتھ میلے نہ ہوں۔ جب اس قسم کا آدمی یہ طے کرے کہ میں نام پیدا کر کے رہوں گا اور وہیل مچھلی کے شکار کو جانے والے جہاز پہ بھرتی ہو جائے تو پھر دیکھئے وہ بندرگاہ پہنچ کے کیسے تماشے کرتا ہے۔ سمندری کپڑے تیار کراتے وقت وہ اپنی واسکٹ میں مرے مرے گھنٹی کی شکل کے بٹن لگواتا ہے اور کرمچ کے پتلونوں میں پٹے کسے لگوا لیتا ہے ارے بیچارے دیہاتی! جب طوفان میں جہاز کی چنگھاڑتی ہوئی ہوا آئے گی اور تو اپنے کپڑوں سمیت بھنور میں جا پھنسے گا پھر دیکھنا تیرے یہ تسمے کس طرح ٹوٹتے ہیں!

مگر یہ نہ کہیے گا کہ اس مشہور و معروف شہر میں دیکھنے کی چیزیں یہ دیہاتی بگھیاں ہیں اور آدم خور ہی وہ بات نہیں۔ بہر حال
نیو بیڈ فرڈ ایک عجیب و غریب جگہ ہے۔ یہ بھی ہم وہیل کے شکاریوں کا فیضان ہے۔ ورنہ نیو بیڈ فرڈ کے ساحل کی طرح یہ علاقہ بھی اجاڑ ہوتا
آج کل بھی ساحل سے دور ہٹ کے تھوڑا سا علاقہ تو بہت اچھا اور خوبصورت ہے ورنہ دیکھ کے ہول آتا ہے۔ خود شہر کا یہ حال ہے کہ ریگستان
میں رہنے کے لیے اس سے اچھی جگہ نہ ہوگی۔ اس علاقے میں تیل بھی نکلتا ہے۔ مچھلیاں بھی اچھی ہوتی ہیں اور شراب کا بھی کاروبار ہوتا
ہے۔ پھر یہاں دودھ اور شہد کی نہریں تو نہیں بہتیں مگر اس کے باوجود امریکہ بھر میں آپ کو ایسے خوش وضع مکان اور ایسے
ہرے بھرے باغ اور پارک نہیں ملیں گے۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ یہاں تو چٹیل میدان تھا۔ یہ جنگل میں منگل کیسے ہوا؟
وہ سامنے جو فلک آسا محل ہے اس کے چاروں طرف لوہے کے برچھے لگے ہوتے ہیں۔ یہ ایک خاص علامت ہے۔
ذرا اسے جا کے غور سے دیکھیے۔ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔ جی ہاں، یہ خوب صورت مکان اور سرسبز باغ بحر اوقیانوس،
بحر الکاہل اور بحر ہند سے آئے ہیں۔ ان سب کو یہاں والے برچھے مار مار کے سمندر کی تہ سے گھسیٹ کے لائے ہیں۔ کیا
سکندر اعظم صاحب نے کوئی ایسا کارنامہ سر انجام دیا ہے؟

کہتے ہیں نیو بیڈ فرڈ میں باپ اپنی بیٹیوں کو جہیز میں وہیل مچھلیاں دیتے ہیں اور بھتیجیوں، بھانجیوں کو دو دو چار
سنگ میاں۔ دلہنیں جھلملاتی ہوئی بات دیکھنی ہو تو نیو بیڈ فرڈ جائیے۔ سنتے ہیں وہاں کے ہر گھر میں مچھلیوں کی چربی سے حوض
کے حوض بھرے رہتے ہیں اور لوگ روز رات کو چربی کی بتیاں بڑی بے دردی سے جلاتے ہیں۔

اس شہر کی بہار گرمیوں میں دیکھیے۔ جدھر نگاہ اٹھائیے میپل کے سبز اور سنہرے درختوں کی دو رویہ قطار چلی جا
رہی ہے۔ پھر اگست کے مہینے میں شاہ بلوط کے حسین اور رفیع درخت اپنے مخروطی پھولوں کے گچھے فانوسوں کی
طرح ادھر ادھر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ انسان کا ہنر بھی
قادر مطلق ہے۔ جب دنیا تخلیق ہوئی تو خرچ شاید بے کار سمجھ کر یہاں پھینک دی گئی تھیں۔ لیکن اب شہر کے بہت سے
علاقوں میں پھولوں کے تختے لہلہا رہے ہیں۔

اور نیو بیڈ فرڈ کی عورتیں؟ یہاں کے سرخ سرخ گلابوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن گلاب تو بس گرمیوں ہی میں
کھلتے ہیں۔ ان کے رخساروں کی شہابی رنگت سدا بہار ہے جیسے ساتویں آسمان پر سورج کا رنگ۔ یہ شاداب رنگ تسنیم کے سوا آپ
کو اور کہیں نہیں مل سکتا۔ کہتے ہیں وہاں کی لڑکیوں کا تو سانس ہی مشک میں بسا ہوا ہے۔ اسی کے سبب یہ خوشبو اپنے جہازوں
میں بیٹھے ملاح دور سے سونگھ لیتے ہیں جیسے مشک و دماغ لوگوں کی دلکش سرزمین قریب آ رہی ہو بلکہ بحر الکاہل کے
عطر بیز جزیرے۔

گرجا

اس شہر میں ایک جہازیوں کا گرجا ہے جسے پیچھے ہزاروں مرتبہ دیکھی گروہ جو الکاہل یا بحرِ ہند کی طرف جانے والے ہوں تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اتوار کے دن یہاں حاضر نہ ہوں۔ کم سے کم میں نے اس معاملے میں کوتاہی نہیں کی۔

صبح کی چہل قدمی سے واپس آ کے میں یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے پھر نکل کھڑا ہوا۔ دھند تو پہلے بھی تھی البتہ آسمان صاف تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر اب ہر طرف دھند چھا گئی تھی اور برف پڑنے لگی تھی۔ میں نے بالوں دار کوٹ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا تھا اور طوفان کے جھکڑوں سے راستہ چل دیا۔ گرجا میں داخل ہوا تو دیکھا تھوڑے سے جہازی، ان کی بیویاں اور بیوائیں ادھر ادھر بکھری بیٹھی ہیں۔ سناٹا چھایا ہوا تھا البتہ کبھی کبھی طوفان کی چنگھاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ عبادت کے لیے آتے ہیں وہ جان بوجھ کے خاموش اور الگ الگ بیٹھتے ہیں گویا ہر خاموش غم اپنی ایک الگ دنیا رکھتا ہے اور اس کا دوسروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ پادری صاحب ابھی تک نہیں آئے تھے۔ یہ عورتیں اور مرد جزیروں کی طرح چپ چاپ اور دور دور بیٹھے ان سنگِ مرمر کی سیاہ حاشیوں والی تختیوں کو تکے چلے جا رہے تھے جو منبر کے دونوں طرف دیواروں میں گڑی ہوئی تھیں۔ ان کی عبارت میں حرف بحرف تو نقل نہیں کر سکتا بہرحال یہ کتبے کچھ اس طرح کے تھے۔

جان ٹیلبٹ

کی یاد میں

جو اٹھارہ سال پٹاگونیا کے ساحل کے قریب

بتاریخ یکم نومبر ۱۸۳۶ء

جہاز سے گر کر سمندر کی نذر ہو گئے

اُن کی یاد میں یہ کتبہ اُن کی بہن نے نصب کرایا

رابرٹ لونگ ، ولس ایلری

نیتھن کولمن ، والٹر کینی

سیتھ میسی اور سیمول گلگ

کی یاد میں

جو ایلائزا جہاز کی ایک کشتی کے ملاح تھے اور جنھیں

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

غیر ملکی زبانوں (ایسی زبانیں جو پاکستان کی مادری زبانیں نہ ہوں) کے علم و ادب کے اردو تراجم کے مطالعہ کے لیے اس گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

لنک:

www.facebook.com/groups/AAKUT/

فیس بک گروپ:

پاکستان کی مادری زبانوں کا عالمی ادب۔ اردو قالب میں

لنک:

www.facebook.com/groups/PKMZKA/

بتاریخ ۳۱ دسمبر ۱۸۳۹ء
بحرالکاہل میں ایک وہیل مچھلی ڈھکیلتی ہوئی لے گئی
اور وہ پھر کبھی نظر نہ آئے
یہ تختی ان کے ساتھیوں نے نصب کرائی

کپتان ایزکیل ہارڈی
کی یاد میں
جنہیں جاپان کے ساحل پر
بتاریخ ۳ اگست ۱۸۳۳ء
ایک وہیل مچھلی نے کشتی کے اندر ہلاک کیا
یہ کتبہ ان کی بیوہ نے نصب کرایا

اپنی ٹوپی اور کوٹ پر سے برف کی تہہ جھاڑ کے میں دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ ذرا گردن پھرائی تھی کہ کوئیکیگ پاس بیٹھا نظر آیا۔ میں تو چونک سا پڑا۔ اس منظر کے تقدس اور جلال سے کوئیکیگ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، اور چہرے سے تجسس، حیرت اور بے یقینی ٹپک رہی تھی۔ یہاں جتنے لوگ موجود تھے ان میں سے بس ایک اس وحشی نے مجھے اندر آتے دیکھا تھا کیونکہ وہی ایک آدمی تھا جسے پڑھنا نہیں آتا تھا اور جس کی نظریں ان ٹھنڈے پھیکے کتبوں پر نہ تھی جن لوگوں کے نام تختیوں پر لکھے تھے ان کے عزیز و اقارب اس وقت موجود تھے یا نہیں اس کا تو مجھے علم نہیں مگر مچھلیوں کے شکار میں بیسیوں ایسے حادثے پیش آتے رہتے ہیں کہ مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ پھر ماتمی لباس کے بغیر بھی بہت سی عورتوں کے چہروں سے کچھ ایسا ابدی غم ٹپک رہا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا یہاں چوٹ کھائے ہوئے دل موجود ہیں جن کے زخم یہ کتبے دیکھ کر ہرے ہو گئے ہیں۔

آپ لوگ جن کے مردے ہری ہری گھاس کے نیچے دفن ہیں، جو پھولوں کے تختے میں کھڑے ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ میرا پیارا یہاں سو رہا ہے، آپ کو اس ویرانی اور بربادی کی کیا خبر جو ان سینوں کے سینے میں بسی ہوئی ہے۔ اس سنگ مرمر کی جن سیاہ حاشیے والی تختیوں کے نیچے مُردوں کی ہڈیاں تک نہیں ہیں انہیں دیکھ کر دل کا کیا حال ہو جاتا ہے۔ ان کتبوں میں کیسی کچھ مایوسی بھری ہوئی ہے۔ ان الفاظ میں کتنی تلخیاں چھپی بیٹھی ہیں، کتنی سرکشی اور ہلاکت پنہاں ہے۔ یہ سطریں تو ایمان کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ جو لوگ بے نام سمندروں میں فنا ہو گئے اور بغیر مقبرہ آج تک پڑے ہیں ان سے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کا امکان تک چھین لیتی ہیں۔ یہ تختیاں اگر یہاں کے بجائے ایلی فنٹا کے غاروں میں ہوں تو بھی بات برابر ہے۔

سمندروں کی مردم شماری میں کبھی مرے ہوؤں کو بھی گنا جاتا ہے؟ ان کے ساتھ کتنے راز دفن ہوتے ہیں جتنے ساحل

پیریت کے ذریت، پیریت جیری یہ مثل کیوں مشہور ہے کہ مُردے بولا نہیں کرتے۔ یہ کیا بات ہے کہ جو آدمی دوسری دنیا کو سدھار جائے ہم اس کے نام کے ساتھ آنجہانی کا سابقہ اور مرحوم مغفور لگاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اسی کرۂ زمین پر کسی دور دراز ملک کی طرف جا رہا ہو تو ہم اسے یہ لقب نہیں دیتے؟ اگر انسان لافانی ہے تو پھر دنیا والے کسی کے مرنے پر رو پیٹ کیوں ادا کرتے ہیں؟ حضرت آدم کو وفات پائے پوری ساٹھ صدیاں گزر گئیں۔ وہ ابھی ابدی اور لازوال نیند کی آغوش میں سو رہے ہیں؟ یہ کیا قصہ ہے کہ ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مُردوں کو لازوال سکون حاصل ہے۔ دوسری طرف ہم ان کا ماتم بھی کیے چلے جاتے ہیں؟ جو زندہ ہیں وہ مُردوں کو خاموش کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ کسی قبر پر کھٹ کھٹ ہونے کی افواہ پھیل جائے تو سارا شہر کیوں سہم کے رہ جاتا ہے؟ یہ ساری باتیں بالکل بے معنی اور مہمل نہیں ہیں۔

مگر عقیدہ گیدڑ کی طرح قبروں پر پلتا ہے اور بڑے سے بڑے شکوک و شبہات سے بھی اپنے لئے ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ یہ جانا ہے مشہور ہے کہ ٹین ٹنگٹ کی طرف روانہ ہوتے وقت میں نے کن جذبات کے ساتھ ان سنگِ مرمر کی تختیوں کو دیکھا اور ان کی تمام تاریک اور اداس دن کی دھندلی روشنی میں ان جہازیوں کا حال پڑھا جو مجھ سے پہلے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ ہاں، اتھاہ! میرا انجام بھی یہی ہوگا۔ لیکن دھیان کیجیے، میں پھر بھی ہنسنے لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاز پر جانے کے محرکات قوی اور ترقی کے امکانات وسیع تھے۔ وہ ے۔ مجھے کسی جہاز پر افسری مل جائے تو میں اپنے آپ کو دیوتا سمجھوں جی ہاں، وہیل مچھلی کے شکار میں موت کا خطرہ تو ضرور ہے۔ اس میں تو انسان کو لڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ بس ایک دم سے بستر گول ہو جاتا ہے اور آدمی ابدیت کی آغوش میں جا پہنچتا ہے۔ لیکن اس سے کیا؟ میرا تو خیال ہے کہ ہم نے زندگی اور موت کے مسئلے کو ٹھیک طرح سمجھا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں جس چیز کو میرا سایہ کہا جاتا ہے وہی میرا اصلی وجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ روحانی حقیقتوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے مچھلیاں پانی کے اندر سے سورج کو دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ پانی کی موٹی سی چادر ہی ہوا کی طرح ہلکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا جسم میرے اصلی وجود کی تلچھٹ ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جو شخص چاہے میرا جسم لے لے۔ ہاں ہاں، لے لے کیونکہ میرا جسم اور چیز ہے میں اور چیز۔ لہٰذا میرا تو نعرہ ہے — ٹین ٹنگٹ زندہ باد! جہاز جب چاہے آئے اور میرا جسم لے جائے کیونکہ میری روح تو اللہ میاں تک نہیں چھین سکتے۔

باب ۔ ۸

منبر

مجھے یہاں بیٹھے کچھ ایسی دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک بڑا کاٹھی آدمی اندر داخل ہوا جس میں ایک تقدس کی شان تھی۔ جوں ہی اس طوفانی حالت میں وہ اندر آیا ہی دروازہ جھٹ سے بند ہو گیا، سب لوگ احترام کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہی بڈھے میاں پادری صاحب ہیں۔ جی ہاں یہ وہی مشہور و معروف پادری صاحب جو وہیل کے شکاریوں میں نہایت مقبول تھے اور جنھیں یہ لوگ فادر میپل کہا کرتے تھے۔ جوانی کے زمانے میں وہ جہازی اور ہارپون باز رہ چکے تھے، لیکن اب کئی سال سے رشد و ہدایت کے لیے وقف ہو کے رہ گئے تھے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، فادر میپل کا بڑھاپا تھا، لیکن صحت ویسی کی ویسی ہی تھی۔ بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے بڑھاپا اور دوسری جوانی آپس میں گھل مل رہے ہوں۔ ان کی جھریوں میں سے ایک نئے شباب کی دھیمی دھیمی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں ۔۔۔ گویا جاڑوں کے برف کے نیچے سے بہار کا سبزہ جھانک رہا تھا۔ جس شخص نے ان کے حالات زندگی سن رکھے ہوں، اس کے لیے ناممکن تھا کہ انھیں پہلی دفعہ دیکھے اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ ان کا مشاہدہ نہ کرے۔ وہ پادری تو ضرور تھے مگر ان میں بعض باتیں بڑی عجیب تھیں جو انھوں نے جہازرانی کی خطرناک زندگی سے اخذ کی تھیں۔ جب وہ اندر آئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس چھتری نہ تھی اور گاڑی میں تو ظاہر وہ آئے ہی نہ تھے کیونکہ ان کے ترپال کے بنے ہوئے ہیٹ پر سے برف پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا اور ان کے لمبے چوڑے جہازیوں والے موٹے کوٹ میں اتنا پانی بھر گیا تھا کہ وہ بوجھ کے مارے گرے پڑ رہے تھے۔ پھر انھوں نے اپنا ہیٹ، کوٹ اور اوپر والے جوتے ایک ایک کر کے اتارے اور برابر والے کونے میں جو تھوڑی سی جگہ تھی وہاں ٹانگ دیے۔ اب ان کی شکل آدمیوں کی سی بنی اور وہ چپ چاپ منبر کی طرف بڑھے۔

پرانے طرز کے منبروں کی طرح یہ منبر بھی بہت اونچا تھا، گرجا ایک تو ویسے ہی چھوٹا سا تھا، اگر منبر کے ساتھ ایک انتہائی اونچا زینہ بھی بنایا جاتا تو لمبے زاویے کی وجہ سے فرش پر بہت جگہ گھیرتا۔ چنانچہ معلوم ہوتا تھا کہ معمار نے فادر میپل کی تجویز پر عمل کیا اور زینے کے بجائے منبر کے پہلو میں ایک عمودی سیڑھی بنادی جیسی سمندر میں کشتی سے جہاز پر چڑھنے کے لیے ہوتی ہے۔ کسی کپتان کی بیوی نے سیڑھی کے لیے اون کی خوب صورت سی لال رسیاں گرجا کی نذر کر دی تھیں۔ پھر خود سیڑھی پر رنگ کا سا رنگ تھا اور اوپر کے سرے نہایت نفیس بنے ہوئے تھے۔ اگر ہم اس گرجا کی تعمیر کا وقت ذہن میں رکھیں تو یہ چیزیں بڑے ستھرے ذوق کا پتا دیتی ہیں۔ فادر میپل سیڑھی کے پاس پہنچ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور دونوں ہاتھوں سے رسی کی آرائشی ڈوریاں پکڑ کے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر ملاحوں کی سی پھرتی کے ساتھ لیکن پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھے سیڑھی پر اس طرح چڑھ گئے جیسے اپنے جہاز کے مستول پر چڑھ رہے ہوں۔

جیسا لٹکنے والی سیڑھیوں میں عام طور سے ہوتا ہے۔ اس سیڑھی کے عمودی حصے بھی کپڑا چڑھی رسی کے تھے، بس

ڈنڈے ضرور واکش کے تھے چنانچہ اس میں ہر ڈنڈے کے پاس ایک جوڑ تھا۔ میں نے منبر کو چل کر خود دیکھا آخر میری نظر اس بات پر بھی پڑی کہ یہ جوڑ جہاز کے لیے چاہے کتنے ہی موزوں ہوں مگر اس جگہ بالکل غیر ضروری معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن اب مجھے ایک ایسی بات نظر آئی جس کے لیے میں ذرا بھی تیار نہ تھا۔ فادر میپل اوپر پہنچ کے آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف مڑے اور منبر پر سے جھک کے سیڑھی کو کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ پوری کی پوری سیڑھی منبر کے اندر سمٹ آئی اور پادری صاحب قلعہ بند ہو گئے۔

میں بڑی دیر تک غور کرتا رہا لیکن اس کی وجہ پوری طرح سمجھ میں نہ آئی۔ پادری صاحب کے خلوص اور تقدس کا دور دور تک چرچا تھا۔ اس لیے مجھے اُن پر یہ شبہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ تھیٹر کے سے کرتب دکھا کے شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا نہیں یقیناً کوئی معقول وجہ ضرور ہو گی۔ شاید اس میں کوئی ماورائی حقیقت پنہاں ہو۔ کہیں وہ جسمانی علیحدگی کے ذریعے یہ تو نہیں بتانا چاہتے کہ روحانی طور پر تھوڑی دیر کے لیے دُنیا کے سارے ظاہری علائق اور رشتوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ ہاں، خدا کے نیک بندوں کے لیے منبر ایک خود کفیل قلعہ ہے جس میں کلامِ ربانی کی غذا موجود ہے۔ یہ ایک بلند و بالا حصارِ عافیت ہے جہاں آبِ حیات کے لازوال چشمے بہتے ہیں۔

یہ سیڑھی تو خیر پادری صاحب کی سابق بحری زندگی سے اخذ کی ہی گئی تھی، لیکن ابھی کئی اور بھی عجیب چیزیں تھیں، جن میں یہ اثر جھلکتا تھا۔ منبر کے پیچھے سنگِ مرمر کی تختیوں کے درمیان دیوار پر ایک لمبی چوڑی تصویر آویزاں تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک نہایت خوب صورت جہاز کالی چٹانوں اور برف جیسی سفید لہروں میں گھرا ہوا طوفان سے نبرد آزما ہے۔ لیکن اڑتے ہوئے جھاگ اور منڈلاتے ہوئے سیاہ بادلوں سے بہت اوپر فضا میں روشنی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس میں سے ایک فرشتے کا نورانی چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نور کی کرنیں متلاطم جہاز کے عرشے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھیں، جیسے وکٹری جہاز میں ایک چاندی کی تختی اس جگہ لگا دی گئی ہے جہاں نیلسن زخمی ہو کے گرا تھا۔ فرشتہ یہ کہتا معلوم ہوتا تھا:
”اے بہادر جہاز، چلے چلو، جیالے، طوفان کا ڈٹ کے مقابلہ کر، وہ دیکھ سورج گھٹا کو چیر کے نکل آیا ہے۔ بادل چھٹے جاتے ہیں۔ بس دم بھر میں آسمان بالکل صاف شفاف اور نیلا ہو جائے گا۔“

اگر سیڑھی اور تصویر میں بحری انداز نمایاں تھا تو خود منبر بھی اس سے خالی نہ تھا۔ اس کا آگے کا حصہ جس پر کلس کی پٹی لگی ہوئی تھی جہاز کے حصوں کی روکار سے مشابہ تھا۔ انجیل مقدس ایک آگے کو نکلے ہوئے منقش تختے پر رکھی تھی۔ یہ جہاز کے ماتھے کی شکل کا بنایا گیا تھا۔

اس سے زیادہ معنی خیز اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، کیونکہ منبر دنیا کا سب سے آگے کا حصہ ہے۔ باقی چیزیں اس کے بعد آتی ہیں۔ دُنیا کی رہنمائی منبر ہی کرتا ہے۔ خدا کے غضب کا طوفان اٹھ رہا ہو تو پہلی دفعہ یہیں سے نظر آتا ہے۔ اور جو حصہ آگے کی طرف ہو جہاز اسی کو سہارا پڑتا ہے۔ موافق ہواؤں کے لیے بھی پہلی دفعہ یہیں سے دعا مانگی جاتی ہے۔ ہاں دنیا ایک جہاز ہے جو سمندر میں چل رہا ہے اور جس کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا اور منبر اس جہاز کا ماتھا ہے۔

باب - ۹

وعظ

فادر میپل اُٹھے اور نہایت منکسر مزاجی کے ساتھ نرم لیکن پُررعب آواز میں لوگوں کو حکم دیا کہ یوں بکھرے بکھرے نہ بیٹھیں؛ بلکہ قریب آجائیں: "دائیں طرف والے ذرا بائیں طرف سرکیں، بائیں طرف والے ذرا دائیں طرف، سب لوگ بیچ میں آجائیں!"

بنچوں کے درمیان بھاری بھاری سمندری بُوٹ بجد بجد بولنے لگے اور زنانے جوتوں کی ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی۔ پھر خاموشی چھا گئی اور ہر ایک کی نظریں واعظ پر جم گئیں۔

پادری صاحب ذرا سا رُکے پھر منبر کے اگلے حصے میں جُھک گئے اپنے بادامی رنگ کے بڑے بڑے ہاتھ سینے پر باندھ لیے، بند آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایسے خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سمندر کی تہ میں خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

دعا ختم ہوئی تو انھوں نے مندرجہ ذیل حمد ایسی طویل اور گمبھیر لے میں پڑھنی شروع کر دی جیسے کُہر میں ڈگمگاتے ہوئے جہاز کے اندر مسلسل گھنٹی بج رہی ہو۔ مگر نظم کے آخری بندوں میں انھوں نے اپنا طرز بدل دیا اور ان کی آواز میں شادمانی اور مسرت گونجنے لگی ——

" —— مچھلی کا پیٹ اندر سے کتنا ہیبت ناک ہوتا ہے!
میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا!
سُورج کی روشنی سے منور لہریں اُمنڈ اُمنڈ کے
مجھے ہلاکت کے گڑھے میں لیے جا رہی تھیں۔

" —— میں نے جہنّم کا دروازہ کھلتے دیکھا،
وہاں طرح طرح کے عذاب اور مصیبتیں نظر آئیں
اسے تو وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گزر چکی ہو۔
ہائے، مجھ سے امید کا دامن چھوٹ چکا تھا۔

" —— میں نے شدید مایوسی کی حالت میں اپنے خدا کو پکارا،
میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھے خدا نے بھی چھوڑ دیا۔

لیکن اس نے میری فریاد سن لی —
میں مچھلی کے پیٹ سے باہر نکل آیا۔

"— وہ میری مدد کو اس طرح پہنچا
جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔
میرے نجات دہندہ کا بارعب اور درخشاں چہرہ
بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔

"— وہ ہیبت ناک اور سرور انگیز لمحہ
میرے تصور میں ہمیشہ گونجتا رہے گا۔
میں اپنے خدا کی تمجید کرتا ہوں۔
ساری رحمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔ ساری بزرگی اسی کو سزاوار ہے —"

اس حمد کو سب نے مل کے گایا اور اس کی آواز میں ملاحوں کی گھبراہٹ بھی دب کے رہ گئی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر واعظ نے انجیل کے ورق آہستہ آہستہ الٹنے شروع کر دیے اور آخر مطلوبہ صفحے پر انگلی رکھ کے کہا۔ "میرے عزیزو! میرے جہاز کے ساتھیو، یوناہ کے پہلے باب کی آخری آیت نکالو — اور خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ یونس کو نگل جائے۔"

"جہازیو، اس کتاب میں صرف چار باب ہیں — چار کہانیاں — کتاب مقدس کی عظیم الشان زنجیر میں جو سب سے چھوٹی کڑیاں ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ مگر حضرت یوناہ نے روح کی کیسی کیسی گہرائیاں کھنگال ڈالی ہیں۔ ان کے حالات زندگی میں ہمارے لیے کتنا حیات افروز سبق پنہاں ہے! مچھلی کے پیٹ میں انھوں نے جو مناجات پڑھی ہے وہ کیسی زبردست چیز ہے! اس میں سمندر کی موجوں کا سا بہاؤ، انھی کی طرح زور اور عظمت ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے اوپر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ ہم یوناہ کے ساتھ پانیوں کی تہ میں جا پہنچتے ہیں۔ ہمیں اپنے چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ اور سمندری پودے محسوس ہونے لگتے ہیں۔"

پادری صاحب نے اس مشہور واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جس جہاز پر حضرت یونس سوار تھے جب وہ سمندر میں روانہ ہوا تو کس طرح طوفان میں پھنس گیا۔ انھوں نے کہا، جہاز چلنے کا وقت آ گیا۔ جہاز کے رسے الگ کر دیے گئے۔ گھاٹ پر ازدحام تھا۔ آہستہ آہستہ جہاز سمندر میں جا نکلا لیکن زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ طوفان آ گیا اور اس کی شدت کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس سے جہاز کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ کپتان نے ملاحوں کو حکم دے دیا کہ جہاز کا بوجھ ہلکا کر دو۔

پھر کہا تھا جہازیوں نے صندوق، بورے، مرتبان غرض جو جو چیزیں بیکار اور غیر ضروری تھیں انھیں سمندر میں پھینکنا شروع کر دیا۔ ہوا چنگھاڑ رہی ہے، عرشۂ جہاز پر ایک ہنگامہ برپا ہے، لوگ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں، غرض میدانِ حشر کا سا نقشہ ہے۔ حضرت یونسؑ اس وقت سو رہے تھے۔ ان کے سر کے نیچے ایک گٹھڑ پڑا ہوا تھا، مگر ان کی نیند اس گڑگڑاہٹ کی آواز سے بھی نہ ٹوٹی۔ انھیں تاریک آسمان اور بپھرا ہوا سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انھیں اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ جہاز سمندر کی طوفانی لہروں سے ڈگمگا رہا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک ہیبت ناک مچھلی سمندر کی طوفانی لہروں کو چیرتی مست جہاز سے ان کی تلاش میں لپکی چلی آ رہی ہے۔ حضرت یونسؑ تو جہاز کے سرد کیبن میں پڑے خراٹے لے رہے تھے کہ کپتان گھبرایا ہوا ان کے پاس آیا اور سوتے ہوئے مسافر کے کان پر منہ رکھ کر چیخا "اے بھائی مسافر! اٹھو! طوفان سر پر آگیا ہے۔"

حضرت یونسؑ اس کی چیخ سن کر ہڑبڑا کر اٹھے اور نیم بیدار حالت میں لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے عرشے پر پہنچے۔ ابھی انھوں نے سمندر کی بپھری ہوئی طوفانی لہروں پر ایک نظر ڈالی ہی تھی کہ ایک طوفانی موج نے پیچھے سے چھلانگ لگا کر ان پر چھپاٹا مارا، پھر تو جہاز پر ان لہروں کے حملوں کا تانتا بندھ گیا۔ اے میرے عزیزو! ذرا اس حالت کا تصور کرو۔ جہاز ابھی ڈوبا نہیں ہے مگر بچارے جہازیوں کو جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ جو جو بھی جہاز کے اندر گھس آئی ہیں ان کو اب واپس لوٹنے کے لیے راستہ نہیں ملتا تو وہ جہاز کے اندر ہی دوڑنے اور چنگھاڑنے لگتی ہیں۔ جب کبھی کوئی کھڑکی کہیں سے چٹختی ہے اور چاند اپنا خوف زدہ چہرہ لیے ہوئے باہر جھانکتا ہے تو یہ دیکھ کر حضرت یونسؑ کا خون خشک ہو جاتا ہے کہ جہاز کا پچھلا حصہ کبھی تو بالکل اوپر اٹھ جاتا ہے اور کبھی تھپیڑوں سے پانی کے اندر ڈوب جاتا ہے۔ جہازی یہ دیکھنے کے لیے قرعہ ڈالتے ہیں کہ انھیں طوفان نے کس آدمی کی وجہ سے آن گھیرا ہے۔ قرعہ میں حضرت یونسؑ کا نام نکلتا ہے۔ حضرت یونسؑ کو ٹانگ کی طرح اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ چشم زدن میں سمندر خاموش اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ پانی تختے کی طرح ہموار ہو جاتا ہے۔ مگر یونسؑ لہروں کے ریلے میں بہتے ہوئے ایک خوفناک متلاطم بھنور میں جا پھنستے ہیں۔ وہاں ایک بڑی ساری مچھلی اپنا جبڑا جیسا منہ کھولے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت یونسؑ کو جانا بھی نہ چلا مگر اس مچھلی کے جبڑے جیسے منہ میں جا گرے۔ مچھلی نے اپنے سفید سفید دانت کھٹ سے بند کر لیے اور حضرت یونسؑ اس کے پیٹ کی اندھیری کوٹھری میں قید ہو گئے۔ اب حضرت یونسؑ اپنے خدا سے دعا کرتے ہیں اور آخر انھیں مچھلی اور سمندر سے نجات مل جاتی ہے۔"

جب پادری صاحب یہ بیان کر رہے تھے تو بیچ بیچ میں چنگھاڑتے طوفان کی گڑگڑاہٹ ان کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں سنائی دیتی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ طوفان پادری صاحب کے اندر اتر آیا ہے اور اس نے انھیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ان کے چوڑے چکلے سینے میں جیسے طوفان سا تلاطم آگیا تھا۔ ان کے لہراتے ہوئے ہاتھ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے عناصر ہوں۔ وہ بیکار ہو پیشانی پر بجلیاں کوندتی تھیں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ان کے اس انداز تقریر کا اثر یہ تھا کہ ان کے سامعین جو سیدھے سادے لوگ تھے ان کی طرف کچھ لیے خوف سے دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے ایک بالکل اجنبی چیز تھی۔

اتنی دھواں دھار تقریر کر چکنے کے بعد اب ان کے چہرے پر ایک سکون سا آگیا۔ اور خاموش ہو کر کتاب مقدس کے

ورق الٹنے لگے۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دم بھر کے لیے بے حرکت کھڑے ہو گئے جیسے خدا سے اور اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

اس کے بعد وہ سامعین کی طرف جھک گئے اور سر جھکا لیا۔ اس وقت ان کے چہرے سے عجز و انکسار ٹپک رہا تھا۔ پھر کہنے لگے:

میرے عزیزو! حضرت یونس کو اس مچھلی نے خدا کے حکم سے نگل لیا تھا اور وہ اس کے پیٹ کی تاریکیوں میں قید ہو گئے تھے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ہزاروں گز نیچے سمندر کی تہ میں لے گئی لیکن اس وقت بھی اور اس حالت میں بھی خدا نے ان کی دعا سنی اور اس نے مچھلی کو حکم دیا کہ وہ انھیں سمندر کی سردی اور تاریکی میں سے نکال کر سورج کی گرمی اور روشنی میں پہنچا دے۔ چنانچہ مچھلی نے حضرت یونس کو خشکی پر اگل دیا۔"

ایک بار پھر پادری صاحب مراقبے میں چلے گئے اور ان کا سر جھک گیا۔

جب انھوں نے پھر سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں سے روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

پادری صاحب کا وعظ ختم ہو گیا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ ہاتھ ہلا کر لوگوں کو رخصت دی۔ پھر انھوں نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ پادری صاحب اسی طرح جھکے کھڑے رہے۔

باب - ۱۱

جگری دوست

میں گرجا سے سرائے واپس آیا تو دیکھا کہ کوئی کوئیگ بالکل اکیلا ہے۔ وعظ کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گرجا سے اُٹھ کے چلا آیا تھا۔ اس وقت وہ آگ کے سامنے آتش دان کی سلاخوں پر پاؤں رکھے بنچ پر بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں وہ چھوٹا سا بُت تھا۔ اسے وہ اپنے چہرے کے قریب لاکے غور سے دیکھ رہا تھا اور چاقو سے اس کی ناک کھرچتا جاتا تھا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ اپنے جنگلیوں کے انداز میں کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔

اب میری وجہ سے جو خلل پڑا تو اس نے بُت الگ رکھ دیا پھر وہ چار منٹ بعد جا کے میز پر سے ایک کتاب اٹھا لایا اور اسے گود میں رکھ کے بڑی باقاعدگی کے ساتھ صفحے گننے لگا۔ جب پچاس صفحے گنے ہو جاتے تو وہ دم بھر کو رک کے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا اور اس کے منہ سے حیرت کے مارے سیٹی کی طرح غرغراتی ہوئی ایک لمبی سی آواز نکلتی۔ اس کے بعد وہ اگلے پچاس صفحے گننے میں لگ جاتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دفعہ گنتی ایک سے شروع کرتا ہے شاید اُسے پچاس تک ہی گننا آتا تھا اور اتنے پچاس ایک جگہ پا کر ہی اُسے صفحوں کی تعداد پر تعجب ہو رہا تھا۔

میں وہاں بیٹھا اُسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جنگلی تو ضرور تھا اور اُس کا چہرہ بھی کم سے کم میرے مذاق کے لحاظ سے تو بگڑ کے رہ گیا تھا پھر بھی اس کی شکل میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ برا نہ لگتا تھا۔ روح چھپائے نہیں چھپتی۔ ان بے ڈھنگم نشانوں میں سے مجھے تو ایک سیدھے سادے، نیک دل اور ایماندار آدمی کے آثار جھلکتے نظر آ رہے تھے اور اس کی بڑی بڑی سیاہ گہری اور دلیر آنکھوں میں سے نکلتے ہوئے شعلے صاف بتا رہے تھے کہ وہ شیطانوں کی پوری فوج کے مقابلے میں بھی ڈٹ جائے گا۔ پھر اس جنگلی کے انداز میں کچھ ایسا وقار تھا جس میں اس کے بانکپن کی وجہ سے بھی ذرا فرق نہ آیا تھا۔ اس کی صورت سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص نے کبھی کسی کی چاپلوسی نہیں کی اور نہ اسے کبھی قرض خواہوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا شاید اسی وجہ سے اس کی پیشانی اتنی کشادہ، ابھری ہوئی اور چمکدار معلوم ہوتی ہو۔ اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس کا سر علم قیافہ شناسی کی رُو سے نہایت شاندار تھا۔ آپ کو یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوگی لیکن اسے دیکھ کر مجھے جنرل واشنگٹن کا سر یاد آ جاتا تھا۔ جس طرح ان کا سر عام طور سے تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ واشنگٹن کی طرح اس کے ابرو بھی بہت آگے کو نکلے ہوئے تھے جیسے درختوں سے ڈھکی ہوئی دو پہاڑیاں، اور سر کی ڈھلان بھی اسی طرح اوپر جا کر پیچھے اُتر کر چلی جاتی تھیں۔ کوئی کوئیگ جنگلی روپ میں جارج واشنگٹن تھا۔ البتہ اس کی شکل و صورت آدم خوروں کی شکل میں ڈھلی تھی۔

میں بڑے غور سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا میں یوں ہی رہا تھا جیسے کھڑکی میں سے طوفان کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اُسے میری موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ اس نے تو میری طرف دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ وہ تو بس اپنی اس عجیب و غریب

کتاب کے صفحے گننے میں مگن تھا۔ کل رات ہم دوستوں کی طرح ساتھ ساتھ سوئے تھے۔ پھر صبح کو آنکھ کھلی تو میں نے اس کا بازو ڈھیلے پن سے اپنے اوپر رکھا ہوا پایا تھا۔ ان باتوں کے پیش نظر مجھے اس کی یہ بے اعتنائی بڑی عجیب لگی۔ لیکن کچھ عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ٹھیک طرح سے پتا ہی نہیں چلتا کہ ان کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ انھیں دیکھ کر شروع شروع میں تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ ان کے سیدھے پن، ان کے سکون اور خود اعتمادی میں کچھ سقراط کی سی دانشمندی کا رنگ ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی پتا چلا لیا تھا کہ میرے کمرے میں جو دوسرے جہازی ہیں ان سے کوئی تعارف کا تو ابھی ربط و ضبط نہیں یا بہت ہی کم ہے۔ وہ کسی کی طرف پیش قدمی نہیں کرتا تھا۔ شاید اس کے دل میں اپنے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع کرنے کی خواہش ہی نہ تھی۔ یہ سب باتیں مجھے بہت عجیب لگیں۔ لیکن ذرا سوچا تو اس میں بھی ایک لطف نظر آیا۔ یہ شخص اپنے گھر سے کوئی بیس ہزار میل دور تھا۔ وہاں پہنچنے کا بس ایک ہی راستہ تھا یعنی کیپ ہارن کی طرف سے ہو کے۔ یہاں کے لوگ اس کے لیے ایسے ہی اجنبی تھے جیسے وہ مریخ میں جا پہنچا ہو۔ اس کے باوجود اسے کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ شکل سے اطمینان اور سکون ٹپکتا تھا۔ اس کے لیے بس اپنی ہم جلیسی کافی تھی اور وہ اپنے آپ میں مگن تھا۔ اس نے کبھی لکھنے کا نام تک نہ سنا تھا لیکن اس کے انداز میں واقعی فلسفیانہ رنگ تھا۔ شاید یہی اصلی درویشی ہے جسے یہ معلوم ہو کہ وہ فلسفیانہ قسم کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ جب میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلسفی کہتا ہے تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ اس بڑھیا کی طرح جس کا معدہ کمزور تھا اس شخص کی بھی ہاضمے کی مشین ٹوٹ گئی ہو گی۔

میں اسی خیال کرنے میں بیٹھا تھا۔ آگ ہلکی ہلکی جل رہی تھی اور اس منزل میں پہنچ چکی تھی کہ شروع میں خوب بھڑک کے ہوا گرم کر چکی ہو اور اب اس کی دھیمی دھیمی آنچ کا بس اتنا مصرف رہ جائے کہ اسے بیٹھے دیکھا کریں۔ شام کے سائے اور پرچھائیاں کھڑکیوں کے گرد جمع ہو گئی تھیں، اور ہم دو خاموش اور تنہا آدمیوں کو جھانک جھانک کے دیکھ رہی تھیں۔ باہر طوفان کے جھکڑ شائیں شائیں کر رہے تھے۔ ایسے میں مجھ پر عجیب و غریب کیفیتیں گزر گئیں۔ میرے اندر ایک گداز سا پیدا ہو چلا۔ میرے دل کی تنگی، وارفتگی اور جنون سب کافور ہو گیا۔ اس خونخوار وحشی سے نفرت اور حقارت کا جذبہ تک باقی نہ رہا۔ اس جنگلی کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ اس نے دنیا کے سارے گناہ بخش دیے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا اور اس کی بے اعتنائی بھی ایک ایسے مزاج کا پتا دے رہی تھی جس میں مہذب ریاکاریاں اور شائستہ دھوکے بازیاں چھپی ہوئی نہ تھیں۔ وہ جنگلی ضرور تھا لیکن ایک اچھا خاصا نمونہ تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ جن چیزوں سے دوسروں کو گھن آتی وہی میرے لیے مقناطیس بن گئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ عیسائیوں کو تو بہت دیکھ چکا۔ ان کی منافقتیں اور خوش اخلاقیاں نری ڈھول کا پول ہیں۔ اب ذرا ایک کافر سے دوستی کر کے دیکھنا چاہیے۔ میں نے اپنی بنچ اس کے قریب کھینچ لی اور کچھ دوستانہ قسم کے اشارے کیے۔ ساتھ ہی بولنے کی بھی اپنی سی کوشش کرتا گیا۔ پہلے تو اس نے توجہ ہی نہ کی لیکن جب میں نے اس کی کل رات والی مہمان نوازی کا ذکر چھیڑا تو اس نے اشاروں سے پوچھا کہ آج رات بھی کیا ہم ساتھ ہی سوئیں گے۔ میں نے کہا ہاں۔ یہ بات سن کر وہ کچھ خوش سا ہوا بلکہ ایسا لگا جیسے میں نے اس کی تعریف کی ہو۔

اب ہم دونوں مل کر کتاب کے صفحے الٹنے لگے۔ میں نے اسے کتاب کا خلاصہ اور اس میں جو دو چار تصویریں تھیں

ں کا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔ اور اس طرح تھوڑی ہی دیر میں اُس کی توجہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد ہم شہر کے مختلف مناظر
کے بارے میں اشاروں سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں نے تجویز پیش کی کہ ہم دونوں ہی کے پائپ پئیں۔ چنانچہ اس نے تمباکو
کی تھیلی اور وہ کھوپڑی نکالی اور چپ چاپ میری طرف بڑھا دی۔ غرض ہم بیٹھ کے دھواں اڑانے لگے۔ ہم دونوں کے درمیان
ہی ایک پائپ چل رہا تھا۔ کبھی وہ پیتا کبھی میں۔

اگر اُس کافر کے دل میں میری طرف سے کچھ غیریت رہی بھی تھی تو وہ اس پائپ کے دھوئیں میں اُڑ گئی اور ہم دونوں
ایسے ہو گئے جیسے لنگوٹیا یار۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بھی مجھ سے بالکل ویسے ہی بے ساختہ انسیت ہو گئی ہے جیسے مجھے اُس سے۔
جب ہم پائپ ختم کر چکے تو اُس نے اپنا ماتھا میرے ماتھے سے لگا دیا، میری کمر میں ہاتھ ڈال کے مجھے لپٹایا اور کہا کہ آج
سے ہماری شادی ہو گئی۔ اس کے ملک کی زبان میں اس فقرے کا مطلب یہ تھا کہ ہم جگری دوست ہیں گے اور اگر ضرورت
پڑی تو وہ میرے لیے جان تک دے دے گا۔ اگر میرا کوئی ہم وطن اس طرح یک لخت دوستی جتانے لگتا تو مجھے یہ بات بڑی
قبل از وقت معلوم ہوتی اور اس پر کبھی اعتبار نہ آتا۔ لیکن اس سیدھے سادے جنگلی پر وہ پرانے اصول عاید نہ ہوتے تھے۔

کھانے کے بعد ہم نے پھر ایک پائپ پیا اور تھوڑی دیر بیٹھے گپ اڑاتے رہے۔ پھر اٹھ کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے کی
طرف چل دیے۔ وہاں اُس نے اپنا حنوط شدہ سر مجھے تحفے میں دیا۔ اس کے بعد اپنی تمباکو والی زبردست تھیلی کھینچی، اس میں سے
ٹٹول ٹٹول کے چاندی کے کوئی تیس گلڈر نکالے اور میز پر پھیلا دیے۔ پھر انھیں دو برابر کے حصوں میں تقسیم کیا اور ایک ڈھیری
میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا، یہ روپیہ تمھارا ہے۔ میں احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیا،
اور وہ سکے میری پتلون کی جیبوں میں بھر دیے۔ میں بھی چپکا ہو رہا۔ اس کے بعد وہ اپنی شام کی عبادت میں لگ گیا اور اپنا
بت نکال کے آتشدان کا تختہ ہٹا دیا۔ اس کے چند اشاروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چاہتا ہے میں بھی شرکت کروں
لیکن مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر اس نے مجھے شریک ہونے
کی دعوت دی تو میں اس کی بات مانوں یا نہ مانوں۔

میں راسخ العقیدہ عیسائی تھا۔ پریسبیٹیرین کلیسا کے سائے میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔ پھر میں اس بت پرست جنگلی کے
ساتھ ایک لکڑی کے ٹکڑے کی پوجا میں کیسے شامل ہو سکتا تھا؟ لیکن عبادت کیا چیز ہے؟ میں نے سوچا۔ اسمٰعیل کیا تم
سمجھتے ہو کہ خدائے بزرگ و برتر، زمین و آسمان کا مالک ہے، دینداروں اور کافروں سب کا آقا ہے، لکڑی کے ایک معمولی
ٹکڑے سے خار کھائے گا؟ ہرگز نہیں! لیکن عبادت کیا چیز ہے؟ — خدا کی مرضی پر چلنا — یہ عبادت ہے۔ اور خدا کی
مرضی کیا ہے؟ — انسانوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جیسا سلوک میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کریں — یہ خدا کی
مرضی ہے۔ اچھا، یہ کوئیکگ بھی میرے جیسا انسان ہے۔ میں اس کوئیکگ سے اپنے ساتھ کس طرح کے سلوک کی توقع
رکھتا ہوں؟ یہی کہ وہ میرے ساتھ یسوعی قسم کی عبادت میں شامل ہو لہٰذا مجھے بھی اس کے مخصوص عبادت میں شریک ہونا چاہیے۔
یعنی بت پرست بن جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے لکڑی کی کھپچیاں جلائیں، اس چھوٹے سے بے ضرر بت کو اٹھا کے سیدھا

رکھتے ہیں کرٹی کرنگ کا ہاتھ بنایا جلے ہوئے بسکٹ کی بھینٹ چڑھاتی ۔ دو تین دفعہ جب کے سامنے جھک کے ڈنڈوت
کی پھر اُس کی ناک بھی چھوئی ۔ اس کے بعد ہم نے کپڑے اتارے اور پلنگ پر جا لیٹے ۔ ہمارا ضمیر ہم سے مطمئن تھا اور ہم بھی
زمانے بھر سے خوش تھے ۔ البتہ سونے سے پہلے ہم نے گپ زنی کا فریضہ بھی تھوڑی دیر ادا کیا ۔

پتا نہیں یہ بات کیا ہے ، مگر دو دوست ایک دوسرے سے اپنے اپنے راز کہنا چاہیں تو اس کے لیے بستر سے اچھی
جگہ کوئی نہیں ہوسکتی ہے ۔ بستر پر میاں بیوی ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل چیر کے رکھ دیتے ہیں اور بعض بڈھے جوڑے
تو صبح ہونے تک پٹی پٹی پرانے زمانے کی باتیں کرتے رہتے ہیں ۔ ہم اور کرٹی کرنگ بھی نئے بیاہے ہوئے جوڑے
کی طرح آرام سے لیٹے تھے اور ہمارے دل ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے ۔

باب - ۱۱

رات کا لباس

غرض ہم بستر پر ساتھ بیٹھے تھے۔ کبھی باتیں کرنے لگتے، کبھی اونگھ جاتے۔ ہم دونوں ایسے گھل مل گئے تھے کہ ایک دوسرے
سے کوئی حجاب باقی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کوئیگ اپنی گودی ہوئی ٹانگیں میری ٹانگوں پر رکھ دیتا اور پھر ہٹا لیتا۔ ہم نے اتنی
باتیں کیں کہ جو تھوڑی بہت نیند آئی تھی آخر وہ بھی اڑ گئی۔ ابھی صبح ہونے میں دیر تھی لیکن ہمارا جی چاہنے لگا کہ بس اب اٹھ بیٹھیں۔
ہماری نیند تو ایسی اڑی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہاں تک کہ ہم چت لیٹے لیٹے اکتا گئے اور آہستہ آہستہ
نوبت بایں جا رسید کہ ہم اٹھ کے بیٹھ گئے۔ ہم نے کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھے تھے اور پیٹ میں گھٹنے دیئے سرہانے
والے تختے سے لگے بیٹھے تھے۔ ناک یوں آگے کو جھکا رکھی تھی جیسے ہمارے گھٹنے ہمارے انگیٹھیاں ہوں۔ ہمیں
بڑا مزا آ رہا تھا۔ اس وجہ سے اور بھی کہ باہر سخت سردی تھی، بلکہ بستر سے نکلتے تو کمرے میں بھی سردی لگتی کیونکہ کمرے میں آگ نہ تھی۔
پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ جسمانی حرارت میں اسی وقت مزا آتا ہے جب آپ کے بدن کے کسی حصے کو سردی لگ رہی ہو۔
دنیا میں ہر صفت اپنی تقابلی ہی کی وجہ سے صفت بنتی ہے۔ بذات خود کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ اگر آپ اس خیال میں مگن ہیں کہ
آپ کو ہر طرح کا اطمینان حاصل ہے اور مدت سے یہی حال رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب آپ کو اطمینان حاصل نہیں
لیکن اگر میری اور کوئی کوئیگ کی طرح آپ کی ناک اور آپ کی چندیا کو ہلکی ہلکی سردی لگ رہی ہے تو جناب عمومی طور سے آپ
اپنے کو خوب گرم محسوس کریں گے۔ اسی لیے سونے کے کمرے میں آگ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تو امیروں کا ڈھکوسلا ہے اور اوپر
سے تکلیف دہ۔ اصل مزا تو اسی وقت آتا ہے جب آپ کے آرام اور باہر کی سردی کے درمیان بس ایک کمبل ہو۔ پھر تو آپ کی
حالت ایسی ہوگی جیسے برف کے تودے میں گرم گرم چنگاری۔

تھوڑی دیر تو ہم تختے سے کمر لگائے بیٹھے رہے۔ پھر ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ آنکھیں کھول دوں۔ میری عادت
یہ ہے کہ چاہے دن ہو یا رات، میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں، بستر پر لیٹ کے آنکھیں ہمیشہ بند رکھتا ہوں، تاکہ یہ آرام کی
کیفیت اور شدید ہو جائے۔ آنکھیں بند کیے بغیر آدمی کو اپنی ہستی کا احساس ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔ ہمارے اندر جو حصہ مٹی کا
ہے اسے تو روشنی مرغوب ہے، لیکن ہمارے اصل جوہر کے لیے تاریکی ہی وہ چیز ہے جو عمل کے لیے بالکل ضروری ہے۔ آنکھیں کھولیں
اور اپنے بنائے ہوئے میٹھی میٹھی تاریکی جو بند کی تھی اس میں سے نکل کر آدھی رات والے خارجی اور بدتر قسم کے اندھیرے میں آیا تو بڑی
کراہت سی ہوئی۔ کوئی کوئیگ نے کہا کہ اب ہم جاگ تو گئے ہی ہیں، لاؤ ذرا چراغ ہی جلا لیں۔ پھر اس کا تمباکو پینے کو بھی بڑا جی چاہ
رہا تھا۔ میں نے بھی اس تجویز کی مخالفت نہ کی۔ یہاں ایک بات کہتا چلوں۔ کل رات مجھے اس کا بستر پر لیٹ کے تمباکو پینا بہت برا
لگا تھا۔ لیکن دیکھیے ہمارے سخت سے سخت تعصبات میں محبت کے زیر اثر کتنی لچک آ جاتی ہے۔ اب مجھے یہ بات بہت اچھی لگ

رہی تھی کہ وہ بستر پر میرے پاس بیٹھ کے تمباکو پیے، کیونکہ ایسے وقت کوئی کوئیکگ پر غضب کا سکون اور ایک گھریلو قسم کی مسرت طاری ہو جاتی تھی۔ اب تو مجھے یہ فکر بھی نہ رہی تھی کہ مرنے والے نے جو کر رکھا ہے یا نہیں۔ مجھے تو بس اتنا احساس تھا کہ ایک اچھے دوست کے ساتھ ایک ہی کمبل میں بیٹھے باری باری سے ایک ہی پائپ پینے میں کتنی شیرینی، یگانگت اور راحت ملتی ہے۔ ہم اپنے باری باری کرکے پیتے پائپ پی رہے تھے۔ کبھی ایک کش لیتا کبھی دوسرا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ہمارے اوپر دھوئیں کا نیلا بادل چھا گیا جس پر ابھی ابھی جلائے ہوئے چراغ کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔

ممکن ہے یہ ابر آلود نیلا بادل جنگلی کے ذہن کو دور دراز مناظر کی طرف لے اڑا ہو۔ بہرحال اب اُس نے اپنے جزیرے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں بھی اس کی کہانی سننے کو بے تاب تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ اپنا پورا حال سناؤ۔ اس نے بڑی خوشی سے میری بات مان لی۔ اس وقت تو اس کے بہت سے الفاظ ٹھیک طرح میری سمجھ میں نہ آئے، لیکن بعد میں جب میں اس کے ٹوٹے پھوٹے فقروں سے مانوس ہو گیا تو مجھے بہت سی باتوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ انھیں کی مدد سے اس کی پوری کہانی کا خلاصہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

باب - ۱۲

سوانح عمری

کوئی کویگ کوکو وکو کا باشندہ تھا، یہ جزیرہ جنوب مغرب کی طرف بہت دور واقع ہے۔ لیکن کسی نقشے میں نہیں مل سکتا، حقیقی جگہیں نقشوں میں ملتی ہی کب ہیں۔

جب یہ جنگلی لڑکا تھا تو گھاس کی لنگوٹ باندھے اپنے وطن کے جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور بکریاں اس کے پیچھے لنگوٹ کی پتیاں چرتی چبایا کرتی تھیں گویا وہ کوئی نیم سبزہ ابھرا ہوا ہو۔ لیکن اس زمانے میں بھی کوئی کویگ کا حوصلہ بلند تھا، وہ سوچا کرتا کہ ایک آدھ جہاز دیکھ لینے سے کام نہیں چلتا، مجھے عیسائیوں کے ملک دیکھنے چاہییں۔ اس کا باپ ایک بہت بڑا سردار، بلکہ بادشاہ تھا اور چچا سب سے بڑا پروہت۔ پھر ننھیال میں اس کے خالو ایسے زبردست سورما تھے کہ انھیں ہرانا آدمی کے بس کا کام نہ تھا۔ غرض اس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا جس میں اگر کچھ خرابی آگئی تھی تو اس وجہ سے کہ نوجوانی میں وہ کتنا ناتراش تھا، آدم خوری کا چسکا بھی پڑ گیا تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سیگ ہاربر کا کوئی جہاز اس کے باپ کی کھاڑی میں آ پہنچا۔ کوئی کویگ نے اپنے لوگوں سے درخواست کی کہ مجھے بھی عیسائیوں کے ملک لے چلو۔ لیکن جہاز میں ملاح پہلے ہی کافی تھے، اس لیے اس کی درخواست مسترد ہو گئی۔ بادشاہ یعنی اس کے باپ کا اثر و رسوخ بھی کام نہ آیا۔ مگر کوئی کویگ نے دل میں ٹھان لی کہ میں جاؤں گا ضرور۔ اسے معلوم تھا کہ جہاز جزیرے سے چل کر کھلی آبنائے میں سے ضرور گزرے گا۔ چنانچہ وہ اپنی چھوٹی سی ناؤ میں اکیلا بیٹھ کے اس طرف چل پڑا۔ آبنائے کے ایک طرف تو مونگے کی چٹان تھی اور دوسری طرف خشکی کا ایک ٹکڑا جس پر تمام جھاڑیاں تھیں۔ یہ جھاڑیاں پانی کے اندر تک چلی آئی تھیں۔ ناؤ کو ان جھاڑیوں کے درمیان تیرتا چھوڑ کے وہ سمندر کے رخ اگلے حصے میں چپو ہاتھ میں لیے تیار بیٹھا رہا۔ جہاز اس طرف سے گزرا تو وہ بجلی کی طرح لپکا اور اس کے پاس جا پہنچا۔ لات مار کے ناؤ کو ڈبو دیا اور خود زنجیر پکڑ کے جہاز پر چڑھ گیا۔ پھر ایک تختے میں ہاتھ ڈال کر عرشے پر سیدھا لیٹ گیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ چاہے میرے ٹکڑے اڑا دو، لیکن یہاں سے نہیں سرکوں گا۔

کپتان نے ڈرایا دھمکایا کہ ہم تمھیں سمندر میں پھینک دیں گے۔ بلکہ اس کی کلائی پر خنجر تک رکھ دیا۔ مگر بے سود۔ کوئی کویگ بھی آخر بادشاہ کا بیٹا تھا، وہ کب ٹس سے مس ہوتا۔ یہ حوصلہ، یہ دلیری، عیسائیوں کے ملک میں جانے کی یہ بے تابی دیکھ کے کپتان نرم پڑ گیا اور کہا کہ اچھا اطمینان سے جہاز میں رہو۔ مگر اس بہادر نوجوان اور سمندری شہزادے کو کپتان کے کمرے میں بیٹھنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اسے ملاحوں میں بھرتی کر لیا گیا اور وہ آخر وہیل کا شکاری بن گیا۔ لیکن جس طرح زار روس پیٹر نے دوسرے ملکوں میں جا کر جہازوں پر محنت مزدوری کی تھی، اسی طرح کوئی کویگ ذلیل سے ذلیل کام میں بھی عار نہ سمجھتا تھا، بشرطیکہ اسے

اپنے جاہل ہم وطنوں تک علم کا نور پہنچانے کی طاقت حاصل ہو جائے۔ جیسا اس نے مجھے بتایا، اس کی دراصل خواہش یہ تھی کہ عیسائیوں سے وہ ایسے علوم سیکھے جن کے ذریعے اس کے ہم قوم اور بھی زیادہ خوش حال اور اخلاقی طور سے بہتر بن سکیں مگر افسوس، عیسائیوں کے طور طریقے دیکھ کر وہ جلدی ہی سمجھ گیا کہ عیسائی بھی بدحال اور بدکردار ہو سکتے ہیں، بلکہ اس کے جنگلی ہم قوموں سے کہیں زیادہ۔ سیگ ہاربر پہنچ کے اس نے جہازیوں کا تماشا اچھی طرح دیکھا۔ پھر نین ٹکٹ آکے اسے پتا چلا کہ یہ لوگ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کہاں خرچ کرتے ہیں۔ اب تو بیچارا کوئی کویگ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس نے دل میں کہا، جہاں بھی جاؤ، لوگ ویسے کے ویسے ہی بدمعاش ہیں، بس تو کافر ہی مروں گا۔

چنانچہ یہ شخص دل میں تو کافر تھا لیکن رہتا تھا عیسائیوں کے درمیان۔ انھیں کے سے کپڑے پہنتا اور انھیں کی ٹوٹی پھوٹی زبان بولنے کی کوشش کرتا۔ اسی لیے اس کے طور طریقے اتنے عجیب تھے حالانکہ اسے اپنا گھر چھوڑے تو عرصہ ہو چکا تھا۔

میں نے اشاروں میں اس سے پوچھا کہ جب آخری دفعہ تمھارے والد کی خیر خبر آئی ہے تو وہ بہت بڈھے اور ضعیف ہو چکے تھے، اب تک تو مر کھپ چکے ہوں گے۔ تم اپنے وطن جاکے ان کی گدی نہیں سنبھالو گے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں ابھی نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اسے عیسائی مذہب، بلکہ عیسائیوں نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ اپنے پیش رو تیس کافر بادشاہوں کے مقدس و منزہ تخت پر قدم رکھ سکے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ میں ایک نہ ایک دن واپس ضرور جاؤں گا یعنی جب یہ محسوس کروں گا کہ مجھے اپنی پاکیزگی دوبارہ مل گئی۔ فی الحال تو اس کی تجویز یہی تھی کہ جہازوں میں دنیا بھر کے چکر لگاتا رہے اور چاروں سمندروں میں گشت کرتا پھرے۔ ان لوگوں نے اسے مچھیرا بنا دیا تھا، لہٰذا اب تو برچھی ہی اس کے لیے عصائے شاہی تھا۔

میں نے پوچھا کہ اچھا، فی الحال کیا ارادے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہی اپنا پرانا کام ہے، اور پھر سمندر پہ جانا ہے۔ یہ سن کر میں نے بتایا کہ میرا بھی ارادہ وہیل مچھلی کے شکار پہ جانے کا ہے اور آدمی ذرا حوصلہ مند ہو تو اس کام کے لیے سب سے اچھی بندرگاہ نین ٹکٹ ہے۔ اس لیے میرا بھی رخ اسی طرف ہے۔ کوئی کویگ نے فوراً طے کر لیا کہ وہ بھی میرے ساتھ وہیں جائے گا۔ دونوں ایک ہی جہاز اور ایک ہی دستے میں بھرتی ہوں گے، کھانا پینا بھی ساتھ ہی رہے گا ـــــ یعنی وہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گا، اور دونوں دنیاؤں میں جو بھی گزرے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہے گا۔ میں نے یہ بات بڑی خوشی سے منظور کر لی کیونکہ ایک تو مجھے اس سے بڑا انس ہو گیا تھا، دوسرے وہ بڑا تجربہ کار مچھیرا تھا۔

تجارتی جہازوں کے سفر سے تو خیر میں اچھی طرح واقف تھا لیکن وہیل کے شکار سے قطعی نابلد تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھ جیسے لوگوں کے لیے تو کوئی کویگ بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔

پائپ کے آخری کش کے ساتھ اس کی کہانی بھی ختم ہو گئی۔ کوئی کویگ نے مجھے گلے سے لگایا، اپنا ماتھا میرے ماتھے پر رگڑا اور چراغ بجھا دیا۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو کے لیٹ گئے اور تھوڑی ہی دیر میں میٹھی نیند سو گئے۔

باب - ۱۴

ڈھکیل

اگلے دن پیر تھا۔ میں نے وہ دو نوٹ سرایک نال کے ہاتھ میں ڈالا اور اپنے دونوں کے پیسے چکا دیے۔ لیکن یہ پیسے میرے ساتھی کے تھے۔ سرائے والے اور دوسرے لوگوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور ہنسی بھی آئی کہ چین میں لوگ کوئی گوئنگ میں ایک دم سے پیار امڈ گیا تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اب جس آدمی سے میری ملاقات ہونی تھی پہلے اس کے متعلق میرے کوئی کی خواہشات سن کے میں ڈر گیا تھا۔

ہم نے ایک ڈھکیل کرائے پر لی اور اپنا سامان یعنی میرا وردی کا تھیلا، کوئی گوئنگ کی کچھ دال، پوری اور جوتا اس پر لاد کے ہم ٹکٹ جانے والے توسی نالی چھوٹے سے جہاز کی طرف چل پڑے جو گھاٹ پر کھڑا تھا۔ راستے میں لوگ ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی گوئنگ کی وجہ سے نہیں، کیونکہ ایسے آدم خوروں کو سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھنے کے تو وہ عادی ہو چکے تھے۔ انھیں تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں اور وہ ایسے گھل مل گئے تھے۔ لیکن ہم نے ان کی ذرا بھی پروا نہ کی اور اطمینان سے چلتے رہے۔ کبھی میں تھیلا ڈھکیلنے لگتا کبھی وہ۔ کوئی گوئنگ بار بار رک کے اپنے برچھے کے پھل کا غلاف ٹھیک کرتا۔ میں نے پوچھا دریا کے کنارے جانے والے جہاز میں کیا برچھے نہیں ہوتے جو تم یہ مصیبت اپنے کندھے پر اٹھائے پھر رہے ہو؟ کوئی گوئنگ نے کچھ اس قسم کا جواب دیا کہ تمھاری بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن مجھے اپنا برچھا بہت پیارا ہے کیونکہ یہ بڑے نفیس لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اس نے بیسیوں معرکوں میں کام دیا ہے اور وہ چیلوں کی رگ رگ سے واقف ہے۔ جنگل پر بھی تو کرتے جب کسانوں کے کھیت کاٹنے جاتے ہیں تو لوگ درانتیاں ساتھ لے جاتے ہیں، حالانکہ ان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ بھی کوئی گوئنگ کی ذاتی پسند کا معاملہ تھا کہ وہ اپنا برچھا لے کے چلتا تھا۔

ڈھکیل میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کوئی گوئنگ نے ایک بڑا مزیدار قصہ سنایا کہ اس نے پہلی دفعہ ڈھکیل کیسے دیکھی۔ یہ واقعہ ریگ یا دیر کا ہے۔ اس کے جہاز والوں نے اسے ایک ڈھکیل دے دی کہ اپنا بھاری بھرکم صندوق اس میں رکھ کے سرائے لے جائے۔ اس بیچارے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ استعمال کس طرح ہوتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسے احمق سمجھیں۔ لہٰذا کوئی گوئنگ نے اپنا صندوق اس پر رکھ کے رسیوں سے خوب جکڑ دیا پھر ڈھکیل کندھے پر رکھ کے چل پڑا۔ میں نے کہا۔ "کوئی گوئنگ! اتنی بات تو تمھیں معلوم ہونی چاہیے تھی۔ لوگ تمھارے اوپر ہنسے نہیں؟"

اس پر کوئی گوئنگ نے مجھے ایک اور کہانی سنائی۔ اس کے بڑے بوڑھے کو کرو کو کے لوگ شادی بیاہ کی رسموں میں بھرے ہوئے ناریلوں کا خوشبودار پانی ایک شیشے سے مرتبان میں بھر لیتے ہیں۔ جس خوبصورت چٹائی پر دعوت کا سامان ہوتا ہے اس کے بیچ میں یہ بادیا آرائش کے طور پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نہایت شاندار

تجارتی جہاز کو گودی پر پہنچا۔ اس کا کپتان بڑا معقول آدمی تھا بلکہ جیسے اور کپتان ہوتے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے تو کپتان پہ لگتا
کہ نہایت سلیقہ مند اور باوقار تھا۔ خیر تو اس کپتان کو کوئی کویگ کی بہن کے بیاہ میں بلایا گیا جو ایک ننھی منھی خوبصورت سی
شہزادی تھی الا یہ کہ اب گیارہ ماں بجی نکلا تھا جب دلہن کی بانس والی جھونپڑی میں سارے مہمان جمع ہو گئے تو کپتان صاحب
بھی پہنچے۔ انھیں صدر میں بٹھایا گیا اور وہ بادیے کے قریب بڑے پجاری اور بادشاہ سلامت یعنی کوئی کویگ کے والد
کے درمیان ڈٹ گئے۔ جب دعا ختم ہو گئی ——— کیونکہ ہماری طرح ان لوگوں کے یہاں بھی دعا پڑھی جاتی ہے۔ لیکن کوئی کویگ
نے مجھے بتایا کہ ایسے موقع پر وہ ہماری طرح اپنی رکابیوں کی طرف نیچے نہیں دیکھتے بلکہ مرغوں کی تقلید میں پلٹ اَن داتا
کی طرف اوپر نظریں اٹھا دیتے ہیں۔ خیر جب دعا ختم ہو گئی تو بڑے پجاری نے اس جزیرے کی پرانی رسم کے مطابق دعوت کا
افتتاح کیا، یعنی اس متبرک شربت کا دور چلنے سے پہلے اس نے اپنی انگلیاں بادیے میں ڈبو دیں۔ کپتان صاحب نے یہ رسم
دیکھی تو خیال آیا کہ میں جیسے پجاری کے پاس بیٹھا ہوں اور جہاز کے کپتان کی حیثیت سے ایک معمولی جزیرے کے بادشاہ
پر مجھے فوقیت حاصل ہے خصوصاً بادشاہ کے مکان میں تو ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ بادیے میں اپنے
ہاتھ دھونے شروع کر دیے۔ شاید وہ سمجھے کہ یہ چلمچی ہے۔ کوئی کویگ کہنے لگا ——— "اب بولو، کیا کہتے ہو؟ کیا ہمارے یہاں
کے لوگ نہ ہنسے ہوں گے؟"

آخر کرایہ ادا کر کے اور اپنا سامان حفاظت سے رکھ کے ہم جہاز کے عرشے پر جا کھڑے ہوئے۔ جہاز نے بادبان
پھیلا دیے اور دریا میں چل پڑا۔ ہمارے ایک طرف نیو بیڈفورڈ تھا شہر کے مکان اس طرح اوپر اٹھتے چلے گئے تھے جیسے جزیرے
پر پیڑ اُگے ہوں۔ برف سے ڈھکے ہوئے درخت صاف اور سرد ہوا میں جگمگا رہے تھے۔ گھاٹ پر پیپوں کے پہاڑ سے
تھے اور ان کے آس پاس وہیل کا شکار کھیلنے والے جہاز دنیا بھر کا چکر لگانے کے بعد خیریت کے ساتھ بندرگاہ پہنچ کے سر
اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ بعض جہازوں سے بڑھئیوں اور لوہاروں کے کھٹ کھٹ کرنے اور دھونکنیوں کے چلنے کی
ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ نئے سفر درپیش ہیں۔ یہ آوازیں بتا رہی تھیں کہ ایک طویل اور خطرناک
سفر ختم ہو جائے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے، دوسرا ختم ہو تو تیسرا، غرض یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ
ہے انسانی جد و جہد کی ابدیت اور اس کی عظمت!

ہم ذرا اور کھلے ہوئے پانی میں پہنچے تو تازہ ہوا کے تازہ تازہ جھونکے آنے لگے۔ ہمارا چھوٹا سا جہاز اپنے کنارے سے
یوں جھاگ اڑاتا چل رہا تھا جیسے بچھیرا چوکڑیاں مارتا ہے۔ میں اس عالم میں کیسے خوش ہو ہو کے سانس لے رہا تھا! میں
زمین کی اس عامیانہ اور گھٹی ہوئی شاہراہ کو کس حقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا جس پر گدھے گھوڑوں کے سموں اور غلاموں کے
پیچھے ہاتھ پاؤں کے نشان چھوڑ گئے ہیں اور میں تو سمندر کی بلند حوصلگی پر فریفتہ ہو رہا تھا جو کسی طرح کے نشان چھوڑنے کی اجازت
ہی نہیں دیتا۔

جھاگ فوارے کی طرح اچھل رہا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ کوئی کویگ بھی اسی آبِ حیات کے نشے میں سرشار تھا۔

اس کے گیاوے تختے پھول گئے تھے۔ اور نکیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ جہاز آگے چلا جا رہا تھا جب شہر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ہمارا جہاز تند و تیز ہوا کے سامنے تعظیم بجا لایا۔ اس کا اگلا حصہ بار بار اس طرح جھکنے اور ڈبکیاں کھانے لگا جیسے کوئی غلام اپنے سلطان کو سلام کر رہا ہو۔ پھر جہاز ایک طرف کو جھک گیا اور یوں ہی جھکے جھکے چلنے لگا۔ ایک ایک رسّی ایسے کھنچ گئی تھی جیسے تار۔ دونوں لمبے لمبے مستول اس طرح خم کھا گئے تھے جیسے آندھی میں بید کے درخت۔ ہم دونوں پانی پر جھکتے ہوئے کنارے میں کھڑے ملاحوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں ایسے محو تھے کہ تھوڑی دیر تک تو ہمیں یہ بھی پتا نہ چلا کہ مسافروں کی نگاہیں ہمارا مذاق اڑا رہی ہیں۔ یہ لوگ بھی نرے کاٹھ کے اُلو تھے۔ انھیں اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ دو انسان آپس میں اتنے گھل مل گئے ہیں۔ آخر گورے اور حبشی میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے؟ حبشی پر سفیدی پھیر دو، وہ گورا بن جائے گا۔

لیکن جہاز پر کچھ گنوار اور دہقانی جمع ہو گئے تھے۔ وہ ویسے ہی گنوار تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ہل چھوڑ کے آ رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نوجوان کوئی کوئیگ کی کمر کے پیچھے جا کے اس کی نقل اتار رہا تھا کہ اس نے گنوار کو پکڑ لیا۔ میں سمجھا اس دہقانی کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اس دیو قامت جنگلی نے برچھا پھینک کے اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور اپنی طاقت کا ایسا کمال دکھایا کہ اسے اٹھا کے ہوا میں اونچا اچھال دیا۔ اس شخص نے بیچ ہی میں ایک قلابازی کھائی اور پھر ہانپتا ہوا کوئی کوئیگ کے قدموں کے پاس آ کے گرا۔ کوئی کوئیگ اپنی کمر اس کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا اور وہ کلہاڑی جیسا پائپ جلا کے مجھے دے دیا کہ ایک کش لگاؤ۔

"کپتان صاحب، کپتان صاحب!" دہقانی چیختا ہوا بھاگا۔ "کپتان صاحب، بچاؤ۔ اس نے مجھے مار دیا!"

"کیوں حضرت، ادھر تو دیکھئے۔" کپتان بھی پتلا دبلا اور بڑا سمجھا بوجھا جہازی تھا۔ وہ دب دب کرتا کوئی کوئیگ کے پاس آیا اور بولا: "یہ تم نے کیا حرکت کی؟ یہ بیچارہ مر جاتا تو کیا ہوتا؟"

"یہ کیا بولتا؟" کوئی کوئیگ نے بڑی ملائمت سے میری طرف مڑ کے پوچھا۔ میں نے کہا: "یہ بولتا کہ تم نے تو اس آدمی کو مار ڈالا تھا۔" اور میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک کانپ رہا تھا۔

"مار ڈالا!" کوئی کوئیگ کے گودے ہوئے چہرے سے انتہائی حقارت جھلکنے لگی۔ "یہ بہت چھوٹا مچھلی۔ کوئی کوئیگ چھوٹا مچھلی مارتا نہیں۔ کوئی کوئیگ بڑا وہیل مارتا۔"

"ادھر دیکھو،" کپتان چلایا۔ "اگر تم نے میرے جہاز میں پھر کوئی ایسی حرکت کی تو آدم خور صاحب، میں تمھیں کچا چبا جاؤں گا۔ ذرا ہوش میں رہنا۔"

لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اب تو خود کپتان صاحب کو ہوش میں رہنے کی ضرورت تھی۔ بڑے بادبان پر ہوا کا اتنا زور پڑا تھا کہ ایک چادر پھٹ گئی تھی اور بادبان کے نیچے کی زبردست لکڑی ادھر سے ادھر ہل رہی تھی۔ عرشے کا پچھلا حصہ پورے کا پورا اس کی زد میں تھا۔ کوئی کوئیگ نے جس آدمی کی مرمت کی تھی، وہ بیچارہ اس لکڑی کی جھونک میں آ کے سمندر میں جا پڑا۔ بیچارے جہازیوں کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ کوئی پاگل ہی ہوتا جو اس لکڑی کو پکڑنے یا روکنے کی کوشش کرتا۔ پلک جھپکتے میں وہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جا پہنچتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب ایک لمحے میں اس کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ سب چپ چاپ کھڑے

تھے۔ کپتان کھڑا چیخ رہا تھا اور جو بھی کہہ سکتا تھا، عرشے والے بھاگ کے جہاز کے اگلے حصے میں آگئے تھے اور کھڑے کھڑے
کراہتے دیکھ رہے تھے جیسے یہ کسی چھاتی بھری ڈبل کا پٹو جڑا ہو۔ اس افراتفری کے عالم میں کوئی کرنگ بڑی پھرتی سے
گھٹنوں کے بل جھک گیا اور جھولتی ہوئی لکڑی کے نیچے سرکنے لگا۔ اس نے جلدی سے لپک کے ایک رسّی کھینچی اور ایک
سرا دیوار کے تختے میں باندھ دیا۔ جب لکڑی اس کے اوپر سے گزری تو رسّی کو کمند کی طرح پھینک کے لکڑی میں لپیٹ دیا اور
جھٹکا مار کے اسے جکڑ لیا۔ اس طرح یہ بلا ٹلی۔ ملاحوں نے جہاز کو پھر کے رخ لگایا، خلاصی جہاز کے پیچھے بندھی چھوٹی ناؤ
کھولنے لگے۔ اتنے میں کوئی کرنگ نے کرتک کپڑے اتار ڈالے اور جہاز کی دیوار پہ چڑھ کے ایک زور کی قوس نما چھلانگ
لگادی۔ تین چار منٹ تک تو وہ اپنے لمبے لمبے بازو آگے کو پھیلائے کتّے کی طرح تیرتا رہا۔ برف آلود جھاگ میں سے کبھی
تو اس کا ایک مضبوط شانہ دکھائی دے جاتا کبھی دوسرا۔ مجھے یہ عظیم الشان آدمی تو نظر آرہا تھا لیکن جس شخص کی جان بچانی تھی وہ
کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دیہاتی ڈوب چکا تھا۔ اب کوئی کرنگ پانی میں سے بالکل سیدھا ابھر کے نکلا اور چاروں طرف نظر
دوڑائی۔ حالات کا ٹھیک طرح اندازہ کر لینے کے بعد اس نے غوطہ لگایا اور غائب ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد وہ پھر ابھرا۔ ایک ہاتھ
سے تو پانی چیر رہا تھا اور دوسرے سے ایک بے جان آدمی کو گھسیٹ کے لا رہا تھا۔ ناؤ والوں نے جلدی سے جا کے دونوں
کو پانی سے نکالا۔ بچارے دیہاتی کو ہوش میں لا دیا گیا۔ اب تو سب لوگ کوئی کرنگ کی بہادری اور شرافت کے قائل ہو گئے۔
کپتان نے اس سے معافی مانگی۔ اس وقت سے بس کوئی کرنگ کے ساتھ بالکل ٹھیک ہو کے رہ گیا اور یہ ساتھ اس دن تک
رہا تاکہ جب اس بچارے نے اپنی آخری چھلانگ لگائی۔

بھلا اپنے آپ سے اتنی بے خبری بھی کسی میں ہو گی؟ واہ رے یہ احساس تک نہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے خصوصیت سے حق کہنے والی
عظیم الشان انجمنوں کی طرف سے تمغہ ملنا چاہیے۔ اس نے تو بس پانی مانگا — تازہ پانی — تاکہ اپنے اوپر سے سمندر کا کھارا دھو
ڈالے۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے خشک کپڑے چپ چاپ پہنے اور دیہاتی لوگ کے جو لوگ چاروں طرف کھڑے تھے
انھیں ملائم ملائم نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہا ہو — "جہاں بھی جاؤ، دنیا ہر جگہ ایک باہمی اشتراک سے
چلنے والا کاروبار ہے۔ ہم آدم خوروں کو ان جہازیوں کی مدد کرنی چاہیے۔"

باب - ۱۴

نین ٹکٹ

راستے میں کوئی اور قابلِ ذکر بات پیش نہیں آئی۔ باقی سفر بہت اچھا رہا اور ہم صحیح سلامت نین ٹکٹ آ پہنچے۔
نین ٹکٹ ذرا اپنا نقشہ تو نکال کے دیکھیے۔ یہ جگہ دنیا کے بالکل ایک کونے میں واقع ہے۔ ساحل سے دور دیکھے
سمندر میں بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھیے — بس ایک تو ٹیلا ہے اور ایک ریت کا تنگ سا میدان۔ یہاں ساحل ہی
ساحل ہے، اس کے پیچھے کچھ نہیں۔ کاغذ کی روشنائی سکھانے کے لیے آپ جتنا ریت بیس سال میں استعمال کریں گے اتنی
سے کہیں زیادہ یہاں پڑا ہے۔ بعض دل لگی باز لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہاں تو جھاڑ جھنکاڑ بھی زور سے نہیں اگتا، بویا جاتا ہے،
کانٹوں دار جھاڑیاں کہاں سے آتی ہیں، جنگل کیا اُگیں گے، تو سوراخ بند کرنے کے لیے ٹاٹ منڈھ کے نکالنی پڑتی ہے۔ نین ٹکٹ
کے لوگ لکڑی کے ٹکڑے اس احترام سے اٹھائے چلتے ہیں جیسے روم والے حضرت عیسیٰ کی صلیب کے ٹکڑے، اپنے
گھروں کے سامنے لوگ سایہ کی چھتری بوتے ہیں تاکہ گرمیوں میں سایہ میسر رہے۔ گھاس کی ایک پتی کو نخلستان سمجھا جاتا ہے
اور دن بھر چلنے کے بعد اگر تین پتیاں نظر آجائیں تو گویا سبزہ زار دیکھ لیا جس طرح لیپ لینڈ کے باشندے برف کے جوتے
پہنتے ہیں، اسی طرح یہاں کے لوگ ریت کے جوتے پہنتے ہیں پھر سمندر نے اس جزیرے کو ہر طرف سے گھیر اؤں کے بل جکڑ رکھا
ہے کہ بعض وضع میزوں کرسیوں تک پہ گھونگھے چپکے ہوتے ہیں جیسے سمندری گھونگھوں کے اوپر۔ خیر یہ تو سب
کی گفتگو ہے لیکن اس سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ نین ٹکٹ آپ کے شہروں کی طرح نہیں ہے۔

اب ذرا وہ عجیب و غریب قصہ سنیے کہ ریڈ انڈین لوگ یہاں کس طرح آگئے ہیں۔ وہ روایت یوں ہے۔ بہت
پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ کیپ کوڈ کے ساحل پر ایک عقاب نے جھپٹا مارا اور ایک شیر خوار بچے کو پنجوں میں دبا کے اڑ
ماں باپ روتے پیٹتے رہ گئے اور عقاب بچے کو لے کے سمندر کے اوپر اڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ان لوگوں نے دل
میں ٹھان لی کہ ہم بھی اسی طرف پیچھے پیچھے جائیں گے چنانچہ وہ اپنی ناؤ میں بیٹھ کے چل دیے اور بڑے خطرناک سفر کے بعد
اس جزیرے میں آ پہنچے۔ یہاں انھیں ہاتھی دانت کا ایک خالی ڈبہ ملا — یہ اس بچارے بچے کا ڈھانچا تھا۔

یہ نین ٹکٹ والے ساحل پر پیدا ہوتے ہیں۔ تو پھر اس میں کون سی تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے ماہی گیری کا پیشہ
اختیار کرلیا۔ پہلے تو وہ ریت میں سے کیکڑے وغیرہ پکڑا کرتے تھے۔ ذرا اور دلیر ہوئے تو کشتی لے کے پانی میں جا کے
جال سے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے لگے۔ کچھ اور دلیر ہوئے تو ساحل چھوڑ کر کشتیوں میں بیٹھ کے بڑی مچھلیوں کا شکار کھیلنے لگے۔ آخر کار
ان لوگوں نے بڑے بڑے جہازوں کا پورا بیڑا پانی میں اتار دیا اور سارے سمندر کو کھنگال ڈالے۔ اب دنیا کے گرد ان کا
سفر چوبیس گھنٹے جاری رہنے لگا جاکے آبنائے بیرنگ تک جھانک آتے۔ ہر موسم اور ہر سمندر میں اس عظیم الجثہ حضرت کے

خلاف ایسی جنگ شروع کر دی جو ایک جاندار پہاڑ کے مانند ہے اور جس سے بڑا کوئی جانور حضرت نوح کے طوفان سے بچ کے نہیں نکلا۔ یعنی کوہ پیکر سمندری ہاتھی ہے جو خود اپنی زبردست طاقت سے بے خبر ہے اور جس کی غراہٹ اُس کے پُرشور اور بے دھڑک عملوں سے زیادہ ہولناک ہے۔

اس طرح تین مکٹ کے ان برہنہ تن باشندوں نے سمندر کے ان راہیوں سے اپنے ٹاپو سے ملک کے سکندر اعظم کی مانند پانی کی تمام دُنیا فتح کر لی ہے جس طرح زمین غاصب ملکوں نے پرتیغہ کر تقسیم کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی بحر اوقیانوس، بحر الکاہل اور بحر ہند آپس میں بانٹ رکھے ہیں۔ امریکہ والے چاہیں تو کناڈا، میکسیکو، کیوبا سب کو اپنے ملک میں شامل کر لیں۔ انگریز ہندوستان پر چھا گئے ہیں تو رہیں سہی۔ اگر وہ اپنا جھنڈا ایسے سورج پہ گاڑ آئیں تو کیا ہے۔ خشکی اور پانی سے بنے ہوئے کرۂ ارض کا دو تہائی حصہ تو تین مکٹ والوں کے قبضے میں ہے۔ سمندر انھیں کی جاگیر ہے۔ وہ شہنشاہوں کی طرح اس پر راج کرتے ہیں۔ دوسرے جہازوں کو تو بس وہاں سے گزرنے کا حق حاصل ہے۔ تجارتی جہازوں کی حیثیت تو محض بگلوں کی سی ہے۔ سطح آب پر جہاز تیرتے ہوئے گئے ہیں۔ بحری قزاق سمندر میں اسی طرح تو ضرور پھرتے ہیں جیسے ڈاکو سڑکوں پر۔ لیکن وہ بس دوسرے جہازوں کو ہی خشکی کے ٹکڑوں کی طرح لوٹتے ہیں۔ اپنا رزق سمندر کی تہوں میں سے حاصل نہیں کرتے۔ البتہ تین مکٹ والے سمندر میں رہتے ہیں اور وہیں دھاچوکڑی مچاتے ہیں۔ ان کے جہاز ادھر سے ادھر تک سمندر کو اس طرح جوتتے ہیں جیسے اپنے کھیت میں ہل چلا رہے ہوں۔ یہی اُن کا گھر ہے، یہیں اُن کا سارا کاروبار ہے۔ جیسے حضرت نوح کا طوفان تک نہیں روک سکتا، چاہے پورے چین کو غرق کر دے۔ تین مکٹ والے سمندر میں ہی رہتے ہیں، جیسے چڑیاں گھاس کے میدان میں۔ کبھی تو وہ لہروں میں چھپ جاتے ہیں اور کبھی اُن پر اس طرح چڑھتے ہیں جیسے شکاری آلپس کی چوٹیوں پر۔ برسوں تک انھیں زمین کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ آخر جب وہ خشکی پر آتے ہیں تو یہ انھیں بالکل دوسری دنیا معلوم ہوتی ہے، گویا زمین کے باشندے چاند میں جا پہنچے ہوں۔ سمندری چڑیاں سورج غروب ہونے کے وقت اپنے پر بند کر کے لہروں پر بیٹھ جاتی ہیں اور لہروں کے ہلکورے انھیں میٹھی نیند سلا دیتے ہیں۔ اسی طرح رات کو تین مکٹ والے خشکی سے کوسوں دُور اپنے بادبان لپیٹ کے آرام سے لیٹ جاتے ہیں اور اُن کے بستر کے نیچے وہیل اور دریائی گھوڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ دوڑتے پھرتے ہیں۔

باب - ۱۵

قلیہ

جب ہمارا جہاز شنگھائی ہوتا ہوا کولون ہانگ کانگ اور میں ساحل پر اترے تو خاصی رات ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس روز کھانا کھانے کے سو رہنے کے سوا اور کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ سرائے والے نے ہمیں اپنے ایک رشتے دار چو ٹیانسی کی سرائے "ٹوائی پرنس" کا پتا بتا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ جگہ ہانگ کانگ کے بہترین ہوٹلوں میں سے ہے اور یہاں کا مچھلی کا قلیہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ غرض اس کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ ہمارے لیے اس سے اچھا انتظام اور کوئی نہیں کہ جا کے "ٹوائی پرنس" میں قسمت آزمائیں۔ اس نے سرائے کا پتا یوں بتایا تھا کہ تمہیں دائیں طرف ایک زرد مال گودام دکھائی دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلو۔ اب ایک سپید گرجا آئے گا۔ اسے بائیں ہاتھ کی طرف رکھ کے چلتے جاؤ۔ پھر کچھ دور آگے جا کے دائیں ہاتھ کو مڑ جاؤ اور جو آدمی نظر آئے اس سے پوچھ لو کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ یہ ہدایات ایسی پیچیدہ تھیں کہ پہلے تو ہم چکرا گئے۔ اس وجہ سے اور بھی کہ جب ہم روانہ ہوئے تو کوئی کوئینگ نے اصرار کیا کہ مال گودام ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف رہنا چاہیے اور میں نے پیٹر کوئن کا یہ مطلب سمجھا تھا کہ مال گودام دائیں ہاتھ رہے۔ خیر تھوڑی دیر تو ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور کئی دفعہ ہمارے شریف لوگوں کے دروازے پیٹ پیٹ کے پتا پوچھا۔ آخر کار ہم ایک ایسی جگہ آ پہنچے جس کے متعلق کوئی غلط فہمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک پرانے دھرانے پھاٹک کے سامنے صلیب کی شکل کا ایک مستول کھڑا تھا۔ اس میں آنکڑوں سے لکڑی کے دو بڑے بڑے ڈیگ لٹک رہے تھے جن پر سیاہ رنگ کر رکھا تھا۔ مستول کے بازو دوسری طرف سے کٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ پرانا مستول کچھ پھانسی کی طرح کا لگتا تھا۔ شاید میں اس وقت کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بن گیا تھا اور میرے دل میں خوف کے واہمے پیدا ہو رہے تھے۔ بہر حال میری نظریں اس پھانسی کے تختے پر گڑ کے رہ گئیں اور مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ مستول میں دو کھونٹیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ان کی طرف دیکھتے دیکھتے میری گردن اکڑ سی گئی۔ ہاں دو کھونٹیاں تھیں۔ ایک کوئی کوئینگ کے لیے اور ایک میرے لیے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بہت ہی بُرا شگون ہے۔ ریل کے شکار ہو جانے کے ارادے سے پہلے ہی بندرگاہ پہنچا تو میرے سرائے والے کا نام کوئی آتا بیت، تھا جہازیوں کے گرجا میں ہر طرف کتے ہی کتے نظر آ رہے تھے اور یہاں یہ پھانسی کا تختہ ہے۔ اور ساتھ میں دو بڑے بڑے سیاہ ڈیگ! کہیں ان لوگوں سے جہنم کی طرف اشارہ تو مقصود نہیں ہے؟

خیر ان خیالات کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ سرائے کی ڈیوڑھی میں ایک میلے سے سرخ رنگ کا لیمپ لٹک رہا تھا جو چقندر جیسا لگتا تھا۔ اس کے نیچے زرد گاؤن میں ملبوس ایک چکلے منہ اور زرد بالوں والی عورت کھڑی نظر آئی۔ پاس ہی ایک مرد قرمزی رنگ کی سوتی قمیص پہنے کھڑا تھا جسے وہ عورت ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی — "جاؤ، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں کھال ادھیڑ کے رکھ دوں گی۔"

میں نے کہا: "چلو آؤ کن کورنگ۔ بس ٹھیک ہے، یہی مسز جسی ہیں۔"

اور واقعی یہی بات نکلی۔ مسٹر ہورنا بسی تو گھر سے غائب تھے اور مسز جسی کو اپنا مکار الہام بتا کے چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں کھانا اور بستر چاہیئے۔ یہ سن کر مسز جسی نے اپنی ڈانٹ ڈپٹ فی الحال ملتوی کر دی اور ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جا کر ایک میز کے سامنے بٹھا دیا۔ کھانا شاید ابھی ختم ہوا تھا اور اُس کے تبرکات میز پر بکھرے پڑے تھے۔ اب وہ ہماری طرف مخاطب ہوئیں اور پوچھا — "گھونگے یا مچھلی؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟" میں نے بڑی شائستگی کے ساتھ کہا۔

"گھونگے یا مچھلی؟" مسز جسی نے وہی بات دہرائی۔

"رات کے وقت گھونگے؟ ٹھنڈے گھونگے؟ یہی تو مطلب ہے نا آپ کا مسز جسی؟" میں بولا۔ "جاڑوں میں آپ ابھی تو صبح کر رہی ہیں!"

لیکن مسز جسی کو اپنی ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ پھر سے شروع کرنے کی بڑی جلدی تھی اور وہ شخص بھی ذرا تیز مزاج ہی سا لگتا تھا۔ شاید مسز جسی نے بس ایک ہی لفظ "گھونگے" سنا اور جھپ سے اُس کھلے ہوئے دروازے میں جو باورچی خانے کی طرف تھا۔ پھر چنگھاڑ کے کہا — "دو آدمیوں کے لیے گھونگے" — اور غائب ہو گئیں۔

میں نے کہا "کن کورنگ! ایک گھونگے میں ہم دو آدمیوں کا پیٹ کیسے بھرے گا؟"

ہمیں فی الحال اپنا مستقبل تاریک سا بے رنگ نظر آ رہا تھا لیکن باورچی خانے سے گرم گرم اور چٹپٹی بھاپ اندر آئی تو ذرا ڈھارس بندھی۔ پھر جب گرم گرم قاب سامنے آیا، ڈھکنا کھلا اور دل باغ باغ ہو گیا۔ جناب، ذرا خوب بیٹے کا تلے میں لیا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اخروٹ کے برابر گھونگے، کٹے ہوئے جاوی بسکٹ، نمکین گوشت کے ٹکڑے، یہ سب چیزیں تازہ مکھن میں پکی ہوئی، اُوپر سے مزے کا نمک مرچ۔ ہم جانتے پانے ہیں مزے کر کے آ رہے تھے، آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگی تھیں۔ پھر یہ کن کورنگ کا دل پسند کھانا تھا اور پکا ہوا بھی اتنا عمدہ چنانچہ ہم پل پڑے۔ کھاتے کھاتے ہی جو دم بھر رکا تو خیال آیا کہ مسز جسی نے گھونگے اور مچھلی دونوں کا اعلان کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ ایک چھوٹا سا تجربہ ہی سہی۔ لہٰذا میں نے باورچی خانے کے دروازے پر جا کے زور سے پکارا "مچھلی" — اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ وہ چاہے کے بعد پھر وہی چٹپٹی بھاپ اندر آنے لگی۔ مگر اب کے مزا دوسرا تھا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں مچھلی کا ایک نفیس قلیہ ہمارے سامنے آ گیا۔

ہم پھر اپنے کام پر ڈٹ گئے۔ یہ پیٹ میں جو جاتے جاتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ اس قصبے کا آدمی کے دماغ پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ لوگ کہا کرتے ہیں کہ تم نے کبھی مچھلی کا قلیہ نہیں کھایا؟ اسے کن کورنگ، ذرا دیکھو تو سہی تمہارے پیٹ میں زندہ مچھلی تو نہیں تیر رہی؟ تمہارا پیٹ اچھا بھر گیا؟"

یہ مسز جسی کا ہی اہم باشی تھی نے تو ہمیں کا گھر سمجھ جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہاں دیگوں میں ہر وقت قلیہ پکا کرتا تھا۔

میں قلیہ۔ دوپہر کو قیلولہ، رات کو آرام۔ یہاں تک کہ آدمی کو شبہ ہونے لگتا تھا کہ میرے بدن میں سے مچھلی کے کانٹے پھوٹ نکلیں گے۔ سرائے کے سامنے کی زمین گھونگوں کے چھلکوں سے پٹی پڑی تھی۔ مسز جیسی مچھلی کی ہڈیوں کی دھنی دار ماہر تھیں اور جھونپڑا سی سے بڑی کھانوں کی جو شارک مچھلی کی کھال سے بنوائی تھی۔ دودھ میں بھی مچھلی کا سا مزا تھا۔ اس کی جیبیری سمجھ ہی میں نہ آئی۔ ایک دن صبح کو ساحل پر مچھیروں کی کشتیوں کے درمیان چہل قدمی کر رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ تیندوا کی بلی گانے کی بچی مچھلیاں کھا رہی ہے۔ اور ریت پر اس طرح چل رہی ہے کہ پیروں میں مچھلی کے کٹے ہوئے سر چپکے ہیں۔

کھانا ختم ہوا تو مسز جیسی نے ہمیں ایک لیمپ دیا اور سونے کے کمرے میں جانے کا قریب ترین راستہ بتایا۔ لیکن جب کوئی کویگ مجھ سے آگے آگے زینے پر چڑھنے لگا تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کے برچھا پکڑ لیا اور کہا کہ میں اپنے گھر میں برچھے جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں بولا "اس میں کیا حرج ہے؟ وہیل کا ہر شکاری اپنا برچھا ساتھ لے کے سوتا ہے۔ آخر کیوں نہ لے جائیں؟" انھوں نے کہا "اس وجہ سے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ جب سے اُس نوجوان اسٹگز کا واقعہ ہوا ہے میں کسی کو اس قسم کے خطرناک ہتھیار رات کے وقت کمرے میں نہیں جانے دیتی۔ وہ کوئی ساڑھے چار برس سمندروں میں گھومتا رہا اور وہاں سے تیل کے تین پیپے لے کے واپس آیا۔ میری سرائے میں پچھلی رات تیسرے کی منزل پر ٹھیرا تھا۔ صبح کو اس کی لاش ملی اور برچھا پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ اس لیے مسٹر کوئی کویگ! انھیں اس کا علم ہو گیا تھا یہ برچھا اپنے پاس رکھے لیتی ہوں، صبح کو دے دوں گی۔ اچھا، وہ کیا اتر صبح کو ناشتے میں گھونگے ہوں یا مچھلی؟"

میں نے کہا "دونوں۔ اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے چھوٹی مچھلیوں کے کباب بھی ہو جائیں۔۔"

جہاز

بستر پر لیٹے لیٹے ہم سوچنے لگے کہ کل کیا کیا کریں گے۔ لیکن اس بات پر مجھے سخت تعجب اور پریشانی ہوئی کہ کوئی کویگ بولا میں نے تو یوجو سے (یہ اس کے چھوٹے سے کالے بت کا نام تھا) مشورہ کر لیا ہے۔ یوجو نے دو تین دفعہ کہا تھا بلکہ بہت اصرار کیا تھا کہ ہم دونوں وہیل کا شکار کھیلنے والے بیڑے میں سے اپنے جہاز کا انتخاب کرنے کے لیے بندرگاہ پر ساتھ ساتھ نہ جائیں بلکہ اس کے بجائے جہاز چھانٹنے کا معاملہ میرے اوپر چھوڑ دیا جائے کیونکہ یوجو ہمارے اوپر بہت مہربان تھا۔ چنانچہ اس نے جہاز چھانٹ بھی رکھا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر تمہیں اکیلا بھیجا گیا تو لامحالہ اسی جہاز کا انتخاب کرے گا۔ حالانکہ ظاہر میں یہ لگے گا جیسے یہ محض اتفاق ہو۔ یوجو کی ہدایت تھی کہ میں اس جہاز میں فوراً بھرتی ہو جاؤں اور فی الحال کوئی کویگ کی فکر نہ کروں۔

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ بہت سے معاملات میں کوئی کویگ کو یوجو کی اصابت رائے اور عجیب غریب پیش گوئیوں پر بڑا بھروسا تھا۔ اس کے دل میں یوجو کا بڑا احترام تھا اور وہ اسے بڑا شریف قسم کا دیوتا سمجھتا تھا جسے اپنے ہمدردانہ ارادوں میں چاہے ہر دفعہ کامیابی حاصل نہ ہو لیکن اس کی نیت ہمیشہ نیک رہتی تھی۔

جہاز چھانٹنے کے معاملے میں کوئی کویگ بلکہ یوجو کی یہ تجویز مجھے ذرا پسند نہ آئی۔ میں تو کوئی کویگ کی دانائی پر تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ وہی بتائے گا ہمارے جان و مال کی سلامتی کس جہاز میں زیادہ رہے گی۔ مگر کوئی کویگ پر میری منت سماجت کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ چنانچہ میں جانے کے لیے تیار ہو گیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کام میں بڑی تیزی اور پھرتی دکھاؤں گا تاکہ یہ قصہ جلدی سے ختم ہو۔ اگلے دن صبح سویرے میں کوئی کویگ کو یوجو کے ساتھ سونے کے چھوٹے سے کمرے میں بند چھوڑ کے روانہ ہو گیا، کیونکہ آج شاید ان دونوں کے یہاں روزے نماز اور توبہ واستغفار کا دن تھا۔ اصل قصہ کیا تھا اس کا مجھے کبھی پتا نہ چل سکا۔ میں نے کوشش تو بہت کی لیکن کوئی کویگ کی مناجاتیں اور اس کے دین کے ۳۹ احکام مجھے کبھی سمجھ نہ آئے۔ تو خیر کوئی کویگ کو روزے میں بیٹھا اور یوجو کو لکڑی کے سامنے آگ تاپتے چھوڑ کر میں بندرگاہ کی طرف چل دیا۔ بہت دیر تک گلیوں میں ادھر ادھر خاک چھانتا پھرا اور لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ آخر پتا چلا کہ اس وقت تین جہاز ایسے ہیں جو تین سال کے لیے سفر پر جا رہے تھے۔ ڈیول ڈیم، ٹٹ بٹ اور پیکوڈ۔ پتا نہیں ڈیول ڈیم کا یہ نام کیسے پڑا۔ ٹٹ بٹ تو خیر ظاہر ہی ہے اور آپ کو یاد ہوگا پیکوڈ ریڈ انڈین لوگوں کے ایک مشہور قبیلے کا نام تھا جو اب میڈیا کے قدیم باشندوں کی طرح نیست و نابود ہو چکا ہے۔ پہلے تو میں نے ڈیول ڈیم کو ہر طرف سے جھانک جھانک کے دیکھا پھر یہیں سے کود کر ٹٹ بٹ کے پاس جا پہنچا۔ سب سے آخر میں پیکوڈ کے اوپر گیا۔ اس کے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور

ذرا فیصلہ کر لیا کہ یہی ہمارے لیے تو یہی جہاز ٹھیک رہے گا۔

آپ نے اپنی عمر میں بہت سے عجیب و غریب جہاز دیکھے ہوں گے۔ بعض چپٹے، بعض پہاڑ کی طرح اونچے، بعض صندوق کی شکل کے اور نہ معلوم کیسے کیسے۔ لیکن یقین جانیے آپ نے ایسا اور جہاز کبھی نہ دیکھا ہوگا جیسا پیکوڈ تھا۔ یہ جہاز ذرا چھوٹا تھا اور پرانے طرز کا۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سوکھا ساکھا بڈھا۔ اس کی ساری عمر جاڑوں کے شدید سمندروں کی تباہی میں گزری تھی طوفانوں کا مقابلہ کرتے کرتے خوب چپٹ ہو چکا تھا اور طرح طرح کے موسم اس پر اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بیچ کے حصّے کا رنگ ان فرانسیسی سپاہیوں کی طرح کا پڑ گیا تھا جو سائبیریا اور مصر دونوں جگہ لڑ چکے ہوں۔ کمانے سے کچھ ایسی بزرگی ٹپکتی تھی جیسے اس کے داڑھی ہو۔ اس کے اصل مستول تو جاپان میں طوفان سے گر کے سمندر میں ڈوب گئے تھے، اب جو مستول تھے وہ وہیں کے ساحل سے کاٹے گئے تھے اور اس طرح سیدھے کھڑے رہتے تھے جیسے کولون کے تین قدیم بادشاہوں کی ریڑھ کی ہڈی۔ عرشے اتنے پرانے، گھسے پٹے اور جھریوں دار جیسے کینٹربری کے گرجا کی وہ جگہ جہاں شہید بیکٹ کا خون گرا تھا اور جسے زائرین آ کے چومتے ہیں۔ جہاز میں خیر یہ قدامت کا رنگ تو تھا ہی لیکن ساتھ ساتھ چند نئی اور عجیب و غریب خصوصیات بھی تھیں جن کا تعلق اس خوفناک پیشے سے تھا جو اس جہاز نے کوئی پچاس سال سے اختیار کر رکھا تھا۔ بڈھا کپتان پیلگ اب تو جہازرانی کا پیشہ چھوڑ چکا تھا اور اس جہاز کے مالکوں میں سے تھا لیکن اپنے ایک اور جہاز کا کپتان بننے سے پہلے وہ کئی سال "پیکوڈ" کا چیف میٹ رہا تھا۔ جہاز ایک تو پہلے ہی بہت بے تکی شکل کا تھا، پیلگ نے اس میں وہ کھلیاں چھیدنے لگا کے بالکل ہی جوتی بنا کے رکھ دیا جس کی نظیر ملنی محال ہے۔ اب تو جہاز کچھ ایسا لگتا تھا جیسے حبش کا وحشی بادشاہ گلے میں ہاتھی دانت کے زیور پہنے کھڑا ہو۔ ہر طرف فتوحات کی نشانیاں ہی نشانیاں نظر آتی تھیں۔ یہ جہاز نہیں اچھا خاصا کوئی آدم خور تھا جس نے اپنے آپ کو دشمنوں کی ہڈیوں سے سجا رکھا تھا۔ اس کے کٹہروں پر اندر کی طرف تختے نہیں لگائے گئے تھے اور کھڑکیوں کے بجائے وہیل مچھلیوں کے لمبے لمبے تیز دانت لگے ہوئے تھے جن میں جہاز کی نسیں یعنی رسّے باندھے جاتے تھے۔ اس طرح یہاں سے وہاں تک لمبا سا جبڑا بن گیا تھا۔ یہ رسّے لکڑی کے حقیر گھرنیوں میں سے نہیں بلکہ سمندری ہاتھی دانت کے ڈھیروں میں سے گزرتی تھیں۔ جہاز کا اگلا حصّہ اتنا قدیم اور قابل احترام تھا کہ گھومنے والا پہیہ اس کے شایانِ شان نہیں سمجھا گیا بلکہ بڑے تختے کے ساتھ ٹنگا ہوا لگا۔ اور یہ تختہ بھی پورا جہاز کے ازلی دشمن یعنی وہیل مچھلی کے نیچے والے لمبے اور پتلے جبڑے سے کاٹ کر لگایا گیا تھا جو تنگ طوفان میں یہ تختہ چلانا وہ ایسا لگتا جیسے کوئی تاتاری اپنے غضب ناک گھوڑے کا جبڑا پکڑ کے روک رہا ہو۔ غرض یہ جہاز نہایت عظیم الشان تھا لیکن معلوم نہیں اس پر افسردگی سی برستی تھی۔ ساری عظیم الشان چیزوں میں یہی افسردگی کا رنگ ہوتا ہے۔

عرشے پر پہنچ کے میں نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی افسر قسم کا آدمی نظر آئے تو اس سے اپنے سفر پر جانے کا معاملہ طے کروں۔ پہلے تو کوئی نظر ہی نہ آیا لیکن بڑے مستول سے ذرا پیچھے کی طرف ایک عجیب قسم کا خیمہ دکھائی دے رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ بندرگاہ پر قیام کے دوران میں اسے عارضی طور پر کھڑا کر لیا ہے۔ یہ کوئی دس فٹ اونچا اور مخروطی شکل کا تھا۔ یہ خیمہ وہیل مچھلی کے جبڑے کی بیچ والی سیاہ اور لچکدار ہڈی کے لمبے لمبے اور زبردست ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ ہڈیوں کے چوڑے سرے

زور سے پیر رکھے تھے اور انہیں چھلکا اوپر سے باندھ دیا تھا۔ پنڈلیوں کے اس گورے کی چوٹی پر بالوں کا ایک گچھا تھا جو ہواؤں میں اس طرح جھوم رہا تھا جیسے کسی ریڈ انڈین کے سر پر بالوں کی گرہ۔ پھر ایک کمرہ اور وہاں تھا جس کا رخ جہاز کے پچھلے حصے کی طرف تھا، لہٰذا جو کوئی اندر بیٹھا ہو اُسے اپنے پیچھے کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔

آخر کار مجھے ایک آدمی ملا جو شکل سے کوئی افسر معلوم ہوتا تھا اور اس عجیب و غریب عمارت میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور جہاز پر کام تھوڑی دیر کے لیے رک چکا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے فرائض سے چھٹکارا پا کے آرام کر رہا تھا۔ یہ شخص شاہ بلوط کی ایک پرانی طرز کی کرسی پر بیٹھا تھا جو اوپر سے نیچے تک بہت ہی انوکھے نقش و نگار سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کی نشست انہیں لچکدار ہڈیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر بنائی گئی تھی جن سے خیمہ تیار ہوا تھا۔

شاید اس معمر آدمی کی شکل میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بوڑھے جہازیوں کی طرح اس کا رنگ بھی گندمی اور جسم گٹھیلا تھا اور اس نے اپنے گرد نیلے رنگ کا لمبا چوڑا کوٹ لپیٹ رکھا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں کے چاروں طرف نہایت باریک جھریوں کا جال تھا جو غالباً اس وجہ سے پیدا ہوئی ہوں گی کہ اس نے عمر بھر طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا اور اس کی نظریں ہوا کے رخ پر لگی رہی تھیں۔ یہ جھریاں اس طرح سے آنکھوں کے چاروں طرف والے عضلات سکڑ جاتے ہیں۔ اگر آدمی چہرے پر غصے کی کیفیت طاری کرنا چاہے تو یہ جھریاں بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

"جہاز کے کپتان آپ ہی ہیں؟" میں نے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"چلو میں ہی سہی، تمہیں کام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں جہاز پہ جانے کو سوچ رہا تھا۔"

"جہاز پہ جانے کو سوچ رہے تھے؟ یہ تو میں نے تمہاری شکل سے پتا چلا لیا کہ تم نین ٹکٹ کے رہنے والے نہیں ہو۔ کبھی شکاری جہاز میں سفر کیا ہے؟"

"جی نہیں، اس میں تو کبھی سفر نہیں کیا۔"

"تو پھر تمہیں وہیل مچھلی کے شکار کا بھی کچھ پتا نہ ہوگا؟ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں، اس میں بھی کورا ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ کام جلد ہی سیکھ لوں گا۔ تجارتی جہازوں میں تو کئی دفعہ سفر کر چکا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ ـــ"

"تجارتی جہاز جائیں بھاڑ میں۔ مجھ سے یہ باتیں مت کرو۔ اپنی ٹانگ دیکھ رہے ہو؟ اگر تم نے میرے سامنے دوبارہ تجارتی جہازوں کا نام لیا تو میں یہ ٹانگ جڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ واللہ کیا بات کی ہے! تجارتی جہاز! معلوم ہوتا ہے تمہیں اس بات پر بڑا ناز ہے کہ تم تجارتی جہازوں میں کام کر چکے ہو۔ لعنت! اب یہ تمہیں کیا شوق چرایا ہے کہ وہیل مچھلی کے شکار پہ جانا چاہتے ہو؟ کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں، ہے نا؟ کہیں سمندر میں ڈاکے تو نہیں مارتے پھرتے تھے؟ اپنے کپتان کی جیب تو نہیں کاٹ کے بھاگے؟ کہیں سمندر میں پہنچ کر اپنے افسروں کو قتل کرنے کا ارادہ تو نہیں؟"

میں نے یقین دلایا کہ ان سب چیزوں سے میرا دامن پاک ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان نیم ظریفانہ جملوں کے پردے میں اس شخص کا تعصب اور تنگ نظری بول رہی ہے۔ یہ بڈھا جہازی ایک نانٹکٹ کا رہنے والا ہے۔ دوسرے اس کا تعلق کوئیکر فرقے سے ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس علاقے کے باشندے نہ ہوں انھیں وہ شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔

"لیکن تمھیں وہیل کے شکار پر جانے کا خیال کیسے آیا؟ پہلے یہ بات بتاؤ، پھر سوچوں گا کہ تمھیں بھرتی کروں یا نہ کروں۔"

"جی اور کوئی بات نہیں، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہیل کا شکار کیا ہے۔ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ ذرا دنیا دیکھوں۔"

"یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ وہیل کا شکار کیا ہے، ویسے ابھی کپتان اہاب کی شکل بھی دیکھی ہے؟"

"جی کپتان اہاب کون ہیں؟"

"خوب، خوب، میں پہلے ہی تاڑ گیا تھا۔ کپتان اہاب اس جہاز کے کپتان ہیں۔"

"اوہ، تو پھر مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں سمجھا کہ خود کپتان صاحب سے باتیں کر رہا ہوں۔"

"تم کپتان پیلگ سے باتیں کر رہے ہو۔ اب مجھے یہ جوان کہو کہ میں کون ہوں؟ سفر سے پہلے جہاز کی مرمت، ساری ضروری چیزوں کا انتظام اور ملاحوں کی بھرتی، یہ کام کپتان بلڈڈ کے اور میرے سپرد ہے۔ ہم دونوں جہاز کے مالکوں میں سے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایجنٹ بھی ہیں۔ ہاں، تو تم کہہ رہے تھے کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہیل کا شکار کیسا ہوتا ہے۔ اچھا تو سنو، اگر تم بھرتی ہو گئے تو جھک نہیں ہو گے۔ میں کچھ ایسا انتظام کر سکتا ہوں کہ تمھیں پتہ چل جائے کہ وہیل کیا چیز ہے۔ جوان، ذرا کپتان اہاب کو جا کے دیکھو، پھر تمھیں معلوم ہو گا کہ ان کے بس ایک ٹانگ ہے۔"

"جی، کیا مطلب؟ کیا دوسری ٹانگ وہیل کی وجہ سے ضائع ہوئی؟"

"وہیل کی وجہ سے ضائع ہوئی! جوان، ذرا قریب آ کے سنو، وہیل نے اس کی ٹانگ کو نگل لیا، دانتوں سے کرکرا چبا ڈالا اور وہیل بھی کیسی۔ پہاڑ دیو ہیکل جیسی! ہاں!"

میں اس کی شدت بیان دیکھ کر گھبرا سا گیا، لیکن اس کے آخری الفاظ میں کچھ ایسی کسک تھی کہ دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ خیر، میں نے لہجے میں سکون پیدا کرتے ہوئے کہا:

"آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ بالکل درست ہے، لیکن بھلا میں کس طرح سمجھ سکتا تھا کہ اس وہیل نے یہ حرکت کی ہے۔ وہ بڑی خونخوار ہو گی۔ البتہ حادثے کی نوعیت سے تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا۔"

"ادھر دیکھو جوان۔ تمھارے پھیپھڑے کچھ ملائم سے ہیں۔ بتاؤ، تمھاری گفتگو میں وہ شائستگی کی ہی بات نہیں۔ کبھی سمندر کا سفر کیا ہے تم نے؟ سچ سچ کہہ دو۔"

میں نے کہا: جی، شاید میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں چار دفعہ تجارتی جہاز ———

"بس بس، یہ کیا بکواس بند کرو۔ وہ بات بھول گئے جو میں نے تجارتی جہازوں کے بارے میں کہی تھی؟ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ مجھے ان کا ذکر گوارا نہیں۔ خیر، ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ میری باتوں سے تمھیں کچھ اندازہ تو ہو گیا

ہو گا کہ وہیل کا شکار کیا چیز ہے۔ کیا تم اب بھی اس کی طرف مائل ہو؟"

"جی ہاں۔"

"بہت ٹھیک۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم زندہ وہیل کے منہ میں برچھا اتارنے کے بعد خود اس کے پیچھے کود سکتے ہو؟ جلدی سے جواب دو۔"

"جی ہاں۔ اگر ایسی ہی ضرورت آ پڑی تو کود جاؤں گا یعنی اگر اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو۔ میرا خیال ہے کہ ایسی بات روز روز تو پیش آتی نہیں۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا ایک تو تم اس لیے جانا چاہتے ہو کہ خود تجربہ کر کے دیکھو وہیل کا شکار کیا ہوتا ہے۔ دوسرے تم دنیا بھی دیکھنی چاہتے ہو یہی کہا تھا تم نے؟ میں نے کچھ ایسا ہی سنا تھا۔ اچھا تو اب ذرا آگے بڑھ کر جہاز کے اوپر سے جھانک کے دیکھو پھر میرے پاس آ کے بتاؤ کہ وہاں کیا نظر آیا۔"

یہ عجیب و غریب حکم سن کر پہلے تو میں چکر میں پڑ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اپنے دل لگی سمجھوں یا سنجیدہ بات۔ لیکن کپتان پیلیگ نے آنکھوں کے آس پاس والی ساری جھریاں سکیڑ کے ایسی چھل دی کہ اس کی بات ماننی ہی پڑی۔

میں نے آگے جا کر کنارے کے اوپر سے جھانکا تو دیکھا کہ جہاز جوار بھاٹے کی لہروں پر جھول رہا ہے اور اس کا رخ کھلے ہوئے سمندر کی طرف ہے۔ جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا تنوع نام کو نہیں، ہر طرف وہی یک رنگی اور یکسانی۔ اس منظر کو دیکھ کے وحشت ہوتی تھی۔

میں واپس آیا تو پیلیگ نے کہا۔ "کہو، کیا خبر لائے؟ کیا دکھائی دیا؟"

میں نے جواب دیا — "کچھ بھی تو نہیں۔ بس پانی ہی پانی ہے۔ لیکن نظر بہت دور تک جاتی ہے اور شاید طوفان بھی آنے والا ہے۔"

"اب کہو دنیا دیکھنے کے متعلق اب کیا رائے ہے؟ کیپ ہورن کے دوسری طرف جا کے یہی منظر بھی اور دیکھنا چاہتے ہو؟ جہاں کھڑے ہو کیا وہاں سے دنیا دکھائی نہیں دیتی؟"

میں کچھ پٹ سا گیا لیکن مجھے تو وہیل کے شکار پر جانا ضرور تھا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جا کے رہوں گا۔ پیکوڈ کون سا برا جہاز تھا بلکہ میرے خیال میں تو سب سے اچھا تھا۔ میں نے یہ ساری باتیں پیلیگ کے سامنے دہرا دیں۔ مجھے اتنا مستعد پا کر وہ بھی مجھے بھرتی کرنے کو راضی ہو گیا۔

"تو پھر تم معاہدے پر دستخط کیوں نہ کر دو؟ چلو آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ مجھے پیچھے ایک کمرے میں لے گیا۔

وہاں کھڑکی کی مسہری پہ ایک آدمی بیٹھا تھا جو مجھے بہت ہی انوکھا اور عجیب و غریب معلوم ہوا۔ یہ شخص کپتان بلڈیڈ نکلا۔ یہ اور کپتان پیلیگ اس جہاز کے سب سے بڑے حصہ داروں میں سے تھے۔ جیسا ان بندرگاہوں کا دستور ہے، باقی حصے بہت سے وظیفہ پانے والے لوگوں کے پاس تھے۔ یعنی بیوائیں، یتیم بچے یا وارث لڑکے جن کی نگرانی حکومت کرتی تھی۔ ان میں سے

ہر ایک حصہ اتنا تھا جتنی جہاز کے ایک تختے یا دو چار کیلوں کی قیمت۔ بس اسی طرح آپ لوگ اپنا پیسہ سرکاری قرضوں میں لگا کر تھوڑا تھوڑا سود
وصول کرتے ہیں، اسی طرح نین ٹکٹ کے باشندے اپنا روپیہ وہیل کے شکار کو جانے والے جہازوں میں لگاتے ہیں۔

پیلگ بلکہ نین ٹکٹ کے بہت سے باشندوں کی طرح بلڈیڈ بھی کوئیکر تھا۔ اس جزیرے میں پہلے پہل اسی فرقے
کے لوگ آکے بسے تھے۔ آج بھی یہاں والوں میں اس فرقے کی خصوصیات بڑی حد تک باقی ہیں، البتہ ان چیزوں میں بڑے
بے ڈھنگے طریقے سے کچھ ایسے عناصر گھس بیٹھ گئے ہیں جو بالکل اجنبی ہیں اور جن کا اس فرقے سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ انھیں
کوئیکر لوگوں میں سے بعض بڑے خونخوار جہازی اور وہیل مچھلی کے شکاری نکلے ہیں۔ یہ لوگ کوئیکر تو ضرور ہیں، لیکن طبیعت
جنگ جویانہ پائی ہے۔ دلاوری اُن پر ختم ہے۔

چنانچہ یہاں ایسے آدمیوں کی کئی مثالیں موجود ہیں جن کا نام اس جزیرے کے عام رواج کے مطابق انجیل مقدس میں
سے نکال کے رکھا گیا، جنھوں نے بچپن میں اپنے فرقے کی بول چال اور قدامت پسندانہ زبان بولنی سیکھی مگر جیسے جیسے بڑے ہوئے دلاوری اور جرأت کی
کی زندگی اختیار کی، اپنے فرقے کی خصوصیات تو ویسی کی ویسی ہی برقرار رکھیں لیکن ساتھ ساتھ کرۂ ارض کی اُن بلندیوں کا مظاہرہ
کیا جو اسکینڈے نیویا کے کسی سمندری شہزادے یا روم کے کسی شاعر مزاج سپہ سالار کے شایانِ شان تھیں اور جب یہ چیزیں
کسی ایسے آدمی کے اندر آکے جمع ہو جائیں جسے قدرت نے غیر معمولی قوت بخشی ہو، جس نے بڑا دماغ اور بڑا دل پایا ہو، جسے
دور دراز سمندروں میں اُن ستاروں کے نیچے جو یہاں شمال کی طرف نظر ہی نہیں آتے، رات رات بھر جاگ کے کھل کے اور
خاموشی میں پروے ہوئے ریتے روایت سے ہٹ کے آزادی کے ساتھ سوچنا آگیا ہو، جس نے فطرت کے نرم شیریں یا
وحشیانہ تاثرات خود اسی کے کنوارے سینے سے حاصل کیے ہوں، جسے فطرت نے اپنا محرم راز بنا لیا ہو، جس نے کچھ تو
اس طرح اور کچھ بعض اتفاقات کی مدد سے ایک نرم و نازک، جری اور بلند زبان بولنی سیکھ لی ہو۔ تو ایسا شخص پورے
ملک میں ایک ہی قسم کا بس ایک ہوتا ہے۔ ایسا عظیم انسان آدمی جسے قدرت نے کسی شاندار المیے کا ہیرو بننے کے لیے تیار
کیا ہو۔ اگر اس شخص کے مزاج میں پیدائشی طور پر یا دوسرے حالات کے باعث بعض شدید اور بظاہر تیز ارادی قسم کے
مریضانہ عناصر موجود ہوں تو ڈراماتی نقطۂ نظر سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہ پڑے گا کیونکہ جن لوگوں میں ایسے
ہیرو کی سی عظمت ہوتی ہے وہ انھیں مریضانہ عناصر کے ذریعے ہی یہ مقام حاصل کرتے ہیں۔ اے حوصلہ مند نوجوانو! تمھیں
معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی عظمت دراصل بیماری ہے۔ خیر ابھی ہمیں اس طرح کے انسان سے واسطہ نہیں بلکہ ایک اور
ہی قسم کے آدمی سے ہے، لیکن اس شخص میں بھی چند باتیں انوکھی ہیں جو کچھ تو کوئیکر فرقے کے ایک دوسرے پہلو سے پیدا
ہوتی ہیں اور کچھ انفرادی حالات کا نتیجہ ہیں۔

کپتان پیلگ کی طرح کپتان بلڈیڈ بھی خاصا امیر آدمی تھا اور وہیل کے شکار کا پیشہ چھوڑ چکا تھا۔ مگر یہ دونوں ایک
دوسرے سے کچھ مختلف بھی تھے۔ جو چیزیں سنجیدہ کہلاتی ہیں انھیں کپتان پیلگ ذرا خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ تضیع اوقات
سمجھتا تھا۔ اس کے برخلاف کپتان بلڈیڈ کی تعلیم و تربیت شروع ہی سے اپنے سخت گیر فرقے کے اصولوں کے مطابق ہوئی

تھی۔ اس کے بعد اس کی ساری عمر سمندر میں گزری۔ لیکن کیپ ہورن کے اس پار جزیروں کے حسین اور برہنہ باشندوں کو دیکھ کر بھی پیورٹن کو بگاڑنے سے بس یہ ہوا کہ اس کے کپڑوں کی ایک شکن تک ادھر سے ادھر نہ ہوئی۔ وہ ذرا بھی تغیر پذیر نہ تھا، لیکن اس کے باوجود بیچارہ معقول انسان اس یک رنگی سے خالی تھا جو عام آدمیوں میں ہوتی ہے۔ اپنے اخلاقی اصولوں کے مطابق اسے مسلح حملہ آوروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے انکار تھا لیکن بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل پر اس نے عمر بھر بار بار چڑھائی کی تھی۔ انسانوں کا خون بہانا اس کے مذہب میں کفر تھا لیکن اپنا لمبا چوڑا کوٹ پہن کر اس نے وہیل مچھلیوں کے خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ خدا جانے یہ دیندار آدمی اب تمام زندگی کی پرچھائیں میں ان باتوں کو یاد کر کے ان کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کرتا ہوگا۔ بہر حال بلڈیڈ کو اس بات کی کوئی ایسی فکر معلوم نہ ہوتی تھی اور غالباً وقت ہوئی وہ اس حقیقت اور اس منطقی نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ آدمی کا مذہب ایک چیز ہے اور عملی دنیا دوسری چیز۔ تجارتی کمپنیوں کی طرح یہ دنیا بھی منافع تقسیم کرتی ہے۔ انگوٹھی بلڈیڈ پھٹے پرانے کپڑے پہننے والا مزدور تھا، ترقی کر کے پہلے اپنا اور جوڑی جوڑی واسکٹ پہننے لگا۔ پھر بتدریج ملاح، چیف میٹ، کپتان اور آخر کار جہاز کا مالک بن گیا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں ساٹھ سال کی عمر میں یہ مستعد آدمی کام کر کے وہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنے کمائے ہوئے پیسے سے کمائی ہوئی دولت کے منافع پر سکون کے ساتھ دن گزارنے لگا۔

لیکن ایک بات ضرور افسوسناک ہے۔ بلڈیڈ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑا خسیس ہے اور اپنی جہاز رانی کے زمانے میں نہایت سخت اور جابر آقا تھا۔ یہ کہانی تو ذرا عجیب سی ہے مگر نینٹکٹ میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ کیٹ گٹ والے جہاز کا کپتان تھا تو اس کے ملاح گھر واپس آتے آتے اپنے خستہ حال اور تھکن سے چور ہو جاتے کہ انہیں اسپتال پہنچایا پڑتا ___ دیندار آدمی اور خصوصاً کوئیکر ہوتے ہوئے بھی وہ انتہائی سنگ دل تھا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ لیکن سنا ہے وہ اپنے نوکروں کو گالیاں بھی نہ دیتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان سے جان توڑ محنت کراتا تھا۔ ان دنوں بلڈیڈ چیف میٹ تھا تو عام یہ رہتا تھا کہ اس کی میلی میلی آنکھوں نے کسی کی طرف غور سے دیکھا اور اس بیچارے کے ہوش و حواس غائب ہوئے۔ پھر وہ شخص کام نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تھوڑا بہت اصلاح اٹھا کے اندھا دھند کوئی نہ کوئی کام شروع کر دیتا تھا اور وہ خود سر سے پیر تک اپنے اذیت پرستانہ کردار کا جیتا جاگتا مظہر تھا۔ اس کے لمبے اور دبلے پتلے جسم پر ذرا سا گوشت بھی فالتو نہ تھا۔ داڑھی تک کے معاملے میں اس نے کفایت شعاری سے کام لیا تھا۔ جس طرح اس کی ٹوپی کے چوڑے کنارے گھسے گھسے بالکل ہی گھس کر رہ گئے تھے اسی طرح اس کی ٹھوڑی پر ایک نرم بھوری جھنگی ہوئی تھی۔

جب میں کپتان پیلگ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو یہ تھا وہ شخص جو مجھے سامنے پر بیٹھا نظر آیا۔ دونوں عرشوں کے درمیان بہت ہی تھوڑی جگہ خالی تھی اور وہاں بڈھا بلڈیڈ تیر کی طرح سیدھا بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح بیٹھتا تھا جھکتا کبھی نہ تھا۔ وہ اس لئے کہ کوٹ کے دامن خراب نہ ہوں۔ چوڑے کنارے والی ٹوپی پاس پڑی تھی۔ ٹانگیں صلیب کی شکل بنا رہی تھیں، پہلے سے کوٹ کے بٹن ٹھوڑی تک لگے ہوئے تھے اور وہ ناک پر عینک چڑھائے ایک بہت بڑی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔

کپتان پیلیگ نے چونک کر کہا "بلڈیڈ! بھوت ہی کام پر لگے ہوئے ہو، بلڈیڈ! مجھے ابھی طرح معلوم ہے پچھلے بیس سال سے تم ایسی قصے پڑھتے جا رہے ہو۔ مگر کہاں تک پہنچے؟"

شاید وہ اپنے پرانے ساتھی کی ان کافرانہ باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بلڈیڈ نے اس بے ہودہ بات کا کوئی خیال نہ کیا اور چپ چاپ سر اٹھایا اور مجھے دکھائی دیا۔ اب اس نے پیلیگ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

پیلیگ نے کہا "یہ جہاز میں بھرتی ہونا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔"

بلڈیڈ نے میری طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "بھرتی ہونا چاہتے ہو؟"

وہ انداز ہر دست گیر تھا کہ میں نے بھی دستوری طور پر اسی لہجے میں جواب دیا "جی ہاں۔"

پیلیگ بولا "بلڈیڈ! ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہیں۔" بلڈیڈ نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا، اور پھر جھک کر اپنی کتاب پڑھنے اور بڑبڑانے لگا۔

میں نے ایسا عجیب و غریب بڈھا کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت اس وجہ سے ہوئی کہ اس کا پرانا ساتھی اور دوست پیلیگ تو بالکل ہی بھڑ بھڑیا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن میں نے کچھ کہا نہیں، بس غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب پیلیگ نے ایک صندوق کھولا، اس میں سے جہاز کے کاغذات نکالے اور قلم دوات مجھے دے کر ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا اب تو مجھے دل میں طے کر لینا چاہیے کہ میں اس جہاز میں کن شرائط پر بھرتی ہوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہیل مچھلی کے شکار میں اجرت نہیں ملا کرتی، بلکہ کپتان سمیت سارے جہازیوں کو منافع میں سے کچھ حصہ ملتا ہے اور ہر آدمی کا حصہ اس کے فرائض کی اہمیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں وہیل مچھلی کے شکار کے معاملے میں اناڑی ہوں، اس لیے میرا حصہ کچھ زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن میں بحری سفر کا عادی ہو چکا تھا۔ جہاز کا رخ بدلنا، رسیاں کھینچنا، غرض اس قسم کے سارے کام مجھے آتے تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر اندازہ یہی تھا کہ جو کچھ ہو اس حساب سے تو مجھے کم سے کم دو سو پچہترواں حصہ ملنا چاہیے۔ یعنی اس سفر کے منافع کا دو سو پچہترواں حصہ جو آخر میں چاہے کتنا ہی پڑے۔ حالانکہ یہ رقم کچھ ایسی زیادہ نہ ہوتی، لیکن کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی تھا۔ اگر یہ سفر کامیاب رہے تو جو کپڑے جہاز میں گھسیں ان کے دام تو وصول ہو ہی سکتے تھے۔ پھر تین سال کے کھانے پینے کا خرچ رہا وہ الگ، اس کا تو مجھے ایک پیسہ بھی نہ دینا تھا۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو امیر بننے کا کوئی اچھا طریقہ نہیں اور واقعی یہ بھی سچی بات ہے۔ لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں جو امیر بننے کی فکر کبھی نہیں کرتے۔ مجھے تو بس روٹی اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے پھر تو دنیا میں یہی میں کھاتا ہے۔ یعنی جس طرح میں آج کل اس ٹوٹی پھوٹی سرائے میں پڑا ہوں، خیر ان باتوں کو چھوڑیے، میں نے یہ سوچا کہ دو سو پچہترواں حصہ نہایت ہی مناسب ہے۔ لیکن اگر مجھے دو سو واں حصہ پیش کیا جاتا تو بھی مجھے تعجب نہ ہوتا کیونکہ میرے دونوں خدا کے فضل سے میری کاٹھی مضبوط اور کندھے چوڑے تھے۔

لیکن ایک چیز تھی جس نے مجھے گڑبڑا دیا اور میں سوچنے لگا کہ دیکھیے میرا حصہ ٹھیک سے مقرر کیا بھی جاتا ہے یا نہیں۔

اور دوسری چیز یہ تھی۔ ساحل پر میں نے کپتان پیلگ اور اس کے پُراسرار بڈھے دوست بلڈیڈ دونوں کا ذکر سنا تھا۔ پیکوڈ کے بڑے حصے دار یہی دونوں تھے۔ چھوٹے چھوٹے اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے حصے داروں نے جہاز کا سارا انتظام انھیں کے سپرد کر دیا تھا۔ اب مجھے فکر یہ تھی کہ خدا جانے یہ کنجوس بڈھا بھرتی ہونے والے جہازیوں کے حق میں کیسی کیسی باتیں کرے گا خصوصاً اس وجہ سے کہ میں نے اسے جہاز کے کمرے میں اطمینان کے ساتھ انجیل پڑھتے پایا تھا جیسے اپنے گھر بیٹھا ہو۔ پیلگ تو اپنے جہازی چاقو سے قلم بنانے کی فضول کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ادھر مجھے یہ تعجب ہو رہا تھا کہ اس کاروائی سے آخر بلڈیڈ کا بھی تو مفاد وابستہ ہے۔ لیکن وہ ہماری طرف دیکھ تک نہیں رہا۔ بس بڑبڑ بڑبڑا اپنی کتاب پڑھے جا رہا ہے۔ "زمین/دنیا میں اپنے لیے خزانے جمع نہ کرو۔ انھیں تو زنگ ——"

"کپتان بلڈیڈ،" پیلگ بیچ میں بول پڑا، "تمھاری کیا رائے ہے؟ انھیں کون سا حصہ دیا جائے؟"

"جو تم مناسب سمجھو۔" قبر میں سے جواب ملا۔ "سات سو ستترواں حصہ زیادہ تو نہ رہے گا؟" "انھیں تو زنگ اور کیڑے لگ جائیں گے۔ تمھارا حصہ ——"

حصہ! بہت خوب! میں نے دل میں کہا۔ کیا حصہ دیا ہے! سات سو ستترواں! اچھا بڈھے بلڈیڈ! تو نے دل میں ٹھان لیا ہے کہ اور لوگ چاہے کچھ ہی کریں، لیکن میں اس دنیا میں خزانے جمع نہ کر سکوں جہاں زنگ اور کیڑے انھیں کھا جاتے ہیں۔ بڑا ہی عجیب حصہ ملا تھا مجھے۔ ویسے یہ عدد اتنا لمبا چوڑا ہے کہ خشکی پر رہنے والے تو پہلی نظر میں دھوکا کھا جائیں۔ لیکن ذرا غور کرنے سے پتا چلے گا کہ اگرچہ سات سو ستتر کا عدد خاصا رعب دار ہے، مگر ایک پیسے کا سات سو ستترواں حصہ نکالیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سات سو ستتر اشرفیوں سے کہیں کم ہوتا ہے اور یہی بات میں نے اس وقت سوچی۔

"لعنت ہو تم پر، بلڈیڈ،" پیلگ نے چیخ کر کہا، "تم تو اس بچارے لڑکے کی جیب کاٹنا چاہتے ہو! اسے تو کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔"

"سات سو ستترواں،" بلڈیڈ نے نظریں اٹھائے بغیر یہی بات دوبارہ کہی اور پھر بڑبڑانے لگا۔ "کیونکہ تمھارا دل بھی وہیں ہو گا جہاں تمھارا خزانہ ہے۔"

"میں انھیں تین سو واں حصہ دینے والا ہوں،" پیلگ نے کہا۔ "سنتے ہو، بلڈیڈ! میں نے کہا تین سو واں حصہ۔"

بلڈیڈ نے کتاب رکھ دی اور بڑے گمبھیر ہو کے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "کپتان پیلگ، تم بڑے فیاض واقع ہوئے ہو۔ لیکن تمھیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ جہاز کے دوسرے مالکوں کی طرف سے تم پر کیا ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ان میں بہت سی بیوائیں ہیں، بہت سے یتیم بچے ہیں۔ اگر ہم نے اس لڑکے کی محنت کا معاوضہ ضرورت سے زیادہ کر دیا تو ہم گویا ان بیواؤں اور یتیموں کے منہ سے روٹی چھینیں گے۔ کپتان پیلگ، بس سات سو ستترواں حصہ۔"

"بلڈیڈ، تم کیسے آدمی ہو،" پیلگ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں کھٹ پٹ ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بولا۔ "لعنت ہو تم پر کپتان بلڈیڈ۔ اگر میں نے ان معاملات میں تمھارے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو آج سے بہت پہلے

میرے کندھوں پر گناہوں کی اتنی بھاری گٹھڑی دھری ہوئی جو میرے جیسے جہاز کو بھی ڈبو دیتی۔

بلڈیڈ نے بڑی استقامت کے ساتھ کہا — "کپتان پیلنگ، تمھارے گناہوں کی گٹھڑی ایک تنکے کی ہے یا دس ٹن کی، اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ لیکن تم نے اپنے گناہوں سے آج تک توبہ نہیں کی۔ اس لیے تمھارے ضمیر کی حالت تو شاید ایسی ہو چکی ہے جیسے جہاز میں سوراخ ہو جائے اور اندر پانی بھر جائے۔ یہ ایک نہ ایک دن تمھیں لے ڈوبے گا اور سیدھا جہنم میں پہنچائے گا۔"

"جہنم میں، جہنم میں؟ تمھیں معلوم ہے تم میری توہین کر رہے ہو۔ اتنی سخت بات کوئی کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ اس سے بڑھ کے اور بدتمیزی کیا ہو سکتی ہے کہ کسی انسان سے کہا جائے تم جہنم میں جاؤ گے۔ تمھارا بیڑا غرق ہو، میرا اول دل کے روگی۔ بلڈیڈ، ذرا ادھر تو مڑ کے دیکھو، مجھے جانتے ہو؟ ہاں، میں پورا اکڑا باز اور سینکڑوں میت کو چبا جاتا ہوں۔ چلو نکلو یہاں سے۔ کمینے، ریاکار، بدمعاش، بھگوڑے، ناک کی سیدھ نکل جاؤ!"

"ڈو ڈو کرتے ہوئے وہ ایک دم سے بلڈیڈ پر جھپٹ پڑا لیکن اس نے بھی کمال پھرتی دکھائی۔ تڑپ کے اس تیزی سے جھکا کہ اس کی لات سے صاف بچ نکلا۔

جہاز کے ان دو خاص الخاص اور ذمہ دار مالکوں کی یہ خوفناک جھپٹ دیکھ کر میں تو سہم گیا اور سوچنے لگا کہ جس جہاز کے مالک اور افسر ایسے بے ڈھنگے لوگ ہوں اس میں سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا تاکہ بلڈیڈ نکل جائے۔ میرا خیال تھا کہ پیلنگ کا غیظ و غضب دیکھ کر وہ تو کھسک جانے کو بیتاب ہو گا، لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ پھر سے اپنی جگہ پہ جا بیٹھا، بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا تو یہاں سے ہٹنے کا ارادہ ہی نہیں۔ غالباً وہ بے دین پیلنگ اور اس کے طور طریقوں کا عادی ہو چکا تھا۔ رہا پیلنگ، تو جی کی بھڑاس نکل جانے کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا گویا اسے کبھی غصہ آیا ہی نہ تھا۔ وہ بھی اللہ میاں کی گائے بن کے بیٹھ گیا۔ بس کبھی کبھی ایک جھرجھری سی آ جاتی تھی جیسے ابھی تھوڑا سا ہیجان باقی ہو۔ آخر وہ ہنس کے بولا — "آؤ، پھر طوفان آیا تھا، نکل گیا۔ بلڈیڈ، تم ایک زمانے میں ہر بچے پر دھار رکھنے کے ماہر تھے۔ ذرا ایک قلم تو بناؤ، میرا جاکر گند ہو رہا ہے۔ بہت ٹھیک، بڑے کام کے آدمی ہو، شکریہ، بلڈیڈ۔ اچھا جوان، کیا نام ہے تمھارا؟ اسمٰعیل ہی بتایا تھا نا تم نے؟ چلو اسمٰعیل، تین سو جمع رہا۔"

میں نے کہا — "کپتان پیلنگ، میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی ہے۔ وہ بھی بھرتی ہونا چاہتا ہے۔ اسے کل آپ کے پاس لے آؤں؟"

پیلنگ بولا — "ضرور، ساتھ لیتے آنا، اسے بھی دیکھ لیں گے۔"

"وہ کون سا حصہ مانگے گا؟" بلڈیڈ نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر روکھی آواز میں کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو، بلڈیڈ۔" پیلنگ نے کہا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "اس نے کبھی وہیل کا شکار کھیلا ہے؟"

"کپتان پیلنگ، اس نے تو اتنی وہیل مچھلیاں ماری ہیں کہ مجھے تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں۔"

"اچھا اُسے لے آنا۔"

کاغذات پر دستخط کر کے میں وہاں سے چل پڑا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ آج صبح میں نے ایک معرکہ مار لیا اور پیکوڈ وہی جہاز ہے جس میں یوجو مجھے اور کوئی کویگ کو بھیجنا چاہتا ہے۔

لیکن میں کچھ ایسی دُور نہ گیا تھا کہ مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ جس کپتان کے ساتھ سفر پہ جا رہا ہوں اُسے تو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ ویسے عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ وہیل کے شکار کو جانے والا جہاز مرمّت وغیرہ کے بعد پوری طرح تیار ہو لیتا ہے اور جہازی سوار ہو جاتے ہیں، پھر کہیں کپتان نظر آتا ہے اور جہاز میں پہنچ کر کمان سنبھالتا ہے۔ کیونکہ یہ سفر عام طور سے طول طویل ہوتے ہیں اور لوگوں کو ساحل پر اپنے گھر ٹھہرنے کی مدّت اتنی کم ملتی ہے کہ اگر کپتان کے بیوی بچے ہوں یا اسی قسم کا اور کوئی ضروری کام ہو تو وہ بندرگاہ میں کھڑے جہاز کی فکر میں نہیں پڑتا بلکہ جب تک روانگی کا وقت نہ آئے اسے مالکوں کی تحویل میں چھوڑ دیتا ہے۔ بہرحال یہ اچھا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنے سے پہلے کپتان کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ میں نے کپتان پیلیگ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کپتان اہاب کہاں ملیں گے؟

"تمھیں کپتان اہاب سے کیا لینا ہے؟ تم بھرتی تو ہو گئے۔ اب اور کیا چاہیے؟"

"جی ہاں، لیکن سوچتا ہوں کہ اُن سے مل ہی لوں۔"

"لیکن تم فی الحال تو اُن سے مل نہیں سکتے۔ پتا نہیں قصّہ کیا ہے، لیکن وہ گھر میں بند پڑے رہتے ہیں، جیسے بیمار ہوں، لیکن بیمار لگتے بھی نہیں۔ واقعی وہ بیمار نہیں ہیں، مگر ٹھیک بھی نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے بھی کم ملتے ہیں۔ نوجوان! وہ ہمیشہ تو مجھ سے بھی نہیں ملتے۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ تم سے بھی نہیں ملیں گے۔ کپتان اہاب عجیب سے آدمی ہیں۔ کم سے کم بعض لوگوں کو عجیب سے لگتے ہیں۔ لیکن ہیں بڑے اچھے۔ تمھیں بہت پسند آئیں گے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کپتان اہاب بڑے شاندار آدمی ہیں، کالج بھی اور دوسری جگہ بھی۔ وہ بولتے بہت کم ہیں، مگر جب بولتے ہیں تو آدمی کو ان کی بات سننی پڑتی ہے۔ ذرا غور سے سُننا، میں پہلے سے بتائے دیتا ہوں۔ اہاب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کالجوں میں بھی تعلیم پائی ہے اور آدم خوروں میں بھی رہے ہیں۔ سمندر کی عجیب کیا ل... انھیں تو بڑے بڑے عجائبات سے سابقہ پڑا ہے۔ ان کا آہنی برچھا وہیل مچھلیوں سے بھی زبردست اور انوکھے دشمنوں کو چھید چکا ہے۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں کہ اُن کا برچھا کیا چیز ہے، وہ تیزی اور کاٹ آج تک کسی اور برچھے میں نہیں دیکھی۔ وہ نہ تو کپتان بلڈڈ ہیں، نہ کپتان پیلیگ۔ ان کا نام اہاب ہے اہاب۔ تمھیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ پرانے زمانے میں اہاب ایک بادشاہ تھا!"

"ہاں تھا تو، لیکن بہت ہی بدمعاش قسم کا۔ جب یہ ظالم بادشاہ قتل ہوا ہے تو اُس کا خون کتّوں نے چاٹا تھا۔ ہے نا یہی بات؟"

"ادھر آؤ۔ ذرا میرے پاس آؤ۔" پیلیگ نے کچھ ایسی تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ میں چونک سا گیا۔ "دیکھو، جوان، جہاز میں آگے یہ بات بھول کر بھی منہ سے نہ نکالنا۔ بلکہ اور کہیں بھی نہ کہنا۔ کپتان اہاب نے اپنا نام خود تھوڑے ہی رکھا تھا۔ تو

اُن کی بیوہ اور عیلی ماں کی حماقت اور جہالت تھی۔ وہ تو سال بھر کے ہی تھے کہ ماں اس دُنیا سے سدھار گئیں۔ لیکن گئے تیلر میں
فن لنگ نامی ریڈ انڈین بڑھیا کہا کرتی تھی کہ یہ نام ایسا رنگ ضرور دکھا کے رہے گا۔ شاید بعض اوقات تم بھی تم سے یہی کہیں گے
لیکن میں تمہیں آگاہ کیے دیتا ہوں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں کپتان اہاب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں دنوں میں میٹ تھا میں نے
اُن کے ساتھ سفر کیا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔ بلڈیڈ کی طرح دیندار اور نیک تو نہیں ہیں۔ گالیاں بہت بکتے
ہیں۔ مگر ہیں اچھے آدمی۔ بس کچھ میری طرح کے ہیں۔ البتہ اُن میں مجھ سے کہیں زیادہ خوبیاں ہیں۔ ہاں میں جانتا ہوں ہنسنے ہنسانے
کی عادت تو اُن میں کبھی نہ تھی۔ پھر یہ بھی جانتا ہوں کہ جب ہم سفر سے واپس آ رہے تھے تو کچھ دن کے لیے اُن کا دماغ چل سا گیا تھا
لیکن اُن کی زخمی ٹانگ میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے اُن کی یہ حالت ہوئی۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم
ہے کہ جب سے پچھلے سفر میں اُس ملعون وہیل نے اُن کی ٹانگ چبائی ہے وہ گُم صُم سے رہتے ہیں۔ اُن کے مزاج کا
عجب حال ہو گیا ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ بعض وقت تو بالکل وحشی بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ دو چار دن کی بات ہے
پھر ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور جوان، میں تمہیں ہاں تو ہے یاد رکھنے کی بات بتاتا ہوں۔ خوش مزاج مگر دل کے بُرے کپتان کے
ساتھ جانے کی بہ نسبت بد مزاج لیکن نیک دل کپتان کے ساتھ جانا اچھا۔ اچھا، خدا حافظ۔ دیکھو کپتان اہاب کو محض اتنی سی
بات پر بُرا نہ سمجھنے لگنا کہ وہ اتفاق سے بدنام ہو گئے ہیں۔ پھر وہ بیوی بچے والے آدمی ہیں۔ اُن کی شادی کو دو ہی تین برس
ہوئے۔ جب سے اُنھوں نے تین سفر بھی تو پورے نہیں کیے۔ اُن کی بیوی بہت ہی سیدھی سادی اور نیک ہیں۔ بالکل اشرف بیل
کی گائے۔ ذرا اس بات پر بھی تو غور کرو۔ اس نیک بیوی سے بڈھے کپتان اہاب کے ایک بچہ بھی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی
تم اُنھیں بُرا اور خطرناک آدمی سمجھو گے؟ نہیں، نہیں، جوان۔ کپتان اہاب کی حالت زار سہی لیکن وہ انسانیت سے خالی نہیں۔

جب میں وہاں سے چلا تو میرے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ مجھے کپتان اہاب کے بارے میں اتفاق
سے جو باتیں معلوم ہو گئی تھیں اُن کی وجہ سے میرے دل میں ایک مبہم سی کسک ہونے لگی۔ مجھے ایک ہمدردی اور رنج سا محسوس
ہو رہا تھا، خدا جانے کس لیے۔ شاید اُس کی ٹانگ ضائع ہو جانے کے باعث۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میرے دل پر اُس کا ایک
عجیب سا رعب بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اسے رعب کہنا بھی درست نہیں۔ میں بیان تو کر ہی نہیں سکتا۔ پتا نہیں یہ چیز کیا تھی لیکن مجھے
کوئی ذکر کی بات محسوس ضرور ہو رہی تھی اور اس کے سبب میں اہاب سے بدظن بھی نہیں ہوا۔ البتہ میں اُس سے ابھی اچھی
طرح واقف نہ تھا۔ وہ کچھ پُراسرار سا لگتا تھا اور اسی بات سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ بہرحال میرے خیالات آخر کار کسی اور
سمت بھٹک گئے۔ چنانچہ اس وقت تو یہ ہیبت ناک شخص میرے ذہن سے غائب ہو گیا۔

باب - ۱۷

رمضان

آج کوئی کویگ کا رمضان تھا۔ اس کا روزہ اور نفس کشی دن بھر جاری رہنے والی تھی۔ اس لیے میں نے اسے رات سے پہلے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں ہر شخص کے مذہبی فرائض کا بڑا احترام کرتا ہوں، چاہے وہ کتنے ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔ اگر چیونٹیوں کی ایک جماعت کسی کھمبی کی پوجا کر رہی ہو تو میں اسے بھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تو زمین کے بعض حصوں میں بسنے والی اس مخلوق کو کم تر نہیں سمجھتا جس کی غلامانہ ذہنیت کی نظیر کسی اور سیارے میں نہیں ملتی اور جو کسی مرحوم رئیس جاگیردار کے مجسمے کے سامنے صرف اس لیے جھک کر تعظیم بجا لاتی ہے کہ اس کے نام پر اب بھی ایک بہت بڑی جائیداد چھوڑی ہوئی ہے۔

ہم عیسائی لوگوں کو ان معاملات میں فراخ دلی سے کام لینا چاہیے اور دوسروں کے خبطی توہمات کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے افضل نہیں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً کوئی کویگ ہی کو لیجئے یوجو اور اپنے روزے کے متعلق اس کے تصورات انتہائی مضحکہ خیز تھے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی کویگ کو معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور وہ اسی میں خوش تھا۔ بس یہی بات کافی ہے۔ اگر ہم اس سے بحث کرتے تو اس کا کیا فائدہ ہوتا۔ اسی لیے میں تو کہتا ہوں کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ عیسائیوں اور کافروں ہم سب پر خدا کی رحمت ہو کیونکہ ہم سب کے دماغ میں کچھ نہ کچھ فتور ہے اور ہم سبھی کو مرمت کی ضرورت ہے۔

شام کے قریب جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی ساری دعائیں ادا ہو چکی ہوں گی تو میں نے جا کر اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن جواب ندارد۔ جب میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو اندر سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔ میں نے سوراخ کے پاس منہ لا کر ہلکے سے پکارا۔ "کوئی کویگ"۔ مگر سناٹا برقرار رہا۔ "ارے، کوئی کویگ بولتے کیوں نہیں؟ میں ہوں ـــــ اسماعیل۔" لیکن حرکت ندارد۔ اب تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے تو اسے کافی مہلت دے دی تھی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہیں اسے مرگی کا دورہ تو نہیں پڑا۔ چنانچہ میں نے سوراخ میں سے جھانکا لیکن یہ دروازہ کمرے کے ایک الگ تھلگ کونے میں کھلتا تھا۔ لہٰذا مجھے سوراخ میں سے ایک بے ڈھب سا اور وحشت ناک منظر دکھائی دیا۔ پلنگ کی پائینتی اور تھوڑی سی دیوار کے علاوہ مجھے اور کچھ نظر نہ آیا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ دیوار سے کوئی کویگ کا وہی برچھا لگا تھا جو کل شام ہمارے اس کمرے میں آنے سے پہلے سرائے کی مالکہ نے اس سے لے لیا تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔ بہر حال برچھا سامنے رکھا ہے اور وہ اس کے بغیر کبھی باہر نہیں نکلتا، لہٰذا اسے اندر ہی ہونا چاہیے۔ اس میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا۔

"کوئی کویگ! کوئی کویگ!"ــــ پھر وہی سکوت۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے۔ مرگی کا دورہ پڑا ہو گا! میں نے

زور لگاکے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر کواڑوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں بھاگ کے پیچھے گیا اور جو شخص سب سے پہلے نظر آیا اُس
کے سامنے اپنے شک کا اظہار کیا۔ یہ خادمہ تھی۔ وہ کہنے لگی، "اوہ! ایں، میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔
ناشتے کے بعد میں بستر ٹھیک کرنے گئی تھی تو دیکھا کہ دروازے میں تالا لگا ہے۔ سانس لینے تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔ مجھے
یہ عجیب سا لگا کیونکہ اس طرح خاموشی رہتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ شاید آپ دونوں کہیں باہر گئے ہیں اور سامان کی
حفاظت کے خیال سے تالا لگا دیا ہے۔ ارے بیگم صاحب، بیگم صاحب! قتل ہو گیا! بیگم صاحب! مرگی کا دورہ پڑ گیا!"
وہ چیختی چلاتی اوپری منزل کی طرف بھاگی اور میں پیچھے پیچھے۔

اتنے میں مسز جیتی بھی آ پہنچیں۔ ایک ہاتھ میں سالنے والی، دوسرے میں سرکے کی بوتلیں۔ وہ اپنے دو کام چھوڑ کے آئی
تھیں، ایک تو سالن کی تیاری، دوسرے حبشی نوکر کی مرمت۔

میں نے چلا کے کہا — "کواڑوں کی کنڈی اور اس کا راستہ کدھر سے ہے؟ خدا کے لیے جلدی کیجئے، کوئی چیز لاؤ جس سے
دروازہ کھلے۔ کلہاڑی، کلہاڑی! خدا کی قسم اُسے مرگی کا دورہ پڑا ہے۔" یہ کہہ کر میں پھر بدحواسی کے عالم میں خالی ہاتھ لوٹ
بھاگا لیکن مسز جیتی نے سالنے والی، سرکے کی بوتلوں اور اپنے پھاوڑے جیسے چہرے سے میرا راستہ روک لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹا؟"

"کلہاڑی لاؤ! خدا کے لیے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اتنے میں دروازہ کھولتا ہوں!"

"سنو تو سہی۔" سرائے کی مالکہ نے جلدی سے سرکے کی بوتلیں نیچے رکھ دیں تاکہ ایک ہاتھ آزاد ہو جائے۔ "سنو تو
کیا تم میرا دروازہ توڑنا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ جوان، یہ قصہ کیا ہے؟"

جہاں تک بھی ہو سکا میں نے اپنے آپ کو سنبھال کے جلدی جلدی ساری بات بتائی۔ مسز جیتی نے اضطراری طور
پر سرکے کی بوتل اٹھا کے اس میں سے لگائی اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا، "نہیں، جب سے وہاں رکھا ہے تم نے
اسے دیکھا ہی نہیں۔" زینے کے نیچے جو کوٹھری تھی وہ بھاگ کے وہاں گئیں اور اندر جھانک کے دیکھا، پھر واپس آکے بتایا کہ
کوئی کرنگ کا بھالا غائب ہے۔ وہ بولیں، "اس نے تو خودکشی کر لی۔ وہی اسٹکلاو والا قصہ پھر ہوا۔ لو ایک اور بستر گیا۔
خدا اس کی بیچاری ماں پر اپنا رحم کرے! میری سرائے کا تو ستیاناس ہو جائے گا۔ اس بیچارے کی کوئی بہن ہے؟ یہ لڑکی
کہاں گئی؟ ادھر دیکھو بیٹی، خدا کے لیے رنگ ساز اسٹار کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ مجھے ایک سائن بورڈ بنا دے ——
"یہاں خودکشی کرنے کی اجازت نہیں۔ کمرے میں تمباکو پینا منع ہے۔" دیکھو، ایک تیر سے دو شکار نکلا؟
خدا اس کی مغفرت کرے، ایں، یہ وہاں شور کیسا ہے؟ ہم بیٹا، ذرا جاکے دیکھو تو!"

وہ بھی میرے پیچھے پیچھے دوڑی آئیں اور جب میں زور لگا کے دروازہ کھولنے لگا تو مجھے پکڑ لیا۔

"میں دروازہ نہیں توڑنے دوں گی۔ میرا مکان خراب ہو جائے گا۔ جاکے لوہار کو بلا لاؤ، یہاں سے میل بھر پر رہتا ہے۔"
پھر جیب میں ہاتھ ڈال کے کہا، "ذرا ٹھہرو، میری جیب میں ایک تالا ہے، شاید یہ لگ جائے۔ دیکھیں تو سہی۔" یہ کہہ کر

انھوں نے نمستے میں ہاتھ اٹھائے۔ لیکن، افسوس، کوئی کویگ نے اندر سے ایک اور چیخ ماری تھی، وہ یوں ہی رہی۔

میں نے کہا: "اب تو دروازہ توڑنا ہی پڑے گا۔" میں دوڑنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ سرائے کی مالکہ نے مجھے پھر پکڑ لیا اور قسم کھائی کہ میں اپنا مکان خراب نہ ہونے دوں گی۔ لیکن میں نے جھٹکا مار کے اپنے آپ کو چھڑایا اور ایک دم جھپٹ کے پورے جسم کے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔

کواڑ گڑگڑا کے چوکھٹ سے کھل گئے۔ زنجیر اتنے زور سے دیوار پر پڑی کہ پلستر اکھڑ کے چھت تک گیا۔ سبحان اللہ! کوئی کویگ صاحب کمرے کے بیچوں بیچ نہایت اطمینان کے ساتھ پالتی مارے ہوئے، یوجو کو چندیا پہ رکھے بیٹھے تھے۔ حضرت نے نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھا، ایسے گم سم بیٹھے رہے جیسے پتھر کا بت۔

"کوئی کویگ،" میں نے اس کے پاس جا کر کہا، "کوئی کویگ، تمھیں ہو کیا گیا ہے؟"

"کیا یہ سارے دن اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں؟" سرائے کی مالکہ نے پوچھا۔

لیکن ہماری بک بک جھک جھک کے باوجود اس کے منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ میں چاہا اسے دھکا دے دوں یہ کم سے کم چلا تو دیتے۔ اس کے بیٹھنے کا انداز تھا ہی اتنا غیر فطری اور تکلیف دہ کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ پھر وہ آٹھ دس گھنٹے سے یوں ہی بیٹھا تھا اور کھانا تک نہ کھایا تھا۔

میں نے کہا: "مسز جیسی، خیر یہ زندہ تو ہے۔ اب آپ جائیے۔ میں خود دیکھ لوں گا کہ یہ قصہ کیا ہے۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے کوئی کویگ کی بڑی خوشامد درآمد کی کہ اور نہیں تو کرسی پر ہی بیٹھ جاؤ۔ لیکن وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یوں ہی بیٹھا رہا۔ میں نے ہزار طرح ہلایا جھنجھوڑا۔ مگر نہ تو وہ بولا چالا، نہ ایک لفظ منھ سے کہا، نہ میری طرف نگاہ ہی اٹھائی۔ بس بے حس و حرکت بیٹھا رہا جیسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو۔

میں نے دل میں کہا، کہیں یہ بھی اس کی عبادت کا حصہ تو نہیں۔ کیا اس کے مذہب میں جب لوگ روزہ رکھتے ہیں تو اسی طرح پالتی مار کے بیٹھ جاتے ہیں؟ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ ہاں، یہ بھی ایک مذہبی رسم ہے۔ اچھا تو اسے یوں ہی بیٹھنے دو۔ تھوڑی بہت دیر میں اپنے آپ اٹھ کھڑا ہوگا۔ یہ اس حالت میں ہمیشہ تو رہنے کا نہیں۔ اس کا امتحان کل ہی میں ایک مرتبہ آ چکا اور وہ بھی نہایت باقاعدگی کے ساتھ نہیں۔

چنانچہ میں کھانے کے لیے نیچے چلا گیا۔ وہاں کچھ جہازی بیٹھے گپ شپ اڑا رہے تھے۔ یہ لوگ ابھی ابھی اس سفر سے واپس آئے تھے جسے آپ کی اصطلاح میں "ملو" کہا جاتا ہے، یعنی چھوٹے سے جہاز میں خط استوا سے اوپر اوپر جو جزائر ہیں ان کے اندر وہیل کا شکار۔ گیارہ بجے تک تو میں ان لوگوں کے قصے سنتا رہا، پھر سونے کے لیے اوپر چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تو کوئی کویگ کا روزہ ختم ہو چکا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ وہ تو وہیں جا بیٹھا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کے گیا تھا، اس جگہ سے بال تک نہ ہلا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ یہ تو بالکل پاگل پن کی بات تھی کہ صبح سے آدھی رات ہونے کو آئی اور ٹھنڈے کمرے میں پالتی مارے سر پہ لکڑی کا کندا رکھے بیٹھے ہیں۔

"خدا کے لیے کرلی کرتیگ۔ اب تو آخر اور آدمیت کی جڑوں میں آؤ۔ چلو، چل کے کھانا کھاؤ ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ اس
طرح اپنی جان دینے سے کیا فائدہ؟" مگر اب بھی جواب نہ ملا۔

ابھی سے یاد ہیں چونکہ میں نے سوچا کہ میں لیٹ کے سوتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہ بھی آ جائے گا لیکن بستر پر جانے سے
پہلے میں نے اپنا پچھلی کھال کا بھاری کوٹ اس کے اوپر ڈال دیا کیونکہ ابھی سے لگ رہا تھا رات کو سردی بہت ہوگی
اور اس سے میں صحرا میں سارا کوٹ پہن رکھا تھا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے باوجود میری پلک تک نہ جھپکی۔ میں نے موم بتی بجھا
دی تھی اور یہ خیال آتے ہی میری حالت غیر ہو جاتی تھی کہ مجھ سے گز بھر کے فاصلے پر بیچارا کرلی کرتیگ اندھیرے اور سردی میں
اس تکلیف کے ساتھ کیوں بیٹھا ہے۔ ذرا غور تو کیجیے بھلا ایسی حالت میں کس سے سویا جا سکتا ہے کہ اسی کمرے میں ایک پاگل پڑا ہوا
بیٹھا ہے اور اپنی عجیب و غریب اور تکلیف دہ ریاضت میں منہمک ہے!

لیکن آخر کسی نہ کسی طرح میری آنکھ لگ ہی گئی اور معلوم ہونے تک مجھے دین دنیا کا ہوش نہ رہا لیکن جب صبح بستر سے جھانک
کے دیکھا تو معلوم ہوا کرلی کرتیگ ویسے بیٹھا ہے جیسے کسی نے اسے فرش پر پیچوں سے کس دیا ہو لیکن کھڑکی میں سے سورج کی
روشنی اندر آنے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جوڑ جوڑ اکڑ گیا تھا لیکن چہرے سے بشاشت ٹپک رہی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا
میرے پاس آیا اور اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رگڑ کے بتایا کہ روزہ ختم ہو گیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جب تک آدمی مذہبی اعتقادات کی بنا پر کسی اور کو قتل یا ذلیل نہ کرے مجھے کسی کے مذہب پر
اعتراض نہیں ہوتا چاہے اس کے عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن جب کسی کا مذہب پاگل پن کی حد تک پہنچ جائے، خود اس کے
لیے اذیت کا باعث ہو اور دوسروں کی زندگی اجیرن کر دے تو پھر میرا جی چاہتا ہے کہ اس شخص کو الگ لے جا کے اس سے
بحث کروں۔

یہاں میں نے کرلی کرتیگ کے ساتھ کیا۔ میں نے کہا "کرلی کرتیگ، اب تم بستر پر لیٹ جاؤ اور ذرا میری بات سنو۔"
پھر میں نے اپنی تقریر شروع کر دی۔ ابتدائی مذہبوں کی پیدائش اور نشوونما سے لے کر آج کل کے مختلف مذاہب تک پوری
تاریخ سنائی اور ساتھ ساتھ کرلی کرتیگ کو یہ بھی سمجھایا کہ روزے، نفس کشی، ٹھنڈے اور اندھیرے کمرے میں دیر دیر تک بے حس و حرکت
مارے بیٹھے رہنا، یہ ساری چیزیں بالکل مہمل ہیں، صحت کے لیے خراب، روح کے لیے بے فیض اور عقل کے خلاف ہیں۔ میں نے
یہ بھی کہا کہ تم جنگلی ہونے کے باوجود دوسرے معاملات میں تو نہایت سمجھدار اور معقول ہو لیکن یہ دیکھ کے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ
اپنے مذہب یعنی روزے کے معاملے میں تم اتنے گھامڑ واقع ہوئے ہو۔ پھر میں نے یہ دلیل پیش کی کہ روزہ رکھنے سے بدن کمزور
پڑ جاتا ہے اور نتیجہ روح بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور وہ تمہارے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ لازمی طور سے فاقہ زدہ ہوتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ روزے رکھنے والے مذہبی لوگ دوسری دنیا کے متعلق نہایت اندوہ گیں خیالات رکھتے ہیں۔ قصہ مختصر میں نے کچھ
مزے سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "کرلی کرتیگ، جہنم کا تصور ہی دراصل کسی شخص کے ذہن میں آیا ہوگا جس نے حلوہ کھایا اور وہ
ہضم نہ ہو سکا۔ پھر سے کی کمزوری روزوں کی وجہ سے شاید جہنم بھی بڑھتی چلی گئی اور یہ تصور مستقل ہی کے رہ گیا۔"

اُس کا نشان

جب ہم گھاٹ کے آخر میں جہاز کے قریب پہنچے تو کپتان پیلیگ نے کوئی کویگ کو برچھا سنبھالے دیکھ کر خیمے
کے اندر سے اپنی اکھڑ آواز میں پکارا اور کہا کہ مجھے خیال تک نہ تھا کہ تمھارا دوست آدم خور ہوگا۔ اس نے صاف صاف
بتا دیا کہ پہلے کاغذات دیکھے بغیر وہ کسی آدم خور کو اپنے جہاز میں نہیں آنے دیتا۔

میں نے اپنے ساتھی کو وہیں گھاٹ پر چھوڑ دیا اور لپک کے کیبن پر چڑھ گیا۔ میں نے کہا —— "کپتان پیلیگ، میں
آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

اس نے جواب دیا —— "میرا مطلب ہے تمھارے دوست کو اپنے کاغذات دکھانے پڑیں گے۔"

"ہاں۔" کپتان بلڈیڈ نے پیلیگ کے پیچھے سے اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ
یہ عیسائی ہو گیا ہے۔" پھر کوئی کویگ سے مخاطب ہو کے بولا —— "او کافر! آج کل تو کیا عیسائیوں کے کسی کلیسا میں شامل ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا —— "ہاں، یہ سب سے پہلے اجتماعی کلیسا کا رکن ہے۔" یہاں یہ بتا دوں کہ بہت سے کشتی کے جہازوں میں بھرتی
ہونے والے کئی جنگلی آخر کار عیسائی ہو جاتے ہیں۔

"سب سے پہلا اجتماعی کلیسا۔" بلڈیڈ نے کہا۔ "کیا! وہی فرقہ جو عبادت کے لیے پادری کوئی کے گرجا میں جمع ہوتا ہے؟"
یہ کہہ کر اس نے عینک نکالی، اپنے پیلے رومال سے صاف کی اور اسے بڑی احتیاط سے ناک پر رکھ کے خیمے سے باہر
نکل آیا۔ پھر کھڑکی پر جھک کے بڑے غور سے کوئی کویگ کو دیکھنے لگا۔

اس کے بعد میری طرف مڑ کے بولا —— "یہ اس فرقے میں کب سے شامل ہے؟ میرا خیال ہے زیادہ دن نہیں ہوئے۔"

"نہیں،" پیلیگ نے کہا۔ "شاید اس نے ابھی ٹھیک طرح سے بپتسمہ بھی نہیں لیا، ورنہ اس کے چہرے کی سیاہی کچھ تو کم ہو جاتی۔"

بلڈیڈ چیخ کے بولا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ، یہ کافر پادری کوئی کے فرقے میں شامل ہوا ہے یا نہیں؟ میں نے تو اسے کبھی
وہاں جاتے نہیں دیکھا اور میں اُدھر سے روز ہی گزرتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے پادری کوئی اور کسی کی عبادت کا کچھ پتا نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ کوئی کویگ سب
سے پہلے اجتماعی کلیسا کا پیدائشی رکن ہے۔ کوئی کویگ خود پادری ہے۔"

بلڈیڈ نے کہا —— "بازی بازی، بازیش! ا، ہم بڑی ... لڑکے، بچی سے دل لگی کرتا ہے! بے ایمان، صاف صاف بتا تیرا
مطلب کس سے کھیلنے ہے؟ جواب دے۔"

اب تو میں مجبور ہو گیا۔ میں نے جواب دیا —— "جناب، میرا مطلب اس قدیم اور عالمگیر کلیسا سے ہے جس میں آپ اور میں

اور کپتان پیلیگ اور کوئی کویگ، بلکہ ہم سب اور ایک ایک انسان شامل ہے یعنی اس ساری عبادت گزار دنیا کا ازلی و ابدی اور عظیم
اجتماعی کلیسا۔ ہم سب اس میں شامل ہیں۔ البتہ ہم میں سے بعض لوگ چند ایسے توہمات میں پڑے ہوئے ہیں جن کا اس شاندار مذہب سے
کوئی تعلق نہیں، لیکن اس دین میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔"

"یعنی سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔" پیلیگ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "جوان، ملاح بننے کے بجائے تم تو تبلیغ کے لیے
فٹ لگتے ہو۔ اس سے اچھا وعظ میں نے آج تک نہیں سنا۔ پادری ڈیپل تک کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پادری ڈیپل تک تمھارے سامنے گرد ہیں، حالاں کہ
ان کا بڑا شہرہ ہے۔ چلو جہاز میں آ جاؤ۔ بیٹے تم کاغذات و دستاویزات کو چھوڑو، اس کوئیگ سے کہہ دو — تم نے اس کا کیا نام بتایا تھا
کوئیگ سے کہہ دو کہ وہ بھی آ جائے۔ اپنے جہاز کی قسم، اس کا برچھا کتنے زور کا ہے۔ ایسے اچھے لوہے کا معلوم ہوتا ہے اور اس
شخص کو برچھا اٹھانے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ سنو جی، کیا نام ہے تمھارا؟ کوئیگ، کبھی کشتی میں وہیل کا شکار کیا ہے؟ — کبھی کوئی
مچھلی ماری ہے؟"

کوئی کویگ نے ایک لفظ نہ کہا۔ بس اپنے جنگلیوں کے انداز میں اچھل کر کشتی پر چڑھا، پھر جہاز کے جالوں پر جو وہیل کے شکار
کی کشتیاں لٹکی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد بایاں گھٹنا ٹکا کے اور برچھا تان کے کھڑا ہوا۔

"کپتان، وہ پانی پہ ذرا کول تار کا دھبہ دکھائی دیتا ہے، اسے وہیل کی آنکھ سمجھو۔ اچھا اب دیکھو!" نشانہ لگا کے اس نے
برچھا جو پھینکا تو ٹھیک بلدد کی ٹوپی کے اوپر سے ہو کے عرشے کے پار چلا گیا اور اس دھبے کو پانی میں ڈبو دیا۔

کوئی کویگ نے نہایت سکون کے ساتھ برچھے کی ڈوری کھینچتے ہوئے کہا: "اب تو اسے وہیل کی آنکھ سمجھو۔ وہ وہیل
مر گئی نا؟"

پیلیگ اپنے ساتھی سے جو ابھی تک ڈرتے ہوئے برچھے کو اپنے قریب دیکھ کر گھبرا گیا تھا، زینے کی طرف بڑھ گیا۔ "بلدد یہ
جلدی کرو، جلدی کرو، جہاز کے کاغذات نکال لو۔ اس ہیج ہاگ کو، میرا مطلب ہے کوئیگ کو ضرور بھرتی کرنا ہے۔
ادھر دیکھو کوئیگ، ہم تمھیں نوے واں حصہ دیں گے۔ نانٹکٹ کے کسی برچھے باز کو اتنا نہیں ملا۔"

چنانچہ ہم کیبن میں پہنچے اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جس جہاز کے عملے میں شامل ہوا تھا، اسی میں کوئی کویگ بھی بھرتی ہو گیا۔

جب ابتدائی کاروائی ختم ہو گئی اور پیلیگ نے دستخط کرانے کے لیے کاغذات تیار کیے تو مجھ سے کہنے لگا — "میرا خیال
ہے کہ کوئیگ لکھنا نہیں جانتا۔ جانتے ہو؟ سنو کوئیگ، کیا تم دستخط کرتے ہو یا کاغذ پر اپنا نشان بناتے ہو؟"

کوئی کویگ اس سے پہلے بھی دو تین دفعہ شریک ہو چکا تھا۔ وہ اس سوال پر ذرا بھی نہ جھجکا، بلکہ قلم لے کے کاغذ پر اصل
ٹھیک جگہ پر جو دیہاتی ... اور قریب کوئی سا نشان بنا دیا جو اس کے بازو پر گدا ہوا تھا۔ کپتان پیلیگ اس کے نام کے سامنے ... غلطی سے
جا رہا تھا، چنانچہ کاغذ پر اس کے نشان نے کچھ یہ شکل اختیار کی —

کوئیگ

اس کا نشان

اس دوران میں کپتان بلڈیڈ بیٹھا بڑے غور اور سنجیدگی سے کرل گرینگ کی گفتگو سنتا رہا۔ آخرکار وہ بڑی متانت کے ساتھ اٹھا اور چوڑے دامنوں والے گندے کوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں سے ٹرل تنگ کے رسالوں کا ایک چندہ نکالا۔ ان میں سے ایک رسالہ جس کا نام "میری کی آمد" تھا وقت ضائع کئے بغیر بچھانٹ کے کرل گرینگ کو دے دیا پھر اس کے دونوں ہاتھ رسالہ سمیت اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا ——— "تمہیں کافر مجھے اپنا فرض ادا کرنا لازمی ہے۔ میں اس جہاز کے مالکوں میں سے ہوں لہٰذا مجھے اس کے سارے جہازیوں کی نجات کی فکر بڑی رہتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تو اب تک بے دینی اور بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ شیطان کی غلامی چھوڑ دے۔ اپنے وہ ناپاک اور منحوس اژدہے کی پرستش سے منہ موڑ۔ آنے والے عذاب سے ڈر۔ ذرا دیکھ تو سہی کدھر جا رہا ہے! خدا کے لیے جہنم کے راستے سے بچا کے چل!"

بڈھے بلڈیڈ کی گفتگو میں کچھ تو گھریلو محاوروں کی آمیزش تھی اور کچھ انجیل کے فقروں کی۔ پھر ملاحوں کی زبان کا بھی تھوڑا سا اثر باقی تھا۔

پیلگ نے چلا کے کہا ——— "بس بلڈیڈ رہنے دو۔ اس بچارے پر رحم کرو۔ تم ہمارے ہرپچے باز کو بگاڑنا چاہتے ہو۔! دیندار آدمی ہرپچے بازی میں کبھی اچھے نہیں رہتے۔ پھر ان میں شارک مچھلی کا سا زور نہیں رہتا۔ جس ہرپچے باز میں شارک جیسی تیزی نہ ہو وہ بھلا کس کام کا؟ ہی ژاکا قابلیت ترین۔ ایک زمانے میں اس جیسا بہادر ہرپچے باز نن ٹکٹ کے علاقے میں ایک نہ تھا۔ وہ گرجا گھر جانے لگا تو اس کا ستیاناس ہو کے رہ گیا۔ اسے اپنی منحوس روح کی ایسی فکر پڑی کہ وہیل مچھلیوں سے دور ہی دور رہنے لگا۔ اسے تو یہ ڈر کھائے جاتا تھا کہ کہیں وہیل کے تھپیڑے سے پانی میں جا گرا اور ڈوب کے مر گیا تو سیدھا جہنم میں پہنچوں گا۔"

"پیلگ! پیلگ!" بلڈیڈ نے ہاتھ اور نگاہیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم اور میں دونوں کے دونوں بڑے برے طوفانوں سے گزرے ہیں۔ پیلگ، تم جانتے ہو کہ موت کا خوف کیا چیز ہے۔ پھر بھلا تم یہ کفر کیسے بک رہے ہو۔ تمہارا دل کچھ اور کہتا ہے زبان کچھ اور کہہ رہی ہے۔ اچھا بتاؤ، جب تم اسی جہاز پیکوڈ میں بیٹھے تھے اور اب کپتان اور جاپان میں اتنے زور کا طوفان آیا کہ تین مستول گر گئے تو اس وقت تمہیں موت اور حشر کے دن کا خیال آیا تھا کہ نہیں؟"

"ذرا اس کی بات سنو، اس کی سنو!" پیلگ نے جیبوں میں اندر تک ہاتھ ٹھونس کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا ——— "لوگو، اس کی سنو! اچھی کہی! ایسی حالت میں جب ہر گھڑی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب جہاز ڈوبا! اس وقت حشر کے دن اور موت کا خیال؟ کیا؟ تینوں مستول دیواروں پر اسی طرح آ آ کے لگ رہے تھے جیسے بادل کی گھڑگھڑاہٹ۔ سمندر کی ہر موج پڑتے ہی جہاز پر سے گزر جاتی تھی اس وقت حشر کے دن اور موت کا خیال آتا؟ نہیں! موت کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ کپتان اہاب اور میں؟ ہم دونوں تو زندگی کے بارے میں سوچ رہے تھے یعنی تو یہ فکر تھی کہ لوگوں کی جان کیسے بچائیں۔ چھوٹے مستولوں پر رسیاں کیسے چڑھائیں، کسی قریب کے بندرگاہ تک کیسے پہنچیں۔ میں تو یہی باتیں سوچ رہا تھا۔"

بنجو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے کرسی کے بغلی تختے کے کونے پر چڑھ گیا اور جسم بھی اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ وہاں پہنچ کے وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا اور بادبان کی حرکت ہوتے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی جھک کر بادبان کا کوئی کونا اٹھا دیتا یا کسی تاروں سے رنگی ہوئی رسی کو پانی میں گرنے سے بچا لیتا۔

مجذوب

"کیوں جہازیو، تم اس جہاز میں بھرتی ہو گئے ہو؟"

کوئی کوئیگ اور میں ابھی ابھی پیکوڈ سے اُترے تھے اور ٹہلتے ہوئے سمندر سے ذرا پرے جا رہے تھے۔ ہم اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے کہ ایک اجنبی ہمارے سامنے آگے رکا اور اپنی موٹی سی انگشتِ شہادت ہمارے جہاز کی طرف اٹھا کے مندرجہ بالا الفاظ کہے۔ وہ بالکل پھٹے حالوں میں تھا ___ کرتے کا رنگ اڑا ہوا، پتلون میں درجن بھر پیوند، گردن میں ایک کالا رومال سا پیچیدہ لپٹا ہوا، چہرے پر چیچک کے داغوں کی برابر بھرمار تھی، جیسے پانی سوکھ جانے کے بعد دریا کی تہ میں سنگریزوں کے نقش و نگار۔

"کیا تم لوگ اس جہاز میں بھرتی ہو گئے ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"شاید تمہارا مطلب اس جہاز پیکوڈ سے ہے،" میں نے کہا۔ دراصل میں تھوڑا سا وقت چاہتا تھا کہ اُسے اطمینان سے دیکھوں۔

"ہاں، پیکوڈ ___ وہ سامنے والا جہاز۔" اس نے اپنا پورا بازو پیچھے کھینچ کر کہا، پھر ایک دم سے بازو آگے کر تان دیا اور اس کی انگلی سنگین کی طرح اٹھ کر جہاز کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

میں نے کہا، "ہاں ہم نے ابھی معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔"

"معاہدے میں کوئی بات تمہاری روحوں کے متعلق بھی تھی؟"

"کس چیز کے متعلق؟"

"اوہو، شاید تمہارے پاس یہ چیز ہی نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "خیر کوئی بات نہیں، میں بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جن کے پاس یہ چیز نہیں۔ یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے وہ اس کے بغیر اچھے ہی رہتے ہیں۔ روح کو ایک ایسی چیز سمجھو جیسے گاڑی کا پانچواں پہیہ۔"

"تم نے یہ کیا بکواس لگائی ہے دوست؟" میں بولا۔

"لیکن اُسے یہ چیز اتنی ملی ہے کہ دوسروں کی کمی بھی پوری ہو گئی۔" اجنبی نے بے جوڑ بات کی اور لفظ "اُسے" پر خاص طور سے زور دیا۔

میں نے کہا، "کوئی کوئیگ، چلو یہاں سے۔ یہ حضرت نہ جانے کہاں سے چھوٹ بھاگے ہیں۔ کسی ایسے آدمی اور کسی ایسی چیز کا ذکر کیے چلے جا رہے ہیں جنھیں ہم جانتے تک نہیں۔"

"ٹھیرو!" اجنبی چلا کے بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے ابھی تک اس بھوت کو نہیں دیکھا، کیوں دیکھا ہے؟"

"یہ بھوت کون ہے؟" میں پھر اس کی غیر سنجیدگی سے متاثر ہو کے رہ گیا تھا۔

"کپتان اہاب۔"

"ہمارے جہاز پیکوڈ کے کپتان؟"

"ہاں وہی۔ بہت سے پرانے جہازی انہیں بھوت ہی کہتے ہیں۔ تم نے ابھی تک انہیں نہیں دیکھا؟"

"نہیں، ابھی نہیں دیکھا۔ سنا ہے وہ بیمار ہیں لیکن اب حالت کچھ بہتر ہے۔ جلدی ہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"وہ جلدی ہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے؟" ایلیجا ایک منافقت آمیز قہقہے کے ساتھ ہنسا۔ "ذرا دیکھو جب کپتان اہاب ٹھیک ہو جائے گا تو میرا یہ بایاں بازو بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔"

"تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"لوگوں نے ان کے بارے میں تمھیں کیا بتایا ہے؟" پوچھنے لگا۔

"کچھ زیادہ تو نہیں بتایا۔ میں نے بس اتنا سنا ہے کہ وہ وہیل کا شکار بہت اچھا کھیلتے ہیں اور اپنے عملے کے ساتھ ان کا سلوک نہایت نفیس ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے ـــــ ہاں، دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن اس کا حکم سنتے ہی اچھل کے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ تمھاری طرف بڑھ کے غرائے گا بس فوراً چل پڑو۔ یہ کپتان اہاب کا دستور ہے۔ اس میں فرق نہیں ہو سکتا۔ لیکن تم نے یہ نہیں سنا کہ کیپ ہورن میں کیا واقعہ پیش آیا تھا جب وہ تین دن اور تین رات مُردوں کی طرح بے ہوش پڑا رہا؟ یہ نہیں سنا کہ سانتا میں قربان گاہ کے سامنے اسپین کے ایک آدمی سے کیسی زبردست جھڑپ ہوئی تھی؟ کیوں، یہ بات نہیں سنی؟ یہ نہیں سنا کہ اس نے چاندی کے کشکول میں کیسے تھوکا تھا؟ اور یہ بھی نہیں سنا کہ پچھلے سفر میں پیشین گوئی کے مطابق اس کی ٹانگ ضائع ہو گئی؟ ان میں سے ایک بات بھی نہیں سنی؟ ہوں، نہیں واقعی نہیں سنی ہوگی۔ تمھیں بھی کیسے؟ جانتا ہی کون ہے؟ شاید ہی نَنٹکٹ میں کوئی کچھ بتا سکے۔ لیکن خیر، یہ قصہ تو ضرور سنا ہوگا کہ اس کی ٹانگ کیسے گئی۔ ہاں، ہاں، یہ بات تو ضرور سنی ہوگی۔ یہ بات تو قریب قریب ہر ایک کو معلوم ہے۔ یعنی لوگ اتنی بات تو ضرور جانتے ہیں کہ اس کی بس ایک ٹانگ ہے۔ دوسری ٹانگ ایک وہیل اڑا لے گئی۔"

میں نے کہا ـــــ "دوست، رہ جانے دو۔ تم کیا بک رہے ہو مجھے کچھ پتا نہیں اور نہ اس کی فکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم کچھ سٹھیا گئے ہو۔ اگر تم کپتان اہاب اور اس سامنے والے جہاز پیکوڈ ہی کا ذکر کر رہے ہو تو دیکھو، مجھے ٹانگ کے ضائع ہونے کا پورا قصہ معلوم ہے۔"

"پورا قصہ معلوم ہے؟ کیوں؟ تمھیں یقین ہے کہ سب کچھ معلوم ہے؟ پورا قصہ؟"

"ہاں یقین ہے۔"

انگلی اٹھائے اور بگڑے ہوئے نقوش کا لگنے والا یہ فقیر نما ایلیجا لمحے بھر خاموش کھڑا رہا جیسے کسی ہیجان میں مبتلا ہو پھر چونک پڑا

اور میری طرف مڑ کے بولا — "تم بھرتی ہو گئے نا؟ کاغذات پر دستخط کر دیئے؟ بہت اچھا، ٹھیک ہو گئے تو ہو گئے، جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ یا پھر شاید نہ ہو۔ بہرحال سب کچھ مقدر ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ ہمارے آدمی تو اس کے ساتھ جائیں گے ہی۔ دوسرے نہ سہی، وہی۔ خدا اپنا فضل کرے۔ خدا حافظ جہازیو، خدا حافظ۔ آسمانی برکتیں تمہارے اوپر نازل ہوں۔ افسوس ہے کہ میں نے تمہیں خواہ مخواہ روکا۔"

میں نے کہا — "سنو بڑے میاں، دوست۔ اگر تمہیں ہم سے کوئی خاص بات کہنی ہے تو کہہ ڈالو۔ لیکن اگر تم ہمیں گفتگو میں گھیر کر الجھانا چاہتے ہو تو کوئی اور گھر دیکھو۔ بس مجھے تم سے اتنا ہی کہنا ہے۔"

"اور تم نے کہا بھی نہایت صفائی سے۔ میں تو آدمی سے ایسی ہی بات سننا چاہتا ہوں۔ تم بالکل اس کے مطلب کے آدمی ہو کہ تم جیسے ہی لوگ چاہئیں۔ خدا حافظ جہازیو، خدا حافظ۔ ہاں، جب تم جہاز میں پہنچو تو ان لوگوں سے کہہ دینا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس جہاز میں بھرتی نہیں ہوں گا۔"

"جناب عالی، آپ ہمیں اس طرح الو نہیں بنا سکتے — ہم جھانسے میں آنے والے نہیں۔ آدمی کے لیے ایسا ظاہر کرنا تو آسان ہے جیسے دل میں کوئی زبردست راز چھپائے پھر رہا ہو۔"

"خدا حافظ جہازیو، خدا حافظ۔"

"خدا تو حافظ ہے ہی۔" میں نے کہا۔ "چلو کوئی کوئیگ، اس پگلے کو چھوڑو۔ لیکن ذرا ٹھہرو، اپنا نام تو بتاؤ۔"

"ایلیاہ۔"

میں نے دل میں کہا — "ایلیاہ" — اور ہم اپنے اپنے طریقے سے اس خستہ حال بڈھے جہازی پر تبصرہ کرتے ہوئے چل پڑے۔ ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ شخص بس جعلیا ہے اور خواہ مخواہ رعب جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ہم سو گز بھی نہ گئے ہوں گے کہ ہمیں اتفاق سے ایک موڑ پر مڑنا پڑا۔ پیچھے کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ذرا فاصلے سے ایلیاہ چلا آ رہا ہے۔ معلوم نہیں، اسے دیکھ کر مجھے ایسا عجب سا محسوس ہوا کہ میں نے کوئیگ کو کچھ نہ بتایا کہ یہ شخص ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے یہ تجسس ہو رہا تھا کہ دیکھوں جہاں سے ہم مڑے ہیں وہیں سے یہ اجنبی مڑتا ہے یا نہیں۔ وہ عین وہیں سے مڑا۔ پھر تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے مگر یہ بات میرے تصور میں نہ آ سکی کہ آخر اس کی نیت کیا ہے۔ ایک تو اس نے باتیں ہی عجب مبہم اور پراسرار انداز میں کی تھیں، کچھ کہا، کچھ نہ کہا۔ اوپر سے یہ حرکت۔ اب تو میرے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ پیکوڈ، کپتان اہاب، اس کی ٹانگ کا ضائع ہونا، کیپ ہورن والا دورہ، چاندی کا کشکول، کل جب میں جہاز سے چلا تھا کپتان پیلگ نے اس کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں، وہ بڑھیا ٹسٹیگ کی پیشین گوئی، ہمارا بھرتی ہونا، سمندر کا آنے والا سفر — غرض یہ اور ہزار دوسری باتیں مجھے نہایت پراسرار معلوم ہونے لگیں۔

میں نے یہ بات معلوم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا کہ ایلیاہ واقعی ہمارا پیچھا کر رہا ہے یا نہیں۔ اس نیت سے میں

لوٹ کو ٹینگ کر ساتھ لے کر سڑک کے پار چلا گیا اور اُدھر پہنچ کے پھر پلٹ آیا لیکن ایکایک سیدھا چلا گیا اور ایسا معلوم
ہوا جیسے ہمیں دیکھا تک نہیں۔ اب ہمیں تشفی ہوئی تو ہم نے ایک دفعہ پھر، بلکہ اپنے نزدیک آخری بار، وہاں ہیں لکھ
پر نظر جمائی ہے۔

چہل پہل

دو ایک دن اسی طرح گزر گئے۔ پیکوڈ میں بڑی چہل پہل تھی۔ پرانے بادبانوں کی مرمت ہو رہی تھی۔ نئے بادبان، رسّی کی چادریں اور رسیوں کے گٹھے جہاز میں لائے جا رہے تھے۔ ہر بات سے پتا چلتا تھا کہ جہاز کی تیاریاں بس ختم ہونے کے قریب ہیں۔ کپتان پیلگ نے ساحل پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھا مزدوروں کی نگرانی کرتا رہتا۔ چیزیں قرینے اور سامان مہیا کرنے کا کام بلڈیڈ کے سپرد تھا۔ جو لوگ جہاز کی مرمت کر رہے تھے وہ رات گئے تک کام میں لگے رہتے۔

کوئی کوئیگ کے معاہدے پر دستخط کرنے کے اگلے دن ساری سراؤں میں جہاں جہاں بھی اس جہاز کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے اعلان کر دیا گیا کہ ان کے صندوق رات ہونے سے پہلے پہلے جہاز میں پہنچ جائیں، کیونکہ خدا جانے کس وقت جہاز چل پڑے۔ چنانچہ کوئی کوئیگ اور میں جا کے اپنا سامان لے آئے۔ مگر ہم نے ارادہ کر لیا کہ آخری دن تک ساحل پر ہی سوتے رہیں گے۔ معلوم ہوتا ہے ایسے حالات میں لوگوں کو بہت پہلے سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جہاز کئی دن تک روانہ ہی نہ ہوا۔ لیکن اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ پیکوڈ کے پوری طرح لیس ہونے سے پہلے نہ جانے کتنی چیزوں کا انتظام کرنا تھا اور ابھی کتنا کام باقی تھا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ گھر بار چلانے کے لیے کتنی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے — پلنگ، دیگچیاں، چھری کانٹا، چمچے، پھاوڑے، ہاون دستے، بھگونے اور نہ جانے کیا کیا۔ یہی حال وہیل مچھلی کے شکار کا ہے۔ یہاں بھی تین سال تک پنساریوں، لوہاروں، نانبائیوں، ڈاکٹروں اور ساہوکاروں سے سیکڑوں میل دور کھلے سمندر میں گھر بار چلانا پڑتا ہے۔ یوں تو یہ بات تجارتی جہازوں کے سلسلے میں بھی ٹھیک ہے لیکن وہیل کے شکار کو جانے والے جہازوں کی حد تک نہیں۔ ایک تو یہ سفر بہت لمبا ہوتا ہے، ماہی گیری کے کام میں بعض خاص قسم کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور جن اجنبی بندرگاہوں میں یہ جہاز عام طور سے ٹھہرتے ہیں وہاں ایسی چیزیں ملتی بھی نہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قسم کے حادثات کا سب سے زیادہ خطرہ انھیں جہازوں کو ہوتا ہے اور جن چیزوں پر سفر کی کامیابی کا دارومدار ہے خصوصاً انھیں کے تلف ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسی لیے فالتو کشتیاں، فالتو چپّو، فالتو رسیاں اور برچھے، غرض ہر چیز فالتو رکھی جاتی ہے۔ مگر ایک نہیں ہوتا تو فالتو کپتان اور فالتو جہاز نہیں ہوتا۔

جس وقت ہم جزیرے میں پہنچے ہیں، پیکوڈ کا بھاری سامان تو قریب قریب آ چکا تھا یعنی گوشت، روٹی، پانی، جلانے کی لکڑی، لوہے کے حلقے اور سلاخیں۔ لیکن جیسا پہلے بتایا گیا کچھ دن تک ادھر ادھر کی چھوٹی بڑی چیزیں پھر بھی

آگاہی رہی۔

ہمیں اپنے والوں میں سب سے خاص شخصیت بلنڈیڈ کی بہن کی تھی۔ یہ ایک دُبلی پتلی بڑھیا تھی، لیکن وہ بس کی پکی اور مخلصانہ جاتی ہی تھی، پھر بڑی نرم دل اور شفیق۔ معلوم ہوتا تھا اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہے پیکو کو سمندر میں پہنچنے کے بعد کسی چیز کی کمی نہیں پڑے گی۔ کبھی دیکھا تو داروغہ کے آرڈر خانے کے لیے اچار کا مرتبان لیے چلی آرہی ہیں کبھی جیب میٹ کی ایک کے لیے تھیلی کا تحفہ جہاں وہ پیار جتا رکھتا تھا کبھی کسی کی کشتی ہوا کرنے کے لیے تولیہ کا لکھا۔ شاید ہی کوئی عورت اتنی اہم ہستی ہو جتنی وہ تھی۔ یعنی اس کا نام پیٹرنی ارحم دل تھا اور لوگ اسے خالہ پیٹرنی کہا کرتے تھے۔ اس میں آئی فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ وہ ہر وقت جلیلان پھرتی اور اس فکر میں رہتی کہ جس جہاز میں اس کا پیارا بھائی بیٹھنے والا ہے اور خود اس کے بھی بڑی مشقوں سے بچائے ہوئے دو چار ڈالر لگے ہوئے ہیں، اس کے عملے کو اگر کسی چیز سے آرام یا اطمینان مل سکتا ہے تو فوراً اس کا بندوبست کر دے۔

لیکن آخری دن تو ایسی ہی گزری یعنی پیکٹ دل اور دبلا عورت جہاز میں آئی تو ایک ہاتھ میں ایک لمبا سا لنگر تھا اور دوسرے میں ایک اور بھی لمبا پرچا۔ بلنڈیڈ اور پیکٹ بھی کچھ کم زور دوں میں نہ تھے۔ بلنڈیڈ ضروری اشیا کی ایک لمبی سی فہرست ہاتھ میں لیے پھر رہا تھا جب کوئی چیز اوپر آتی تو وہ کاغذ پر اس کے نام کے سامنے فوراً نشان لگا دیتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیکٹ اپنے ہتھوڑوں والے تھیلے سے دھکیل کر باہر نکالتا جو خارج جہاز کے نیچے تھے یا مستول پر چڑھے رسیاں کھینچ رہے تھے ان پر ڈانٹتا اور پھر فوراً بچانے کے اندر واپس چلا جاتا۔

جن دنوں یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کوئی کرنیگ اور میں اکثر جہاز پر جاتے رہتے تھے۔ میں ہر دفعہ پوچھتا کہ کپتان اب کیسے ہیں اور جہاز پر کب آئیں گے؟ ان سوالوں کا یہی جواب ملتا کہ ان کی حالت بہتر ہوتی جا رہی ہے اور آج کل میں جہاز پر آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس دوران میں یہ دو کپتان بلنڈیڈ اور پیکٹ سفر کی تیاریاں مکمل کر ہی سکتے ہیں۔ اگر میں اپنے ساتھ انصاف برتتا تو مجھے دل میں اقرار کرنا پڑتا کہ جو شخص جہاز کے سمندر میں پہنچتے ہی ہمارا مطلق العنان حکمران بننے والا تھا اسے دیکھے بغیر اپنے لیے سفر کے لیے اس طرح معاہدہ کر بیٹھنا مجھے زیادہ پسند نہ آیا تھا لیکن جب آدمی کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہو تو بعض دفعہ ہوتا یوں ہے کہ وہ اس معاملے میں پھنس چکا ہے تو اپنے شبہات کو غیر شعوری طور پر خود اپنے آپ سے بھی چھپاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی بات پیش آئی میں نے ایک لفظ کہا نہ میں نے یہ کوشش کی کہ اس بارے سے کچھ سوچوں ہی نہیں۔

آخرکار ہمیں اطلاع ملی کہ جہاز کل کسی وقت ضرور چل پڑے گا چنانچہ اگلے دن صبح سویرے کوئی کرنیگ اور میں جہاز کی طرف روانہ ہو گئے۔

باب - ۲۱

جہاز پر جانا

جب ہم گھاٹ کے قریب پہنچے تو چھ بج چکے تھے، لیکن دھند کی وجہ سے ابھی اچھی طرح روشنی نہ ہوئی تھی۔

میں نے کوئی کوئیگ سے کہا ——"اگر مجھے ٹھیک دکھائی دے رہا ہے تو وہ سامنے کچھ جہازی دوڑتے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ سائے تو ہو نہیں سکتے۔ میرا خیال ہے کہ سورج نکلتے نکلتے جہاز چل پڑے گا۔ جلدی چلو!"

"ٹھہرو!" ایک زور کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک آدمی نے پیچھے سے آ کے ہم دونوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ ہمارے سوچ ہی میں گھس کے کھڑا ہو گیا اور اس دھندلی سی روشنی میں تھوڑا سا آگے کو جھک کر عجیب نظروں سے کبھی کوئی کوئیگ کو دیکھنے لگا کبھی مجھے —— یہ ایلیاہ تھا۔

"جہاز پر جا رہے ہو؟"

"اچھا، اپنا ہاتھ ہٹاؤ۔" میں نے کہا۔

"ادھر دیکھو۔" کوئی کوئیگ جھرجھری لے کے بولا، "جاؤ یہاں سے۔"

"تو پھر تم جہاز پر نہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمھیں اس سے مطلب؟ ایلیاہ صاحب، آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو سخت بدتمیز سمجھ رہا ہوں؟"

"نہیں، نہیں، نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔" ایلیاہ نے بڑے تعجب سے پہلے تو مجھے دیکھا، پھر کوئی کوئیگ کو۔ اس کی نظریں بہت ہی پُراسرار ہو گئی تھیں۔

میں نے کہا —— "ایلیاہ، اب تم چل دو۔ میرے دوست پر اور مجھ پر تمھارا بڑا احسان ہو گا۔ ہم بحر ہند اور بحر الکاہل جا رہے ہیں۔ نہیں ٹھہر سکتے، دیر ہوتی ہے۔"

"اچھا، جا رہے ہو؟ ناشتے سے پہلے واپس آ جاؤ گے نا؟"

"کوئی کوئیگ، اس کا تو دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "آؤ چلیں۔"

ایلیاہ وہیں جما کھڑا رہا، لیکن جب ہم دو چار قدم نکل گئے تو پکارا —— "سنو!"

میں نے کہا، "چلنے بھی دو، کوئی کوئیگ، بس چلے چلو۔"

لیکن وہ پیچھے پیچھے پھر ہمارے قریب آ گیا اور ایک دم سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا —— "تم نے تھوڑی دیر پہلے کچھ سائے جہاز کی طرف جاتے دیکھے تھے نا، جو بالکل آدمی لگتے تھے؟"

یہ سیدھا سادہ سا سوال مجھے اتنا عجیب معلوم ہوا کہ جواب دینا ہی پڑا۔ میں نے کہا۔ "ہاں، خیال تو ہے کہ چار پانچ آدمی نظر آئے تھے۔ لیکن اتنی دھند تھی کہ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا۔"

"بہت ہی دھند ہے، بہت ہی دھند ہے۔" ایلیا بولا۔ "خدا حافظ۔"

ہم پھر اس سے الگ ہو گئے لیکن وہ ایک دفعہ پھر لپکے لپکے ہمارے پاس آ پہنچا اور میرا کندھا پکڑ کر کہنے لگا۔ "ذرا دیکھو تو سہی وہ لوگ اب بھی نظر آتے ہیں یا نہیں۔"

"کون لوگ؟"

"خدا حافظ! خدا حافظ!" وہ کھسکتے ہوئے بولا۔ "ارے میں تو تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خیر، چھوڑو، فکر نہ کرو، سب ایک بات ہے۔ یہ تو جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ آج بڑا کہر پڑ رہا ہے۔ کیوں، پڑ رہا ہے نا؟ اچھا، خدا حافظ۔ اب تو شاید تم سے جلدی ملاقات نہیں ہوگی۔ بلکہ قیامت کے میدان ہی میں ہوگی۔" یہ اول فول کی باتیں کہہ کر وہ رخصت ہو گیا اور ہمیں ملے جلے سے اس احمقانہ بدتمیزی پر حیران پریشان کر گیا۔

آخر ہم جہاز پر جا پہنچے۔ وہاں دیکھا تو ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ایک متنفس چلتا پھرتا نظر نہیں آتا۔ افسروں کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ روشندانوں کے تختے نیچے کر دیے گئے تھے اور ان پر رسیوں کے پھندے لٹکے ہوئے تھے۔ پھر ہم جہاز کے اگلے حصے میں پہنچے تو ایک روشندان کا ڈھکنا کھلا پایا۔ روشنی دیکھ کر نیچے گئے تو وہاں بس ایک بڑھا خلاصی بیٹھا جھک کر ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ وہ دونوں گھٹنوں پر سر اوندھائے ہوئے دونوں بازو اوپر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا گھوڑے بیچ کے سو رہا ہے۔

میں نے سونے والے کی طرف شبہے کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی کوئیگ، یہی وہ جہازی نظر آتے تھے وہ کدھر گئے؟" لیکن معلوم ہوتا ہے کوئی کوئیگ نے گھاٹ پر ان لوگوں کو دیکھا ہی نہ تھا۔ اگر ایلیا نے وہ عجیب سوال نہ پوچھا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس حالت میں میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ بہرحال میں نے یہ بات ہی نظرانداز کر دی اور سونے والے کی طرف دیکھ کر کوئی کوئیگ سے مذاق میں کہا کہ آؤ لاش کے پاس بیٹھ جائیں۔ چلو ایک طرف تم جم جاؤ۔ اس نے اپنا ہاتھ سونے والے کی پشت پر ایسے رکھا جیسے دیکھ رہا ہو کہ جگہ نرم ہے یا نہیں۔ پھر لپک کے تختے پر چپ چاپ وہاں بیٹھ گیا۔

"ارے، یہ کیا! کوئی کوئیگ وہاں مت بیٹھو۔" میں نے کہا۔

کوئی کوئیگ بولا۔ "بڑا نرم گدا۔ ہمارے ملک میں ایسے ہی بیٹھتا۔ اس کا منہ نہیں دبتا۔"

میں نے کہا۔ "منہ! تم کیا اس کے منہ پر بیٹھے ہو؟ خیریت ہی سہی۔ لیکن دیکھو تو کیسے زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ اس کا سینہ تو دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ اس کے اوپر سے ہٹ جاؤ۔ کوئی کوئیگ، تم بہت بھاری ہو۔ اس بیچارے کا منہ پچکے دے رہے ہو۔ کوئی کوئیگ اتر جاؤ۔ دیکھو، یہ ابھی اٹھے گا تو تم گر پڑو گے۔ خدا جانے اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔"

کوئی کوئیگ اٹھ کر سونے والے کے سر کے دوسری طرف جا بیٹھا اور اپنا کلہاڑی نما پائپ جلایا۔ میں پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ ہم باری باری سے پائپ پینے لگے۔ جب ایک پی چکتا تو سونے والے کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کے دوسرے کو دے دیتا۔ میں نے اسی کی طرح ٹوٹے پھوٹے فقروں میں کوئی کوئیگ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے ملک میں صوفے اور کرسیاں تو ہوتی نہیں چنانچہ دستور یہ ہے کہ بادشاہ، سردار اور دوسرے بڑے لوگ نیچے بیٹھنے کے لیے پانچ آدمیوں کو کھلا پلا کے موٹا کر لیتے ہیں جو گدوں کا کام دیتے ہیں۔ اور مکان کو آراستہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے آٹھ دس عمدہ خرید لیے جائیں اور انہیں ایک قطار میں بٹھا دیا جائے۔ اس کے علاوہ کہیں سیر کے لیے باہر جائیں تو اس طرح بڑی سہولت رہتی ہے۔ یہ طریقہ ان کرسیوں سے بہتر ہے جنہیں لپیٹ کے چھڑی بنا لیتے ہیں۔ اگر کوئی گیلی ہوئی جگہ یا کیچڑ ہو تو سردار اپنے خادم کو بلا کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے اس کا صوفہ بنا کے بیٹھ سکتا ہے۔

یہ باتیں سناتے ہوئے جب کوئی کوئیگ مجھ سے پائپ لیتا تو ہر دفعہ اس کا پھل سونے والے کے سر پر جاتا۔

"کوئی کوئیگ! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"بلے مارنا بہت آسان! بہت آسان!"

وہ اپنے کلہاڑی نما پائپ کے متعلق بڑے وحشت ناک قصے سنانے لگا۔ یہ پائپ دو طرح استعمال ہوتا تھا۔ ایک تو دشمنوں کا بھیجا نکالنے کے لیے، دوسرے اس کی روح کو تسکین پہنچانے کے لیے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمیں برابر والے سوتے ہوئے خلاصی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں تمباکو کا تیز دھواں اتنا بھر گیا کہ اسے بھی تنگ کرنے لگا۔ پہلے تو اس کا سانس گھٹا، پھر کچھ ناک میں تکلیف ہوئی، پھر اس نے دو تین کروٹیں لیں، پھر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

آخر وہ بولا — "کون ہے؟ یہ تمباکو پینے والا کون ہے؟"

"ہم اس جہاز میں بھرتی ہوئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "جہاز کب چل رہا ہے؟"

"اچھا، تو تم بھی جہاز میں جا رہے ہو؟ آج ہی چلے گا۔ کپتان صاحب رات آ گئے۔"

"کون سے کپتان؟ آہاب؟"

"اور کون ہو سکتا ہے؟"

میں اس سے آہاب کے متعلق کچھ اور سوال پوچھنے جا رہا تھا کہ عرشے پر ایک شور سنائی دیا۔

"اوہو! اسٹاربک اٹھ بیٹھا۔" خلاصی بولا۔ "ہمارا چیف میٹ بڑے مزے کا آدمی ہے۔ پھرتیلا بھی بہت ہے اور دیندار بھی، لیکن وہ جاگ اٹھا۔ اب مجھے چلا جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ عرشے پر چلا گیا اور ہم بھی پیچھے پیچھے گئے۔

اب دھوپ پھیل چکی تھی۔ جلدی ہی ملاح دو دو تین تین کر کے آنے لگے۔ خلاصی کام میں لگ گئے۔ میٹ بھی بڑے مصروف دکھائی دینے لگے۔ کچھ ساحل کے لوگ وہ چیزیں لے کے آ رہے تھے جو باقی رہ گئی تھیں۔ لیکن ابھی کپتان آہاب نمودار نہیں ہوا۔ وہ اپنے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔

کرسمس

آخر دوپہر کے قریب خلاصیوں کو جہاز سے رخصت کر دیا گیا اور پیکوڈ بھی گھاٹ سے کچھ دور ہٹ آیا۔ چیریٹی تو ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتی تھی۔ وہ کشتی میں بیٹھ کے پیا آخری تحفہ دینے آئی۔ یعنی اپنے بھتیجی اور جہاز کے سیکنڈ میٹ صاحب کے لیے رات کی ٹوپی اور دوا دینے کے لیے ایک فالتو انجیل۔ اس کے بعد دونوں کپتان بلڈیڈ اور پلیگ کمرے سے باہر آئے اور پلیگ نے چیف میٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا مسٹر اسٹاربک، ہر چیز ٹھیک ہے نا؟ کپتان اہاب تو بالکل تیار ہیں۔ ابھی ان سے پوچھ کے آ رہا ہوں۔ ساحل پر سے کچھ اور تو نہیں لانا؟ اچھا تو سب جہازیوں کو بلاؤ اور ان حرامیوں کو جہاز کے پچھلے حصّے میں جمع کرو۔"

بلڈیڈ نے کہا۔ "پلیگ، تمھیں گالی کی بھی جلدی ہی۔ مگر گالیاں نہ بکو۔ مسٹر اسٹاربک تم جاؤ اور جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ کرو۔"

دیکھا! جہاز کا سفر شروع ہونے والا تھا لیکن کپتان بلڈیڈ اور کپتان پلیگ ایسے کر رہے تھے جیسے بندرگاہ کی طرح سمندر میں بھی جہاز کی کمان انھیں دونوں کے ہاتھوں میں رہے گی۔ رہا کپتان اہاب تو اس کا ابھی تک کوئی پتا نہ تھا۔ بس اتنا سنا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ مگر چیز یہ تھی کہ جب تک جہاز روانہ ہو کے سمندر میں خاصی دور نہ پہنچ جائے اس کا باہر نکلنا کچھ ایسا ضروری نہ تھا۔ واقعی یہ کام اس کا نہیں بلکہ جہاز کے رہبر کا تھا۔ اور چونکہ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا، اس لیے کپتان اہاب نیچے ہی رہا۔ بہرحال لوگ یہی کہتے تھے اور یہ بات بالکل درست بھی معلوم ہوتی تھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ تجارتی جہازوں میں تو بعض کپتان جہاز کی روانگی کے بہت دیر بعد تک عرشے پر نہیں آتے بلکہ جب تک ان کے ساحل والے دوست رہبر کے ہمراہ جہاز سے رخصت نہ ہو جائیں وہیں اپنے کمرے میں بیٹھے وہاں ہی رنگ رلیاں منانے میں لگے رہتے ہیں۔

لیکن اس وقت ان باتوں پر غور کرنے کی مہلت ہی کہاں تھی، کیونکہ کپتان پلیگ پورے زور میں تھا۔ معلوم ہوتا تھا لوگوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے اور ہدایتیں دینے کا زیادہ تر کام وہی کرتا ہے، بلڈیڈ نہیں۔

اس نے جہازیوں کو بڑے مستول کے پاس کھڑے ہوئے دیکھ کر پکارا۔

"جہاز کے پچھلے حصّے کی طرف چلو، حرامیو۔ مسٹر اسٹاربک، ان سب کو ادھر ہانکو۔"

"خیمہ اکھاڑ دو" — اگلا حکم تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ چھولداری بس اسی وقت لگائی جاتی تھی جب جہاز بندرگاہ میں کھڑا ہو۔ پیکوڈ پر تیس سال سے یہ بات ہر ایک کو معلوم تھی کہ لنگر اٹھنے کے بعد اگلا حکم خیمہ اکھاڑنے کا دیا جاتا ہے۔

"لنگر کا چرخ چلاؤ، لعنت ہو تم پر! زور لگا کے چلو!" اگلا حکم ملا، جہازی ایک کے چرخ کی سلاخیں پکڑنے لگے۔
لنگر اٹھنے کے وقت ریبر عام طور سے جہاز کے اگلے حصے میں کھڑا ہوتا ہے۔ یہاں بلڈیڈ جمّا ہوا تھا۔ یوں تو
اس کے ذمّے دوسرے فرائض تھے لیکن اس نے اور پیلگ نے ساتھ ساتھ ریبری کا اجازت نامہ بھی لے رکھا تھا۔ لوگوں کو
شبہ تھا اس نے اجازت نامہ یوں لیا ہے کہ اپنے جہازوں میں کسی ریبر کو پیسے نہ دینے پڑیں، کیونکہ وہ کسی اور کے جہاز
کی ریبری نہ کرتا تھا۔ غرض بلڈیڈ خاموشی سے لنگر اٹھوا رہا تھا اور کبھی کبھی بے رنگ مناجات کا ایک آدھ ٹکڑا الاپنے لگتا تھا
کہ ان لوگوں کا دل بڑھے۔ اُدھر سب ملاح مل کر چرخے کو ان میں کوئی جھگڑا کا ہاتھ ہے تھے۔ ابھی ہی دن پہلے بلڈیڈ نے
ہدایت کی تھی کہ جہاز میں کوئی بھی دنیاوی قسم کا گیت نہ گایا جائے خصوصاً جہاز کی روانگی کے وقت۔ اور اس کی بہن چیرٹی
نے ہر ملاح کے بستر پر مناجات کی ایک چھوٹی سی کتاب رکھ دی تھی۔

کپتان پیلگ جہاز کے دوسری طرف نگراں کھڑا تھا اور اس میں جو چال تھی کہ اب چل دیں تو سمجھا کہ لنگر اٹھنے سے
پہلے ہی یہ جہاز کو چلا دے گا۔ چرخ کی سلاخ گھماتے میں بالکل غیر اختیاری طور پر ڈر گیا اور کوئی کوئیک سے کہا
کہ تم میں رنگ چاؤ کیونکہ میں نے سوچا ایسے خوفناک ریبر کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے ہیں خدا جانے کیا کیا خطرے لاحق ہوں۔
بہر حال میں اپنے آپ کو اس خیال سے تسکین دے رہا تھا کہ بلڈیڈ بھلے پیسے تو بہت کم دیتے ہیں پھر بھی یہ
دیندار آدمی ہے۔ شاید یہ ہمیں بچالے۔ اتنے میں پیچھے سے کوئی نوکیلی چیز لگی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ بھوت
کپتان پیلگ میرے قریب سے اپنی ٹانگ ہٹا رہا تھا۔ میں تو سہم کے رہ گیا۔ یہ اس کی پہلی ٹھوکر تھی۔

"تیرے تجارتی جہازوں میں اسی طرح کام ہوتا ہے؟" وہ دھاڑا۔ "زور لگا، اُلّو کی دُم فاختہ! زور لگا، چاہے کمر
ہی کیوں نہ ٹوٹ جائے! تم لوگ زور کیوں نہیں لگاتے۔ چلو لوگو! لگے زور! او میاں چھوکرے، مکھن! زور لگاؤ!
او بھئی ترکی باز! ڈھیلے کیسے پڑ گئے؟ چل بے ہری! زور لگا! چلو سب مل کے زور لگاؤ، چاہے آنکھوں کے ڈھیلے نکل
پڑیں!" غرض یوں کہتا جاتا وہ ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا اور اس کی ٹھوکر بڑی فیاضی سے استعمال میں آ رہی تھی۔ دوسری
طرف بلڈیڈ مناجات الحان کے ساتھ اپنی مناجات گا رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا آج کپتان پیلگ نے ضرور چڑھا رکھی ہے۔

آخر لنگر اٹھ گیا۔ بادبان لگ گئے اور ہم چل پڑے۔ آج کرسمس کا دن تھا اور سردی غضب کی پڑ رہی تھی۔ شمال خطّے کا
مختصر سا دن جب رات میں جذب ہو گیا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سردی سے بچے ہوئے کھلے سمندر میں پہنچ چکے ہیں اور برف کا
جھاگ نے جہاز کو چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے زرہ بکتر کی طرح جکڑ لیا ہے۔ پشتی پر داستوں کی لمبی لمبی قطاریں چاندنی
میں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں اور برف کے زبردست خم دار ٹکڑے جہاز کے پیچھے ایسے لٹکے ہوئے تھے جیسے کسی دیوقامت
ہاتھی کے سفید سفید دانت۔

ڈولا چکا بلڈیڈ چونکہ ریبر تھا اس لیے پہرہ دینے والوں کے بچھے رہنے کی نگرانی اسی کو کرنی پڑتی تھی۔ جب یہ پرانا جہاز
سمندر کی سبز لہروں میں اندر تک دھنس جاتا، کہرے کے جمے ہوئے ٹکڑے فضا میں اُڑنے لگتے، ہوا غرّاتی اور رسّیاں

میں بس بس ہونے لگیں تو بلنڈیڈ کی پاٹ دار آواز ابھرتی ہوئی ہمارے کانوں تک آئی ——

"—— طوفان خیز لہروں کے اُس پار ہرے بھرے کھیت
اپنی دھانی پوشاک پہنے کھڑے ہیں،
اسی طرح یہودیوں کے سامنے دریائے یردن بہہ رہا تھا،
اور اُس پار کنعان کا شہر آباد تھا ——"

یہ شعر یا نظم مجھے کبھی آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس وقت ان الفاظ میں امید اور کامرانی گونج رہی تھی۔ متلاطم بحر اوقیانوس میں جہازوں کی یخ بستہ رات کے باوجود، اپنے گیلے پیروں اور اُس سے بھی زیادہ گیلے گوشت کے باوجود مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ آگے چل کے بہت سی جنتیں ملیں گی۔ ایسی سدا بہار وادیاں اور سبزہ زار آئیں گے جہاں چیزیں کے کانٹے لگنے والی گھاس پیروں کے نیچے آ کے مرتی نہیں، بلکہ شیٹ گرمیوں میں بھی ہری بھری رہتی ہے۔

آخر ہم اتنے کھلے سمندر میں آ پہنچے کہ اب ان دونوں بیڑوں کی ضرورت نہ رہی۔ وہ مضبوط بادبانی کشتی جو ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اب جہاز کے بالکل قریب آ گئی۔

یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ اس مرتبہ پیلیگ اور بلنڈیڈ دونوں دل گیر سے ہو رہے تھے خصوصاً کپتان بلنڈیڈ۔ اُس کا ابھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس جہاز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑتے دکھ ہوتا تھا جو طوفانی سمندروں میں اتنے طویل اور خطرناک سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ جس جہاز میں اس کے تحت مشقت جھیلتے ہوئے ہزاروں ڈالر لگے ہوئے تھے۔ جس جہاز میں اس کا ایک پرانا ساتھی کپتان بن کے جا رہا تھا جو خود اسی کی طرح بڈھا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر وہیل کے بے رحم جبڑوں کا سامنا کرنے نکلا تھا —— غرض یہ کہ جس چیز سے اس کے اتنے مفاد وابستہ تھے اس سے الگ دیکھا جاتا تھا۔ بیچارا بلنڈیڈ بڑی دیر تک جہاز پر ہی ٹھہرا رہا۔ پہلے تو بے چینی سے عرشے پر ٹہلا کیا، پھر جہاز کا جائزہ لیتے ہوئے کپتان کے کمرے میں دوسری دفعہ الوداع کہنے گیا، پھر عرشے پر آیا اور ہوا کے رخ کا اندازہ لگایا، پانی کی لامحدود وسعتوں کی طرف دیکھا جو کہیں نظروں سے دور مشرقی براعظموں کے پاس جا کے ختم ہوتی تھیں، خشکی کو دیکھا، اوپر دیکھا، دائیں بائیں دیکھا، ہر طرف دیکھا اور کسی طرف بھی نہیں دیکھا۔ آخر بے خیالی میں کھونٹے پر رسی لپیٹتے لپیٹتے مضطرب ہو کے اس نے پیلیگ کا ہاتھ پکڑ لیا اور لالٹین اٹھا کے بڑے ولولہ انگیز انداز میں مجھے پھر اس کے چہرے کو تکتا رہا جیسے کہہ رہا ہو خیر کوئی بات نہیں، دوست۔ مجھے یہ بھی گوارا ہے۔ ہاں، یہ بھی گوارا کروں گا۔

رہا پیلیگ تو اس کا انداز فلسفیانہ تھا لیکن سارے فلسفے کے باوجود جب لالٹین اس کے قریب آئی تو اس کی آنکھ میں بھی ایک آنسو جھلکنے لگا۔ پھر وہ بھی کبھی نیچے گیا، کبھی اوپر عرشے پر آیا، کبھی ملاحوں کو ہدایات کیں، کبھی چیف میٹ اسٹاربک سے دو چار لفظ کہے۔

لیکن آخر کار وہ ایک فیصلہ کن انداز میں اپنے ساتھی کی طرف مڑا اور بولا ——

"کپتان بلڈیڈ — آؤ دوست، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ مستول کا تختہ نیچے ہٹاؤ کشتی والو! آگے مت بڑھو جہاز کے قریب آجاؤ۔ با، ذرا احتیاط سے! احتیاط سے! — آؤ یار بلڈیڈ — جو کچھ کہنا ہے کہہ لو۔ خدا حافظ، اسٹاربک — خدا حافظ مسٹر وشب — خدا حافظ مسٹر فلاسک — سب کو خدا حافظ — بسلامت روی و باز آئی — تین سال بعد آج ہی کے دن میں تمھارے لیے نین ٹکٹ میں گرم گرم کھانا تیار رکھوں گا۔ اچھا، رخصت!"

"اچھا، خدا تمھارا حافظ و ناصر ہو جہازیو — بڈھے بلڈیڈ نے کچھ بے ربط سے انداز میں منمناتے ہوئے کہا — "خدا کرے موسم اچھا رہے تاکہ کپتان اہاب باہر نکل آئیں۔ ذرا دھوپ لگے گی تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم لوگ گرم ملکوں کی طرف جا رہے ہو، وہاں تو خوب دھوپ ہوگی۔ دیکھو، جہازیو، شکار میں احتیاط سے کام لینا۔ برچھے بازو، کشتیاں لے کے خواہ مخواہ نہ دھنس پڑنا۔ دیودار کے سفید تختوں کے دام سال بھر میں تین فی صدی چڑھ گئے ہیں۔ ہاں، دعائیں پڑھتے رہنا۔ اس میں کمی نہ کی جائے۔ مسٹر اسٹاربک، ذرا خیال رکھنا، لوہار فالتو سلائیں ضائع نہ کرے۔ اوہو، بادبان سینے کی سوئیاں ہری الماری میں ہیں! جہازیو، یہ مت کرنا کہ روز شکار کھیلتے رہو اور اتوار کے دن بھی کام نہ چھوڑو۔ لیکن اگر کوئی اچھا موقع ہو تو اسے ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ یہ تو خدا کی نعمت ہوگا۔ مسٹر وشب، شیرے کے پیپے کا دھیان رہے۔ شاید ٹپکتا ہے۔ — مسٹر فلاسک، اگر جزیروں میں پھرنا ہو تو خبردار کوئی فسق و فجور میں نہ پڑے۔ اچھا، خدا حافظ، خدا حافظ! مسٹر اسٹاربک، پنیر کو زیادہ دن کوٹھری میں مت پڑا رہنے دینا، سڑ جائے گا۔ مکھن ذرا دیکھ بھال کے خرچ کرنا — بیس سینٹ فی پونڈ آیا ہے۔ ہاں، ایک بات اور ہے، اگر"

"چلو، چلو، کپتان بلڈیڈ، اب چلو۔ یہ بک بک جھک جھک بہت ہولی — بس آؤ —" یہ کہہ کر پیلیگ اُسے گھسیٹتا ہوا جہاز کی دیوار کے پاس لے گیا اور دونوں کشتی میں کود گئے۔

اب جہاز اور کشتی اپنے اپنے راستے پر پڑ لیے، دونوں کے درمیان رات کی ٹھنڈی اور نم آلود ہوا چلنے لگی۔ ایک سمندری چڑیا چیختی چلاتی اُوپر اُٹھی۔ جہاز اور کشتی دونوں کے دونوں سروں پہ زیروزبر ہونے لگے۔ ہمارا دل بھر آیا۔ ہم نے تین دفعہ نعرے لگائے اور تن بہ تقدیر اندھوں کی طرح سنسان بحر اوقیانوس میں چل پڑے۔

ساحل

پچھلے کسی باب میں ایک لمبے تڑنگے جہازی بلکنگٹن کا ذکر ہوا تھا۔ یہ شخص سمندر کے سفر سے ابھی واپس آیا تھا اور اُس سے میری ملاقات نیو بیڈفورڈ کی سرائے میں ہوئی تھی۔

جب رات کی اس کڑکڑاتی سردی میں پیکوڈ گویا ایک انتقامی جذبے کے ماتحت کینہ پرور موجوں کا سینہ چیرنے لگا تو سکان کے پاس بھلا مجھے کون کھڑا نظر آیا؟ بلکنگٹن! اسے دیکھ کر مجھے ہمدردی سی ہوئی لیکن مجھ پر سب سے زیادہ تو ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ یہ شخص چار سال کی بحری مہم کے بعد ٹھیک جاڑوں میں خشکی پر واپس آیا تھا لیکن بے چین ہو کے پھر طوفانوں کا مقابلہ کرنے چل کھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خشکی پر اُس کے پیر جلتے ہوں۔ سب سے حیرت انگیز چیزیں وہ ہوتی ہیں جو بیان میں نہ آ سکیں۔ گہری یادوں کے اوپر کوئی کتبہ نہیں ہوتا۔ اس چھوٹے سے باب کو بلکنگٹن کی بے نام و نشان قبر سمجھیے۔ البتہ میں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ اُس کا وہی حال ہوا جو طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کا ہوتا ہے، یعنی اس کے عالم میں بس خشکی کے کنارے کنارے چلا کرتا ہے، ساحل پر نہیں آتا۔ بندرگاہ والوں کو جہاز پر ترس آتا ہے، وہ بڑی خوشی سے مدد دینے کو تیار ہیں، بندرگاہ میں سلامتی ہے، آرام ہے، آتشدان ہے، کھانا ہے، گرم گرم کمبل ہیں، دوست ہیں، غرض ہر وہ چیز میسّر ہے جس سے فانی انسان کو راحت ملتی ہے۔ لیکن اس طوفان میں جہاز کا سب سے بڑا دشمن ہے بندرگاہ ——— خشکی۔ جہاز کو اس مہمان نوازی سے دور بھاگنا پڑتا ہے۔ اگر جہاز کا پچھلا حصہ تک خشکی سے چھو بھی گیا تو لرز لرز جائے گا۔ جہاز سارے بادبان لگا کے اپنا پورا زور ساحل سے دور ہٹنے میں صرف کر دیتا ہے۔ جو ہوائیں اسے گھر کی طرف لا رہی ہیں انھیں سے لڑتا ہے، پھر وہیں سمندر کی متلاطم پہنائیوں میں ٹھکانا ڈھونڈتا ہے۔ بالکل مایوس ہو کر خطرے کے اندر پناہ لیتا ہے۔ اُس وقت تو اُس کا واحد دوست اُس کا سب سے زبردست دشمن بن گیا ہے!

اب تو آپ بلکنگٹن کو پہچان گئے نا؟ اب تو آپ نے اس حقیقت کی ایک جھلک دیکھ لی جو انسان سے برداشت نہیں ہوتی؟ یعنی گہرے اور سنجیدہ فکر کا مطلب یہ ہے کہ چاہے آسمان اور زمین کی وحشی ہوائیں مل کر اُسے کیسے ہی اور دغاباز ساحل پر پھینک دینا چاہتی ہوں، لیکن روح اپنے سمندر میں آزادی سے گھومنے پھرنے کی دلیرانہ جدوجہد میں مصروف رہے۔

اعلیٰ ترین حقیقت سمندر کی طرح لامحدود ہے، ساحل سے بے نیاز ہے، خدا کی طرح لامتناہی ہے۔ چاہے سلامتی کے کنارے پر کیوں نہ ہو، لیکن ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کی ذلّت سے تو یہ بہتر ہے کہ انہی ہولناک پہنائیوں میں موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ پھر رینگتی ہوئی گندے کیڑوں کی طرح کوئی بزدلانہ ساحل کی طرف کیوں جائے

آہ! کتنی ہیبت ناک چیز ہے! کیا یہ ساری اذیت یوں ہی رائگاں جائے گی! جنت نہ ہارو، بلند کھٹکنی، جنت نہ ہارو!
تم دوڑ کا ٹنے والے ہو، خبردار، قدم نہ ڈگمگانے پائے! تم سمندر میں فنا ہو گئے تھے۔ لو وہ دیکھو، برجوں میں
سے تمھاری روح دیوتاؤں کے آسمان کی طرف اُڑی جا رہی ہے!

باب - ۲۴

وکالت

اب چونکہ میں نے اور کوئیکوگ نے وہیل کے شکار کا پیشہ تو کیے اختیار کر لیا پھر اس پیشے کو عقل والے نہ معلوم کیوں غیر شاعرانہ اور مذموم سمجھنے لگے ہیں۔ لہٰذا خشکی والو میں تمھیں قائل کرنے کو ہوں کہ ہم وہیل کے شکاریوں کے ساتھ بڑی بے انصافی کی گئی ہے۔

یہ ثابت کر کے دکھانا تو تحصیلِ حاصل ہو گا کہ عام طور سے لوگ وہیل کے شکار کو اُن کاموں کے برابر نہیں سمجھتے جنھیں آزاد پیشے کہا جاتا ہے۔ اگر بڑے شہروں کی کسی محفل میں جہاں ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوں کسی کو شکار پیشہ باز کی حیثیت سے پیش کیا جائے تو اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کی جائے گی اور اگر بحری فوج کے افسروں کی تقلید میں وہ اپنے ملاقاتی کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ اپنا پیشہ بھی لکھ دے تو بات بڑی مضحکہ خیز اور جسارت آمیز ہو گی۔

دنیا ہم وہیل کے شکاریوں کا احترام نہیں کرتی تو بلاشبہ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے ـــــ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا پیشہ زیادہ سے زیادہ قصائیوں کے کام کی طرح ہے اور جب ہم اپنا کام کرتے ہیں تو ہمارے چاروں طرف ہر قسم کی گندگی بکھری ہوتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم لوگ قصائی ہیں۔ لیکن بڑے بڑے قصائی تو سپہ سالار ہوتے ہیں جنھیں دنیا سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ رہا ہمارے پیشے کی گندگی کا معاملہ، تو ابھی آپ کو چند ایسے حقائق سے آگاہ کیا جائے گا جن سے لوگ عام طور پر ناواقف ہیں۔ لیکن جن کے ذریعے یہ بات سورج کی طرح ثابت ہو جائے گی کہ وہیل کے شکار کو جانے والا جہاز اس صاف ستھری زمین کی پاکیزہ ترین چیزوں میں سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ الزام درست ہے تو بھی شکاری جہاز کے عرشے کی بے ترتیبی اور پھسلن کا اُس میدان کی گھناؤنی لاشوں سے کیا مقابلہ جہاں سے واپس آکر سپاہی خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں؟ اگر خطرے کا خیال عام لوگوں کی نظر میں سپاہی کے پیشے کی توقیر بڑھا دیتا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ بڑے بڑے جگرے کے سپاہی جو دندناتے توپ کے منہ میں گھستے چلے گئے ہیں، کسی وہیل کی زبردست دُم کو ہوا میں اچھالتے دیکھ پائیں تو ساکت رہ جائیں۔ کیونکہ انسان کی قابلِ فہم ہولناکیاں خدا کی پیچ در پیچ ہولناکیوں اور معجزوں کے سامنے کیا مال ہیں!

لیکن دنیا چاہے ہم وہیل کے شکاریوں کو حقیر سمجھے، پھر بھی غیر شعوری طور پر ہمیں سب سے بڑا خراجِ تحسین پیش کرتی ہے، بلکہ ہماری پرستش کرتی ہے، کیونکہ دنیا بھر میں جتنی شمعیں، چراغ اور موم بتیاں جلتی ہیں وہ گویا ہمارے مندر کے دیے ہیں اور ان کے ذریعے ہماری تقدیس و تمجید کی جاتی ہے!

خیر اب اس معاملے کو ہر نقطۂ نظر سے دیکھیے، ہر معیار سے جانچیے۔ ذرا یہ دیکھیے کہ ہم وہیل کے شکاری لوگ

کیا ہیں اور کیا رہے ہیں۔

ڈی وٹ کے زمانے میں ہالینڈ کے لوگ وہیل کے شکار کو جانے والے بیڑوں پر امیر البحر کیوں مقرر کرتے تھے؟ فرانس کے بادشاہ لوئی شانزدہم نے اپنے خرچ پر ڈنکرک میں وہیل کے شکاری جہاز کیوں تیار کرائے اور خود ہمارے جزیرے نین ٹکٹ سے دو ایک درجن خاندانوں کو نہایت تعظیم کے ساتھ کیوں بلوایا؟ ۱۷۵۰ء اور ۱۷۸۸ء کے درمیان برطانیہ نے اپنے وہیل کے شکاریوں کو دس لاکھ پونڈ سے زیادہ انعام کیوں دیا؟ پھر یہ کیا قصہ ہے کہ دنیا بھر میں کل ملا کے اتنے وہیل کے شکاری نہیں ہوں گے جتنے امریکی ہیں؟ ہمارے بیڑے میں سات سو سے زیادہ جہاز ہیں جن میں اٹھارہ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر سالانہ چالیس لاکھ ڈالر خرچ آتے ہیں۔ روانہ ہوتے وقت جہازوں کی قیمت دو کروڑ ڈالر ہوتی ہے اور ان کی بدولت ہماری بندرگاہیں ہر سال سات کروڑ ڈالر کماتی ہیں۔ اگر یہ پیشہ کوئی زبردست چیز نہیں ہے تو پھر یہ کیا قصہ ہے؟

لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں، ابھی تو اور سنیئے۔

میرا دعویٰ ہے کہ آپ کے مہذب اور شائستہ فلسفی کسی ایک ایسی چیز کا نام نہیں بتا سکتے جس نے پچھلے ساٹھ سال کے عرصے میں بحیثیت مجموعی ساری دنیا پر نہایت پُرامن طریقے سے اتنا زبردست اثر ڈالا ہو جتنا اس عظیم الشان پیشے نے۔ اس کی بدولت مختلف طریقوں سے چند ایسے واقعات رُونما ہوئے ہیں جو بذاتِ خود بھی اہم ہیں اور جن سے برابر اتنے وسیع نتائج مرتب ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ وہیل کے شکار کو مصر کی اس عورت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کے پیٹ سے حاملہ بچیاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان چیزوں کی فہرست کوئی کہاں تک بنائے۔ نمونہ از خروارے، دو ایک دیکھیے۔ کرۂ زمین کے دور دراز اور نامعلوم علاقوں کا کھوج لگانے میں وہیل کے شکاری جہاز ایک مدت سے رہنما کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ جہاز ایسے ایسے جزیروں اور سمندروں میں جا پہنچے ہیں جن کا کوئی نقشہ نہ تھا، جہاں آج تک کسی سیاح کا قدم نہ گیا تھا۔ آج کل امریکہ اور یورپ کے جنگی جہاز نہایت اطمینان کے ساتھ اُن بندرگاہوں میں جا ٹھہرتے ہیں جو پہلے جنگلیوں کے قبضے میں تھیں، تو انھیں چاہیے کہ وہیل کے شکاری جہاز کو توپوں سے سلامی دیا کریں، کیونکہ انھیں ہی نے تو سب سے پہلے راستہ دکھایا تھا اور پہلے پہل وحشیوں اور گورے آدمیوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ لوگ کُک اور کروسین سٹرن جیسے سیاحوں کے کارناموں کی جتنی چاہیں تعریف کریں، مگر نین ٹکٹ سے بیسیوں گمنام کپتان ایسے نکلے ہیں جو ان سیاحوں سے کہیں بڑے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ نہتے اور بے یار و مددگار وحشیوں اور شارک مچھلیوں سے بھرے ہوئے سمندروں میں اور چھوٹے چھوٹے بے نام جزیروں کے ساحلوں پر ایسے ایسے عجیب اور ہولناک خطرات کے مقابلے میں ڈٹ گئے ہیں جن کے سامنے کُک اپنے جہازوں اور بندوقوں کے باوجود ٹھہر تک نہ سکتا تھا۔ جنوبی سمندر کے سیاحت ناموں میں جن باتوں کو زبردست کارنامہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ نین ٹکٹ کے دلاور جہازرانوں کے لیے تو روزمرہ کی پیش پا افتادہ چیزیں ہیں۔

جن واقعات پر دین کورو نے تین تین باب صرف کیے ہیں انھیں تو ان لوگوں نے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ جہاز کے روزنامچے میں ہی لکھ دیں۔ ہائے یہ دُنیا! ہائے، یہ دُنیا!

جب تک وہیل کے شکاری کیپ ہورن کے اس پار نہیں گئے بحر الکاہل کے ساحل پر اسپین کے زرخیز مقبوضات اور یورپ کے درمیان تجارت یا آمد و رفت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ اپنی نو آبادیات میں جانے کا حق صرف اسپین والوں کو حاصل تھا۔ اسپین کے بادشاہوں کی اس اجارہ داری کو سب سے پہلے وہیل کے شکاریوں نے توڑا۔ اگر جگہ ہوتی تو نہایت واضح طور سے دکھایا جا سکتا تھا کہ پیرو، چلی اور بولیویا کو آخر انھیں شکاریوں کی بدولت اسپین کے پنجے سے رہائی ملی اور وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔

کرۂ ارض کے دوسری طرف جو عظیم الشان امریکہ ہے یعنی آسٹریلیا، وہ بھی تہذیب یافتہ دُنیا کو وہیل کے شکاریوں سے ہی ملا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے ایک ہالینڈ والے نے یوں ہی غلطی میں دریافت کیا۔ اس کے بعد بہت دن تک جہازراں ساحلوں سے کتراتے ہی رہے کیونکہ یہاں نہایت خونخوار جنگلی بستے تھے۔ لیکن وہیل کے شکاری وہاں بھی جا پہنچے۔ یہ زبردست نو آبادی دراصل شکاری جہاز کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ پھر وہاں کی سب سے پہلی بستی کو ابتدائی زمانے میں وہیل کے شکاریوں نے ہی کئی دفعہ بسکٹ دے کر فاقوں سے بچایا، کیونکہ وہ خوش قسمتی سے ہر ایسے موقع پر اس علاقے میں آ پہنچے۔ بحر الکاہل کے ان گنت جزیرے ہیں داستان دہراتے ہیں اور تجارتی مال کے ذریعے شکاری جہازوں کے احسان کا بدلہ چکاتے ہیں، کیونکہ مبلغوں اور تاجروں کا راستہ انھیں جہازوں نے صاف کیا تھا، بلکہ بعض حالات میں تو ابتدائی زمانے کے مبلغوں کو ان کی پہلی منزل تک پہنچایا تھا۔ جاپان کے ملک نے ابھی تک تو اپنا دروازہ بند کر رکھا ہے، لیکن اگر اس نے کبھی مہمان نوازی دکھائی تو اس کا سہرا شکاری جہازوں کے سر ہو گا کیونکہ یہ دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔

لیکن اگر ان تمام باتوں کے باوجود آپ اب بھی یہی کہتے جائیں کہ وہیل کا شکار جمالیاتی اعتبار سے کوئی بلند چیز نہیں ہے تو میں آپ سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہر دفعہ پالا میں ہی ماروں گا۔

آپ کہیں گے کہ وہیل کے متعلق کسی مشہور مصنف نے کچھ نہیں لکھا اور وہیل کے شکار کو ایک بھی مشہور مؤرخ نہیں ملا۔

کسی مشہور مصنف نے نہیں لکھا، کوئی مشہور مؤرخ نہیں ملا! بھلا بتائیے تو سہی، وہیل کا حال سب سے پہلے کس نے لکھا؟ جناب حضرت ایوبؑ نے! اور وہیل کے شکار کی داستان سب سے پہلے کس نے بیان کی؟ کسی چھوٹے موٹے آدمی نے نہیں، بلکہ خود الفریڈ اعظم نے۔ ناروے کے شکاری اوتھر سے سارا حال سن کر اپنے شاہی قلم سے لکھا! اچھا انگلستان کی پارلیمنٹ میں ہماری مدح کس نے پڑھی؟ ایڈمنڈ برک نے!

خیر ٹھیک ہے۔ مگر خود وہیل کے شکاری تو چھچھورے لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی رگوں میں شریفانہ خون نہیں ہوتا۔

اُن کی رگوں میں شریفانہ خون نہیں ہوتا! بی شاہی خون سے بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ بنجمن فرینکلن کی نانی میری موریل

تھی۔ بعد میں اس کی شادی ونگر خاندان میں ہوئی۔ وہ تین ٹکٹ کے سب سے پرانے باشندوں میں سے تھی۔ اس کا خاندان اب تک چلا آرہا ہے۔ یہ لوگ بڑے جانباز ہیں اور دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک آج بھی اپنا پرچم چمکا رہے ہیں یہ سب کے سب فرینکلن گھر کے رشتے دار ہیں۔

پچھلے یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر سب لوگوں کی یہی رائے ہے کہ وہیل کا شکار کوئی شریفانہ کام نہیں۔

شریفانہ کام نہیں؟ وہیل کا شکار تو شاہانہ کام ہے۔ پرانے انگریزی قانون کی رو سے وہیل تو "شاہانہ مچھلی" ہے[1]

اسے، یہ تو محض برائے نام ہے۔ خود وہیل تو کسی شاندار طریقے سے کبھی ہمارے سامنے نہیں آئی۔

شاندار طریقے سے سامنے نہیں آئی؟ جس زمانے میں روم کو دنیا کا دارالخلافہ سمجھا جاتا تھا جب ایک سپہ سالار شہر میں آیا اور اس کے استقبال کے لیے بڑے زبردست جلوس نکالے گئے تو اس مظاہرے میں سب سے نمایاں چیز وہیل کا ڈھانچا تھا جو شام کے ساحل سے لایا گیا تھا۔

آپ نے یہ تاریخی واقعہ سنایا ہے تو خیر مان لیا، مگر آپ چاہے کچھ بھی کہیں اس پیشے میں کوئی وقار نہیں۔

کوئی وقار نہیں؟ ہمارے پیشے میں کتنا وقار ہے اس کی گواہی تو آسمان تک دیتا ہے۔ ستاروں کے ایک برج کا نام حوت ہے۔ خیر، بحث بے کار ہے۔ چاہے آپ کسی شہنشاہ کا احترام کریں یا نہ کریں، لیکن کوئی کوئیگ کو تعظیم دینی پڑے گی۔ بحث بے کار ہے۔ میں ایک ایسے آدمی سے واقف ہوں جس نے اپنی عمر میں تین سو پچاس وہیل مچھلیاں ماری ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ شخص پرانے زمانے کے اُس عظیم سپہ سالار سے زیادہ قابلِ احترام ہے جسے ناز تھا کہ میں نے تین سو پچاس قلعہ بند شہر فتح کیے ہیں۔

رہا میں، تو اگر میرے اندر اتفاق سے کوئی جوہر اب تک چھپا پڑا ہے، اگر کبھی اس چھوٹی سی لیکن بلند اور پرسکون دنیا میں مجھے کوئی حقیقی شہرت ایسی حاصل ہوئی جس کی میں اپنی بساط کے مطابق تمنا کر سکوں، اگر آئندہ میں نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس کا کرنا انجام نہ کرنے سے ہزار درجے بہتر ہو، اگر میرے مرنے کے بعد میرے وارثوں کو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے قرض خواہوں کو میری میز میں سے کوئی بیش قیمت مسودہ ہاتھ لگے تو میں ابھی سے اعلان کیے دیتا ہوں کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ عزت اور وقار وہیل کے شکار میں ہے۔ کیونکہ شکاری جہاز میری درس گاہ، میرا کالج، میری یونیورسٹی، غرض سب کچھ تھا۔

---

[1] اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے اگلے باب دیکھیے۔

باب - ۲۵

مزید برآں

اس پیشے کا وقار ثابت کرنے کے لیے میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو مستند نہ ہو، لیکن اگر کوئی وکیل اپنے دلائل پیش کرنے کے بعد ایک اچھا خاصا معقول قیاس بالکل ہی گول کر جائے، حالانکہ اس سے مقدمے میں بڑی مدد مل سکتی ہو، تو کیا ایسے وکیل کو مورد الزام نہ گردانا جائے گا؟

یہ تو مشہور بات ہے کہ آجکل کے زمانے میں بھی بادشاہوں اور ملکاؤں کی تاج پوشی کے وقت ایک عجیب و غریب رسم ادا کی جاتی ہے جسے یوں کہنا چاہیے کہ ان کے مسالہ لگایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک شاہی نمک دان ہوتا ہے اور شاید شاہی تیل دان بھی ہوتا ہوگا۔ خدا جانے یہ نمک کس طرح استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بہر حال اتنی بات یقینی ہے کہ تاج پوشی کے وقت بادشاہ کے سر پر بڑے اہتمام کے ساتھ تیل چپڑا جاتا ہے جیسے گوشت کے اوپر۔ کہیں تیل اس غرض سے تو نہیں لگایا جاتا کہ بادشاہ کا دماغ ٹھیک طرح کام کرے، وہی جیسے مشین میں تیل دیا جاتا ہے؟ یہ شاہانہ رسم کوئی معقول چیز ہے یا نہیں، اس کے متعلق کئی باتیں غور کرنے کی ہیں، کیونکہ جو شخص بالوں میں تیل چپڑتا ہو اور جس کے سر سے تیل کی بو آئے، عام طور سے ہم اسے بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوا کے طور پر استعمال کرنے کی بات تو اور ہے لیکن پختہ عمر کا آدمی بالوں میں تیل لگائے تو اس کے دماغ میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ہوگا۔ بحیثیت مجموعی ایسا آدمی قطعاً معقول نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہاں تو ہمیں بس ایک بات سے مطلب ہے۔ تاج پوشی کے وقت کس قسم کا تیل استعمال ہوتا ہے؟ زیتون کا تیل تو ہو نہیں سکتا، نہ سرسوں کا، نہ ریڈی کا، نہ ریچھ کا، نہ معمولی مچھلیوں کا۔ یہ تو بس ایک ہی قسم کا تیل ہو سکتا ہے — یعنی وہیل کا غیر معمولی اور خالص تیل — دنیا کا بہترین اور پاکیزہ ترین تیل۔

شاہ پرست انگریزو، کبھی اس بات پر بھی غور کرو۔ تمھارے بادشاہوں اور ملکاؤں کی تاج پوشی کے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہم وہیل کے شکاری مہیا کرتے ہیں!

باب ۲۶

سردار اور اُن کے ساتھی (۱)

پیکوڈ کا چیف میٹ اسٹاربک تھا، نین ٹکٹ کا رہنے والا اور خاندانی کویکر۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور پُرخلوص آدمی تھا۔ پیدا تو ہوا ایک برفیلے ساحل پر، لیکن گرم ملکوں میں بھی بالکل ٹھیک رہتا تھا کیونکہ اس کا جسم اتنا سخت اور مضبوط تھا جیسے کرارا بسکٹ۔ بحرالکاہل کے جزیروں میں جا کر بھی اس کا خون خراب نہیں ہوتا تھا جیسے بوتل میں بند شراب نہیں بگڑتی۔ وہ یقیناً خشک سالی یا قحط کے زمانے میں پیدا ہوا ہوگا، یا پھر روزے کے دن، کیونکہ اس معاملے میں یہ علاقہ بہت مشہور ہے۔ ابھی اس نے صرف تیس بنجر اور سوکھی ہوئی گرمیاں دیکھی تھیں۔ ان گرمیوں نے اس کے سارے جسمانی زوائد کو خشک کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر یہ دبلا پن نہ تو گھلا ڈالنے والی فکروں اور پریشانیوں کی علامت معلوم ہوتا تھا، نہ کسی جسمانی مرض کی نشانی۔ یہ آدمی بس اس کے بدن کا نچوڑ تھا۔ چونکہ سارا اڑ چکا تھا۔ اُسے بدصورت کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ بات اس کے برعکس تھی۔ بے داغ جلد تنی ہوئی اور چست، پھر اندرونی صحت اور قوت میسر۔ چنانچہ اسٹاربک ایسا لگتا تھا، جیسے مصر کی کوئی ممی دوبارہ زندہ ہو گئی ہو۔ معلوم ہوتا تھا اُسے بنایا ہی اس طرح گیا ہے کہ ایک مدت دراز تک چلے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے جیسا اب تھا۔ گویا گھڑیوں کی طرح اس کی اندرونی قوت کی بھی ضمانت ہو چکی تھی کہ چاہے قطب شمالی کا برف ہو یا گرم خطوں کی دھوپ، ہر قسم کی آب و ہوا میں ٹھیک رہے گی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے اُن ہزاروں خطروں کے عکس ابھی تک وہیں جھلکتے ہوئے نظر آنے لگتے تھے جن کا اس نے عمر بھر نہایت سکون کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ وہ نہایت مستقل مزاج اور دھیما آدمی تھا۔ اس کی زندگی نے افعال سے ترکیب پائی تھی، الفاظ سے نہیں۔ اس کی زندگی میں حال قسم کا شور و شغب نہیں تھا، بلکہ معنی خیز گونگی حرکت۔ لیکن سنجیدگی، جفاکشی اور مستقل مزاجی کے باوجود اس میں چند صفات ایسی تھیں جو کبھی کبھی دوسری صفات کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی تھیں بلکہ بعض دفعہ تو بالکل ہی غالب آجاتی تھیں۔ دوسرے جہازیوں کو دیکھتے ہوئے تو وہ بڑا ہی ایماندار تھا۔ پھر فطرت نے اُسے احترام کا مادہ بھی عطا کیا تھا، چنانچہ بحر و سمندر کی وحشت ناک تنہائی میں رہتے رہتے وہ خاصا توہم پرست ہو گیا تھا، لیکن یہ توہم پرستی وہ تھی جو ایک خاص طبیعت کے لوگوں میں جہالت سے نہیں، بلکہ ذہانت سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ خارجی شگونوں کا بھی قائل تھا اور اس بات کا بھی کہ آدمی کو آنے والے واقعات کا اندازہ پہلے سے ہی ہو جاتا ہے۔ یوں تو اس کی روح پختہ فولاد کی طرح تھی، لیکن یہ چیزیں بعض اوقات اُسے نرم کر دیتی تھیں۔ ان سے بھی زیادہ دل گداز اپنے گھر، نوجوان بیوی اور بچے کی یادیں تھیں جو اس کے مزاج کی درشتی کم کر کے اُن چھپے ہوئے رجحانات کو بروئے کار لے آتی تھیں جن کے طفیل بعض نیک دل انسانوں میں جانبازی کا وہ شدید جوش باقی نہیں رہتا جو ویل کے شکاریوں میں خطرات کے موقع پر دوسروں کی طرف سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔ اسٹاربک کہا کرتا تھا ——— "میں اپنی کشتی میں

کسی ایسے آدمی کو نہیں بیٹھنے دوں گا جو وہیل سے نہ ڈرتا ہو۔ اس بات کا مطلب ایک تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد
اور سودمند جرأت وہ ہے جو خطرے کے صحیح اندازے سے پیدا ہو اور دوسرے یہ کہ جو شخص بالکل ہی نڈر ہو وہ بزدل
آدمی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

سیکنڈ میٹ اسٹب کہتا تھا ——— "ہاں، اسٹاربک جیسا آدمی ہمارے پیشے میں دوسرا نہیں۔" لیکن آپ آگے چل کے
دیکھ لیں گے کہ اسٹب جیسا آدمی یا وہیل کا کوئی بھی شکاری جب "محتاط" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

اسٹاربک کو جان بوجھ کے خطرات میں پڑنے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ اس کے نزدیک جرأت کوئی جذبہ نہ تھا، بلکہ ایک
کام آنے والی چیز جو سخت ضرورت کے موقعوں پر ہمیشہ اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہیل کے شکار میں گوشت
اور روٹی کی طرح جرأت بھی جہاز کے ساز و سامان کا ایک حصہ ہے اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسے یہ
بات بالکل پسند نہ تھی کہ سورج غروب ہونے کے بعد وہیل کا پیچھا کیا جائے یا اگر کوئی مچھلی اس کے مقابلے میں ڈٹ
گئی ہو تو وہ بھی اس کے مقابلے میں ڈٹ جائے۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس خطرناک سمندر میں اپنی روزی کے لیے وہیلیں مارنے
آیا ہوں، ان کی روزی کے لیے ہلاک ہونے نہیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ سینکڑوں آدمی اسی طرح موت کے گھاٹ
اتر چکے تھے۔ خود اس کے باپ کا انجام کیا ہوا تھا؟ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اسے اپنے بھائی کے کٹے پھٹے اعضا
کہاں مل سکتے تھے؟

توہم پرستی اور اس قسم کی یادوں کے باوجود اسٹاربک کی دلیری اور جرأت کبھی نہ کبھی جوش میں آ ہی جاتی تھی۔ اس میں شک
نہیں کہ وہ بڑا جیدار آدمی ہو گا لیکن جو آدمی اس پیشے کا ہو اور اپنے اندر ایسے خوفناک تجربات اور یادیں لیے پھرتا ہو اس کے
معاملے میں تو یہ بالکل فطری اور لازمی بات ہے کہ یہ چیزیں چپکے چپکے اس میں ایک ایسا عنصر پیدا کر دیں جو موقع ملتے ہی
اپنی قید سے نکل پڑے اور اس کی ساری دلاوری کو خاک میں ملا دے۔ اسٹاربک بہادر تو تھا لیکن یہ بہادری اس قسم
کی تھی جو بعض دلیر آدمیوں میں نظر آتی ہے یعنی جو سمندروں، ہواؤں، وہیلوں یا دنیا کی ان ہولناک چیزوں کے مقابلے میں
تو بامردی سے ڈٹ جاتی ہے جو خلافِ عقل لیکن ساتھ ساتھ معمولی بھی ہوں، مگر اس ہیبت کو ذرا بھی برداشت نہیں کر سکتی
جو روحانیت آمیز ہونے کی وجہ سے اور بھی خوفناک ہو جاتی ہے اور بعض اوقات کسی عظیم اور مغلوب الغضب انسان کی آنکھ اور
پیشانی سے جھانک جھانک کر ہمیں ڈراتی ہے۔

لیکن اگر اس کہانی میں آگے چل کر کوئی ایسا مقام آیا جہاں بیچارے اسٹاربک کی ہمت اور مستقل مزاجی بالکل ختم ہوتی
معلوم ہو تو شاید مجھ سے یہ واقعہ لکھا بھی نہ جا سکے۔ کیونکہ انسان کی روح میں دلاوری کی شکست دکھانا بہت ہی اندوہناک بلکہ
مذموم چیز ہے۔ جماعتوں اور قوموں کی حیثیت سے چاہے انسان قابلِ نفرت معلوم ہوں، بدمعاشوں، احمقوں اور قاتلوں
کی بھی چاہے کوئی کمی نہ ہو، انسانوں کے چہرے بھی حقیر اور ذلیل ہوں، مگر انسان ایک تصور کی حیثیت سے ایک اتنی بلند،
عظیم الشان اور تابناک چیز ہے کہ اگر اس میں کوئی نفرت انگیز عیب لگے تو دوسرے انسانوں کو جلدی سے اس پر اپنے
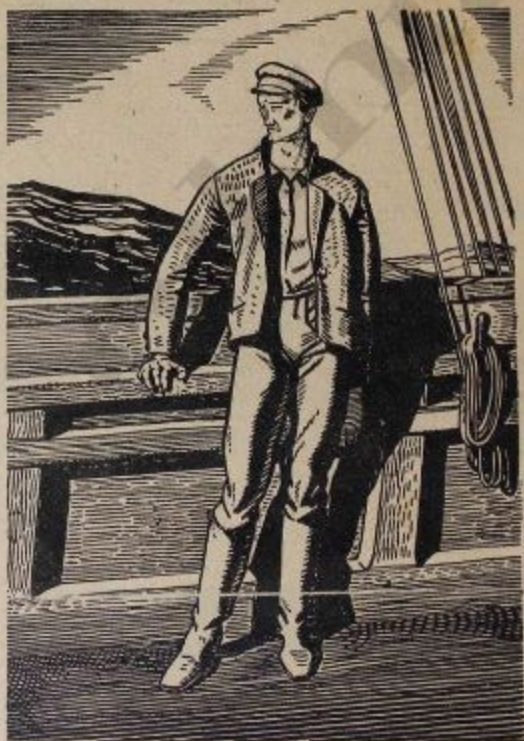
بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑے اُتار کے ڈال دینے چاہئیں۔ ہماری رُوح کی گہرائیوں میں ایک ایسی معصوم اور پاکیزہ مردانگی ہوتی ہے جو خارجی کردار کے ختم ہو جانے کے بعد بھی جُوں کی تُوں رہتی ہے۔ جس آدمی کی دلاوری بالکل تَس نَس ہو چکی ہو اُسے بے نقاب دیکھ کر یہ مردانگی اذیت کے مارے خوُن کے آنسو رونے لگتی ہے۔ یہ شرمناک منظر دیکھنے کو ہماری دینداری تک اُن آسمانی طاقتوں کے خلاف زہر اُگلنے لگتی ہے جنھوں نے ایسی بات روا رکھی۔ لیکن میں جس اعلیٰ وارفع وقار کا ذکر کر رہا ہوں یہ بادشاہوں اور شاہانہ لباسوں کا وقار نہیں ہے، بلکہ وہ بھرپور وقار ہے جو چوغوں کی رعب یا زرّیں لباسوں سے ظہور کا بھی محتاج نہیں۔ یہ وقار آپ کو اُس بازو میں نظر آئے گا جو پھاوڑا چلاتا ہے یا ہتھوڑا اٹھاتا ہے ــــــ وہ جمہوری وقار جس کا منبع خدائے تعالیٰ کی ذات ہے، جمہوریت کا مرکز اور محور، جو قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور یہی چیز ہماری مساواتِ کُلّی خاص ہے اور اُسے عظمت بخشتی ہے!

لہٰذا اگر میں حقیر جہازیوں، مرتدوں اور جلاوطنوں میں تاریک اور پُراسرار لیکن نہایت بلند صفات دکھاؤں، اُن کی شکل میں المیہ کا سا جلال اور حُسن پیدا کروں، اگر ان میں سے کوئی انتہائی فرومایہ بلکہ انتہائی ذلیل شخص بعض اوقات رُوحانی بلندیوں پر جا پہنچے، اگر میں کسی غلام کے بازو کو آسمانی نُور میں نہلا دوں، اگر میں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اندوہناک تاریکی میں ایک قوسِ قزح روشن کر دوں تو اُسے مساوات کی رُوح جس نے میرے سارے ہم جنسوں کو انسانیت کی ایک ہی خلعت بخشی ہے تمام زہریلے نقادوں کے مقابلے میں میری گواہ رہیو! اے جمہوریت پسند خدا! تو اس معاملے میں میرا گواہ اور رہبر ہو! تو جس نے جون بنین جیسے دہقانی اور قیدی تک کو شاعری کا جوہر عطا کیا، تو جس نے مفلس نقاش اور بوڑھے سروانٹیس کو زرّیں خلعت سے نوازا، تو جس نے اینڈریو جیکسن کو خاک سے اُٹھا کر میدانِ جنگ میں پہنچا دیا اور اُسے وہ جاہ وجلال بخشا جو بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں، اور جو زمین پر اپنی عظیم فوج کی سرداری کے لیے صرف اُن لوگوں کو انتخاب کرتا ہے جن کا تعلق شہنشاہِ مرتبت عوام سے ہو۔ اے میرے خدا، اِس معاملے میں تُو میرا گواہ اور رہبر!

باب - ۲۷

سردار اور اُن کے ساتھی (۲)

سیکنڈ میٹ تھا اسٹب۔ وہ کیپ کوڈ کا باشندہ تھا، لہٰذا مقامی دستور کے مطابق اسے کیپ کوڈ والا کہا جاتا تھا۔ یہ شخص بالکل مست مولا تھا، نہ ڈرپوک، نہ بہادر۔ کوئی خطرہ سامنے آجائے تو اس وقت بھی بے پروا انداز میں چاہے کیسا ہی مرحلہ کیوں نہ درپیش ہو وہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا جیسے کسی بڑھئی کو سال بھر کے لیے ملازم رکھ لیا گیا ہو۔ خوش مزاج، لاابالی، بے فکرا۔ اپنی کشتی میں اس طرح چلتا جیسے وہیل سے لڑائی نہیں بلکہ دعوت ہو رہی ہے اور اس کے جہازی اس میں مدعو ہیں۔ کشتی کے جس حصے میں خود بیٹھتا اس کا خاص خیال رکھتا کہ یہ جگہ بطور خاص آرام دہ ہو، یعنی جیسے بگھی چلانے والا کوچوان اپنی نشست کا خاص خیال رکھتا ہو۔ جب وہیل سے دوبدو لڑائی ٹھن جاتی تو وہ اپنا خونی برچھا اس اطمینان اور بے نیازی کے ساتھ چلاتا جس طرح ٹھٹھیرا سیٹی بجا بجا کے اپنا ہتھوڑا چلاتا ہے۔ انتہائی غضب ناک اور عفریت نما وہیلوں سے ٹکر پہ ٹکر لیتے ہوئے بھی وہ کوئی پرانی چلبلی سی دھن گنگناتا رہتا۔ ایک عرصہ دراز سے وہ روز ہلاکت کا سامنا کرتا رہا تھا چنانچہ موت اس کے لیے ایک آرام کرسی بن کے رہ گئی تھی۔ خود موت کے بارے میں اس کا خیال کیا تھا، یہ کچھ معلوم نہیں۔ بلکہ اس میں شک ہے کہ وہ موت کے متعلق سوچتا بھی تھا یا نہیں۔ لیکن اگر اطمینان سے کھانا کھانے کے بعد اتفاقاً اس کا ذہن اس طرف جاتا بھی ہوگا تو بلاشبہ وہ ایک اچھے جہازی کی طرح موت کو بیرے کے حکم کی طرح کی چیز سمجھتا ہوگا، یعنی پہلے تو سب سے اٹھ کے چل پڑو، حکم کی تعمیل کے بعد پتا چلے گا کہ قصہ کیا ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔

منجملہ اور باتوں کے جس چیز نے اسٹب کو ایسا لاابالی اور نڈر بنا دیا تھا کہ جس دنیا میں ہر طرف موت کے تاجر اپنے بوجھ کے نیچے زمین تک جھکے نظر آتے ہیں وہاں وہ زندگی کا بار اٹھائے ہنستا کھیلتا چلا جاتا تھا — جس چیز نے اس میں یہ قریب قریب بے ساختہ خوش مزاجی پیدا کر دی تھی وہ یقیناً اس کا پائپ ہوگا، کیونکہ اس کی ناک کی طرح، اس کا چھوٹا سا کالا پائپ بھی اس کے چہرے کا ایک مستقل جزو تھا۔ وہ اپنے بستر سے نہ تو ناک کے بغیر نکل سکتا تھا نہ پائپ کے بغیر۔ اس کے سرہانے تمباکو سے بھرے ہوئے پائپ ایک تختے پر قطار میں لگے رہتے تھے تاکہ وہ ہاتھ بڑھا کے اٹھا سکے۔ بستر پر لیٹ کر وہ یکے بعد دیگرے ان سب کو پی ڈالتا۔ ایک سے دوسرا جلاتا رہتا، یہاں تک کہ قطار بالکل خالی ہو جاتی۔ پھر وہ انھیں دوبارہ بھر کے رکھ دیتا کہ بالکل تیار رہیں کیونکہ کپڑے پہنتے ہوئے اسٹب پہلے پتلون میں ٹانگیں ڈالنے کے بجائے منہ میں پائپ لگاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس کے مزاج کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ مستقل پائپ پیتے رہنے کی عادت کا بھی تھا، کیونکہ سبھی جانتے ہیں چاہے سمندر ہو یا خشکی، اس زمین کی ہوا ان بے شمار انسانوں کے بے نام مصائب سے آلودہ ہے جو اس میں سانس لیتے ہوئے مرے ہیں، جس طرح ہیضے کے دنوں میں بعض لوگ منہ پر کافور میں بسا ہوا رومال رکھ کے چلتے ہیں، اسی طرح انسانی آلام کے

خلاف اسٹب کا پائپ کا دھواں جراثیم کو ہلاک کرنے والی دوا کا کام دیتا ہوگا۔

تیسرا میٹ فلاسک تھا۔ یہ شخص ٹسبری کا رہنے والا تھا۔ پستہ قد، اوبڑا بدن، سُرخ سفید، نوجوان۔ وہیلوں کا جانی دشمن
وہ کچھ ایسا محسوس کرتا تھا ان بحری عفریتوں کو اس سے اور اس کے آباؤ اجداد سے ذاتی مخاصمت رہی ہو۔ چنانچہ جہاں بھی
وہیل آئے اُسے تہس نہس کر دینا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہیل کے شاندار قد و قامت اور پُر اسرار عادتوں میں جو عجائبات ہیں
ان کا اس کے دل میں ذرا بھی احترام نہ تھا۔ پھر وہیل کو سامنے دیکھ کر اُسے کسی خطرے کا امکان تک نظر نہ آتا تھا۔ اس
کے نزدیک تو وہیل ایک حیرت انگیز مخلوق نہیں، بلکہ ایک بڑا سا چوہا یا سمندری چوہے کی قسم کی چیز تھی جسے مار کے اُبال لینے
کے لیے بس تھوڑی سی ہوشیاری اور تھوڑی سی محنت اور وقت درکار تھا۔ اس جاہلانہ اور غیر شعوری بے خوفی کی وجہ سے
وہیلوں کے بارے میں اس کا رویہ کچھ مشغلہ کا سا ہو گیا تھا۔ وہ محض دل لگی کی خاطر ان مچھلیوں کا شکار کھیلتا تھا اور کیپ ہورن
کے گرد تین سال کا سفر اس کے لیے بس ایک مذاق تھا جو لگتے دن جاری رہتا تھا۔ جس طرح بڑھئی کے پاس دو قسم کی کیلیں
ہوتی ہیں، ایک تو ڈھلی ہوئی کیلیں اور دوسرے کٹی ہوئی کیلیں، اسی لحاظ سے انسانوں کی بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ننھا فلاسک
ڈھلی ہوئی کیلوں میں سے تھا۔ وہ بنا ہی اس طرح تھا کہ پائدار بھی ہو اور بہت دن تک چلے۔ پیکوڈ میں لوگ اُسے شاہی ستون
کہتے تھے۔ کیونکہ اس کا جسم اس چھوٹے سے چوکور کھمبے سے مشابہ تھا جو قطب شمالی کے علاقے میں چلنے والے شکاری
جہازوں میں لگا ہوتا ہے۔ اس کھمبے میں بہت سے تختے آڑے ترچھے رہتے ہیں جن کے ذریعے جہاز ان سمندروں کی
طوفانی لہروں کے برفانی حملوں سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ تین میٹ —— اسٹاربک، اسٹب اور فلاسک —— بڑے زبردست آدمی تھے۔ جہاز کی تین کشتیوں کی
کمان یہی کرتے آئے تھے۔ وہیل کے خلاف کپتان اہاب جس عظیم جنگ میں صف آرا ہونے والا تھا اس میں ان تینوں سرداروں
کی حیثیت کچھ ایسی ہی ہے جیسے دستوں کے کپتان۔ یا پھر چونکہ انھوں نے لمبے لمبے تیز قلم سنبھال رکھے تھے اس لیے انھیں تین
منتخب نیزہ باز کہیے۔ برچھے بازوں کو تیر اندازوں سے مثال دی جا سکتی ہے۔

جس طرح قرونِ وسطیٰ میں ہر نائٹ کے ساتھ ایک پیش خدمت ہوا کرتا تھا اسی طرح ماہی گیری کے پیشے میں بھی ہر
میٹ کے ساتھ ایک کشتی کھینے والا یا برچھے باز رہتا ہے۔ اگر کسی موقع پر ایک برچھا مڑ تڑ جائے یا جھٹکے میں ہاتھ سے گر
جائے تو یہ ساتھی فوراً دوسرا برچھا پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں آدمیوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔
چنانچہ مناسب ہوگا کہ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ پیکوڈ کے برچھے باز کون کون تھے اور کس کس سردار کے ساتھ منسلک تھے۔
سب سے پہلے تو کوئی کویگ ہی تھا جسے چیف میٹ اسٹاربک نے اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ مگر اس سے تو آپ
واقف ہی ہیں۔

پھر آتا ہے تاش تیگو۔ یہ شخص نجیب الطرفین ریڈ انڈین تھا اور گے ہیڈ کا باشندہ۔ یہ علاقہ مارتھاز ون یارڈ کی بالکل مغربی
راس ہے اور یہاں ریڈ انڈین لوگوں کا ایک بچا کھچا گاؤں اب تک چلا آتا ہے جو ایک مدت سے قریب کے جزیرے نان ٹکٹ

کو بڑے بڑے دلیر برچھے باز مہیا کرتا رہا ہے۔ ماہی گیری کے پیشے میں ان لوگوں کو آگے بیٹھنے والے کہا جاتا ہے۔ تاش ٹیگو
کے بال لمبے، باریک اور سیاہ تھے، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، آنکھیں گول گول اور کالی اور اس کے ریڈ انڈین ہونے کے
باوجود ایشیائی لوگوں کی آنکھوں کی طرح بڑی بڑی لیکن قطب جنوبی کے علاقے والوں جیسی چمکدار۔ ان باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ
اس کی رگوں میں ان باوقار اور جنگجو شکاریوں کا بے میل خون دوڑ رہا ہے جو کمان ہاتھ میں لیے نیو انگلینڈ کے زبردست ہرنوں
کے پیچھے اس براعظم کے قدیم جنگل چھانتے پھرا کرتے تھے۔ لیکن تاش ٹیگو جنگلی جانوروں کی بو سونگھتے پھرنے کے بجائے اب سمندر
میں وہیل کا شکار کھیلنے لگا تھا۔ باپ دادا کے بے خطا تیروں کی جگہ اب بیٹے کے اچوک برچھے نے لے لی تھی۔ اس کے
سڈول اور لچکیلے جسم اور سانپ کی طرح چمکدار اعضا کو دیکھ کر قدیم پیوریٹن لوگوں کے توہمات پر یقین آنے لگتا اور یہ جنگلی ریڈ انڈین
ابلیس کی اولاد معلوم ہوتا۔ تاش ٹیگو سیکنڈ میٹ اسٹب کا ساتھی تھا۔

تیسرا برچھے باز تھا ڈیگو۔ حبشی، کالا بھجنگ، ڈیل ڈول دیو کا سا، شیر کی سی چال۔ اچھا خاصا عوج بن عنق لگتا تھا۔ اس کے کانوں میں
سونے کے دو اتنے بڑے بڑے چھلے رہتے تھے کہ جہازی کہا کرتے تھے یہ رنگ بولٹ ہیں، لاؤ ان میں مستول کی رسیاں باندھیں۔
جوانی کے زمانے میں ایک دن ڈیگو اپنے جزیرے کے ساحل پر ایک سنسان سی جگہ جا بیٹھا اور جب ایک شکاری جہاز ادھر
سے گزرا تو اپنی مرضی سے اس میں بھرتی ہو گیا۔ افریقہ، نین ٹکٹ اور جنگلیوں کی ان بندرگاہوں کے سوا جہاں شکاری جہاز
ٹھیرتے تھے، اس نے دنیا کا اور کوئی ملک نہ دیکھا تھا۔ پھر ایک عرصہ دراز سے ماہی گیری کا اولوالعزم پیشہ اختیار کر رکھا تھا اور ایسے
جہازوں میں رہا تھا جن کے مالک اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ ہم نے کس قسم کے جہازی بھرتی کیے ہیں۔ چنانچہ ڈیگو کی ساری
وحشیانہ صفات جوں کی توں برقرار رہی تھیں اور وہ جرابوں میں چھ فٹ پانچ انچ لمبا تڑنگا۔ زرافے کی طرح تنا ہوا جہاز کے
عرشوں پر گشت لگاتا پھرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے سے آدمی کو جسمانی کمتری کا احساس ہوتا۔ اس کے سامنے کوئی گورا آدمی کھڑا ہو تو
ایسا لگتا جیسے ایک سفید جھنڈا کسی قلعے کے حضور میں صلح کی درخواست لے کے آیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ دیو قامت کالا
شاہ زادہ حبشی ڈیگو ننھے منے فلاسک کا ساتھی تھا جو اس کے مقابلے میں شطرنج کا مہرہ معلوم ہوتا۔ اب رہے پیکوڈ کے دوسرے جہازی
تو یوں سمجھیے کہ آج کل بھی امریکہ کے شکاری جہازوں میں کئی ہزار جہازی کام کرتے ہیں مگر ان میں سے آدھے بھی پیدائشی امریکن
نہیں ہیں، البتہ افسر تقریباً سب کے سب امریکن ہیں۔ یہ کچھ ماہی گیری پر ہی موقوف نہیں۔ امریکہ کی فوج، تجارتی بیڑے، نہریں
اور ریلیں بنانے والے دستوں سب کا یہی حال ہے۔ ان تمام پیشوں میں ذہن تو امریکی لوگوں کا استعمال ہوتا ہے اور
جسمانی طاقت باقی دنیا بڑی فیاضی کے ساتھ فراہم کرتی ہے۔ وہیل کے شکاریوں میں ایک کثیر تعداد جزائر ازور کے رہنے
والوں کی ہے۔ نین ٹکٹ سے جانے والے جہاز ان پتھریلے ساحلوں پر ٹھیر کے ان جفاکش کسانوں میں سے اپنے عملے کے
لیے کچھ لوگ بھرتی کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہل یا لندن سے گرین لینڈ جانے والے جہاز شیٹ لینڈ کے جزائر میں اپنا عملہ پورا کرتے
ہیں اور واپس آتے ہوئے ان لوگوں کو پھر وہیں اتار دیتے ہیں۔ نہ معلوم اس کی وجہ کیا ہے، لیکن وہیل کے شکار میں جزیروں
کے لوگ سب سے اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ پیکوڈ کے تقریباً سارے ہی شکاری جزیروں کے رہنے والے تھے۔ بلکہ

ہر آدمی خود ایک جزیرہ تھا۔ انھیں دوسرے انسانوں کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا، ہر شخص اپنے ایک الگ جزیرے میں رہتا تھا۔ لیکن اب ان جزائر میں وہ گویا ایک وفاق میں شامل ہو گئے تھے۔ کیسی عجیب تھی یہ ٹولی! اچھا خاصا ایک وفد مجھے جو سمندر کے تمام جزیروں اور زمین کے سارے کونوں سے جمع ہو کر آپ کی سرکردگی میں دنیا کے صاحب اس وقت کے حضور میں پیش کرنے جا رہا تھا جہاں سے آدمی واپس نہیں آتا۔ کم سے کم بچارا حبشی چپ تو واپس نہیں آیا نہیں بلکہ وہ تو اوروں سے بھی پہلے چلا گیا۔ ہائے بچارا لڑکا! ابھی تھوڑی دیر میں آپ اسے بیکوڈ کے خطرناک عرشے پر اپنا چکارا بجاتے دیکھیں گے۔ یہ گویا اس کی ابدی زندگی کا پیش خیمہ ہوگا، کیونکہ اسے تو آسمان پر پہنچ کے فرشتوں کی جنرائی میں اپنا ساز بجانے کا حکم ملنے والا ہے۔ یہاں تو اسے بزدل سمجھا گیا، لیکن وہاں اس کا مرتبہ بلند ہوا۔

اہاب

نین ٹکٹ سے چلنے کے بعد کئی دن تک جہاز کے عرشے پر کپتان اہاب کی پرچھائیں تک نہ پڑی۔ تینوں میٹ باری باری سے نہایت باقاعدہ پہرہ دیتے رہے۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ جہاز کی کمان بس انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ البتہ بعض اوقات وہ کپتان کے کمرے سے اچانک ایسے نادر ہی احکام لے کر نکلتے کہ صاف پتا چل جاتا یہ لوگ کسی اور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ہاں، ان کا آقا اور حکمران تو اپنے کمرے کی مقدس خلوت گاہ میں بیٹھا تھا، حالانکہ جن لوگوں کی وہاں تک رسائی نہ ہو انھوں نے اسے ابھی دیکھا نہ تھا۔

نیچے پہرے سے فراغت پا کر میں عرشے پر جاتا تو ہر دفعہ جہاز کے پچھلے حصے کی طرف نظر اٹھ جاتی کہ دیکھوں کوئی اجنبی چہرہ تو سامنے نہیں۔ اس انجانے کپتان کے سلسلے میں ایک تو میں پہلے ہی کچھ بے چین سا ہو رہا تھا، لیکن سمندر کی تنہائی میں تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ پھر جب خستہ حال ایلیاہ کی بے ربط اور خوفناک باتیں بن بلائے مہمان کی طرح میرے ذہن میں چپکے چپکے لیکن اس قوت کے ساتھ وحشی چلی آتیں کہ پہلے تو یہ چیز میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔ اس وقت میری الجھن اور بڑھ جاتی۔ عام طور سے میں بندرگاہ کے اس عجیب و غریب مجذوب کی بڑ کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتا تھا، بلکہ مسکرانے لگتا تھا۔ مگر اس وقت میں بالکل مغلوب ہو کے رہ جاتا۔ ایک طرف تو میں یہ بے چینی یا خوف محسوس کرتا تھا لیکن دوسری طرف جب میں جہاز میں اپنے اردگرد دیکھتا تو اس قسم کے جذبات کا ذرا بھی جواز نظر نہ آتا۔ اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر میں اب تک تو صرف تجارتی جہازوں سے واقف تھا۔ یہ برچھے باز اور دوسرے جہازی ان لوگوں سے کہیں زیادہ بے میل، وحشی اور جنگلی تھے۔ لیکن میں سوچا کرتا اور واقعی ٹھیک ہی سوچتا — کہ میں نے بے دھڑک جو ہولناک پیشہ اختیار کیا ہے وہ بذات خود وحشیانہ اور عجیب و غریب ہے۔ خصوصاً جہاز کے ان تین بڑے افسروں کو دیکھ کر تو میرے سارے شکوک و شبہات رفع ہو جاتے اور اس سفر کے مستقبل پر بڑا یقین اور اعتماد پیدا ہوتا۔ اپنی اپنی طرح کے ایسے تین افسر ان سے اچھے ملنے مشکل تھے۔ پھر تینوں کے تینوں امریکی تھے۔ ایک نین ٹکٹ کا، دوسرا وائن یارڈ کا، تیسرا کیپ کا۔ خیر، تو جب ہمارا جہاز بندرگاہ سے چلا تو کرسمس کا زمانہ تھا۔ اسی لیے چند روز تک قطب شمالی کا سا موسم رہا، حالانکہ ہم تو بڑی تیزی سے جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بہر حال ہم اپنے سفر کے ساتھ ساتھ اس بے رحم سردی اور ناقابل برداشت موسم کو درجہ بدرجہ پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے۔ اسی عبوری دور میں صبح کا وقت ڈراؤنا تو نہ ہوتا تھا، لیکن دھند ضرور چھائی رہتی تھی۔ اسی قسم کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ ہوا موافق تھی اور جہاز ایک منتقمانہ جوش اور افسردہ سی تیزی کے ساتھ لہروں کو چیرتا پھاڑتا چلا جا رہا تھا۔ صبح کے پہرے کی آواز لگی تو میں عرشے پر آیا۔ پچھلے کٹہرے کی طرف نظر گئی تو ڈر کے مارے کپکپی چھوٹ گئی۔ حقیقت تصور سے بھی چار جوتے آگے نکل چھوٹے

عرشے پر کپتان اہاب کھڑا تھا۔

کسی عام جسمانی مرض کا تو اس میں نشان تک نہ تھا اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھا ہے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی شخص کو ستون سے باندھ کر جلا دیا گیا ہو لیکن نہ تو اس کا جسم جل کے راکھ ہوا ہو نہ اس کے ٹھوس اور پختہ اعضا کے گٹھیلے پن میں کوئی فرق آیا ہو۔ اس کا لمبا اور چوڑا چکلا بدن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ٹھوس فولاد کا بنا ہوا ہے اور چیلینی کے مجسمے کی طرح کسی پختہ سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ ایک سلاخ کی طرح سیدھا اور زردی مائل سفید نشان اس کے کھچڑی بالوں میں سے نکل کر اس کے جھلسے ہوئے گندمی چہرے اور گردن پر سے ہوتا ہوا کپڑوں میں غائب ہو گیا تھا بعض وقت کسی زبردست پیڑ کے بلند اور سیدھے تنے پر آسمان سے بجلی گرتی ہے اور زمین میں غائب ہونے سے پہلے درخت کی ٹہنیوں کو برباد کیے بغیر چھال کو اوپر سے نیچے تک ادھیڑتی چلی جاتی ہے۔ پیڑ تو ویسا ہی ہرا بھرا رہتا ہے لیکن تنے پر داغ پڑ جاتا ہے۔ یہ نشان اسی طرح کے داغ سے مشابہ تھا۔ یہ نشان پیدائشی تھا یا کسی گہرے زخم کی یادگار، اس کے بارے میں کسی کو بھی ٹھیک طرح علم نہ تھا کسی خاموش فیصلے کے ماتحت اس کے متعلق سارے سفر میں کسی نے اشارۃً بھی تو کچھ نہ کہا، خصوصاً ہمارے تینوں افسروں نے۔ لیکن جہازیوں میں گے ہیڈ کا ایک بڈھا ریڈ انڈین تھا۔ ایک مرتبہ اس نے توہم پرستانہ یقین کے ساتھ اتنا ضرور بتایا کہ اہاب کے یہ داغ چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد لگا ہے اور وہ بھی انسانوں سے لڑتے ہوئے نہیں بلکہ سمندر میں عناصر سے جنگ کرتے ہوئے۔ ہمیں یہ اشارہ ملا تو سمی ویلکن مینکس کے ایک اجڑے گھٹے بڈھے نے ایک اور نقرہ دیا جس سے پہلی بات کی نفی ہوتی تھی۔ یہ بڈھا پہلے کبھی نین ٹکٹ سے باہر نکلا ہی نہ تھا چنانچہ اس نے وحشی اہاب کو بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر جہازیوں کی موروثی ضعیف الاعتقادی اور سمندر کی پرانی روایتوں نے بڈھے کو آسمانی بصیرت بخش دی تھی۔ لہٰذا کسی گورے جہازی نے سنجیدگی کے ساتھ اس کی تردید نہ کی۔ اس نے کہا یہ تھا کہ اول تو اہاب اطمینان کے ساتھ مرنے کا نہیں، لیکن اگر ایسا ہوا تو جو شخص تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کرے گا وہ دیکھے گا کہ کپتان کے جسم پر سر سے پیر تک ایک پیدائشی نشان ہے۔

اہاب کا غضب ناک چہرہ اور اس پر یہ زردی مائل دھاری دیکھ کے مجھ پر ایسا مرعوب ہوا کہ دو چار لمحے تک یہ بات بھی میری سمجھ میں نہ آئی کہ اگر اہاب اتنا رعب دار اور خوفناک لگ رہا ہے تو کسی حد تک اس عجیب و غریب سفید ٹانگ کی وجہ جس کا اس نے سہارا لے رکھا ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ ہاتھی دانت کی سی ٹانگ سمندر میں ہی بنوائی گئی تھی اور وہیل کے جبڑے کی چکنی ہڈی سے۔ ایک مرتبہ گے ہیڈ والے ریڈ انڈین بڈھے نے کہا تھا — "ہاں، اس کا مستول جاپان کے قریب ٹوٹا تھا۔ لیکن جہاز کے ٹوٹے ہوئے مستول کی طرح انھوں نے یہ مستول بھی گھر آئے بغیر وہیں کے وہیں لگوا لیا۔ ابھی درجنوں بچے ہیں۔"

اہاب کے کھڑے ہونے کا انداز بھی مجھے بہت عجیب لگا۔ جہاز کے پچھلے عرشے پر دونوں طرف بادبانوں کے قریب تختے میں کوئی آدھ انچ گہرا سوراخ تھا۔ ایک ٹانگ اس سوراخ میں اڑی ہوئی، ایک ہاتھ سے بادبان تھامے کپتان اہاب بالکل سیدھا کھڑا تھا اور جہاز کے زیر و زبر ہوتے ہوئے سرے سے آگے کی طرف کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں ایک بے پناہ عزم، مستقل، ایک سنجیدہ قسم کی مردانگی، ایک انہماک اور بے خوفی، ایک اٹل خود سری تھی۔ اس کی نظریں اُفق پر اس طرح

گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ تن من دھن سب کسی کام کے لیے وقف کر چکا ہو۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ نہ جانے افسروں نے اُس سے بات کی۔ مگر اُن کی ذرا ذرا سی حرکت سے یہ تکلیف دہ احساس لپکتا تھا جیسے ایک رہی تھی کہ ہمیں ایک ایسی مضطرب آنکھ دیکھ رہی ہے جس میں جادو کا سا اثر ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ شکستہ اور مصیبت زدہ اہاب کسی عظیم الشان قسم کے شاہانہ اور بے نام جلال کے ساتھ اُن کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے چہرے پر کچھ ایسا تقدس تھا جیسے وہ صلیب پر چڑھ چکا ہو۔

آج وہ پہلی دفعہ کھلی ہوا میں نکلا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی اپنے کمرے میں واپس چلا گیا لیکن اُس دن سے وہ جہازیوں کو روز نظر آنے لگا۔ یا تو وہ اُسی سوراخ میں ٹانگ اڑائے کھڑا ہوتا۔ یا اُس کے پاس جو ہاتھی دانت کی تپائی تھی اُس پر بیٹھ جاتا۔ یا بھاری بھاری قدموں سے عرشے پر ٹہلتا۔ جب آسمان اتنا افسردہ منقبض نہ رہا بلکہ تھوڑی سی چمک آ چلی تو اُس کی خلوت گزینی کم ہو گئی۔ مگر جب جہاز بندرگاہ سے چلا تھا تو بس جاڑوں کے سمندر کی ویرانی اور بے رنگی نے ہی اُسے کمرے میں بند کر رکھا تھا اور نہ اس کے سوا اور کوئی وجہ نہ تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ وہ تقریباً ہر وقت ہی کھلی ہوا میں رہنے لگا۔ لیکن دھوپ سے چمکتے ہوئے عرشے پر وہ جو کچھ کرتا یا کہتا اُس سے تو یہی معلوم ہوتا کہ اُس کا وجود ایسا ہی غیر ضروری ہے جیسے ایک نیا مستول کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن پیکوڈ کا اصل سفر ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ ابھی تو وہ بس چل رہا تھا۔ وہیل کے شکار میں جو تیاریاں لازمی ہوتی ہیں اُن کی نگرانی میٹ لوگ بخوبی کر سکتے تھے۔ لہٰذا ابھی اہاب کے پاس اپنی ہستی سے باہر کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس پر وہ اپنی توجہ صرف کرے یا اُس کے سلسلے میں کوئی سرگرمی دکھائے اور اس طرح تھوڑی دیر کے لیے اُن بدلیوں کو دُور ہٹا دے جو تہ بہ تہ اُس کی پیشانی پر جمی ہوئی تھیں — کیونکہ بادل ہمیشہ سب سے اُونچی چوٹیوں پر ہی بسیرا لیتے ہیں۔

بہرحال چند ہی روز میں موسم نہایت گرم اور خوشگوار ہو گیا۔ فضا میں ایک مرغوبی اور شگفتگی سی آ گئی۔ اہاب پر بھی اس جادو کا اثر تھا اور اُس کی وہ گرفتگی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ جب یہ دو شگفتہ رخ رقاصائیں یعنی اپریل اور مئی، ٹھٹھری ہوئی جاڑوں کے مردم بیزار جنگلوں میں اپنے گھر واپس آ جاتی ہیں تو پرانے سے پرانا، بد ہیئت، بجلیوں کا مارا اور شکستہ شاہ بلوط بھی ایسے زندہ دل مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے دو چار سبز ٹہنیاں ضرور نکال ہی لاتا ہے۔ اسی طرح اہاب آخرکار اُس کی دوشیزگی، شوخی اور ترغیبات کا جواب دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کئی دفعہ اُس کے چہرے پر ایک کلی سی چٹکی۔ اگر اُس کے بجائے کوئی اور آدمی ہوتا تو یہی کلی کھل کر مسکراہٹ بن جاتی۔

اہاب داخل ہوتا ہے

مکالمہ اُس کے اور اسٹب کے درمیان

غرض دن گزرتے گئے۔ جہاز کے پچھلے حصے پر برف کے ٹکڑے جمے ہوئے تھے اور پیکوڈ بہار کے درخشاں موسم میں اڑا چلا جا رہا تھا جو کیٹو کے علاقے میں سمندر پر ہمیشہ ہی چھایا رہتا ہے۔ دن صاف شفاف، کچھ ٹھنڈے کچھ گرم، معطر، پُرنغمہ، ہرے اور بھرپور تھے جیسے ایرانی شربت کی بلوریں صراحیاں جن میں عرقِ گلاب میں برف کے ٹکڑے تیر رہے ہوں۔ تاروں سے جگمگاتی ہوئی شاندار راتیں ایسی لگتی تھیں جیسے مغرور شہزادیاں زرکار مخملی لباس پہنے خلوت میں بیٹھی سورج کے زریں تاج اور کامران شہزادوں کو یاد کر رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا جب دن اتنے سحر انگیز اور راتیں ایسی پرکیف ہوں تو آدمی سوئے کس وقت۔ موسم میں کوئی تبدیلی ہوتی ہی نہ تھی۔ یہ جادو خارجی دنیا کے حسن اور کشش میں تو خیر بہت سے اضافے کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ روح کی گہرائیوں میں بھی اترتا چلا جا رہا تھا خصوصاً جب شام کا سہانا وقت آتا تو حافظہ طرح طرح کی شکلیں پیدا کرنے لگتا جیسے برف خاص طور سے چٹخ چٹخ کے خاموشی میں جمتی ہے۔ اور یہ لطیف محرکات اہاب کی روح میں چپکے چپکے اپنا کام کیے چلے جا رہے تھے۔

بڑھاپے میں نیند بہت کم آتی ہے۔ گویا آدمی زندگی سے جتنے زیادہ دن متعلق رہے اتنا ہی زیادہ ان چیزوں سے بچنے لگتا ہے جو موت کی مانند ہوں۔ بڈھے جہازی کپتان اکثر اپنے کمرے سے اٹھ کے رات کے پردے میں لپٹے ہوئے عرشے پر چلے آتے ہیں۔ یہی حال اہاب کا تھا لیکن کچھ دن سے وہ عرشے پر اتنا رہنے لگا تھا کہ در اصل وہ اپنے کمرے سے عرشے پر نہیں آتا تھا بلکہ یہاں سے کمرے میں جایا کرتا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتا ——— "مجھ جیسے بڈھے آدمی کا نیچے اتر کے اس تنگ کوٹھڑی میں جانا تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے قبر میں اترنا۔"

روز رات کو پہرے بانٹ دیے جاتے۔ عرشے والا دستہ نگرانی کرتا، نیچے والے سوتے۔ اگر کوئی رسی نیچے پہنچانی ہوتی تو جہازی دن کی طرح اسے بدتمیزی سے نہ پھینکتے بلکہ احتیاط کے ساتھ گراتے تاکہ ان کے ساتھیوں کی نیند اچاٹ نہ ہو۔ غرض جب روز رات کو اس طرح کی مکمل خاموشی طاری ہو جاتی تو سکان چلانے والا چپ چاپ کھڑا کپتان کے کمرے کی طرف دیکھنے لگتا۔ تھوڑی ہی دیر میں بڈھا سرنگے سے باہر نکل آتا اور رسے کا جنگلا پکڑ پکڑ کے چلنے لگتا۔ اس میں تھوڑی سی انسانیت ضرور تھی، کیونکہ ایسے وقت وہ چھوٹے عرشے پر کبھی نہ ٹہلتا کیونکہ اس کی ہاتھی دانت والی ایڑی کی کھٹ کھٹ سے اتنی زبردست گونج پیدا ہوتی کہ تھکے ماندے افسر جو وہاں قریب ہی سوئے ہوتے، ہمیشہ خواب میں شارک مچھلیوں کو دانت کٹکٹاتے دیکھتے۔ لیکن ایک دفعہ اس پر ایسا جنون سوار تھا کہ اس بات کا خیال تک نہ رہا۔ وہ عرشے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاری بھاری قدموں سے چہل قدمی کر رہا تھا کہ اتنے میں سیکنڈ میٹ اسٹب نیچے سے اوپر آیا اور کچھ

پچکاتے ہوئے ایک طنز آمیز تبسم کے ساتھ بولا کہ اگر کپتان صاحب محض پڑھنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی علاج ایسا نکل سکتا ہے جس سے شور کم ہو۔ پھر اُس نے ڈرتے ہوئے مبہم طریقے سے اشارۃً کہا کہ بھی بات کی ایڑی میں موم کی گولی لگا دی جائے تو بہتر ہوگا۔ اب استب، تو اُس وقت اباب سے واقف نہ تھا!

اباب نے کہا —— کیوں استب، کیا میں کوئی توپ گاڑ رہا ہوں جو تو میرے سر پہ چلا آیا ہے؟ اچھا ہٹ یہاں سے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ چل کے اپنی قبر میں پڑ۔ تجھ جیسے لوگ رات کو کفن میں لپٹ کے سوتے ہیں تاکہ پہلے ہی سے قبر کی عادت پڑ جائے۔ دور ہو کتے! اپنی کوٹھڑی میں جا!

بڈھے کو ایک دم غصہ آ گیا تھا۔ استب کو ذرا بھی خیال نہ تھا کہ یہ ایسی حقارت آمیز باتیں کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ آخری فقرہ سن کے تو وہ دم بخود رہ گیا، پھر جوش میں آ کے بولا —— "جی، مجھے ایسی باتیں سننے کی عادت نہیں۔ مجھے آپ کا یہ انداز کچھ پسند نہیں آیا۔"

"دور ہو!" اباب نے دانت پچکاتے ہوئے کہا، اور جلدی سے آگے چل دیا جیسے کسی خوفناک ترغیب سے بھاگ رہا ہو۔

"جی نہیں جناب۔ ابھی دور نہیں ہوں گا۔" استب میں ذرا ہمت آ گئی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے کتا کہا جائے اور میں بیٹھا سنتا رہوں۔"

"اچھا، گدھا سہی، خچر سہی، الو سہی۔ اب تو دور ہو، ورنہ میں دنیا سے تیرا نام و نشان مٹا دوں گا!"

یہ کہہ کر اباب اس کی طرف ایسے غضبناک چہرے کے ساتھ جھپٹا کہ استب بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

استب سیڑھیاں اتر کے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا —— "ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کہ مجھے کسی نے ایسی بات کہی ہو اور میں نے آگے بڑھ کے ایک جھانپڑ رسید نہ کیا ہو۔ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔ ٹھیرو استب۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ واپس جا کر اس کے ایک ہاتھ لگاؤں یا —— ارے یہ کیا ہے —— یا گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے لیے دعا مانگوں؟ ہاں مجھے یہی بات سوجھی تھی، لیکن اس سے پہلے تو میں نے کبھی دعا مانگی ہی نہیں۔ بڑی عجیب چیز ہے، بہت ہی عجیب اور وہ بھی بڑا عجیب آدمی ہے۔ چاہے اسے آگے سے دیکھو چاہے پیچھے سے، استب نے ایسے عجیب و غریب بڈھے کی ماتحتی میں کبھی کام نہیں کیا۔ میری طرف کیسے آنکھیں نکال کے جھپٹا تھا —— اس کی آنکھوں میں سے تو چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ کیوں، پاگل تو نہیں؟ ہو نہ ہو اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ضرور ہے، کیونکہ جب عرشے کے تختے چٹختے ہیں تو اُن پر بوجھ پڑا کرتا ہے۔ اور ہاں، یہ چوبیس گھنٹے میں تین گھنٹے سے زیادہ بستر پر نہیں لیٹتا اور اس وقت بھی سوتا بالکل نہیں۔ ڈو نے مجھے بتایا تھا کہ صبح کو بڈھے کا بستر الٹ پلٹ پڑا ملتا ہے، چادریں پائنتی پر، پلنگ پوش کی بتیاں سی بنی ہوئی اور تکیہ سخت گرم جیسے اس پر جلتی ہوئی اینٹ رکھی رہی ہو۔ بڑا ہی گرم گرم بڈھا ہے! شاید اسے وہ مرض لاحق ہے جسے خشکی پر بعض لوگ ضمیر کہتے ہیں۔ سنا ہے اس میں ایک طرح کی ٹیس ہوتی ہے —— داڑھ کے درد سے بھی بری۔ خیر، مجھے کیا معلوم یہ کیا چیز ہے۔ پھر بھی خدا مجھے اس بیماری سے محفوظ رکھے۔ کہیں اُس سے مجھے نہ لگ جائے۔ یہ شخص تو ایک معمہ ہے۔

فرما جائے یہ ۔ وزارت کے نیچے سامان کی کوٹھری میں کیوں جاتا ہے ۔ والدہ نے بتایا تھا کہ اُسے شبہ ہے یہ وہیں جاتا ہے۔ آخر
اس کا کیا مطلب ہے ۔ وہاں کوٹھری میں اس سے کون ملنے آتا ہے ؟ ہے تو عجیب سی بات ۔ مگر کسی کو کیا معلوم ۔ اس کو پتا تا
فقط ہوگا ــــ ارے مجھے جمائی آگئی ۔ لعنت! دُنیا میں پیدا ہونے کا یہی تو مزہ ہے کہ آدمی خوب سوئے ۔ ہاں ۔ خوب یاد آیا بچے
بھی تو پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرتے ہیں اور یہ بھی ایک عجیب بات ہے ۔ لعنت! ذرا غور کرو تو کتنی چیزیں
عجیب ہیں ۔ لیکن غور کرنا تو میرے اصول کے خلاف ہے ۔ میرے مذہب کا گیارہواں حکم ہے ۔ سو مست ۔ اور بارھواں حکم
ہے کہ جب بھی ہو سکے خوب سوؤ ــــ لیکن تو چلا، مگر یہ کیا ؟ اس نے مجھے گالی کی تھی! لعنت! اگر وہ ابھی کچھ کہتا تو
اُٹھ بیٹھتے! ایسے تو اچھا تھا میرے شکر کرنے کے بات ختم کر دیتا ۔ شاید اس نے ٹھوکر بھی ماری تھی اور میں نے خیال ہی نہیں کیا ۔
میں تو اس کی پیشانی دیکھ کے گُم سُم رہ گیا تھا ۔ اس میں سے تو ایسے چنگاریاں نکل رہی تھیں جیسے مُردے کی ہڈی میں سے ۔ ارے
مجھے ہو کیا گیا ہے ! میری تو آنکھیں دُکھ رہی ہیں ۔ اس بڈھے سے جھڑپ کیا ہوئی میری تو کھوپڑی ہی اوندھی ہو گئی ۔ خدا کی قسم میں تو
اس وقت خواب دیکھ رہا تھا ــــ کیسے ؟ کیسے ؟ ــــ اب تو اس بات کو بھول جاؤں ہی اچھا ۔ تو میں لیٹ رہا ہوں ۔ صبح
اُٹھ کے سوچوں گا پھر دیکھوں دن کی روشنی میں یہ کم بخت پہیلی کیسی لگتی ہے ۔

باب ۔ ۳۰

پائپ

اسٹب چلا گیا تو اہاب تھوڑی دیر بیٹھے پر جھکا کھڑا رہا پھر جیسا کچھ دن سے اس کا معمول ہو گیا تھا ایک پہرے والے کو پکار کے ہاتھی دانت کی تپائی اور اپنا پائپ منگوایا۔ پھر چراغ کی لو سے پائپ جلایا اور عرشے پر ہوا کے رُخ تپائی جما کے بیٹھ گیا اور تمباکو پینے لگا۔

روایت ہے کہ پرانے زمانے میں ڈنمارک کے سمندر سے محبت کرنے والے بادشاہوں کے تخت وہیل کے دانتوں سے بنائے جاتے تھے۔ اہاب کو ہڈیوں کی تپائی پر بیٹھا دیکھ کے بھلا کسی کو بادشاہوں کا خیال کیوں نہ آتا؟ یہ تپائی تو اسی بات کی نشانی تھی پھر اہاب جہاز کا سلطان، سمندر کا بادشاہ اور وہیلوں کا شہنشاہ تھا۔

چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ وہ لگاتار جلدی جلدی کش لگاتا رہا اور گھر گھر دھواں اس کے منہ سے نکل کے پھر اس کے چہرے کی طرف واپس جا رہا۔ آخر کار وہ پائپ منہ سے نکال کے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا ——— "یہ کیا بات ہے ہائیں کیا پینے سے اب مجھے کوئی تسکین ہی نہیں ہوتی۔ ہائے میرا پائپ! اگر تیری دلکشی بھی ختم ہو گئی تو میرا کیا حشر ہوگا! مجھے کوئی مزہ ہی نہیں آ رہا بس خواہ مخواہ محنت کیے جا رہا ہوں ——— ہاں یہ میری بے وقوفی ہے کہ اتنی دیر سے بیٹھا ہوا یہیں دھواں چھوڑ رہا ہوں۔ ہوا میں دھواں چھوڑ رہا ہوں اور ایسے زور زور سے کش لے رہا ہوں جیسے مرتی ہوئی وہیل جب آخری دفعہ اپنا فوارہ چھوڑتی ہے تو پوری قوت سے اور اس میں شدت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ میرا اس پائپ سے کیا مطلب؟ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ طبیعت میں سکون پیدا کرے اور ہلکا ہلکا سفید دھواں اڑ کے نرم نرم سفید بالوں میں جائے میرے جیسے کھچڑی رنگ اور اُلجھے ہوئے بالوں میں۔ اب میں پائپ نہیں پیوں گا ———"

اس نے جلتا ہوا پائپ اٹھا کے سمندر میں پھینک دیا۔ آگ پانی میں چھن چھن کر کے بجھ گئی اور پائپ کے ڈوبنے سے جو بلبلہ پیدا ہوا اسے اٹھائے جہاز سر سے پیچھے چھوڑ گیا۔ اہاب نے ٹوپی کا کنارہ آگے کو کھینچ دیا اور ڈگمگاتا ہوا عرشے پر ٹہلنے لگا۔

باب ـ ۲۱

خواب

اگلے دن صبح کو اسٹب فلاسک سے کہنے لگا ـــــ

"ارے، شاہی ستون، ذرا سنو۔ ایسا عجیب و غریب خواب تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا جیسا رات دیکھا۔ بڈھے کی ہاتھی دانت والی ٹانگ جو ہے نا، تو میں نے دیکھا کہ اس نے اس ٹانگ سے میرے ٹھوکر ماری اور جب میں نے جواب میں ٹھوکر مارنی چاہی تو یار، خدا کی قسم، میں بس ٹھوکریں مارتے مارتے پاگل ہو گیا، پھر ایک اور دل لگی ہوئی۔ ارے اب ایسا لگنے لگا جیسے کوئی پہاڑ ہو اور میں الّو کی دم فاختہ کی طرح ٹھوکریں مارے چلا گیا۔ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات اور ہوئی، فلاسک، تم تو جانتے ہی ہو کہ خواب کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ میں غصّے کے مارے کھول رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اہاب کی ٹھوکر سے توہین تھوڑی ہوئی۔ میں نے کہا، ارے، اتنا جھگڑا کیوں؟ اصل ٹانگ تو ہے نہیں نقلی ہے۔ زندہ ٹانگ اور مردہ ٹانگ میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔ فلاسک، یہی تو وجہ ہے کہ بید کی چوٹ برداشت ہو جاتی ہے، ہاتھ کا تھپڑ برداشت نہیں ہوتا۔ زندہ چیز سے مارا جائے تو سب سے زیادہ توہین ہوتی ہے۔ ہاں، تو میں اپنی حماقت میں اس کم بخت پہاڑ کے ٹھوکریں مار رہا تھا اور دل میں یہ باتیں سوچ رہا تھا۔ عجب گڑبڑ کا معاملہ تھا۔ میں دل میں کہے جا رہا تھا ـــــ اس کی ٹانگ غور کیا ہے، بس بید ہی تو ہے ـــــ ہاتھی دانت کی بید۔ ہاں میں سوچ رہا تھا، اس نے تو مجھے مذاق میں مارا ہے، بلکہ وہیل کی ہڈی ماری ہے، ٹھوکر تھوڑی۔ میں نے کہا، پھر ذرا اس ٹانگ کو دیکھو تو سہی، اس کا پیر والا حصّہ کتنا چھوٹا سا ہے۔ اگر کوئی چوڑے پیروں والا کسان میرے ٹھوکر مارتا تو واقعی بڑی زبردست توہین ہوتی، لیکن یہ توہین تو بالکل ذرا سی ہے۔ اچھا، فلاسک، سب سے بڑا لطیفہ تو اب آتا ہے۔ میں اس پہاڑ کے اوپر جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک کبڑے اور جھکے ہوئے بالوں والے سمندری بڈھے نے میرے کندھے پکڑ کے مجھے اپنی طرف گھمایا۔ وہ بولا، "تم کیا کر رہے ہو؟" اوہ، یار میں واقعی ڈر گیا کیونکہ تھا اس کا چہرہ کسی طرح خوف کم ہوا تو میں نے کہا ـــــ "تم کیا کر رہے ہو، کبڑے میاں، تمہیں اس سے مطلب؟ لگاؤں ایک تمھارے بھی؟" توبہ، توبہ، فلاسک، میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ کبڑا پیچھے کی طرف مڑ کے جھک گیا۔ اس نے سمندری گھاس کا ایک تہمد سا باندھ رکھا تھا۔ بھلا بتاؤ تو سہی کہ اب میں نے کیا دیکھا؟ یار، تمھاری جان کی قسم، اس کی کمر پر تو یہاں سے وہاں تک لنگر کی میخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں کچھ سوچ کے بولا ـــــ "نہیں، کبڑے میاں میں تمھارے لات نہیں ماروں گا۔" وہ کہنے لگا، "اسٹب، تم بڑے عقلمند ہو، تم بڑے عقلمند ہو۔" اور بس یہی کہتا چلا گیا جیسے کوئی کھوسٹ بڑھیا اپنے جبڑے چبا رہی ہو۔ میں نے دیکھا کہ وہ تھکنے میں ہی نہیں آتا تو میں نے چاہا کہ اس پہاڑ کے پھر سے ٹھوکریں مارنا شروع کر دوں۔ لیکن میں نے پیر اٹھایا ہی تھا کہ وہ چیخ پڑا ـــــ "ٹھوکر مت مارو!" میں نے کہا، "کیوں، کبڑے میاں، اب کیا ہوا؟" وہ بولا، "او دیکھو، تمھاری جرأت بڑھ گئی ہے،

آؤ اس کے متعلق گفتگو کریں کپتان! آپ نے تمھارے ٹھوکر ماری تھی، ٹھیک ہے نا؟" میں نے کہا: "ہاں، ٹھوکر ماری تھی — ٹھیک اسی جگہ۔" وہ کہنے لگا —— "اچھی بات ہے۔ ہاتھی دانت کی ٹانگ استعمال کی تھی نا؟" میں نے کہا: "ہاں، کی تھی۔" وہ بولا: "ذرا غور فرمائیے، اسٹب، انصاف کی کیا گنجائش ہے جو انھوں نے یک جنبش کے ساتھ ہی تو ٹھوکر ماری تھی؟ کوئی معمولی دیودار کی لکڑی والی ٹانگ تو تھی نہیں۔ اسٹب، تمھارے ٹھوکر ماری بھی تو ایک بڑے آدمی نے، اور ہاتھی دانت کی خوبصورت ٹانگ سے۔ یہ تو ایک عزت کی بات ہے۔ میں تو اسے عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ سنو عقلمند اسٹب، انگلستان میں بڑے سے بڑے امرا اس میں اپنی شان سمجھتے ہیں کہ ملکہ انھیں چپیٹ کے تھپڑ مارے۔ اسٹب، تمھیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ بڈھے احاب نے تمھارے ٹھوکر مار کر تمھیں عقلمند بنا دیا۔ میں جو بات بتا رہا ہوں اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس کی ٹھوکریں ضرور کھاؤ۔ اس کی ٹھوکروں کو عزت افزائی سمجھو اور جواب میں خود کبھی ٹھوکر نہ مارو، کیونکہ عقلمند اسٹب، تم اپنی مدد اپنے آپ نہیں کر سکتے۔ وہ پہاڑ دیکھ رہے ہو نا؟" یہ کہہ کر وہ نامعلوم کس طرح اچانک ہوا میں غائب ہو گیا۔ میں پھر خراٹے لینے لگا۔ پھر کروٹ بدل کے دیکھا تو اپنے بستر پہ لیٹا تھا۔ اکھڑ فلاسک، اس خواب کے بارے میں کیا رائے ہے تمھاری؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے تو احمقانہ سا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔ مگر فلاسک، یہ خواب دیکھ کے مجھے عقل آ گئی۔ احاب کو دیکھ رہے ہو نا؟ وہ سامنے کھڑا ادھر سے پیچھے جھانک رہا ہے۔ فلاسک، سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس بڈھے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ کچھ بھی کہے، اس سے بات نہ کرو۔ ارے، یہ چیخ چیخ کے کیا کہہ رہا ہے؟ ذرا سنو تو!"

"مستول کے اوپر والو! نظریں جمائے رکھو، سب کے سب چوکنے رہو۔ آس پاس وھیل نظر آ رہی ہیں۔ اگر کوئی سفید وھیل دکھائی دے تو گلا پھاڑ کے چلاؤ۔"

"ہاں، او سنو، فلاسک، اب کیا خیال ہے تمھارا؟ ہے نا عجیب سی بات؟ سفید وھیل — یار، سنتے ہو؟ ادھر دیکھو ضرور کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ دیکھتے جاؤ فلاسک، احاب کے دماغ میں ضرور کوئی فتور ہے۔ اچھا، خاموش، وہ اسی طرف آ رہا ہے۔"

باب - ۳۲

علم دریاؤ

سمندر میں تو ہم چل ہی پڑے لیکن اب کوئی دن جاتا ہے کہ ہم اس کی ناپیدا کنار وسعتوں میں کھو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ واقعہ پیش آئے اور سیکڑوں بحری عفریت کے پہلو بہ پہلو چلنے لگے، مناسب ہوگا کہ ہم شروعات میں ہی اس معاملے سے نبٹ لیں جس کے بغیر وہیلوں کے متعلق آگے آنے والے انکشافات اور تلمیحات نہ تو پوری طرح سمجھ میں آئیں گی نہ دلچسپ معلوم ہوں گی۔

اب میں آپ کے سامنے وہیلوں کی موٹی موٹی قسمیں ترتیب وار پیش کرتا ہوں۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔ بالکل ایسا ہے جیسے آدمی ایک پوری کائنات کے عناصر گنوانے بیٹھ جائے۔ خیر اب دیکھئے نہایت مستند، بہترین اور نئی سے نئی کتابیں اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔

کپتان اسکورسبی (۱۸۲۰ء) لکھتے ہیں ——— "علم حیوانات کی کوئی شاخ اتنی پیچیدہ نہیں جتنا فیل ماہی سے تعلق رکھنے والا علم۔"

ڈاکٹر بیل (۱۸۳۹ء) کہتے ہیں ——— "فیل ماہی کو خاندانوں اور گروہوں میں تقسیم کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اس کی تفتیش میری طاقت سے باہر ہے۔ ویسے بھی میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ... جن مصنفوں نے اس جانور (وہیل) کے متعلق لکھا ہے انھوں نے عجب عجب الجھنیں پیدا کی ہیں۔"

"یہ تو ایسا سمندر ہے جس کا اور نہ چھور۔ ہم اس معاملے میں تحقیق و تفتیش سے معذور ہیں۔" "فیل ماہی کے صحیح حالات پردۂ اخفا میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس میدان میں تو کانٹے ہی کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ نیز ناکمل اشارات بس اتنا ہی فائدہ پہنچاتے ہیں کہ ہم ماہرین حیوانات اور الجھیں۔"

علم حیوانات اور علم تشریح کے وہ درخشندہ ستارے یعنی کووئیے اور جون ہنٹر وہیل کے متعلق یہ کچھ کہتے ہیں۔ بہرحال دنیا میں علم چاہے کم سہی مگر کتابیں لاتعداد ہیں۔ ایک حد تک یہی حال اس وہیلوں کے علم کا ہے۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، نئے ہوں یا پرانے، شکل والے ہوں یا جاہل، غرض بیسیوں طرح کے آدمی ہیں جنھوں نے تفصیل سے یا اختصار کے ساتھ وہیل کے متعلق لکھا ہے۔ دو چار کے نام ملاحظہ فرمائیے ——— انجیل، ارسطو، پلینی، ایلڈرووانڈی، سر ٹامس براؤن، گیسنر، رے، لینیئس، رون ڈیلیشیس، ولوبی، گرین، آرٹیڈی، سبالڈ، بریسن، مارٹن، لاسے پید، بون تیرے، دسمارے، کووئیے، فریڈرک کووئیے، جون ہنٹر، اوون، اسکورسبی، بیل، بینٹ، روس براؤن، مریم کوفن کا مصنف، اولمسٹیڈ، پادری چیور۔ مگر ان کتابوں سے آخر میں نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ اس کا حال مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوگا۔

وہیل کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی اس فہرست میں بس آؤن کے بعد آنے والوں نے زندہ وہیل دیکھی تھی اور صرف
ایک شخص کا پیشہ برچھے بازی اور وہیل کا شکار تھا میری مراد کپتان سکورس بی سے ہے۔ گرین لینڈ وہیل کے موضوع پر اس کی
کتابیں سب سے زیادہ مستند ہیں۔ مگر سکورس بی رائٹ وہیل کے بارے میں نہ تو کچھ جانتا ہے نہ اس کا ذکر ہی کرتا ہے علاوہ
اس وہیل کے مقابلے میں گرین لینڈ وہیل تو اس لائق بھی نہیں کہ اس کا نام لیا جائے۔ واضح رہے کہ سمندر کی سلطنت میں گرین لینڈ
ایک غاصب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ذرہ بات بھی نہیں کہ وہیلوں میں سب سے بڑی ہو مگر اس کا ذکر ہی ایک عرصہ دراز
سے متقدم چلا آرہا ہے۔ پھر اب سے ستر سال پہلے تک روغنی وہیل سے لوگ یا تو بالکل ناواقف تھے یا اسے فقط کہانی
سمجھتے تھے اور یہ بے خبری دو چار علمی حلقوں اور بندرگاہوں کے سوا اب تک ہر جگہ مسلط ہے۔ لہٰذا گرین لینڈ وہیل کا
غاصبانہ قبضہ پوری طرح مستحکم رہا ہے۔ پرانے زمانے کے عظیم شاعروں کے یہاں جہاں بھی وہیل کا ذکر آیا ہے اسے دیکھنے
سے پتا چل جائے گا کہ ان کے نزدیک گرین لینڈ وہیل بلا شرکت غیرے سمندر کے تخت کی مالک ہے۔ لیکن اب ایک نئے
اعلان کا وقت آچکا ہے۔ گوش ہوش، گوش ہوش، سنو، لوگو سنو ——— گرین لینڈ وہیل کو تخت سے اتار دیا گیا ہے۔ اب
روغنی وہیل کا راج ہے!

دنیا میں بس دو کتابیں ایسی ہیں جن میں روغنی وہیل کا صحیح نقشہ کھینچنے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور جو اس کوشش میں تھوڑی
بہت کامیاب رہی ہیں۔ ایک کتاب تو بیل کی ہے، دوسری بینیٹ کی۔ یہ دونوں انگلستان کے شکاری جہازوں میں ڈاکٹر
تھے اور دونوں کے دونوں قابل اعتماد اور سچی باتیں کرنے والے آدمی ہیں۔ روغنی وہیل کے متعلق ایسی باتیں جو اور کہیں
نہ ملتی ہوں، ان کی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں پھر ان کا بیان بھی علمی قسم کا ہے۔ بہر حال جتنا مواد بھی ملتا ہے وہ اعلیٰ درجے کا ہے
مگر ابھی تک کسی علمی یا ادبی کتاب میں روغنی وہیل کو مکمل اور جاندار طریقے سے پیش نہیں کیا گیا۔ وہیل کی جتنی قسموں کا بھی شکار کیا
جاتا ہے ان سب میں ایک روغنی وہیل ایسی ہے جس کی سوانح عمری آج تک لکھی ہی نہیں گئی۔

اب ضرورت ہے کہ وہیل کی مختلف قسموں کی ایک آسان سی اور جامع تشریح کی جائے۔ فی الحال ایک خاکہ سا تیار
ہی سہی، اس کی ساری تفصیلات بعد میں آنے والے محقق پوری کریں گے۔ اس کام کے لیے کوئی مجھ سے بہتر آدمی تو سامنے
آتا نہیں، اس لیے میری ہی ناچیز کوششیں حاضر ہیں۔ میں تکمیل کا تو وعدہ کرتا نہیں، کیونکہ جس انسانی چیز کو بھی مکمل سمجھا جائے،
اس میں خود اسی وجہ سے کوئی نہ کوئی نقص لازمی طور پر ہوگا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہاں آپ کو وہیل کی مختلف قسموں کے ایک ایک
عضو کا بیان ملے گا۔ بلکہ بیان تو بہت ہی کم ہوگا۔ میرا مقصد تو بس اتنا ہے کہ اس نئے علم یعنی وہیلیات کا ایک باقاعدہ
خاکہ پیش کروں۔ میں تو نقشہ نویس ہوں، معمار نہیں۔

لیکن یہ بڑی زبردست مہم ہے۔ ڈاک خانے کا ایک معمولی خط چھانٹنے والا اس کی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہیلوں کو سمندر
کی تہہ میں ٹٹولنا، دنیا کی بنیادوں، پسلیوں، بلکہ پیڑو میں ہاتھ ڈالنا وہ بھی ایسا تو بڑی ہولناک چیز ہے میں ہوں بھلا کیا ہوں کہ اس عفریت کی
ناک میں نکیل ڈالنے کی کوشش کروں۔ حضرت ایوب کے خوفناک طعنے یاد آتے ہیں تو میرا دل دہل جاتا ہے۔ "کیا تو مگرمچھ

تیرے ساتھ عہد باندھے گا؟ دیکھو! اُس کے بارے میں اُمید بے فائدہ ہے۔ لیکن میں نے پورے پورے کتب خانے چھان مارے ہیں، بڑے بڑے سمندروں میں سفر کر چکا ہوں، میں نے اپنے ہاتھوں سے وہیلوں کو چھوا ہے۔ میں واقعی سنجیدہ ہوں اور کوشش ضرور کروں گا۔ ابھی چند ابتدائی باتیں اور طے کرنی باقی ہیں۔

پہلی بات —— یہ علم ماہیات کسی غیر معین اور غیر یقینی حالت میں ہے۔ اس کا اندازہ تو شروع ہی میں اس چیز سے کر لیجیے کہ بعض حلقوں میں یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ وہیل مچھلی ہے بھی یا نہیں۔ اپنی کتاب "نظامِ فطرت" ۱۷۶۶ء میں لینیئس کہتا ہے —— "میں وہیلوں کو مچھلیوں سے الگ سمجھتا ہوں۔" مگر میں خود اپنی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ۱۸۵۰ء تک لینیئس کے فتوے کے برخلاف سمندر کی ملکیت میں دوسری مچھلیوں کے ساتھ وہیلیں بھی حصے دار تھیں۔

جن وجوہ کی بنا پر لینیئس وہیلوں کو سمندر کی دُنیا سے خارج کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہیں —— "وہیلوں کے دل میں دو خانے ہوتے ہیں اور دل گرم گرم ہوتا ہے، وہ پھیپھڑے بھی رکھتی ہیں، اُن کی آنکھوں کے پپوٹے ہل سکتے ہیں، کان کھوکھلے ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو عورتوں کی طرح چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہیں۔" میں نے یہ مسئلہ اپنے دوستوں سمن میسی اور چارلی کوفن کے سامنے رکھا۔ یہ دونوں نینٹکٹ کے رہنے والے تھے اور ایک سفر میں میرے شریک رہے تھے۔ انھوں نے بالاتفاق لگے ہی کہا کہ جو دلیلیں دی گئی ہیں وہ کافی نہیں۔ چارلی تو یہاں تک گستاخی پر اتر آیا کہ بولا، یہ سب گپ ہے۔

واضح ہو کہ میں سب دلیل بازی چھوڑ چھاڑ کے وہی دقیانوسی بات قبول کیے لیتا ہوں کہ وہیل ایک قسم کی مچھلی ہوتی ہے اور اپنی تائید کے لیے حضرت یونسؑ کا نام پیش کرتا ہوں۔ یہ بنیادی بات تو طے ہو گئی۔ اب اگلی چیز یہ ہے کہ اندرونی اعتبار سے وہیل دوسری مچھلیوں سے کس طرح مختلف ہے۔ اوپر لینیئس نے وہ باتیں گنوا ہی دی ہیں، لیکن مختصراً وہ باتیں یہ ہیں —— وہیل کے پھیپھڑے ہوتے ہیں اور خون گرم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسری مچھلیوں کے پھیپھڑے نہیں ہوتے اور خون ٹھنڈا ہوتا ہے۔

اگلی چیز —— خارجی ہیئت کے اعتبار سے وہیل کی تعریف کس طرح معین کریں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُوسرے جانوروں سے الگ ہو جائے؟ اچھا تو سنیے —— وہیل ایک ایسی مچھلی ہے جو فوارہ چھوڑتی ہے اور جس کی دم مسطح ہوتی ہے۔ بس یہ وہیل کا نقشہ کھینچ گیا۔ یہ تعریف مختصر سہی لیکن طویل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ والرس بھی وہیل کی طرح فوارہ چھوڑتی ہے مگر والرس مچھلی نہیں کیونکہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ رہتی ہے۔ لیکن تعریف کا دوسرا جزو پہلے جزو کے ساتھ مل کے اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ خشکی کے لوگ جتنی مچھلیوں سے واقف ہیں اُن کی دم مسطح نہیں بلکہ عمودی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف فوارہ چھوڑنے والی مچھلیوں کی دم چاہے اسی شکل کی ہو، مگر مسطح حالت میں رہتی ہے۔

میں نے یہ تو بتا دیا کہ وہیل کیا چیز ہوتی ہے، لیکن اس تعریف کے ذریعے میں وہیل کی برادری سے کسی بھی ایسے سمندری جانور کو خارج نہیں کر رہا ہوں جسے نینٹکٹ کے واقف کار لوگ وہیل سے متعلق سمجھتے ہوں اور نہ ایسی مچھلیوں کو اس خاندان سے منسلک کر رہا ہوں جنھیں اب تک مستند طریقے سے غیر سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ماہیات کے اس ابتدائی خاکے

ہیں وہ ساری چھوٹی مچھلیاں شامل ہوں گی جو فوارہ چھوڑتی ہیں اور جن کی دم مسطح ہے۔ اچھا اب وہیلوں کی اس ساری فوج کے عظیم دستے ملاحظہ فرمایئے۔

پہلے تو میں جسامت کے لحاظ سے وہیلوں کو تین ابتدائی جلدوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پھر ہر جلد کے باب ہوں گے اور ان میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی وہیلیں آ جائیں گی۔

نمبر۱۔ بڑی تقطیع کی وہیل ——— نمبر۲۔ درمیانی تقطیع کی وہیل ——— نمبر۳۔ چھوٹی تقطیع کی وہیل

بڑی تقطیع کا نمونہ ہے روغنی وہیل، درمیانی تقطیع کا بجوکڑ وہیل، چھوٹی تقطیع کا سنگ ماہی۔

بڑی تقطیع ——— یہاں مندرجہ ذیل باب آتے ہیں۔ نمبر۱۔ روغنی وہیل، نمبر۲۔ گرین لینڈ وہیل، نمبر۳۔ پردار وہیل، نمبر۴۔ کبڑی وہیل، نمبر۵۔ استرے جیسی کمر والی وہیل، نمبر۶۔ گندھک دار پیٹ والی وہیل۔

جلد اول (بڑی تقطیع)، باب اول (روغنی وہیل)۔ اس وہیل کو پرانے زمانے میں انگریز لوگوں نے کئی نام دے رکھے تھے ٹرمپا وہیل، فزیٹر وہیل، اینول جیسے سر والی وہیل۔ آجکل فرانس کے لوگ اسے کاشالو کہتے ہیں، جرمن لوگ پوٹس فش اور لمبے لفظوں والے میکروسیفیلس۔ کرۂ زمین پر اس سے بڑا جانور کوئی نہیں، پھر وہیلوں میں بھی سب سے خوفناک یہی ہے۔ شکل صورت بڑی شاندار، تجارتی لحاظ سے نہایت گراں قدر، کیونکہ یہی ایک ایسی وہیل ہے جس سے بیش قیمت روغن نکلتا ہے۔ اس کی خصوصیات آگے چل کر کئی جگہ تفصیل کے ساتھ لکھی جائیں گی۔ فی الحال مجھے اس کے نام سے غرض ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے یہ نام بالکل مہمل ہے۔ دو چار صدی پہلے روغنی مچھلی کو ایک منفرد ہستی کے لحاظ سے کوئی جانتا بھی نہ تھا اور اس کا تیل یونہی اتفاق سے جنگلی مچھلیوں کے ذریعے مل جاتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ سمجھتے تھے کہ یہ روغن اسی مچھلی میں سے نکلتا ہے جسے انگریز گرین لینڈ وہیل کہا کرتے تھے۔ پھر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ روغن گرین لینڈ وہیل کے جوشِ حیات کا نتیجہ ہے چنانچہ روغنی وہیل کے نام میں یہ اشارہ موجود ہے۔ اس زمانے میں یہ روغن بے حد نایاب تھا اور چراغوں میں نہیں بلکہ مرہم یا دوا کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور صرف عطاروں دوا فروشوں کے ہاں جیسے ہم آجکل تولہ دو تولہ ریوند چینی خریدتے ہیں۔ جب اس روغن کی ماہیت کا پتا چل گیا تو بھی تاجروں نے شروع کا نام باقی رکھا تاکہ اس کی قدر و قیمت زیادہ ہو، کیونکہ یہ تصور اس چیز کی نایابی پر دلالت کرتا ہے۔ آخرکار یہ نام اس وہیل کو بخش دیا گیا جس سے واقعی روغن نکلتا ہے۔

جلد اول (بڑی تقطیع)، باب دوم (گرین لینڈ وہیل)۔ ایک لحاظ سے یہ وہیلوں میں سب سے بزرگ ہے کیونکہ

مجھے معلوم ہے کہ جن مچھلیوں کو لوگ [illegible] والے سور اور سورنی کہتے ہیں انھیں بعض ماہرین حیوانات اب تک وہیلوں میں شامل سمجھتے ہیں۔ مگر یہ مچھلیاں تو بڑی گندی اور گستاخ ہوتی ہیں، زیادہ تر دریاؤں کے دہانے میں چھپی رہتی ہیں اور گیلا بھس کھاتی ہیں۔ پھر یہ مچھلیاں فوارہ بھی نہیں چھوڑتیں۔ لہٰذا مجھے یہ بات قبول نہیں کہ ان کا سلسلۂ نسب وہیلوں سے ملتا ہے اور میں نے انھیں پروانۂ راہداری دے دیا ہے کہ ماہیات کے ملک سے چلی جائیں۔

انسان نے باقاعدہ طور پر سب سے پہلے اسی کا شکار کھیلا۔ اس مچھلی سے ایک تو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو وہیل کی ہڈی
کے نام سے مشہور ہے اور دوسرے وہ تیل جسے وہیل کا تیل کہتے ہیں اور جو تجارتی اعتبار سے ذرا گھٹیا درجے کی چیز
ہے۔ ماہی گیر اس مچھلی کو بلا امتیاز طرح طرح کے ناموں سے یاد کرتے ہیں ـــــ وہیل، گرین لینڈ وہیل، کالی وہیل، بڑی وہیل،
اصل وہیل، رائٹ وہیل۔ جس مچھلی کے لئے اتنے کچھ نام رکھے گئے ہیں اس کی انفرادی شخصیت کے متعلق بڑا ابہام پایا جاتا ہے۔
پھر یہ وہیل کون سی ہے جسے میں نے بڑی تقطیع کی دوسری قسم میں رکھا ہے؟ یہ وہ مچھلی ہے جسے انگلستان کے
ماہرین حیوانات مسٹی سیٹس کہتے ہیں۔ انگریز ماہی گیر گرین لینڈ وہیل، فرانسیسی بالین اوردی نیر اور سویڈن والے
گرولانڈس وال فش۔ دو صدیوں سے انگلستان اور ہالینڈ کے لوگ بحر منجمد شمالی میں اسی کا شکار کھیلتے رہے ہیں،
امریکہ کے ماہی گیر بھی ایک مدت سے بحر ہند میں، برازیل کے ساحل پر اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جنھیں رائٹ وہیل
کی شکار گاہ کہا جاتا ہے۔ اسی کے پیچھے پڑے رہے ہیں۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انگریزوں کی گرین لینڈ وہیل امریکیوں کی رائٹ وہیل سے مختلف ہے مگر ان دونوں
کی نمایاں خصوصیات بالکل ایک جیسی ہیں۔ ابھی تک کوئی ٹھوس چیز پیش نہیں کی گئی جس کی بنا پر ان دونوں میں بنیادی طور
سے امتیاز کیا جا سکے۔ بعض لوگ انتہائی مبہم فرق نکال کے قسموں پر قسمیں بناتے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے علم حیوانات کے
بعض شعبے اتنے پیچیدہ اور گنجلک ہو گئے ہیں۔ روغنی وہیل کی تشریح کے سلسلے میں آگے چل کے رائٹ وہیل کا بیان
تفصیل کے ساتھ ہوگا۔

جلد اول (بڑی تقطیع)، باب سوم (پردار وہیل) اس عنوان کے تحت وہ عفریت آتے ہیں جس کے کئی نام ہیں پردار وہیل،
فوارہ وہیل، لانگ جون۔ اسے لوگوں نے تقریباً ہر سمندر میں دیکھا ہے اور نیویارک کے جہازوں میں بحر اوقیانوس پار کرتے
ہوئے مسافروں کو دور سے عموماً اسی وہیل کا فوارہ نظر آتا ہے۔ لمبائی اور کلّے کی ہڈی کے اعتبار سے پردار وہیل رائٹ وہیل
سے مشابہ ہوتی ہے لیکن جسامت اتنی نہیں ہوتی پھر رنگ بھی نسبتاً ہلکا اور زیتون جیسا ہوتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے
ہونٹ رسّوں کی طرح لگتے ہیں اور ہونٹ بھی کیا ہوتے ہیں بس چوڑی چوڑی جھریوں کی پرتیں کی پرتیں ایک دوسرے میں بھنچی
چلی جاتی ہیں۔ اس وہیل کی وجہ تسمیہ اور امتیازی نشان ایک پر ہے جو عام طور سے بہت نمایاں رہتا ہے۔ یہ پر تین چار فٹ
لمبا، نکیلی شکل کا اور بہت کھردرا ہوتا ہے اور کمر کے پچھلے حصے پر سیدھا کھڑا رہتا ہے۔ اس جانور کے بدن کا چاہے کوئی
دوسرا حصہ نظر نہ آئے لیکن بعض وقت یہ واحد پر پانی کی سطح سے ابھرا ہوا ضرور دکھائی دے گا۔ جب سمندر تھوڑا
بہت پرسکون ہو، پانی میں گول گول لہریں اٹھ رہی ہوں اور یہ پر سوئی کی طرح ابھر کر اسی گول سطح پر سائے ڈال رہا ہو تو
اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اس کے چاروں طرف جو پانی کا گھیرا ہے وہ کچھ کچھ دھوپ گھڑی سے مشابہ ہے اور اس پر
گھنٹوں کی لکیریں بنی ہوتی ہیں۔ اس گھڑی کی سطح پر سایہ اکثر پیچھے کی طرف چلتا ہے۔ یہ وہیل دوسری وہیلوں کے ساتھ رہنا پسند
نہیں کرتی جس طرح بعض لوگ مردم بیزار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ مچھلی وہیل بیزار ہے۔ انتہائی شرمیلی، ہمیشہ اکیلی پھرنے والی

سمندر میں کبھی الگ تھلگ اور ویران سی جگہ ایک دم اوپر ابھر آتی ہے اور اس کا فوارہ یوں سیدھا اچھلتا ہے جیسے ایک فوارہ میں
سے کسی فضا میں چھوڑا گیا ہو۔ اس کا لمبا بیڑہ وہ اس تیزی اور قوت کے ساتھ تیرتی ہے کہ اس کا پیچھا کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس
مچھلی کو یہی نسل کا قابیل سمجھنا چاہیے جسے وطن سے نکال دیا گیا مگر جس پر کوئی قابو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یہ گویا اس کا داغ
ہے۔ چونکہ اس کے منہ میں ہڈی ہوتی ہے۔ اس لیے بعض دفعہ رائٹ وہیل کے ساتھ ساتھ لیتے ہیں۔ وہیل کی اس فرضی قسم میں
شمار کیا جاتا ہے جسے ہڈی والی وہیل کہتے ہیں۔ ہڈی والی وہیلوں کی بھی کئی قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر ایسی ہیں
جن سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض کے نام ماہی گیروں نے یوں رکھے ہیں۔ — چپٹی ناک والی وہیل، چرچ والی
وہیل، ڈھیلے سر کی وہیل، کنگری ہوئی وہیل، بے جبڑے کی وہیل اور چونچ دار وہیل۔

اس نام ہڈی والی وہیل میں یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ بعض قسم کی وہیلوں کی طرف اشارہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔
لیکن ایک بات اور بھی یاد رہے۔ بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی یا کوہان یا پر یا دانتوں کی بنیاد پر علم ماہیات بڑی آسانی
سے مرتب ہو سکتا ہے اور یہ بات وہیل کے دوسرے جسمانی خصائص کو الگ الگ حاصل نہیں۔ مگر ان چیزوں کے لحاظ سے
وہیل کی قسمیں واضح طور سے متعین نہیں کی جا سکتیں۔ یہ کوشش ہی فضول ہوگی۔ پھر کیا ہو؟ ہڈی، کوہان، پر اور دانت تو ایسی چیزیں
ہیں جن کی مختلف شکلیں ہر طرح کی وہیلوں میں بلا امتیاز ملتی ہیں۔ چاہے دوسرے اور زیادہ اہم اعتبارات سے ان کی جسمانی ساخت
کیسی ہی ہو۔ سنفارونی وہیل اور کبڑی وہیل دونوں کے کوہان ہوتا ہے۔ مگر یہاں آ کے مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اسی
کبڑی وہیل اور گرین لینڈ وہیل دونوں میں ہڈی ہوتی ہے۔ مگر مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی دوسری چیزوں کا ذکر کیا
ان کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف قسم کی وہیلوں میں یہ چیزیں اتنی بے قاعدگی سے یکجا ہوتی ہیں اور فرداً فرداً بھی ان کے بیچ
سے ایسی رہ جاتی ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی عمومی نظام مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ چٹان ہے جس سے ٹکرا کے وہیلوں کے ہر ایک
ماہر کا جہاز پاش پاش ہو جاتا ہے۔

لیکن شاید آپ سوچیں گے کہ وہیل کے اندرونی حصے میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی دستیاب ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہیلوں
کی قسمیں مقرر کی جا سکیں۔ نہیں، یہ بھی نہیں۔ مثلاً گرین لینڈ وہیل کے جسم میں اس کی ہڈی سے زیادہ نمایاں چیز اور کون سی ہے؟
لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کی ہڈی کے اعتبار سے گرین لینڈ وہیل کو کسی ایک قسم میں داخل کرنا ممکن نہیں۔ اگر آپ مختلف قسم کی وہیلوں
کے پیٹ میں اتر جائیں تو بھی آپ کو ایسے امتیازات میسر نہیں آئیں گے جو اس علم کے مرتب کو مندرجہ بالا خارجی امتیازات سے
زیادہ، بلکہ اس کا پچاسواں حصہ بھی مدد پہنچا سکیں۔ پھر کیا چارہ ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بس اتنا ہو سکتا ہے کہ آپ وہیلوں کو ان کی پوری جسامت
کے لحاظ سے دیکھیں اور نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ان کی قسمیں مقرر کرتے چلے جائیں۔ یہی کتابی طریقہ یہاں اختیار کیا گیا
ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جو کامیاب ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ بس یہی عمل میں آ سکتا ہے۔ اچھا اب آگے چلیے۔

جلد اول (تیسری تقطیع) باب چہارم (کبڑی وہیل): یہ وہیل امریکہ کے شمالی ساحل پر اکثر دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ لوگوں نے
بہت خوشی سے یہیں پکڑی بھی ہے اور نیو انگلینڈ کے بندرگاہوں میں لے آئے ہیں۔ اس کی کمر پر ایک بہت بڑا بوجھ سا رکھا ہوتا ہے جیسا

بسائل لیے پھرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے ہاتھی وہیل یا قلعہ وہیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ مچھلی جس نام سے مشہور ہے اُسی
سے اس کی امتیازی خصوصیات نمایاں نہیں ہوتیں، کیونکہ روغنی وہیل کے بھی کوہان ہوتا ہے، خواہ چھوٹا سا سہی۔ اِس کا تیل
کچھ ایسا قیمتی نہیں ہوتا۔ ہڈی اس کے بھی ہوتی ہے۔ وہیلوں میں یہ سب سے زیادہ کھلنڈری اور زندہ دل ہے اور جیسا
خوش رنگ جھاگ اور سفید پانی یہ اڑاتی ہے ویسا کوئی وہیل نہیں اڑاتی۔

جلد اوّل (بڑی تقطیع) باب ہفتم (استرے جیسی کمر والی وہیل) اس وہیل کے متعلق نام کے سوا کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں
نے کیپ ہورن کے قریب اسے دُور سے دیکھا ضرور ہے۔ یہ ذرا خلوت پسند واقع ہوئی ہے اور شکاریوں اور فلسفیوں دونوں
سے بار بار پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ڈرپوک تو نہیں ہے، مگر اس نے آج تک کمر کے سوا اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھایا اور کمر بھی
بس ایک لمبی اور تیز دھار کی طرح باہر نکلی رہتی ہے۔ خیر اسے چھوڑیے۔ اس کے متعلق نہ تو مجھے زیادہ معلومات حاصل ہیں
نہ کسی اور کو۔

جلد اوّل (بڑی تقطیع) باب ششم (گندھک دار پیٹ والی وہیل) یہ ایک اور خلوت پسند جیو ہے۔ اس وہیل کا پیٹ
گندھک کی طرح دمکتا ہے، چونکہ یہ سمندر میں بہت گہرے غوطے لگاتی ہے، اس لیے وہیں کہیں چٹانوں سے رگڑ
کھا کھا کے اس کا پیٹ ایسا ہو گیا ہو گا۔ یہ مچھلی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ کم سے کم میں نے اسے جنوبی سمندروں کے دور دراز
علاقوں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا اور وہ بھی اتنے فاصلے سے کہ چہرہ تک ٹھیک طرح نظر نہیں آیا۔ شکاری اس کا پیچھا بھی نہیں کرتے
یہ تو رسیاں تک توڑ کے بھاگ جاتی ہے۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اچھا بھئی، خدا حافظ!
یہ تمھارے متعلق کوئی ایسی بات نہیں بتا سکتا جو سچی ہو۔ میں تو کیا، نن ٹکٹ کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی نہیں بتا سکتا۔

جلد اوّل (بڑی تقطیع) کا بیان ختم ہوا اور اب جلد دوم (درمیانی تقطیع) شروع ہوتی ہے۔

درمیانی تقطیع۔ اس جلد میں درمیانی جسامت کی وہیلیں شامل ہیں۔ فی الحال مندرجہ ذیل اقسام کا شمار ہو سکتا ہے۔——

۱۔ دھمکڑ وہیل۔ ۲۔ کالی وہیل۔ ۳۔ نار وہیل۔ ۴۔ ٹھٹھے باز۔ ۵۔ قاتل۔

جلد دوم (درمیانی تقطیع) باب اوّل (دھمکڑ وہیل) یہ مچھلی اتنی مشہور و معروف ہے کہ اس کے سانس لینے، بلکہ دھونکنی
چلانے کی گونج دار آواز نے تو خشکی والوں کو بھی بے اختیار متوجہ کر دیا ہے۔ لیکن عموماً اس کا شمار وہیلوں میں نہیں ہوتا، مگر اس میں وہیل کی
ساری امتیازی خصوصیات موجود ہیں، اس لیے زیادہ تر ماہرین حیوانات اسے وہیل تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی جسامت درمیانی ہوتی ہے، یعنی پندرہ سے پچیس
فٹ لمبی، کمر کا گھیر بھی اسی مناسبت سے۔ یہ سمندر میں بڑے غول کے ساتھ چلتی ہے۔ حالانکہ اس کا تیل مقدار میں بہت زیادہ اور روشنی کے لیے نہایت عمدہ ہوتا
ہے، مگر اس کا باقاعدہ شکار نہیں کیا جاتا۔ بعض ماہی گیر اس کی آمد کو روغنی وہیل کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔

جلد دوم (درمیانی تقطیع) باب دوم (کالی وہیل) میں سب مچھلیوں کے وہ نام دے رہا ہوں جو ماہی گیروں میں مقبول
ہیں، کیونکہ عام طور سے یہی نام سب سے اچھے ہیں۔ جہاں کوئی نام مبہم یا غیر واضح ہو گا، میں صاف کہہ دوں گا اور اس کے بجائے
دوسرا نام تجویز کروں گا۔ نام نہاد کالی وہیل کے سلسلے میں بھی مجھے یہی کرنا پڑے گا، کیونکہ تقریباً سبھی وہیلیں کالی ہوتی ہیں۔ لہٰذا

گو آپ چاہیں تو اسے نکر بٹا وہیل کہہ لیں۔ اس کا پیٹ بہت مشہور ہے۔ اس کے ہونٹ اندر سے اوپر کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک احمقانہ مسکراہٹ چھائی رہتی ہے۔ اوسطاً یہ وہیل لمبائی میں ساڑھے اٹھارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ قریب قریب ہر علاقے میں ملتی ہے۔ تیرتے وقت یہ کوہان کو آگے سے مڑا ہوا پر کچھ عجب طرح اٹھائے رکھتی ہے کہ بالکل رومن لوگوں کی ناک جیسا لگتا ہے۔ جب اور کوئی مصروفیت نہ ہو تو روغنی وہیل کے شکاری بعض دفعہ نکر بٹا وہیل ہی کو پکڑ لیتے ہیں تاکہ گھر میں کام آنے والے سستے تیل کا ذخیرہ کم نہ ہونے پائے۔ یہی جیسے بعض کفایت شعار لوگ جب اکیلے بیٹھے ہوں اور کوئی باہر کا آدمی موجود نہ ہو تو خوشبودار موم کے بجائے گندی چربی جلاتے ہیں۔ حالانکہ اس وہیل کی چربی بہت پتلی ہوتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ تو اس میں سے ترسٹھ گیلن سے بھی زیادہ تیل نکلتا ہے۔

جلد دوم اور میانہ تقطیع (باب سوم) ناروہیل یعنی نتھنا وہیل۔ اس وہیل کا نام بھی عجیب ہے۔ شاید یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کے ناک کی شکل کے سینگ کو لوگوں نے شروع میں غلطی سے ناک سمجھا۔ یہ مچھلی سولہ فٹ لمبی ہوتی ہے اور اس کا سینگ اوسطاً پانچ فٹ کا مگر کبھی کبھی دس فٹ سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ بلکہ پندرہ فٹ تک پہنچتا ہے۔ دراصل یہ سینگ ایک لمبا دانت ہے جو مچھلی کے جبڑے سے ٹیڑھا نکلتا ہے۔ لیکن یہ دانت صرف بائیں طرف ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے یہ مچھلی کچھ ایسی منحوس لگنے لگتی ہے جیسے کوئی کھبا آدمی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس سینگ یا نیزے کا اصل مقصد کیا ہے۔ یہ اکثر مچھلی یا درانتی مچھلی کی تلوار کی طرح تو استعمال ہوتا نہیں۔ البتہ میں نے بعض جہازیوں سے سنا ہے کہ سمندر کی تہ میں ناروہیل اس سے پھاوڑے کی طرح اپنی غذا کھود کھود کے نکالتی ہے۔ چارلی کوفن نے بتایا کہ یہ سینگ برف توڑنے کے کام آتا ہے۔ بحر منجمد شمالی میں ناروہیل تہ میں سے اٹھ کر اوپر آتی ہے اور وہاں برف کی چادر جمی ہوئی ملتی ہے تو اپنا سینگ اڑا کے برف کو توڑ دیتی ہے اور باہر نکل آتی ہے۔ مگر ان دونوں قیاسوں کا ثبوت کوئی نہیں ملتا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ناروہیل اس اکیلے سینگ کو چاہے جس طرح استعمال کرتی ہو لیکن اگر وہ کتابیں پڑھے تو ورق کاٹنے میں بڑی آسانی رہے۔ میں نے ناروہیل کے اور نام بھی سنے ہیں — دانت والی وہیل، سینگ والی وہیل، ایک سینگ والی وہیل۔ ذی روح مخلوق کی تقریباً ہر شاخ میں ایک سینگ والے جانور موجود ہیں۔ یہ مچھلی اس خصوصیت کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔ پرانے گوشہ نشین مصنفوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ قدیم زمانے میں اس وہیل کے سینگ کو زہر کا تریاق سمجھا جاتا تھا اور اس سے تیار کی ہوئی دوائیں بڑی مہنگی قیمت ہوتی تھیں۔ پھر اس سے بے ہوش ہونے والی بیگمات کے لیے نمک بھی بنایا جاتا تھا جیسے ہرن کے سینگوں سے بنتا ہے۔ ان دنوں یہ سینگ بجائے خود نوادرات میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے ایک کتاب میں سر مارٹن فروبشر کے ایک سفر کا حال پڑھا ہے۔ جب فروبشر کا جہاز روانہ ہو رہا تھا تو ملکہ الزبتھ نے محل کی کھڑکی سے بڑے زور و جواہر میں غرق ہاتھ نکال کر اس کی طرف ہلایا تھا۔ جب فروبشر واپس آیا تو اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر ملکہ کی خدمت میں ناروہیل کا ایک زبردست سینگ پیش کیا جو عرصے تک ونڈسر کے قلعے میں لٹکا رہا۔ آئرلینڈ کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ ارل آف لیسٹر نے بھی گھٹنوں کے بل جھک کر ملکہ معظمہ کی خدمت میں ایک اور سینگ پیش کیا تھا جو ایک خشکی کے واحد سینگ والے جانور کا تھا۔

ناروہیل کی شکل و صورت بڑی دل فریب اور تیندوے کی سی ہوتی ہے۔ نیچے والا حصہ سفید رنگ، اوپر سے گول اور ابھری ہوئی سیاہ چتیاں۔ اس مچھلی کا تیل صاف شفاف نفیس اور اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے لیکن مقدار میں بہت کم۔ اس کا شکار شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے اور یہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے آس پاس رہتی ہے۔

جلد دوم درمیانی تقطیع، باب چہارم (قاتل) اس وہیل کے متعلق نیوگنٹ ولاس کو صحیح معلومات حاصل نہیں اور نہ عام ماہرین حیوانات کو، بالکل ہی نہیں۔ میں نے اسے دور ہی سے دیکھا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ گرز وہیل کے برابر ہوتی ہوگی۔ یہ وہیل بڑی وحشی اور خونخوار ہے۔ بعض دفعہ یہ بڑی تقطیع کی وہیل کا ہونٹ پکڑ کے جونک کی طرح لٹک جاتی ہے یہاں تک کہ وہ زبردست مچھلی سر پٹخ پٹخ کے مر جاتی ہے۔ اس مچھلی کا شکار کبھی نہیں کھیلا جاتا۔ نہ معلوم اس کا تیل کس طرح کا ہوتا ہے، میں نے تو کبھی اس کے متعلق کچھ سنا ہی نہیں۔ شاید آپ اعتراض کریں گے کہ اس مچھلی کو یہ نام غلط دیا گیا۔ یہ تو بہت ہی مبہم لفظ ہے کیونکہ خشکی والے اور تری والے، ہم سبھی قاتل ہیں، نپولین بوناپارٹ بھی اور شارک مچھلی بھی۔

جلد دوم درمیانی تقطیع، باب پنجم (ڈنڈے باز) یہ مچھلی اپنی دم کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ اس سے ڈنڈے کا کام لیتی ہے اور اپنے دشمنوں کو دم سے رگید دیتی ہے۔ یہ بڑی تقطیع والی وہیل کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھتی ہے اور ڈنڈے لگا لگا کر اس سے سواری لیتی ہے یعنی جس طرح بعض مدرسے دنیا میں ترقی کرتے ہیں۔ ڈنڈے باز وہیل کے متعلق زیادہ کسی کو معلوم نہیں جتنا قاتل وہیل کے بارے میں معلوم ہے۔ حالانکہ سمندر میں کوئی قانون نہیں چلتا مگر وہاں بھی ان دونوں کی حیثیت قانون توڑنے والوں کی سی ہے۔

یہاں درمیانی تقطیع کی جلد دوم ختم ہوئی اور اب جلد سوم (چھوٹی تقطیع) شروع ہوتی ہے۔

چھوٹی تقطیع:- اس میں چھوٹی وہیلیں شامل ہیں۔ ۱۔ واہ واہ مچھلی ۲۔ ابھری ناک کی سنگ ماہی ۳۔ چپٹے منہ کی سنگ ماہی۔

جن لوگوں نے اس موضوع کا خصوصی مطالعہ نہیں کیا انھیں شاید یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی کہ یہاں چار چار پانچ پانچ فٹ کی مچھلیوں کو بھی وہیلوں کے زمرے میں داخل کر دیا گیا ہے کیونکہ وہیل کے لفظ سے تو لوگوں کے ذہن میں کسی بہت بڑی چیز کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے وہیل کی جو تعریف کی ہے اس کے لحاظ سے یہ مچھلیاں جنھیں چھوٹی تقطیع میں رکھا گیا، وہیلیں ہیں۔ میں نے بتایا تھا کہ وہیل وہ مچھلی ہے جو فوارہ چھوڑتی ہے اور جس کی دم سطح ہوتی ہے۔

تیسری جلد (چھوٹی تقطیع) باب اول (واہ واہ مچھلی) یہ عام سنگ ماہی ہے جو قریب قریب ساری دنیا میں ملتی ہے۔ اس کا یہ نام میں نے خود ہی رکھا ہے کیونکہ سنگ ماہی کئی قسم کی ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی تفریق تو پیدا کرنی ہی چاہیے۔ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ ان مچھلیوں کا پورا جھنڈ کا جھنڈ اٹکھیلیاں کرتا جاتا ہے اور کھلے سمندر میں آسمان کی طرف اس طرح اچھلتا ہے جیسے کوئی ہجوم خوشی کے مارے ٹوپیاں اچھال رہا ہو۔ ان مچھلیوں کو آتا دیکھ کر جہازیوں کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ ان کی زندہ دلی کا یہ عالم ہے کہ لہروں میں سے نکل نکل کے ہوا کے رخ چل پڑتی ہیں۔ ان کی زندگی ہوا کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے بسر ہوتی ہے۔ ان کا نظر آنا بہت نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اگر ان اچھل باز مچھلیوں کو دیکھ کر آپ کا نعرہ لگانے کو جی نہیں چاہتا تو خدا آپ کے اوپر رحم کرے۔ پھر تو آپ کے اندر وہ دیوتاؤں کی سنت یعنی دل لگی بازی کا مادہ ہے ہی نہیں۔ اس قسم کی ایک موٹی تازی مچھلی

میں سے اچھا خاصا ایک گیلن نہایت نفیس تیل نکلتا ہے۔ لیکن اس کے جبڑوں میں سے جو لطیف مادہ نکالا جاتا ہے وہ تو بہت ہی بیش قیمت ہوتا ہے۔ اس کی جوہریوں اور گھڑی سازوں کو بہت ضرورت رہتی ہے۔ جہازی اسے اپنی سان پر لگاتے ہیں۔ پھر اس کا گوشت بھی کھانے میں اچھا ہوتا ہے۔ شاید آپ کو یہ خیال نہ آیا ہو کہ سنگ ماہی تو فوارہ بھی چھوڑتی ہے اصل میں اس کے فوارے کی دھار اتنی پتلی ہوتی ہے کہ آسانی سے دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اگلی دفعہ آپ کو موقع ملے تو غور سے دیکھیے گا۔ آپ کو چھوٹے پیمانے پر بالکل روغنی وہیل نظر آئے گی۔

جلد سوم (چھوٹی تقطیع) باب دوم (ابھرے ہونٹ کی سنگ ماہی) یہ تو پوری سمندری ڈاکو ہے۔ نہایت خونخوار۔ میرا خیال ہے کہ بس بحر اوقیانوس ہی میں ملتی ہے۔ وادوا مچھلی سے ذرا بڑی ہوتی ہے لیکن اتنی ہی جسامت ہوتی ہے۔ اسے ذرا چھیڑیے تو بھڑک کے شارک بن جاتی ہے۔ میں نے اس کا پیچھا تو کئی دفعہ کیا ہے مگر ہاتھ کبھی نہیں آئی۔

جلد سوم (چھوٹی تقطیع) باب سوم (چپٹے منہ کی سنگ ماہی) یہ سنگ ماہیوں میں سب سے بڑی ہوتی ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے صرف بحر اوقیانوس ہی میں ملتی ہے۔ انگریزی میں اس کا بھی ٹھیک ایک ہی نام ہے اور وہ بھی ماہی گیروں نے رکھا ہے یعنی رائٹ وہیل کی سنگ ماہی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عام طور سے یہ مچھلی رائٹ وہیل کے آس پاس رہتی ہے۔ شکل صورت میں یہ وادوا مچھلی سے کچھ مختلف ہے کیونکہ یہ اتنی موٹی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تو شکل سے اچھی خاصی چھریری اور زیادہ لمبی ہے اور سنگ ماہیوں کی کمر پر پر ہوتے ہیں لیکن اس کے نہیں ہوتے۔ اس کی دم بڑی خوب صورت اور آنکھیں بادام کی شکل کی بڑی بڑی لڑکی جیسی اور کچھ جذباتی قسم کی ہوتی ہیں۔ مگر اس کا چپک چپکا ٹیڑھا سا منہ سارا معاملہ خراب کر دیتا ہے۔ اس کی ساری کمر تو سیاہ رنگ کی ہوتی ہے لیکن سر سے دم تک ایک نمایاں لکیر چلی جاتی ہے جیسے جہاز کے جنگلے ہیں۔ اسے جھکولے دار کہتے ہیں اس کی وجہ سے دو الگ الگ رنگ نظر آتے ہیں۔ اوپر کالا، نیچے سفید۔ سر کا تقریباً سارا حصہ اور زیریں دامن سفید ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ مچھلی کچھ ایسی لگتی ہے جیسے چوری چوری کھیر چاٹ کے آرہی ہو۔ مگر یہ تو بہت ہی چکنی چپکی اور گندہ سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تیل معمولی سنگ ماہی کے تیل جیسا ہوتا ہے۔

* * *

چھوٹی تقطیع سے آگے یہ ترتیب نہیں چلتی کیونکہ سنگ ماہی وہیلوں میں سب سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اہم اور مشہور وہیلوں کا ذکر تو پورا ہو چکا۔ لیکن ابھی بہت سی جھگڑالو سے نام اور نیم افسانوی وہیلیں باقی ہیں۔ ایک امریکی ماہی گیر کی حیثیت سے میں نے ان کے بارے میں سنا تو ضرور ہے لیکن انھیں خود کبھی نہیں دیکھا۔ یہاں ان کے وہ نام لکھے دیتا ہوں جو میں نے جہازیوں سے سنے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کے یہ فہرست محققین کے لیے مفید ثابت ہو اور جس کام کی ابتدا میں نے کی ہے وہ ان کے ہاتھوں پورا ہو جائے۔ اگر مندرجہ ذیل وہیلوں میں سے کوئی ہاتھ آجائے تو اس کی بڑی یا درمیانی یا چھوٹی تقطیع کے حساب سے اسے بھی نہایت آسانی کے ساتھ اس نظام میں شامل کیا جا سکتا ہے:۔ بکڑ جیسی ناک والی وہیل، گورڈ وہیل، پلپلے سر کی وہیل، نقاب پوش وہیل، لنگڑا وہیل، توپ وہیل، کھینچی وہیل، تانبا وہیل، ہاتھی وہیل، پہاڑ وہیل، بھوت کشتی وہیل

نل دمن وغیرہ وغیرہ۔ آتش پرست، ہندو اور انگلستان کی پرانی مستند کتابوں سے ہر قسم کی دیویوں کی اور فرشتوں کی نقل کی جا سکتی ہیں۔ ان دیویوں کے نام بھی بڑے بڑے عجیب ہیں لیکن میں انہیں فرسودہ اور بے کار سمجھ کے چھوڑے دیتا ہوں۔ بلکہ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ نام ہیں تو دیویوں ہی کے لیکن ان میں گرج زیادہ ہے معنی غائب۔

اب ایک آخری بات اور ہے۔ شروع میں بتایا گیا تھا کہ حیات کا یہ نظام فوراً اور یہیں کے یہیں مکمل نہیں ہوگا۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں اپنے حیاتی نظام کو نامکمل چھوڑ رہا ہوں۔ جیسے کولون کے عظیم گرجا کو چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس کے نامکمل مینار پر تو مزید تعمیر کرنے کی کرین یوں ہی کھڑی رہنے دی گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی عمارتوں کو تو ان کے ابتدائی معمار ہی پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن عظیم عمارتوں میں یعنی بڑی عمارتوں میں آخری پتھر رکھنے کا کام ہمیشہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خدا کرے میں بھی کوئی کام پورا کروں۔ یہ ساری کتاب تو بس ایک خاکہ ہے —— نہیں خاکے کا بھی خاکہ۔ ہائے وقت! ہائے طاقت! ہائے روپیہ، ہائے صبر!

باب - ۳۳

بڑا برچھے باز

بہتر ہوگا کہ شکاری جہازوں کے افسروں کے سلسلے میں ایک خصوصیت بیان کر دی جائے۔ شکاری بیڑے میں برچھے باز افسروں کا بھی ایک طبقہ ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے دوسری قسم کے جہاز بالکل ناواقف ہیں۔

برچھے بازی کے پیشے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس بات سے ظاہر ہوگی کہ دو سو سال پہلے ہالینڈ کے شکاری جہازوں میں پورا اختیار اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا تھا جسے آجکل کپتان کہتے ہیں، بلکہ اس کا ساجھی ایک اور افسر بھی تھا جسے اسپیک سنڈر کہتے تھے۔ لغوی اعتبار سے اس لفظ کے معنی ہیں "چربی کاٹنے والا" لیکن کثرتِ استعمال سے یہ چیف برچھے باز کا مترادف ہو گیا۔ اُس زمانے میں کپتان کے اختیارات جہازرانی اور انتظامی امور تک محدود تھے، وہیل کا شکار اور اس کے متعلقہ لوازمات چیف برچھے باز کے زیرِ نگیں تھے۔ انگلستان کے گرین لینڈ والے شکاری بیڑے میں یہ پرانا عہدہ اسپیک سیونیر کے مسخ شدہ نام سے اب تک باقی ہے لیکن اس کا پرانا وقار ختم ہو چکا ہے۔ آجکل اس کا درجہ بس اوّل قسم کے برچھے باز کا ہے اور اس اعتبار سے اس کا شمار کپتان کے ادنیٰ نائبین میں ہوتا ہے۔ بہرحال چونکہ شکاری سفر کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک برچھے بازوں کی محنت اور حوصلے پر ہے پھر امریکی بیڑے میں وہ کشتی کا ایک اہم افسر تو ہوتا ہی ہے لیکن بعض حالات میں، مثلاً وہیلوں سے بھرے ہوئے علاقے میں رات کے پہرے کے وقت جہاز کے عرشے کی کمان بھی وہی کرتا ہے۔ لہٰذا سمندری سیاسی مصلحت کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے جہازیوں سے برائے نام الگ رہے اور اُن کے افسر کی حیثیت سے ممتاز نظر آئے۔ حالانکہ وہ لوگ تو اُسے اپنا ہم رتبہ سمجھتے ہیں اور اس سے برابر والوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔

سمندر میں افسروں اور ماتحتوں کے درمیان اس طرح امتیاز پیدا کیا جاتا ہے — وہ تو جہاز کے پچھلے حصے میں رہتے ہیں اور یہ اگلے حصے میں۔ چنانچہ شکاری جہازوں اور تجارتی جہازوں دونوں میں میٹ لوگوں کے کمرے کپتان والے کمرے کے قریب ہوتے ہیں اور اسی طرح امریکہ کے زیادہ تر شکاری جہازوں میں برچھے باز جہاز کے پچھلے حصے میں رکھے جاتے ہیں۔ یعنی وہ کھانا تو کپتان کے کمرے میں کھاتے ہیں اور سوتے ہیں ایک اور جگہ جہاں اس کمرے سے راستہ جاتا ہے۔

جنوبی سمندروں میں شکاری جہازوں کا سفر بڑا طول طویل ہوتا ہے، بلکہ اس سے لمبا سفر انسان نے کبھی کیا ہی نہیں خطرے بھی اس میں عجیب و غریب پیش آتے ہیں، افسر ہوں چاہے معمولی جہازی ان لوگوں کو بندھی ہوئی تنخواہ تو ملتی نہیں ان کے منافع کا انحصار تو ان کی مشترکہ خوش نصیبی، مشترکہ ہوشیاری، دلاوری اور محنت پر ہوتا ہے۔ اس لیے سب کا مفاد یکساں ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ بعض حالات میں یہ مرتب ہوتا ہے کہ شکاری جہازوں میں ضابطے کی اتنی سخت پابندی نہیں رہتی جتنی تجارتی جہازوں میں۔ لیکن یہ لوگ بعض موقعوں پر چاہے قدیم زمانے کے قبیلوں کی طرح زندگی کیوں نہ بسر کرتے ہوں پھر بھی

چھوٹے عہدے کی ظاہری رسومات میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔ اور ختم تو کبھی نہیں ہوتیں۔ یہی ڈھنگ ہے کہ اکثر جہازوں پر آپ
دیکھیں گے کہ کپتان اپنے عہدے پر اس شان کے ساتھ اکڑ اکڑ کے چل رہا ہے کہ جیسے کوئی فوج کا کوئی افسر بھی نہ چلتا ہوگا۔ بلکہ ظاہری
تعظیم تو اس کی اتنی ہوتی ہے جیسے اس نے عہدے کے بجائے کپڑے نہیں شاہانہ لباس پہن رکھا ہے۔

بیلجیم کے ایک کپتان میں یہ رسمی اکڑ تمام کو ختم تھی۔ وہ لوگوں کو اپنے رعب میں رکھنا بھی چاہتا تھا اور اس حد تک کوشش
کا حکم تھا کہ وہ بے چون و چرا بجا لایا جائے۔ اس کے یہاں یہ پابندی بھی نہ تھی کہ آدمی اس کے عہدے پر قدم رکھے تو جوتے اتار
کے۔ جو واقعات آگے بیان ہوں گے ان کے ضمن میں ایسے موقعے بھی آئے کہ جب اس نے جہازیوں سے نہایت غیر معمولی لہجہ
الفاظ میں خطاب کیا بلکہ حقیقت کے ساتھ بھی برتاؤ کے ساتھ لگی کسی اور طرح۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود کپتان اب نے عہدے کی رسومات
اور تکلفات کو بالائے طاق نہیں رکھا تھا۔

بالآخر شاید یہ بات بھی آپ سے مخفی نہ رہے گی کہ بعض وقت وہ اپنے آپ کو ان رسومات کے نقاب میں چھپا لیتا
اور انہیں ایسے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا جن کے لیے وہ دراصل ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں۔ اس کے ذہن میں ایک
طرح کی شہنشاہیت بھی جو دنیا بھر میں چھپی پڑی رہتی ہے۔ ان رسومات کے ذریعے یہ شہنشاہیت جسیم پا کر ایک بے پناہ قوت بن
جاتی تھی۔ کوئی شخص ذہنی اعتبار سے دوسروں پر کتنی ہی فوقیت کیوں نہ رکھتا ہو لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک برتری حاصل
نہیں کر سکتا جب تک کہ چند ایسے خارجی پیچ اور تدبیریں اختیار نہ کرے جو بذات خود ذلیل اور مذموم ہوں۔ یہی چیز ہے جو خدا
کے برگزیدہ بندوں کو سرکار دربار سے دور رکھتی ہے اور اس دنیا کی ساری عزتیں ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیتی ہے جو مردہ
ذہن عوام سے برتر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ خدا کے معدودے چند گرم، منتخب اور چاپلوس بندوں سے بدرجہا کمتر
ہونے کے باعث شہرت حاصل کرتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سیاسی توجہات کی بدولت کچھ ایسا اثر آجاتا ہے کہ یہ
بعض اوقات حماقت اور جہالت کو بھی قوت اور عظمت بخش دیتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی نادر گوہر کا سا حال ہوتا ہے یعنی جب
آدمی کے سر پر صرف تاج شاہی نہ ہو بلکہ اس کا دماغ بھی شاہانہ ہو تو اس عظیم اور مرکز قوت کے سامنے معمولی آدمی تو الوان خلق
تک سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ادیب ذہین انسان کے غیر متزلزل ارادے کی شدت اور زور کا تماشا دکھانا چاہتا ہو
تو وہ بھی متذکرہ بالا حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو اس کے فن کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

لیکن میرا کپتان بیرن لوگٹ والوں کی طرح جبرا اور جہالت کا آپ اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے پھر
رہا ہے۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنی چاہیے کہ میرا واسطہ تو اس جیسے غریب
اور بوڑھے شکاری سے ہے چنانچہ ظاہری جاہ و جلال اور زیب و زینت مجھے میسر نہیں آ سکتی۔ اب تیرے اندر جو
عظمت نظر آئے گی اسے تو آسمانوں سے کھینچ کے نیچے دریا کے سمندروں کی تہوں سے ڈھونڈ کے نکالا جائے گا۔
اس کے مددگار تو غیر مرئی ہوائیں تلاش کرنے پڑیں گے!

باب - ۳۴

کھانے کی میز

دوپہر کا وقت ہے۔ باورچی خانے کا دروازہ کھلنے میں سے ایک زرد ڈبل روٹی جیسا چہرہ باہر نکال کے اپنے مالک اور آقا کو مطلع کرتا ہے کہ کھانا تیار ہو گیا۔ اس کا آقا چھوٹی کشتی میں بیٹھا ہے۔ سورج کے رخ وغیرہ کا اندازہ لگا چکا ہے۔ اب ایک گول اور چکنی سی تختی پر جو اس کی ہاتھی دانت والی ٹانگ کے بالائی حصہ پر اسی مقصد سے بنائی گئی ہے چپ چاپ عرض البلد کا حساب لگا رہا ہے۔ اس اطلاع کی طرف وہ کوئی توجہ نہیں دیتا۔ آپ سمجھیں گے کہ شاید اہاب نے اپنے خادم کی بات سنی ہی نہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ بادبان پکڑ کے جھولتا ہے اور عرشے پر چڑھ جاتا ہے۔ بغیر ہیچ اور ہموار زبان میں کہتا ہے "مسٹر اسٹاربک کھانا تیار ہے۔" وہ اپنے کمرے میں غائب ہو جاتا ہے۔

جب اس کے شہنشاہ کے قدموں کی آخری گونج بھی ختم ہو جاتی ہے اور وزیر اعظم اسٹاربک یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ بیٹھ گیا تو اسٹاربک کان جھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ عرشے پر دو چار قدم ادھر سے ادھر ٹہلتا ہے اور نہایت سنجیدگی سے قطب نما کے صندوق میں جھانکنے کے بعد بڑے شگفتہ لہجے میں کہتا ہے "مسٹر اسٹب، کھانا تیار ہے۔" اور کھڑکی میں سے نیچے اتر جاتا ہے۔ وزیر دوم تھوڑی دیر رسیوں کے پاس ٹھٹکا رہتا ہے۔ بیچ والی رسی کو ہلا کے دیکھتا ہے کہ ٹھیک ہے یا نہیں، پھر وہ بھی ٹپ کا مصرعہ دہراتا ہے اور جلدی سے "مسٹر فلاسک، کھانا تیار ہے۔" کہہ کر اپنے پیش روؤں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ امیر سوم دیکھتا ہے کہ عرشہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے اوپر سے کوئی پابندی ہٹ گئی ہو۔ بے پروا ہو کر وہ جوتے اتار پھینکتا ہے اور ٹھیک اپنے شہنشاہ کے سر کے اوپر ہر طرف آنکھیں مٹکا مٹکا کر ایک تیز سی بے آواز ناچ ناچنے لگتا ہے۔ پھر ایک ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے یعنی ٹوپی کو اچھال کے بادبان پر رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد عرشہ پر سے دکھائی دیتا ہے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے نیچے چلا جا رہا ہے اور اس نے جلوس کا قاعدہ بدل کے رکھ دیا ہے یعنی باجوں کے آخر میں ہے۔ مگر کپتان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ رک جاتا ہے اور ایک نئے انداز کا چہرہ بنا لیتا ہے۔ پھر یہ آزاد وحشی اور شگفتہ بازو فلاسک ڈھیلے ڈھالے غلام کی طرح اپنے بادشاہ اہاب کے حضور میں پہنچتا ہے۔

سمندری رسومات کے تضیع سے بعض بڑی عجیب و غریب باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عرشے پر کھلی ہوا میں بعض افسر اشتعال ملنے پر اپنے سردار کے ساتھ بڑی جسارت اور گستاخی کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہی افسر حسب معمول اسی افسر کے کمرے میں کھانا کھانے جاتے ہیں تو اسے صدر میں بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی نہایت غیر جارحانہ بلکہ عاجزانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ بلکہ بعض وقت تو اس پر ہنسی آتی ہے۔ آخر یہ فرق کیوں؟ کیا یہ کوئی مسئلہ ہے؟ بابل کا بادشاہ بیلشضر ہونا ——— غرور کے ساتھ نہیں بلکہ شائستگی کے ساتھ ——— بیلشضر ہونا بھی بڑی بات ہے۔ مگر یہاں بھی کچھ نہ کچھ دنیاوی شان

ضرور ہوگی، لیکن جو شخص مہماں کر گھر جاتا ہے اور شاہانہ وقار اور ذہانت کے ساتھ میزبان بن کر صدر میں بیٹھتا ہے،
تھوڑی دیر کے لیے تو اس کا فاق اثر دوسروں پر بالکل غالب آجاتا ہے اور کسی کو سرکشی کی مجال نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کا شاہانہ
رتبہ بیلشضر سے بھی چڑھ بڑھ کے ہوتا ہے، کیونکہ بیلشضر دنیا کا سب سے بڑا آدمی تو تھا نہیں۔ جس نے ایک دفعہ اپنے دوستوں کو کھانا
کھلا دیا وہ بادشاہی کے مزے سے واقف ہوگیا۔ یہ مجلسی شخصیت کا جادو ہے جس کے سامنے کوئی نہیں ٹھیر سکتا۔ چنانچہ
اگر آپ اس بڑے جہاز کے کپتان کے عہدے کی افضلیت کا اضافہ اور کریں تو آپ خود سمجھ جائیں گے کہ بحری زندگی کی یہ خصوصیت
اور ہیجان ہونے کی وجہ کیا ہے۔

اپنی ہاتھی دانت کے نقش و نگار سے آراستہ میز کے صدر میں اہاب ایسا لگتا تھا جیسے سفید رنگ کے ساحل پر کوئی
ایالوں والا سمندری شیر چپ چاپ بیٹھا ہو اور اس کے خونخوار لیکن ترشہ بچے اس کے گرد ہوں۔ ہر افسر اس انتظار میں بیٹھا
کہ میری باری آئے تو مجھے کھانا ملے۔ اہاب کے سامنے ان کی حالت چھوٹے چھوٹے بچوں کی سی ہوتی تھی لیکن اہاب میں غرور
یا تکلم کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ وہ تو اہاب سامنے رکھے گوشت کاٹتا اور وہ سب لوگ یک زبان ہو کر بیٹھے کے چاقو کو
سے دیکھتے رہتے چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے لیکن وہ اس بیچ بے موقع کسی موضوع پر کوئی بات کہہ کر اس لمحے کی
بے حرمتی نہ کرتے۔ نہیں، جب اہاب اپنے چاقو اور کانٹے سے گوشت کا ٹکڑا پکڑ کے اشارہ کر کے پلیٹ ادھر لانے کا اشارہ
کرتا تو سٹب گوشت اس طرح لیتا جیسے خیرات لے رہا ہو، اسے بڑی نزاکت سے کاٹتا۔ اگر پلیٹ پر چاقو کی رگڑ لگ جاتی
تو چونک پڑتا، نوالہ بالکل چپ چاپ چباتا اور اسے نہایت احتیاط کے ساتھ نگلتا۔ فرینکفرٹ میں تاجپوشی کی ضیافت کی طرح
کپتان کے کمرے میں بھی کھانے کا وقت گمبھیر ہوتا اور کھانا مکمل خاموشی کے ساتھ کھایا جاتا۔ یہ نہیں کہ بڈھے اہاب نے
بات چیت کی ممانعت کر دی ہو، بس وہ خود گونگا بنا بیٹھا رہتا۔ چپ چپ بیٹھے بیٹھے اسٹب کا دم گھٹنے لگتا۔ اگر نیچے کوٹھری
میں کوئی چوہا کھڑ کھڑ کرنے لگتا تو اسے راحت سی ملتی۔ بیچارا فلاسک اس کنبے جیسے خاندان کا سب سے چھوٹا بیٹا
اور بچہ تھا۔ دست کا گوشت اور مرغ کی ٹانگ اسی کو ملا کرتی۔ اگر وہ کبھی اپنی پلیٹ میں کھانا اپنے آپ لینے کی جرأت
کر بیٹھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی زبردست چوری کی ہو۔ اگر کبھی اس سے یہ حرکت سرزد ہو گئی ہوتی تو وہ
اپنے آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھتا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اہاب کی طرف سے کوئی ممانعت نہ تھی۔ اگر فلاسک
اپنا کھانا خود لے لیتا تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اہاب اس چیز کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرتا۔ پھر مکھن اٹھانے کی
ہمت تو فلاسک کو پڑتی ہی نہ تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ جہاز کے مالک اسے مکھن یوں نہیں دیتے کہ اس کا صاف
اور چمکدار رنگ خراب ہو جائے گا یا شاید وہ سمجھتا تھا کہ ایسے ناپید کنار سمندر اور اتنے لمبے سفر میں مکھن بڑی نایاب چیز
ہے۔ لہٰذا اس جیسے چھوٹے افسر کے لیے مکھن کھانا مناسب نہیں۔ بہرحال جو بات بھی ہو بیچارے فلاسک کو مکھن کے
بغیر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔

اچھا، ایک بات اور ہے۔ فلاسک کھانے کے لیے سب سے آخر میں آتا اور سب سے پہلے اٹھ جاتا

تو بس بےچارے فلاسک کو کھانے کے لیے کتنا کم وقت ملتا تھا۔ اسٹاربک اور اسٹب دونوں اس سے پہلے شروع
کرتے تھے اور اس کے باوجود انھیں یہ رعایت حاصل تھی کہ فلاسک کے اٹھ جانے کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھیں۔
اگر اسٹب کو جو فلاسک سے بس دو چار ہی اونچا تھا اتفاق سے کسی دن بھوک کم ہوتی اور یہ آثار نظر آنے لگتے کہ وہ اپنا
کھانا ختم کر چکا تو فلاسک کو فوراً اٹھ جانا پڑتا اور اس روز وہ تین نوالوں سے زیادہ نہ کھا سکتا کیونکہ یہاں کی مقدس رسومات
اسٹب کو فلاسک سے پہلے عرشے پر جانے کی اجازت نہ دیتی تھیں یہی وجہ ہے کہ فلاسک نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں
کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ جس دن سے مجھے افسری کا درجہ حاصل ہوا ہے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ
جتنا کھاتا تھا اس سے بھوک کم نہیں ہوتی تھی بلکہ غیر فانی بن کے رہ جاتی تھی۔ فلاسک دل ہی دل میں کہا کرتا میرے پیٹ کا
امن چین رخصت ہو گیا ہے۔ ہاں افسر تو ضرور ہوں لیکن جی چاہتا ہے کہ جہازیوں کے ساتھ بیٹھ کے گائے کا گوشت
اڑاؤں جیسے پہلے اڑایا کرتا تھا۔ یہ ہے ترقی کا ثمر —— یہ ہے مرتبے کی بے بنیادی —— یہ ہے زندگی کا
پاگل پن۔ اس کے علاوہ اگر پیکوڈ کے کسی معمولی جہازی کو فلاسک سے اس کی افسری کے بارے میں کوئی شکایت ہوتی
تو اس سے پورا انتقام لینے کے لیے جہازی کو بس اتنا کرنا پڑتا کہ کھانے کے وقت جہاز کے پچھلے حصے میں جا کر کپتان والے
کمرے کے روشندان میں سے جھانک کے دیکھ لے کہ فلاسک بہت الگ آہب کے سامنے احمقوں کی طرح بے
دم سادھے بیٹھا ہے۔

اس کمرے میں آہب اور اس کے تین میٹ سب سے پہلے کھانا کھاتے تھے۔ وہ جس ترتیب سے آتے اس
سے الٹی ترتیب کے ساتھ واپس جاتے۔ ان کے جانے کے بعد زرد رُو داروغہ کرمچ کا میز پوش صاف کرتا، بلکہ
جلدی جلدی لے کھینچ کھانچ کے تھوڑا سا ٹھیک کر دیتا۔ پھر تینوں برچھے بازوں کو کھانے کے لیے بلایا جاتا۔ وہ گویا
پچھلی جماعت کے وارث تھے۔ یہ عظیم الشان قصر تھوڑی دیر کے لیے نوکروں کے دالان میں تبدیل ہو جاتا۔

کپتان کے دسترخوان پر تو ایک ناقابلِ برداشت گھٹن اور ایک بے نام اور غیر مرئی رعب و داب کی فضا چھائی
رہتی تھی۔ اس کے برخلاف یہ ادنیٰ درجے کے برچھے باز پوری آزادی اور بے تکلفی ہی نہیں بلکہ ایک بے جوڑ قسم کی جمہوریت سے
کام لیتے تھے۔ ان کے آقا یعنی تینوں میٹ تو ان کے جبڑوں کی آواز سے بھی خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن برچھے باز
ایسے مزے لے لے کے نوالے چباتے کہ برابر چپڑ چپڑ کی آواز آتی رہتی۔ یہ لوگ نوابوں کی طرح کھاتے اور اپنا پیٹ اس طرح
بھرتے جیسے ہندوستانی جہازوں میں دن بھر مصالحے لادے جاتے ہیں۔ کوئی کوئیگ اور تاشتیگو ایسے مر بھکے تھے
کہ پچھلے وقت کے کھانے کے بعد ان کے پیٹ میں جو جگہیں خالی رہ جاتیں انھیں بھرنے کے لیے داروغہ کو گائے
کے گوشت کا ایک پورا ٹکڑا لانا پڑتا جو ایسا لگتا جیسے سالم بیل میں سے کھود کے نکالا گیا ہو۔ اگر وہ اس کام میں تیزی سے
کام نہ لیتا اور گھونگے کی چال جا کر بلی کی چال واپس آتا تو تاشتیگو بڑے نامعقول طریقے سے اس کے ایک لگا یعنی اپنا
کانٹا برچھے کی طرح پھینک کے اس کی کمر میں مارتا۔ ایک مرتبہ ڈیگو کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ داروغے کے حافظے کو مدد پہنچانے

کے لیے اس بچارے کو کپڑے کے اوپر اٹھایا اور اس کا سر لکڑی کی ایک زبردست خالی کشتی میں ٹھونس دیا۔ ادھر تاش ٹیگو نے چاقو ہاتھوں میں لے کے ایک حلقے کا سا نشان بنانا شروع کر دیا کہ میں اس کی کھال کھینچوں گا۔ بیڈول روٹی کے سے چہرے والا داروغہ ——— ایک دیو ہیکل نانبائی اور ایک ہسپتال کی نرس کا بیٹا ——— ہر وقت بوکھلایا اور گھبرایا ہوا رہتا تھا۔ ایک تو ہر وقت اس خوفناک بھوت اہاب کا سامنا، پھر وقتاً فوقتاً ان تینوں ہنگامہ خیز جنگلیوں کا آتے رہنا، اس بچارے کی زندگی بس کانپتے لپکپاتے ہی گزر رہی تھی۔ اس کا دستور تھا کہ جب برچھے بازوں کو ضرورت کی ساری چیزیں پہنچ جاتیں تو وہ ان کے ہاتھوں سے چھٹ کر برابر والی کوٹھری میں جا چھپتا اور جب تک یہ شور و شر ختم نہ ہو جاتا سہما ہوا دروازے کی جھلملیوں میں سے جھانکتا رہتا۔ جب کوئی کوئیگ اور تاش ٹیگو اپنے نوکیلے دانتوں سمیت ایک دوسرے کے مقابل بیٹھتے تو عجیب منظر ہوتا۔ ان دونوں کے ایک جانب ڈگو فرش پر چسکڑا مار کے بیٹھتا کیونکہ اگر بنچ پر بیٹھے تو اس کا سر جس پر پرندے کے پر لہرا رہے تھے چھت کے کڑس سے جا لگتا۔ وہ تھا بھی تو دیو کا دیو۔ اس کی ذرا سی جنبش سے کمرے کا ڈھانچا یوں ہل کے رہ جاتا جیسے ہاتھی کے جہاز میں سفر کرتے وقت ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حبشی بڑے رکھ رکھاؤ کا آدمی بلکہ خاصا نفاست پسند تھا۔ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا کہ یہ سمجھ میں آنا مشکل تھا کہ ایسے لمبے چوڑے اور قوی ہیکل انسان کے جسم میں قوت کس طرح پہنچتی ہے۔ لیکن غالباً یہ شریف طبع جنگلی اپنی غذا اور پانی ہوا ہی سے حاصل کرتا تھا اور اس کے پھیلے ہوئے نتھنے ہر سانس کے ساتھ پوری کائنات میں سے زندگی اخذ کرتے رہتے تھے۔ دیو گوشت روٹی کھا کے نہیں پلتے۔ اب رہا کوئی کوئیگ تو کھانا کھاتے وقت اس کے ہونٹوں سے چپڑ چپڑ کی ایسی وحشیانہ اور بھونڈی آواز نکلتی تھی کہ بچارا داروغہ گھبرا کے اپنے دبلے پتلے بازوؤں کو دیکھنے لگتا کہ ان پر کہیں دانتوں کے نشان تو نظر نہیں آ رہے اور جب وہ سنتا کہ تاش ٹیگو مجھے پکار رہا ہے تاکہ میری ہڈیاں نوچی جائیں تو بچارے سادہ دل داروغہ پر اچانک ایسی بجلی سی گرتی کہ اس کے چاروں طرف رکھے ہوئے شیشے کے برتن گر کے چور چور ہو جانے سے بس بال بال بچتے۔ پھر برچھے باز اپنی جیب میں برچھے اور دوسرے ہتھیار تیز کرنے کے لیے سلیاں رکھے رہتے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ انھیں نکال کر اپنی چھریاں تیز کرنی شروع کر دیتے۔ داروغہ کے لیے اس گھس گھس کی آواز کو ذرا بھی سکون آور نہ تھا۔ بھلا وہ یہ بات کیسے بھول سکتا تھا جس زمانے میں کوئی کوئیگ اپنے جزیرے میں رہتا تھا اس سے یار باشی کے سلسلے میں دو چار قابل ذکر بے احتیاطیاں ضرور سرزد ہوئی ہوں گی۔ ہائے بے چارہ داروغہ! جو سفید فام خادم آدم خوروں کے سامنے کھانا لاتا ہے اس پر تو بری ہی گزرتی ہے۔ اسے تو اپنے بازو پر تولیے کے بجائے ڈھال رکھ کے چلنا چاہیے۔ آخر کار یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا کہ یہ تینوں بحری سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے اور اب جا رہے ہیں۔ اس کے ضعیف الاعتقاد کانوں کو ان کی سپاہیانہ ہڈیاں ہر ہر قدم پر یوں بجتی معلوم ہوتیں جیسے میان میں عربوں کی تلواریں۔

حالانکہ یہ جنگلی کھانا کپتان کے کمرے میں کھاتے تھے اور برائے نام رہتے بھی وہیں تھے لیکن انھیں ایک

جم کر بیٹھنے کی عادت نہ تھی چنانچہ وہ اس کمرے میں ایک تو بس کھانے کے وقت آتے اور ایک سونے سے
پہلے جب وہ اس کمرے میں سے گزر کے اپنی عجیب و غریب کوٹھری میں جایا کرتے۔

امریکہ کے شکاری جہازوں کے کپتان ایک جماعت کی حیثیت سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ کپتان والے کمرے
پر صرف انھیں کا حق ہے اور اگر کسی کو کبھی یہاں آنے کی اجازت مل سکتی ہے تو صرف اخلاقاً۔ چنانچہ دراصل یہ کہنا زیادہ
مناسب ہوگا کہ پیکوڈ کے میٹ اور نیزے باز اس کمرے کے اندر نہیں بلکہ باہر رہتے تھے۔ کیونکہ جب یہ لوگ یہاں
داخل ہوتے تو اس طرح جیسے سڑک والا دروازہ مکان میں داخل ہوتا ہے —— یعنی اندر پہنچتے ہی پھر باہر نکال دیا جاتا
ہے۔ کیونکہ یہ تو مستقل طور سے کھلی ہوا میں رہنے والی چیز ہے۔ لیکن اس میں ان لوگوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ کپتان کے
کمرے میں اہاب جیسی کا کوئی رفیق نہ تھا۔ کیونکہ اہاب سخت کم آمیز تھا۔ یوں برائے نام تو وہ بھی انسانوں میں شامل تھا۔ لیکن
دراصل اس دنیا کا باشندہ نہ تھا۔ وہ تو انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا تھا جیسے بستی بسنے کے بعد میسوری میں آخری
ریچھ جب بہار اور گرمیاں گزر جاتیں تو یہ جنگلوں کا اسی کسی کھوکھلے درخت میں مدفون ہو جاتا اور جاڑوں بھر وہیں پڑا اپنے
پنجے چاٹا کرتا۔ اسی طرح بڑھاپے کی بے رحم اور وحشت ناک سردی میں اہاب کی روح اس کے جسم کے کھوکھلے تنے
میں بند ہو کے بیٹھ گئی تھی اور اپنے رنج و غم کے بے رنگ پنجے چوستی رہتی تھی۔

باب - ۲۵

مستول کے اوپر

موسم بہت خوشگوار ہو چلا تھا کہ اپنی باری پر مجھے بھی مستول کے اوپر چڑھ کے پہرہ دینا پڑا۔ امریکہ کے شکاری جہازوں میں دستور یہ ہے کہ چاہے شکارگاہ تک پہنچنے سے پہلے پندرہ ہزار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑے لیکن جہاز کے بندرگاہ سے روانہ ہوتے ہی مستولوں پر پہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر جہاز تین، چار یا پانچ سال کے سفر کے بعد بھی واپس آئے اور اس کے اندر ایک چھوٹی شیشی بھی خالی رہے تو آخر تک مستولوں پر آدمی بیٹھے رہتے ہیں۔ جب تک جہاز کے کھمبے بندرگاہ کے میناروں کے درمیان آ کر کھڑے نہ ہو جائیں، لوگ یہ امید نہیں چھوڑتے کہ شاید ایک وہیل اور مل جائے۔

چونکہ بندرگاہوں یا سمندر پر مستولوں کے اوپر کھڑے ہونے کا کام نہایت قدیم اور دلچسپ ہے اس لیے اس کا بیان ذرا تفصیل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ میری رائے ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے مستولوں کے اوپر پہرہ دیا وہ قدیم مصری تھے، کیونکہ اپنی تحقیق کے سلسلے میں مجھے تو ان سے پہلے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کے پیش رو یعنی بابل بسانے والوں نے تو اپنی مینار اسی نیت سے بنائی ہوگی کہ ایشیا بلکہ افریقہ میں بھی اس سے اونچا مستول کوئی اور نہ ہو لیکن ابھی یہ مینار پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ان کا یہ سنگین مستول خدا کے غضب کی خوفناک آندھی میں لڑکھڑا گیا چنانچہ ہم بابل بسانے والوں کو مصریوں پر فوقیت نہیں دے سکتے۔ میں نے مصریوں کو مستول کے اوپر پہرہ دینے والوں کی قوم کہا ہے تو اس دعوے کی بنیاد ماہرین آثار قدیمہ کے اس عام عقیدے پر ہے کہ سب سے پہلے اہرام علم فلکیات کے سلسلے میں بنائے گئے تھے۔ اس نظریے کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ ان عمارتوں کے چاروں پہلو زینے کی شکل کے ہیں۔ قدیم مصری ٹانگ اونچی اٹھا اٹھا کے انھیں سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے چوٹی پر پہنچتے تھے اور نئے ستارے دیکھ کر خوشی کے مارے چیخ اٹھتے تھے ——— بالکل اسی طرح جیسے آجکل کے جہازوں میں پہرہ دار کسی بادبان یا وہیل کو سامنے آتا دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔ سینٹ سٹائی لائٹس بھی قدیم زمانے کے اس مشہور عیسائی راہب نے ریگستان کے بیچوں بیچ پتھر کا ایک اونچا ستون بنوایا تھا اور اپنی عمر کا باقی حصہ اس کی چوٹی پر گزار دیا تھا۔ وہ اپنا کھانا ایک رسی کے ذریعہ زمین پر سے اوپر کھینچ لیا کرتا تھا یہ شخص مستول کے اوپر کھڑے ہونے والے دلاوروں کی ایک زبردست مثال ہے۔ کہرہ، پالا، بارش، اولے، برف، کوئی چیز اسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی۔ آخر تک وہ ہر چیز کا مقابلہ مردانہ وار کرتا رہا اور اپنے مورچہ پر ہی جان دے دی۔ آجکل کے زمانے میں تو مستول پر کھڑے ہونے والے بہت ہی بے جان ہیں۔ یہ تو بس پتھر، لوہے یا تانبے کے آدمی ہیں۔ وہ کسی سخت طوفان کا مقابلہ تو کر سکتے ہیں لیکن کوئی عجیب منظر دیکھ کر چیخ اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، مثلاً نپولین ہی کو لیجیے۔ وہ وانڈوم کے ستون پر جہاں کوئی ڈیڑھ سو فٹ اونچا ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور اس بات سے

قطعی بے نیاز ہے کہ یہ جزیرے پر کس کا راج ہے۔ واشنگٹن بھی باقی تحریر میں اپنے فلک بوس ستون کے اوپر کھڑا ہے اور اس کا ستون انسانی عظمت کے اس درجے کی نشان دہی کرتا ہے جس سے آگے شاید ہی کوئی جا سکے۔ ایبر ہیم لنکن بھی پورٹ لینڈ اسکوائر میں آپ کے لوہے سے بنے ہوئے چبوترے پر کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ جب وہ لندن کی دھند میں بالکل چھپ جاتا ہے تو بھی اس بات کی نشانی ضرور باقی رہتی ہے کہ یہاں ایک عظیم انسان پہرے کے پیچھے کھڑا ہے۔ کیونکہ جہاں دھواں ہو گا وہاں آگ بھی ضرور ہو گی۔ لیکن یہ تینوں واشنگٹن اور لنکن تینوں کے تینوں ایک بات سے عاری ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی روح مستقبل کے گہرے دھندلکے کو بھی چیر جاتی ہے اور یہ دیکھ لیتی ہے کہ ان کی قوم کو کن کن چٹانوں اور کگاروں سے بچنا چاہیے۔ جزیرے کے لوگ دیوانگی کے عالم میں انھیں مدد کے لیے پکارتے ہیں لیکن وہ تینوں ان کی آواز پر ایک دفعہ بھی لبیک نہیں کہتے۔

آپ کہیں گے کہ لنکن کے پہرہ داروں اور سمندر کے پہرہ داروں کو ایک ہی درجے میں رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی بات بالکل نہیں۔ میں اس کے ثبوت میں ایک دلیل پیش کرتا ہوں جس کی ذمہ داری نین ٹکٹ کے واحد مورخ اوبیڈ میسی پر ہے۔ اوبیڈ بتاتا ہے کہ ماہی گیری کے ابتدائی زمانے میں جب جہاز شکار کے لیے باقاعدہ نکلتے بھی نہ تھے، اس جزیرے کے لوگوں نے ساحل پر اونچے اونچے ستون بنا دیے تھے جن پر پہرہ دار ستون میں گڑی ہوئی کھونٹیوں کے ذریعے چڑھتے تھے بالکل اسی طرح جیسے ڈربے میں مرغیاں اوپر جاتی ہیں۔ چند سال ہوئے یہی تدبیر نیوزی لینڈ کے شکاریوں نے اختیار کی تھی۔ پہرہ دار وہیل کو دیکھتے ہی شکاریوں کو اطلاع دیتے تھے جو ساحل کے قریب اپنی کشتیوں میں تیار بیٹھے رہتے تھے لیکن اب یہ رواج باقی نہیں رہا۔ لہٰذا ہمیں ستون کے اصل اور واحد پہرہ داروں کی طرف توجہ کرنی چاہیے ـــــ سمندر میں وہیل کا شکار کھیلنے والے جہاز کے پہرہ داروں کی طرف تینوں مستولوں پر سورج نکلنے کے وقت سے لے کر سورج ڈوبنے تک پہرہ دار بیٹھے رہتے ہیں۔ ملاحوں کی طرح یہ بھی جہازی باری باری سے آتے ہیں اور ہر دو گھنٹے بعد پہرہ بدلتا ہے۔ گرم ملکوں کے پرسکون موسم میں مستول کے اوپر کھڑا ہونا بڑا خوشگوار معلوم ہوتا ہے بلکہ جس آدمی کو سوچنے اور خواب دیکھتے رہنے کا شوق ہو اسے تو بڑی لذت ملتی ہے آدمی خاموش عرشے سے کوئی سو فٹ اونچا کھڑا سمندر میں یوں بڑھتا چلا جاتا ہے جیسے مستول نہیں، واسے بانس ہوں اور آدمی کے نیچے اور ٹانگوں کے درمیان سمندر کے زبردست عفریت یوں تیرتے رہتے ہیں جیسے روڈز میں اس مشہور مجسمے کے جوتوں کے درمیان جہاز چلا کرتے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کے آپ سمندر کی پنہائیوں میں کھو جاتے ہیں۔ لہروں کے سوا کسی طرح کا بھی کوئی ہیجان نہیں ہوتا۔ مرزدہ جہاز آہستہ آہستہ بہتا رہتا ہے۔ خوابناک برسانی ہوائیں چلتی ہیں۔ ہر چیز آپ کے اندر غنودگی پیدا کرتی ہے۔ گرم ملکوں میں شکاری جہاز کے اندر تقریباً ایک اعلیٰ و ارفع قسم کی بے رنگی اور یکسانی طاری ہو جاتی ہے۔ آپ خبریں نہیں سنتے، اخبار نہیں پڑھتے، جیسے چیزیں یا شقہ چیزوں کے سنسنی خیز بیان سے آپ کے اندر جوش اور غیر ضروری ہیجان پیدا نہیں کرتے۔ اگر یہ جھگڑوں، دیوالوں اور بازار

کے جاڑ گزرنے کی اطلاعات آپ تک نہیں پہنچتیں، آپ کو اس بات کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ شام کو کیا کھائیں گے ــــ یہ کہ تپ
کا قابل حال کھانا اطمینان سے پیپوں میں بند رکھا ہے اور آپ کے دسترخوان پر کسی چیز میں بھی ذرا سی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

جنوب کی طرف جانے والے شکاری جہازوں میں عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ آپ کو تین چار سال کے سفر میں
بیٹھے بیٹھے مستول کے اوپر گزارنے پڑتے ہیں مگر انھیں جوڑا جائے تو گھنٹے بیٹھتے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اپنی
طبعی عمر کا اتنا بڑا حصہ آپ جس جگہ صرف کرتے ہیں وہاں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہوتی جس سے آرام و اطمینان یا گھریلو پن کا
احساس پیدا ہو سکے ــــ وہ احساس جو بستر، بچھونے، تابوت، سنتری کے ڈبے، منبر، گاڑی بان، تمام چھوٹی
آرام دہ چیزوں سے متعلق ہے جن کے ذریعے لوگ تھوڑی دیر کے لیے خلوت گزینی اختیار کرتے ہیں۔ مستول پر کھڑے ہونے
کے لیے عام طور سے دو پتلے پتلے متوازی تختے ہوتے ہیں۔ یہاں سمندر ایسے جھکولے دیتا ہے کہ جتنی کوئی کرتب ہی
آرام طلب ہے جتنا بیل کے سینگوں پر کھڑا ہونے سے۔ البتہ سردیوں میں آپ اپنا مکان کوٹ کی شکل میں اوپر لے جا سکتے ہیں۔
لیکن در اصل زیادہ سے زیادہ جسیم مکان ہو سکتا ہے نہ موٹے سے موٹا کوٹ، کیونکہ جس طرح روح جسد خاکی میں بند پڑی رہتی ہے
وہ اندر آزادی سے چل پھر سکتی ہے نہ باہر نکل سکتی ہے، اور اگر نکلے تو ہلاکت کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے رہے برفانی
کے موسم میں ناواقف مسافر جیسے کا پہاڑ عبور کرتے ہوتے اسی طرح کوٹ بھی مکان نہیں بلکہ صرف لفافہ زائد کھال ہوتا ہے
جو آپ کو چاروں طرف سے لپیٹے ہے۔ آپ الماری اپنے بدن کے اندر نہیں رکھ سکتے، اسی طرح آپ اپنے کوٹ
کو بھی ایک آرام دہ کمرہ نہیں بنا سکتے۔

اس سلسلے میں یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ جنوبی جہازوں میں وہ قابل رشک چھوٹے چھوٹے خیمے یا منبر
نہیں ہوتے جنھیں "کوّے کا گھونسلا" کہتے ہیں اور جن کی وجہ سے گرین لینڈ والے جہازوں کے پہرہ دار برفانی منزل
کے بے رحم موسم سے محفوظ رہتے ہیں۔ کپتان سلیٹ نے ایک داستان لکھی ہے جس کا نام ہے "وہیل کے شکار اور
گرین لینڈ کی کھوئی ہوئی نو آبادیات کی تلاش میں برف کی چٹانوں کے درمیان ایک سفر"۔ اس دلچسپ کتاب میں مستول پر
کھڑے ہونے والوں کے لیے "کوّے کے گھونسلے" کا تفصیلی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ سلیٹ نے خود اپنے احترام کے پیش نظر
اسے "سلیٹ والا کوّے کا گھونسلا" کہا ہے۔ وہ اس کا پہلا موجد تھا اور بچوں کے اور مضحکہ خیز تکلفات سے آزاد ہونے کی
وجہ سے اس کی رائے تھی کہ اگر ہم اپنے بچوں کو اپنا نام دیتے ہیں (کیونکہ ہم ان کے سب سے پہلے موجد ہیں) تو اسی
طرح اپنی بنائی ہوئی مشینوں کا نام اپنے نام پر رکھنا چاہیے۔ سلیٹ والے کوّے کے گھونسلے کی شکل ایک بڑے سے پیپے
یا نال کی سی ہوتی ہے۔ اوپر سے کھلا ہوا اور ساتھ میں ایک کھلنے والا تختہ جسے طوفان میں ہوا کے لحاظ سے سر کی حفاظت
کے لیے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ گھونسلا مستول کی چوٹی پر ہوتا ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے ڈول کے ذریعے چڑھتے ہیں۔
جہاز کے پچھلی طرف والی سمت اس گھونسلے میں ایک نہایت آرام دہ نشست ہوتی ہے اور اس کے نیچے چھتری،
مفلر اور کوٹ رکھنے کے لیے ایک ڈبہ، سامنے کی طرف ایک چمڑے کا خانہ ہوتا ہے جس میں بھرا ہوا پائپ، دور بین

اور جہازرانی کے دوسرے لوازمات رکھے جاتے ہیں۔ کپتان سلیٹ نے لکھا ہے کہ جب وہ بذاتِ خود اس گھونسلے میں بیٹھا ہوتا تھا تو اپنے ساتھ ایک رائفل، بارود کی کُپی اور گولیاں رکھتا تھا تاکہ اگر کوئی بھولی بھٹکی نارویل یا آوارہ وہیل گھومتی نظر آئے تو اسے وہیں گرا دے، کیونکہ عرشے پر سے تو پانی کے دباؤ کی وجہ سے نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا لیکن اتنی اونچائی سے گولی چلانے میں بات ہی اور ہے۔ کپتان سلیٹ نے اپنے کوّے کے گھونسلے کی تمام چیزیں تفصیل کے ساتھ گنوا کر جہاں اور بڑی حکایت کی ہے، پھر اس گھونسلے میں بیٹھ کر ایک چھوٹی سی قطب نما کے ساتھ جو تجربات کیا کرتا تھا ان کا حال بھی بڑے علمی طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس نے یہ قطب نما اس مقصد سے رکھی تھی کہ جس چیز کو مقناطیس کی مقامی کشش کہتے ہیں اس کی بدولت پیدا ہونے والی غلطیاں دور کی جائیں۔ ان غلطیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاز کے تختوں کا لوہا مقناطیس کے صندوق سے بہت قریب اور متصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کپتان سلیٹ کے جہاز میں تو ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے عملے میں بہت سے مختلف الحال لوہار بھی تھے۔ اس لیے کپتان نے ہر بات بہت تفصیل سے بیان کی ہے اور اپنے تجربات کا حال نہایت ہی محتاط اور علمی طریقے سے لکھا ہے۔

لیکن اپنے تمام عالمانہ الفاظ اور اصطلاحات کے باوجود کپتان سلیٹ کو ابھی جلد معلوم ہے کہ وہ مقناطیس کے متعلق موشگافیوں میں ایسا غرق نہیں ہوا تھا کہ گھونسلے میں اپنے قریب گھسی ہوئی شراب کی پوری بوتل کی طرف وقتاً فوقتاً توجہ ہی نہ کرے۔ فی الحقیقت میں اس بہادر، ایماندار اور عالم کپتان کی بڑی عزت اور محبت کرتا ہوں لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ اس نے شراب کی بوتل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ جب وہ قطب نما سے تھوڑی دور کے فاصلے پر دستانے چڑھائے اور سر لپیٹے اتنے اونچے گھونسلے میں بیٹھا ریاضی کا مطالعہ کر رہا تھا تو بوتل نے ایک وفادار دوست اور روح پرور ساتھی کے فرائض ضرور انجام دیئے ہوں گے۔ لیکن اگر ہم جنوب کے ماہی گیروں کو مستول کے اوپر وہ آرام نہیں ملتا جو کپتان سلیٹ اور اس کے ساتھیوں کو ملتا تھا تو ہمیں ایک اور زبردست امتیاز حاصل ہے۔ ہم لوگ جن سمندروں میں چلتے ہیں وہ بڑے پرسکون اور دلکش ہوتے ہیں۔ میرا تو یہ حال تھا کہ رسیوں پر آرام سے کے چڑھتا۔ بیچ میں رک کے کوئی گپ شپ یا اس وقت جو کوئی بھی ملاح ہوتا اس سے باتیں کرنے لگتا۔ پھر تھوڑا سا اوپر جا کے بادبان کے کُنڈے پر ایک ٹانگ ڈال دیتا اور سمندر کا نظارہ کرنے لگتا۔ پھر کہیں جا کے اپنی منزل پر پہنچتا۔

میں نہایت صفائی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں پہرہ دینے میں نہایت بُرا تھا۔ ایک تو ویسے ہی پوری کائنات کا مسئلہ میرے دماغ میں ہر وقت چکر کاٹتا رہتا تھا، پھر ایسی خیال پرور بلندی پر مکمل تنہائی نصیب ہو تو میں اپنے فرائض سے پہلو تہی کیوں نہ کرتا اور شکاری جہازوں کے اس حکم سے بے اعتنائی کیوں نہ برتتا کہ پہرے کے وقت نظریں جلتے کی طرف رکھو اور کوئی چیز دیکھتے ہی فوراً پکار کے بتاؤ۔

نن ٹکٹ کے جہاز والو، میں یہاں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں: اپنے شکاری جہازوں پر جہاں سخت نگرانی کی

خصوصاً جبکہ کسی ایسے نوجوان کو بھرتی کر رہے ہیں جس کا چہرہ پیلا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہوں، جو وقت بے وقت
کسی نہ کسی سوچ میں پڑا رہتا ہو، جس کے سر میں جہازرانی کے قوانین کے بجائے افلاطون کے مکالمات بھرے ہوں۔ یہ
دیکھو ایسے آدمی سے خبردار رہو۔ وہیلیں اس وقت تک ماری نہیں جا سکتیں جب تک کہ انھیں دیکھا نہ جائے اور یہ
دھنسی ہوئی آنکھوں والا فلسفی تمہارے جہاز کو دنیا کے گرد دس مرتبہ چکر کھلانے کے بعد بھی تمہارے وہیل روغن کے
ذخیرے میں ایک آنس کا اضافہ نہیں کرے گا۔ میری اس تنبیہ کو غیر ضروری نہ سمجھو۔ کیونکہ آجکل وہیل کے شکار کرنے سے
لاابالی افسردہ خاطر اور رومانی مزاج نوجوانوں نے اپنی پناہ گاہ بنا رکھا ہے۔ وہ مکروہات دنیوی سے بیزار ہو کر تارکول اور وہیل
کی چربی میں جذبات ڈھونڈنے آتے ہیں۔ آپ اکثر دیکھیں گے کہ کسی بدنصیب اور آفتوں کے مارے شکاری جہاز
کے مستول پر ایک چاک گریبان شخص لٹکا ہوا ہے اور غمناک لہر میں یہ شعر پڑھ رہا ہے ————

"چلتا رہ، اے گہرے نیلے سمندر، تو چلتا رہ!
وہیل کے ہزاروں شکاری تیری پہنائیوں میں
بے نیل و مرام پھر رہے ہیں۔"

اکثر ان جہازوں کے کپتان ان کھوئے کھوئے نوجوان فلسفیوں سے جواب طلب کرتے ہیں اور انھیں ڈانٹتے ہیں
کہ تم اپنا کام دلچسپی سے نہیں کرتے اور شریفانہ عزائم سے اتنے بیگانہ ہو چکے ہو کہ تم نے دل میں تہیہ کر لیا ہے کہ وہیل کو
دیکھو گے ہی نہیں۔ لیکن یہ ساری ڈانٹ ڈپٹ بے کار جاتی ہے۔ یہ نوجوان فلسفی سمجھتے ہیں کہ ہماری بینائی کمزور ہے آنکھیں
ٹھیک طرح کام نہیں کرتیں۔ پھر اپنی آنکھوں پر زور ڈالنے سے کیا فائدہ؟ بغیر دیکھنے کی عینک تو وہ گھر ہی چھوڑ آتے ہیں۔
ایک مرتبہ اسی قسم کے ایک نوجوان سے ایک بوڑھے ہارپونر کا کہنا تھا: کمبخت بندر! ہمیں سفر کرتے تین سال
ہونے کو آئے اور تجھے آج تک ایک وہیل دکھائی نہیں دی۔ جب تو مستول کے اوپر پہنچ جاتا ہے تو وہیلیں ایسے غائب
ہو جاتی ہیں جیسے مرغی کے منہ سے دانت۔" ممکن ہے وہیلیں غائب ہو جاتی ہوں یا ممکن ہے دور افق کے قریب ان کے
غول کے غول پھر رہے ہوں۔ لیکن خیالات اور لہروں کے نغمے مل جل کر اس کھوئے کھوئے سے نوجوان کو کچھ ایسی
لوری دیتے ہیں کہ اس پر ایک غیر شعوری حجاب کی سی کیفیت اور افیم کے نشے کا سا اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ اپنی
ہستی سے بالکل غافل ہو کر اس پراسرار سمندر کو اس عمیق اور لامحدود نیلی روح کی مادی تصویر سمجھنے لگتا ہے جو انسان اور فطرت
دونوں میں جاری و ساری ہے۔ ہر عجیب اور حسین چیز جو ایک جھلک دکھانے کے بعد نظروں سے غائب ہو جائے، کسی
نامعلوم جانور کا پانی میں سے نکلا ہوا اور ابھرا ہوا پر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ گریزپا خیالات جو روح میں بھٹکتے پھرتے
ہیں مجسم ہو کر سامنے آ گئے ہوں۔ سحر زدگی کے اس عالم میں تیری روح بھٹک کر پھر وہیں چلی جاتی ہے جہاں سے آئی تھی،
زمان و مکان میں تحلیل ہو جاتی ہے اور آخر دنیا کے ایک ایک ساحل میں جذب ہو جاتی ہے۔
اس وقت اگر تیرے اندر کوئی زندگی ہے تو بس وہ جو جہاز کے ہلکے ہلکے جھولنے سے تجھے ملی ہے، جو جہاز نے یہ

زندگی سمندر سے مستعار لی ہے اور سمندر نے حقیقت عظمیٰ کے ناقابلِ فہم مد و جزر سے۔ لیکن جس وقت یہ نیند، یہ خواب تجھ پر طاری ہو، ذرا اپنا پیر یا ہاتھ تو ہلا کر دیکھ، اپنی جگہ سے سرک تو سہی، تیری ہستی خوف زدہ ہو کر واپس آ جائے گی۔ تجھے ایسا معلوم ہوگا جیسے تو کسی گرداب میں چکر لگا رہا ہے۔ اور شاید یا تجھے خزاں کے موسم میں دوپہر کے وقت ٹڈے چھنی چھنی آوازیں پیچ مار کر ان صاف و شفاف ہواؤں سے گزر جاتا سمندر میں آ پہنچے گا اور پھر کبھی نہیں اچھلے گا
یہ بات اچھی طرح یاد رکھو میرے لوگو !

چھوٹا عرشہ

[اہاب داخل ہوتا ہے - پھر باقی لوگ]

اہاب کے پائپ کا قصہ تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ اس کے تھوڑے دن بعد کا ذکر ہے کہ ایک روز ناشتے کے بعد اہاب حسبِ معمول عرشے پر آیا۔ جس طرح دیہاتی اکثر ناشتے کے بعد باغ میں چہل قدمی کرتے ہیں اسی طرح اکثر بحری کپتان عرشے پر ٹہلتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں عرشے پر ہاتھی دانت کی ٹانگ کی ٹھک ٹھک سنائی دینے لگی۔ یہ تختے اس کی چال سے اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ پرانے پتھروں کی طرح ان میں اس کے چلنے کے نشان پڑ گئے تھے۔ اگر آپ اس کی شکن آلود اور داغدار پیشانی کو غور سے دیکھتے تو آپ کو وہاں قدموں کے اور بھی عجیب و غریب نشان دکھائی دیتے —— اس واحد خیال کے قدموں کے نشان جو کبھی سونا جانتا ہی نہ تھا اور ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔

لیکن آج صبح اس کے ٹہلتے ہوئے قدموں کے نشان پہلے سے زیادہ گہرے بن رہے تھے اور اسی طرح وہ شکنیں بھی اور گہری لگ رہی تھیں۔ اہاب اپنے خیال میں اتنا غرق تھا کہ جب وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ پہلے تو بڑے مستول کے پاس سے اور پھر قطب نما کے پاس سے مڑتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے اندر وہ خیال ساتھ ساتھ مڑتا ہے اور ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتا ہے۔ اس خیال کو اہاب پر اتنا غلبہ حاصل تھا کہ معلوم ہوتا ہر خارجی حرکت کی اندرونی شکل یہی ہے۔

«فلاسک، اسے دیکھتے ہو؟» اسٹب نے آہستہ سے کہا۔ «اس کے اندر جو بچہ ہے وہ اپنا انڈا کھٹکھٹا رہا ہے۔ بس باہر آیا ہی چاہتا ہے۔»

گھنٹے گزرتے چلے گئے۔ پہلے تو اہاب اپنے کمرے میں بند ہو کے بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد پھر چہرے پر ارادہ کی وہی شدت اور سنگینی لیے عرشے پر ٹہلنے لگا۔

اب دن ختم ہونے کو تھا۔ اچانک وہ ونچس کے پاس رک گیا اور ہڈی والی ٹانگ سوراخ میں اڑا کر اور ایک ہاتھ سے بادبان پکڑ کے اسٹاربک کو حکم دیا کہ سب لوگوں کو جہاز کے پچھلے حصے کی طرف بھیج دو۔

«جی!» اسٹاربک نے کہا۔ اس جہاز میں یہ حکم صرف غیر معمولی موقعوں پر ہی صادر ہوتا تھا چنانچہ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

«سب کو پچھلی طرف بھیجو۔» اہاب نے پھر کہا۔ «مستول کے اوپر والو! نیچے آ جاؤ!»

جہاز کا سارا عملہ وہاں جمع ہو گیا اور کچھ تجسس اور کچھ خوف چہرے پہ لیے اس کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ وہ بالکل ویسا لگ رہا تھا جیسا طوفان آنے سے پہلے افق لگتا ہے۔ اہاب نے پہلے تو جلدی سے ایک نظر کشتیوں کے

ادھر ڈالی، پھر جہازیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی جگہ سے چل پڑا۔ اس نے بھاری بھاری قدموں سے عرشے پر ٹہلنا شروع کر دیا جیسے آس پاس نہ کوئی ہو نہ آدم زاد۔ سر جھکائے اور ٹوپی نیچے کھینچے وہ چہل قدمی کرتا رہا اور اسے یہی خبر نہ رہی کہ لوگوں میں کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ اسٹب نے بڑی احتیاط کے ساتھ فلاسک کے کان میں کہا کہ شاید اہاب نے ہمیں اپنی چہل قدمی کے کرتب دکھانے کے لیے بلایا ہے۔ لیکن یہ حرکت زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور چیخ کے بولا ——

"کیوں جہازیو، جب کوئی وہیل نظر آتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟"

"نعرے لگاتے ہیں!" کوئی بیس آوازوں نے ایک ساتھ مل کر گھٹ سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے!" اہاب نے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک وحشیانہ پسندیدگی تھی کیونکہ اس نے دیکھا کہ اس غیر متوقع سوال سے ان لوگوں پر ایک جوش و خروش کا عالم طاری ہو گیا ہے۔

"اچھا پھر کیا کرتے ہو، جہازیو؟"

"کشتیوں میں بیٹھ کے اس کے پیچھے چل دیتے ہیں!"

"اور اس وقت تمھاری نیت کیا ہوتی ہے جہازیو؟"

"یا تو وہیل نہیں یا ہم نہیں!"

ہر جواب کے ساتھ ساتھ بڈھے کے چہرے پر زیادہ سے زیادہ وحشتناک خوشی اور پسندیدگی کے آثار بڑھتے چلے گئے، ادھر جہازی ایک دوسرے کو حیرت انگیز نظروں سے دیکھنے لگے جیسے تعجب کر رہے ہوں کہ ایسے بظاہر بے مقصد سوالوں پر ہمیں اتنا جوش کیوں آ گیا۔

لیکن وہ پھر ہمہ تن اشتیاق بن گئے کیونکہ اہاب نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے بادبان کو مضبوط پکڑ کے اور اپنے سوراخ میں پیر گڑا کے تناؤ سے خطاب شروع کر دیا تھا ——

"مستول کے اوپر پہرہ دینے والوں نے اس سے پہلے بھی ایک سفید وہیل کے بارے میں مجھے حکم دیتے سنا ہے! اچھا غور سے سنو! یہ سونے کا ٹکڑا دیکھ رہے ہو؟" —— اس نے ایک چوڑا اور چمکدار سکہ سورج کی طرف اٹھا دیا —— "یہ سولہ ڈالر کا سکہ ہے جہازیو، اسے دیکھ رہے ہو نا؟ مسٹر اسٹاربک، ذرا مجھے وہ ہتھوڑا تو دینا۔"

اسٹاربک ہتھوڑا لانے گیا اور اہاب چپ چاپ اس سکے کو اپنے کوٹ کے دامن پر آہستہ آہستہ رگڑنے لگا جیسے اسے چمکانے لگا ہو۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا، بس منہ ہی منہ میں کچھ گنگنا رہا تھا جس سے کچھ ایسی عجیب اور مبہم آواز پیدا ہو رہی تھی گویا اس کے اندر جو قوت کی مشین کام کر رہی تھی اس کے پہیے گھر گھر چل رہے ہوں۔

اسٹاربک ہتھوڑا لے آیا تو وہ ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے میں سکہ اوپر اٹھائے بڑے مستول کی طرف چلا اور بلند آواز میں پکار کے بولا —— "جو آدمی سب سے پہلے ایک سفید سر والی وہیل دیکھے گا جس کی پیشانی

پھڑپھڑا رہی ہیں اور جبڑا ٹیڑھا ہے، جو آدمی سب سے پہلے سفید سر والی وہیل دیکھے گا جس کے دائیں طرف دم میں تین سوراخ ہیں ——— سنو، جو آدمی اس سفید مچھلی کو دیکھ کر مجھے خبردار کرے گا اسے یہ سونے کا سکہ ملے گا!"

"زندہ باد! زندہ باد!" اہاب سکّہ کو مستول پر ٹھونکنے لگا تو جہازیوں نے ترپال کی ٹوپیاں ہلا ہلا کے نعرے لگائے۔

"یاد رکھنا، یہ وہیل سفید ہے۔" اہاب نے ہتھوڑا پھینک کر کہا: "سفید وہیل ہے۔ اس کی تاک میں رہنا جہازیو۔ سفید پانی کی تلاش میں رہنا۔ اگر ایک بلبلہ بھی نظر آئے تو فوراً پکار دینا۔"

اس دوران میں ٹاشٹیگو، ڈگو اور کوئی کوئیگ اوروں سے بھی زیادہ حیرت اور شدید دلچسپی کے ساتھ اہاب کو تکتے رہے۔ جب جھریوں دار پیشانی اور ٹیڑھے جبڑے کا ذکر آیا تو وہ ایسے چونک پڑے جیسے ہر ایک کو الگ الگ کوئی خاص چیز یاد آ گئی ہو۔

ٹاشٹیگو نے کہا: "کپتان اہاب، یہ سفید وہیل ضرور وہی ہو گی جسے بعض لوگ موبی ڈک کہتے ہیں۔"

"موبی ڈک؟" اہاب نے چیخ کر کہا: "اچھا تو تم اس سفید وہیل کو جانتے ہو؟"

"جی، کیا وہ پانی میں غائب ہونے سے پہلے اپنی دم پنکھے کی طرح پھیلا دیتی ہے؟" گے ہیڈ والے نے سوچ سوچ کے کہا۔

ڈگو بولا: "کیا اس کا فوّارہ بڑی عجیب قسم کا ہے؟ پورا درخت کا درخت، بے انتہا تیز کہ ایسا تو کسی اور وہیل کا بھی نہ ہو گا؟"

"اور کپتان، اس کے اندر ایک، دو، تین ——— ارے بہت سے برچھے چبھے ہیں۔" کوئی کوئیگ نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا: "سب ٹیڑھے میڑھے ——— جیسے وہ ——— وہ ———" جب اسے کوئی لفظ نہ ملا تو وہ اپنا ہاتھ گول گول پھرانے لگا جیسے بوتل کی کاگ نکال رہا ہو۔ "جیسے وہ ——— وہ ———"

"جیسے کاگ نکالنے کا اوزار!" اہاب نے کہا: "ہاں، کوئی کوئیگ، سارے برچھے اس کے اندر ٹیڑھے میڑھے ہو کر پھنسے ہیں۔ ہاں، ڈگو، اس کے فوّارے کی دھار بہت اونچی ہے جیسے کوئی اوپر سے گیہوں برسا رہا ہو، اور وہ سفید جیسے ہمارے نین ٹکٹ کا نیا نیا اون۔ ہاں، ٹاشٹیگو، وہ اپنی دم اس طرح پھیلا دیتی ہے جیسے کل گرنے سے بادبان پھٹ جاتے ہیں۔ مار دیا! مار دیا! ہاں جہازیو، تم نے موبی ڈک ہی کو دیکھا ہے ——— موبی ڈک ——— موبی ڈک!"

اسٹاربک اب تک اسٹب اور فلاسک سمیت اپنے افسر کو لفظ بہ لفظ بڑھتے ہوئے تعجب کے ساتھ دیکھتا رہا تھا لیکن آخر کار اسے ایک ایسی بات سوجھی جس سے ان حیرتناک باتوں کی تھوڑی بہت توجیہ ہو جاتی تھی۔ وہ کہنے لگا "کپتان اہاب میں نے موبی ڈک کا ذکر سنا ہے ——— لیکن کہیں موبی ڈک ہی نے تو آپ کی ٹانگ نہیں کاٹی؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" اہاب چیخ پڑا، پھر ٹھہر ٹھہر کے بولا: "ہاں، اسٹاربک۔ ہاں، میرے جانثار، یہ موبی ڈک ہی تھی جس نے میرا مستول گرایا۔ موبی ڈک ہی تھی جس نے میری یہ گت بنائی کہ آج اس مردہ ٹھونٹھ کے سہارے کھڑا ہوا

ہاں، ہاں، یہی بات ہے۔" وہ بڑی بلند، خوفناک اور جانوروں کی سی آواز میں چیخ رہا تھا جیسے کوئی دل گرفتہ جنگلی ہرن رو رہا ہو۔ "ہاں ہاں! یہی وہ ملعون سفید وہیل ہے جس نے میرا ستیاناس کر دیا! جس نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا اور اپاہج بنا دیا!" پھر وہ ہوا میں دونوں بازو اس طرح لہرانے لگا جیسے ہزاروں لعنتیں بھیج رہا ہو۔ "ہاں ہاں، اس امید ہو یا کیپ ہارن یا ناروے کے بھنور، میں کہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اگر جہنم میں بھی جانا پڑے تو اس کے پیچھے وہاں بھی جاؤں گا۔ جہازیو! اسی لیے تو میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ میں اس سفید وہیل کی خاطر دنیا کا کونا کونا چھان ماروں گا جب تک وہ سیاہ خون کا فوارہ چھوڑنے لگے اور اس کی لاش پانی پر تیرتی نظر آنے لگے میں چین نہیں لوں گا۔ بولو جہازیو، میرے ساتھ شریک ہو یا نہیں! اتحاد پہ ہاتھ مارتے ہو، گھٹنے تو بہادری ہو۔"

"ہاں ہاں!" جہازیوں اور برچھے بازوں نے اس پرجوش بڈھے کے پاس آ کے نعرہ لگایا۔ "سفید وہیل کی آنکھ میں ڈبو دو، موبی ڈک کے پیٹ میں برچھا اتار دو!"

"تم پر خدا کی رحمت ہو۔" اہاب کچھ تو سسکیاں لے رہا تھا اور کچھ چیخ رہا تھا۔ "جہازیو! تم پر خدا کی رحمت ہو۔ داروغہ! جا کے شراب لاؤ۔ لیکن مسٹر اسٹاربک، تم نے منہ کیوں لٹکا لیا؟ تم سفید وہیل کا پیچھا نہیں کرو گے؟ موبی ڈک سے ڈر گئے؟"

"کپتان اہاب، ہم جس کام کے لیے نکلے ہیں اگر اس میں یہ موقع آ پڑے تو میں موبی ڈک کے ٹیڑھے جبڑے سے کیا، موت کے جبڑوں سے بھی نہیں ڈروں گا۔ لیکن میں تو یہاں وہیلوں کا شکار کھیلنے آیا تھا، اپنے کپتان کا انتقام لینے نہیں۔ کپتان اہاب، اگر آپ نے اپنا بدلہ لے بھی لیا تو بھی آپ کو اس میں کتنے پیپے روغن ہاتھ آئے گا؟ نین ٹکٹ کے بازار میں ایسے انتقام کے ذرا بھی تو دام نہیں اٹھیں گے۔"

"نین ٹکٹ کا بازار! لعنت! اچھا، اسٹاربک، ذرا قریب آؤ، تمھیں ذرا گہرا پڑے گا بسنا۔ اگر ہر چیز کا مول دو پیسوں پر ہے اور حسابیوں نے ایک ایک انچ زمین پر ایک ایک اشرفی رکھ کے کرۂ ارض کو اپنا دفتر بنا دیا ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ میرے انتقام کی بہت بڑی قیمت ہے ——— یہاں!"

"یہ تو اپنا سینہ پیٹ رہا ہے۔" اسٹاربک نے چپکے سے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے سینے میں سے تو ایسی آواز نکلی ہے جیسے بہت لمبا چوڑا مگر کھوکھلا ہو۔"

"بے زبان جانور سے انتقام!" اسٹاربک نے چیخ کر کہا۔ "ایسے جانور سے انتقام جس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کے اندھے پن میں تمھیں نقصان پہنچایا! یہ تو پاگل پن ہے کپتان اہاب۔ ایک بے زبان چیز پر اتنا غصہ! توبہ، بڑی کفر کی بات ہے۔"

"تم تو نرے احمق ہو۔ اچھا کان کھول کے سنو، جتنی چیزیں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ تو بس مٹی کی مورتیں ہیں۔ لیکن ہر واقعے میں ——— ہر زندہ اور عظیم کارنامے میں ——— بے عقل مورت کے پیچھے سے ہمیں کسی نامعلوم مگر ذی عقل چیز کے خدوخال جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اگر انسان اپنا وار کرنا چاہتا ہے تو اسی کا وار اس پردے میں سے

ہو کر پڑے گا۔ قیدی دیوار کو توڑے بغیر باہر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ میرے لیے یہ سفید وہیل وہی دیوار ہے جو میرے
قریب پہنچا دی گئی ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اس کے دوسری طرف کچھ بھی نہیں۔ لیکن میرا اتنا ہی کافی ہے
اس مچھلی نے ایک کام تو دیا، میرے سر پر ایک بوجھ تو ڈال دیا۔ مجھے اس کے اندر ہولناک قوت نظر آتی ہے۔ اس کے
جوڑ جوڑ میں ناقابلِ فہم کینہ بھرا ہوا ہے۔ دراصل مجھے اسی ناقابلِ فہم چیز سے نفرت ہے۔ سفید وہیل چاہے کسی
کی نمائندہ ہو یا خود اپنی مالک، بہرحال میں اپنی نفرت کا شکار اسی کو بناؤں گا۔ دیکھو میرے سامنے یہ دینی کفر کا ذکر نہ کرو
اگر سورج میری توہین کرے تو میں اس پر بھی حملہ کر دوں گا کیونکہ اگر سورج ایک کام کر سکتا ہے تو میں بھی دوسرا کام کر
سکتا ہوں۔ یہاں دنیا میں ایک طرح کی منصفی رائج ہے۔ ہر قسم کی مخلوق پر رقابت کی حکمرانی ہے۔ لیکن میں اس منصفی
کو بھی اپنا آقا تسلیم نہیں کرتا۔ میرے اوپر کون ہے؟ صداقت کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ اپنی نظریں میری
طرف سے ہٹاؤ! احمقانہ نگاہیں عفریتوں کی خوفناک نظروں سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں۔ اچھا اچھا، تم
لال پیلے ہو رہے ہو۔ میری حرارت نے تمہارے دل میں بھی غصّہ کی چنگاری بھڑکا دی ہے۔ لیکن دیکھو، اسٹاربک، جو
بات غصّہ میں کہی جائے وہ خود بخود واپس ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی تیز تیز باتیں سن کر کسی کی بے عزتی
نہیں ہوتی۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ تمہیں اشتعال دلاؤں۔ چلو جانے دو۔ وہ دیکھو! سامنے کیسے چکنے چپڑے اور گندمی
چہرے نظر آ رہے ہیں۔ سورج نے بھی کیسی کیسی جاندار تصویریں بنا رکھی ہیں۔ ان کافروں کو دیکھو —— یہ اسی قسم
کے لوگ ہیں اور کسی چیز کی پرستش نہیں کرتے۔ یہ زندہ ہیں، اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں اور جس قسم کی حرارت محسوس
کرتے ہیں اس کی ذرا بھی توجیہ نہیں کرتے! ہاں دوست، ان جہازیوں کو تو دیکھو! کیا یہ سب لوگ اس وہیل کے معاملے
میں آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟ اسٹب کو دیکھو! وہ ہنس رہا ہے! وہ سامنے چلی کے آدمی کو دیکھو! وہ تو اس کا خیال
کرتے ہی مسکرانے لگتا ہے۔ اسٹاربک، اس زبردست طوفان میں تیرا تنکا سا پودا اکھڑا نہیں رہ سکتا! اور کام کیا ہے؟ ذرا
سوچو تو سہی۔ ایک مچھلی مارنے کے کام میں مدد دینا۔ یہ اسٹاربک کے لیے کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں۔ اور اس سے زیادہ کیا
ہے؟ جب معمولی سے معمولی خلاصی نے اپنا برچھا اٹھایا ہو تو اس مچھلی کے مرنے کے شکار میں تین کٹ کا بہترین برچھا باز
پیچھے نہیں رہ سکتا! آہ! اب تو بھی مجبور ہو چلا۔ میں دیکھ رہا ہوں! آخر تو بھی اس لہر کی لپیٹ میں آ گیا! بول! بول تو سہی! —
ہاں، ہاں، تیری خاموشی تیرے دل کا راز کہے دے رہی ہے۔ (دوسری طرف مڑ کے اپنے آپ سے کہتا ہے) میرے پھیلے
ہوئے نتھنوں سے کوئی ایسی چیز نکل رہی ہے جو سانس کے ساتھ اس کے پھیپھڑوں میں بھی پہنچ گئی۔ اب اسٹاربک میرا ہو گیا۔
وہ بغاوت کیے بغیر میری مخالفت نہیں کر سکتا۔"

"خدا میرے اوپر رحم کرے! —— ہم سب پر رحم کرے!" اسٹاربک نہایت عاجزی سے بولا۔

میٹ نے اپنے پیچھے سے کان دبا کے اس کی اطاعت قبول کر لی کہ آ جائے۔ اپنی خوشی میں منادی نہیں کر اس کے
منہ سے کیسی بدشگونی کی بات نکل گئی ہے۔ نہ یہ سنا کہ جہازی بکسے سے ہنس پڑے نہ یہ سنا کہ جہاز کی رسیوں میں ہوا سرسرا کر

بڑی بڑی پیش گوئیاں کر رہی ہے۔ اور یہ سنار ستونوں پر بادبان چٹ پٹ لگ رہے ہیں جیسے ان کا دل بیٹھا جا رہا ہو۔
اسٹاربک کی جھکی ہوئی آنکھوں میں زندگی کا ڈھیٹ پن آگیا، ہلکا سا قہقہہ غائب ہوگیا، ہوائیں چلنے لگیں، بادبان پھول گئے
اور جہاز پہلے کی طرح جھکورے کھاتا چلنے لگا۔ آہ، آہ یہ پُراسرار آگاہیاں اور تنبیہیں، جب یہ آتی ہیں تو ضرور آتی کیوں نہیں!
لیکن شاید یہ سارے تنبیہیں نہیں ہوتے بلکہ پیش گوئیاں، خارجی پیش گوئیاں ہی نہیں بلکہ اندر جو کچھ واقع ہوچکا ہے ان کی
تصدیق بھی کیونکہ کسی خارجی مجبوری کے بغیر بھی ہمارے وجود کا کوئی اندرونی قانون ہمیں دوڑائے چلا جاتا ہے۔

"پیالہ لاؤ، پیالہ لاؤ!" اہاب نے پکارا، شراب سے بھری ہوئی صراحی آگئی تو اس نے برچھے بازوں کی طرف مڑ کر
انھیں حکم دیا کہ اپنے ہتھیار لاؤ، پھر انھیں لنگر کے چرخ کے قریب ان کے برچھوں سمیت ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ تینوں میٹ
اپنے نیزے لے کر اس کے قریب آگئے اور جہاز کے باقی لوگوں نے اس جماعت کے گرد ایک حلقہ بنا لیا۔ اہاب لمحہ بھر کے لیے
کھڑا ہو کر اپنے جہاز کے ایک ایک آدمی کو ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو لیکن وہ وحشی نظریں اس کی نظروں
سے اس طرح ملیں جیسے جنگلی بھیڑیوں کی خون کی مانند سرخ آنکھیں اپنے سردار کی آنکھوں سے ملتی ہیں، اور پھر وہ انھیں
لے کر ارنے بھینسے کی تلاش میں روانہ ہو جاتا ہے اور آخر کار کسی ریڈ انڈین کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتا ہے۔

"پیو اور پلاؤ!" اہاب نے شراب کی بھری ہوئی صراحی پاس والے جہازی کو دے کر کہا۔ سب سے پہلے جہازی پئیں۔
خوب دور چلے، دور چلے، اچھے چھوٹے گھونٹ لو اور دیر دیر تک پیو۔ ایسی گرم ہے جیسے جہنم کی آگ، ٹھیک ہے ٹھیک
ہے، خوب دور چل رہی ہے پیٹ میں بھیری بن کے جاتی ہے، اور پھر اوپر چڑھ کے آنکھوں کو ایسا دہکا دیتی ہے کہ سانپ
دیکھے تو ڈر جائے۔ شاباش، پوری صراحی پی ڈالی، ادھر ختم ہوئی ادھر دوسری آئی۔ لاؤ، صراحی مجھے دو —— تلچھٹ تک نہیں
چھوڑی اے جہازیو، تمھارا حال تو وقت کا سا ہے، زندگی کو پیتا چلا جاتا ہے اور ڈکار تک نہیں لیتا۔ داروغہ اسے پھر بھرو!

"اچھا جوانو، ادھر سنو، میں نے تمھیں اس چرخ کے گرد جمع کیا ہے۔ میٹ لوگ نیزے لے کر میرے دونوں طرف کھڑے
ہو جاؤ، برچھے باز وہ برچھے لے کر وہاں کھڑے ہو، میرے جانباز ملاحو، میرے گرد حلقہ بنالو تاکہ میں اپنے آبا و اجداد کی بھولی
کی ایک رسم کی تازہ کرسکوں، جوانو، تم دیکھو گے کہ —— ادھر ہوا ادھر تم آگئے، اتنی جلدی تو گھونٹ پیے
بھی واپس نہیں آتے۔ لاؤ مجھے دو، یہ صراحی تو پھر لبالب بھر گئی۔ تم تو پورے شیطان کے چیلے ہو —— بھاگ
یہاں سے، ملعون!

"میٹ لوگو، آگے بڑھو! اپنے نیزے میرے سامنے آگے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دو، شاباش! لاؤ میں ان کا آنکڑہ
چھو دوں۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور تینوں نیزوں کو اس جگہ سے پکڑ لیا جہاں یہ آکر ملتے تھے۔ پھر انھیں زور زور سے
ہلایا اور ساتھ ہی ساتھ اسٹاربک سے اسٹب اور اسٹب سے فلاسک تک نظر دوڑاتا گیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے کسی اندرونی اور بے نام ارادے کے زور سے وہ ان کے اندر بھی وہی آتشیں جذبہ بھر دینا چاہتا ہو جو خود اس کی
مقناطیسی زندگی کے برقی مرتبان میں جمع ہو رہا تھا اس کی پُراسرار، منجمد اور قوی نظروں کے سامنے تینوں میٹ ایسے ہوگئے

جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اسنت اور ولاسک ترچھی نظروں سے دوسری طرف دیکھنے لگے، اور اسٹاربک کی ایماندار آنکھ نیچے جھک گئی۔

"کامیاب رہا!" اہاب نے کہا۔ "مگر شاید اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر تم تینوں کو اس کا ایک دھچکا بھی پوری طرح لگ جاتا تو شاید میری دیو کی سی طاقت میرے اندر سے بالکل زائل ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ تم لوگ مر کے گر پڑتے۔ شاید تمہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اچھا اب نیزے نیچے کر دو! ہاں تم تینوں جیٹوں کو اپنے ان تینوں کافر نیزہ داروں کا ساقی مقرر کرتا ہوں ——— میرے یہ تین بہادر برچھے باز نہایت قابل احترام اور بلند مرتبہ انسان ہیں۔ بھلا کوئی اس کام کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟ خود پوپ تک تو اپنے تاج میں پانی بھر کے فقیروں کے پیر دھوتا ہے۔ میرے نائبو! تمہاری عاجزی تمہیں خود اس کام پر مجبور کر دے گی۔ میں تمہیں حکم نہیں دیتا، تم خود اپنے ارادے سے یہ کام کرو گے۔ برچھے بازو، اپنے برچھے کی انی اتار کے بانس الگ کر دو!"

تینوں برچھے بازوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے برچھوں کی تین فٹ لمبی انی اتاری اور اسے ہاتھ میں سیدھا لیے کر اہاب کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"کہیں یہ تیز دھار میرے اندر مت اتار دینا! ان کو الٹا کر دو! الٹا کر دو! اسے الٹ کے پیالہ بناؤ! الٹا کر دو! ہاں! پیالے! ساقیو! آگے آؤ! ان کے ہاتھ سے یہ لوہے کے پیالے لے لو! تم انھیں پکڑے رہو! میں بھرتا ہوں!" پھر اس نے ایک ایک افسر کے پاس جا کے ان کے پیالوں میں صراحی سے انڈیل انڈیل کر سیال آتشیں لبالب بھر دیا۔

"اچھا اب تم تینوں کی قطاریں کھڑے ہو، یہ زہریلے پیالے آگے بڑھاؤ! اب تم بھی اس گروہ میں شامل ہو چکے ہو جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ چلو پیالے دو! آہا! اسٹاربک! لیکن اب تو ہونا تھا ہو چکا! اب تو سورج اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرنے والا ہے۔ برچھے بازو پیو! تم وہیل کا شکار کھیلنے والی ہلاکت خیز کشتیوں میں بیٹھتے ہو۔ پیو اور قسم کھاؤ کہ جو ہل ڈک کو موت کے گھاٹ اتار کے رہو گے!" برچھے بازوں نے فولاد کے لمبے لمبے پیالے اٹھائے اور سفید ویل کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے، اس پر لعنت بھیجتے ہوئے، چٹکارا مار کر ایک ساتھ شراب پی گئے۔ اسٹاربک پیلا پڑ گیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ لبالب بھری ہوئی صراحی نے جوش سے دیوانے جہازیوں میں ایک بار پھر گشت کیا۔ اس کے بعد اہاب نے اپنا خالی ہاتھ ان کی طرف ہلایا تو وہ سب اپنی اپنی طرف چل دیے، اور اہاب جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

باب ۳۷

غروبِ آفتاب

[کپتان کا کمرہ۔ پچھلی طرف کی کھڑکیوں کے قریب۔ وہ اب اکیلا بیٹھا ہے اور کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھ رہا ہے۔]

میں جدھر بھی جاتا ہوں پیچھے پیچھے اور متلاطم پانی کی ایک لکیر اور اس سے بھی زیادہ رفتار اپنے پیچھے چھوڑتا چلا جاتا ہوں۔ لہریں مجھ پر پھنکار کھاتی ہیں۔ میرا راستہ روکنے کو اٹھتے اٹھتے گر جاتی ہیں۔ جو چاہیں کریں، میں تو گزر ہی جاتا ہوں۔

سامنے اس ہمیشہ ہرے رہنے والے پیالے کے کنارے پر گرم اور لعل شراب کی طرح سرخ ہوتی جا رہی ہیں وہ سنہری پیشانی جیسے پانی کو چھو رہی ہے۔ خود خود سورج نے اور میرے غوطہ لگانا شروع کیا تھا۔ وہ نیچے کی طرف جا رہا ہے، میری روح اوپر جا رہی ہے، اور وہ اپنی ناممکن چڑھائی پر چڑھتے چڑھتے تھک گئی ہے۔ میں نے جو تاج پہن رکھا ہے، کیا وہ بہت بھاری ہے؟ یہ ہیرے کا تاج لیکن اس میں بہت سے موتی جگمگا رہے ہیں۔ میں نے تو اسے پہن رکھا ہے، اس لیے مجھے نظر نہیں آتا کہ اس کی کرنیں کتنی دور تک پہنچتی ہیں مگر مجھے مبہم سا احساس ہے کہ میں نے وہ تاج پہن رکھا ہے جس سے لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ہے تو یہ ایسا ـــــ میں یہ بات جانتا ہوں ـــــ سونا نہیں ہے۔ یہ تو تاج ٹوٹا ہوا بھی ہے ـــــ مجھے خود محسوس ہو رہا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے کنارے مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا سر کچے فولاد سے ٹکرا رہا ہو۔ ہاں، میری کھوپڑی بھی فولاد کی ہے۔ اس قسم کی بھیجے سر پھوڑنے والی لڑائی میں کسی خود کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ارے، میری پیشانی کو خشک خشک گرمی محسوس ہو رہی ہے! ایک زمانہ تھا کہ جب سورج نکلتا تو مجھ میں ایک نیا اور جوش و خروش پیدا ہوتا۔ اسی طرح جب سورج ڈوبتا تو مجھے راحت ملتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ یہ حسین روشنی مجھے مسرور نہیں کرتی۔ ہر قسم کا حسن مجھے ایک اذیت معلوم ہوتا ہے کیونکہ مجھے کسی چیز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ مجھے بصیرت تو ضرور عطا ہوئی ہے لیکن مجھ میں وہ عام آدمیوں کی سی صلاحیت نہیں کہ چیزوں سے لطف لے سکوں۔ میں ہی ایک لعنت میں گرفتار ہوں جیسے کسی نے نہایت کینہ پروری اور ہوشیاری سے مجھے اس جنت میں پھنسا دیا ہو۔ جنت میں ہوں، لیکن مردود! اچھا خدا حافظ ـــــ خدا حافظ!

[اپنا ہاتھ ہلا کر کھڑکی سے ہٹ جاتا ہے۔]

کام اتنا مشکل نہیں نکلا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ایک نہ ایک تو ڈھیٹ ہوگا ہی، لیکن میرا دندانے دار حلقہ ان کے مختلف پہیوں میں بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے اور وہ گھومنے لگتے ہیں۔ یا اگر آپ چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ میرے سامنے وہ بارود کے ڈھیروں کی طرح ہیں اور میں ان کی دیا سلائی ہوں۔ ہائے، کتنی مشکل ہے، دوسروں میں آگ لگانے کے لیے دیا سلائی کو خود بھی آہستہ آہستہ سلگنا پڑتا ہے! میں نے جس کام کی ہمت دکھائی ہے، اسے خود اپنے ارادے سے کیا ہے۔ اور جس بات کا ارادہ کیا ہے اسے کر کے رہوں گا۔ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں ـــــ اسٹاربک تو ضرور سمجھتا ہے، لیکن میرے اندر تو کوئی بھوت سما گیا ہے۔ میں

زنجیر جنون ہوں۔ یہ وہ دیوانگی اور وحشت ہے جس میں اگر کبھی سکون آتا ہے تو بس اپنے آپ کو پرکھنے کے لیے۔ ایک پیشین گوئی یہ بھی کہ میرا جوڑ جوڑ الگ ہو جائے گا اور ——— اس پیشنگوئی ضائع ہو گئی۔ اب میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ جو میرا جوڑ جوڑ الگ کرنے والا ہے اس کا جوڑ جوڑ میں الگ کروں گا۔ یہ پیشین گوئی کرنے والا اور اسے پورا کرنے والا دونوں ایک شخص ہوں گے عظیم دیوتاؤ اس رتبے تک تو تم بھی کبھی نہیں پہنچے۔ اے گلی ڈنڈا کھیلنے والو، اسے کے بازو، اے اندھو، اے بہرو، میں تمہارے اوپر ہنستا ہوں۔ تمہارے پیچھے تالیاں پیٹتا ہوں۔ میں تم سے وہ بات نہیں کروں گا جو اسکول کے لڑکے بھیگی بلی سے کیا کرتے ہیں ——— ذرا اپنے برابر والے کے سامنے آؤ۔ مجھ سے کیا کرتے ہو، نہیں؟ تم نے مجھے مار کے گرا دیا تھا۔ میں پھر اٹھ کھڑا ہوا لیکن تم بھاگ کے چھپ گئے ہو۔ ذرا اوٹ کے پیچھے سے نکلو۔ آسمی، میرے پاس اتنی بڑی بندوق نہیں جس کی مار وہاں تک ہو۔ آؤ اب تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہے اور ذرا اسے اپنی جگہ سے ہلا کے تو دیکھو۔ مجھے میری جگہ سے ہلا دو گے؟ تم مجھے نہیں ہلا سکتے ورنہ تمہیں بھی اپنی جگہ سے ہٹنا پڑے گا! انسان نے یہاں تمہیں داب لیا ہے۔ مجھے میری جگہ سے ہلا دو گے؟ میرے مضبوط ارادے کے راستے میں لوہے کی پٹریاں بچھی ہوئی ہیں۔ میری روح کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ان پر دوڑتی چلی جائے۔ جن وادیوں میں کوئی کبھی نہ گیا ہو، جن پہاڑوں کے سینوں میں اندھے غار ہیں، جن چشموں کی تہ میں پتھریلے پتھر ہیں، میں وہاں سے گزرتا چلا جاتا ہوں، اور اپنے راستے سے ذرا نہیں ہٹتا۔ میری راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ لوہے کی سڑک کسی چیز کے روکنے سے نہیں رکتی!

باب ۳۸

جھٹ پٹا

[بڑے مستول کے قریب۔ اسٹاربک اس سے لگ کر کھڑا ہے]

میری روح کو اپنا مدِمقابل مل گیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کے۔ وہ تو مغلوب ہو کے رہ گئی اور ایک دیوانے سے! ایسی اذیت ناقابلِ برداشت ہے کہ ہوش مندی لیے میدان میں ہتھیار ڈال دے! لیکن اس نے تو بارود کا فیتہ بھی گھر لگایا اور میری عقل کو جھٹک سے اڑا دیا! میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کا کافرانہ انجام ابھی سے نظر آ رہا ہے، لیکن میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس بات سے اس کی مدد کرنی پڑے گی۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں کسی انجانی چیز نے مجھے اس کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ مجھے رسّے میں باندھ کے کھینچے لیے جا رہی ہے اور میرے پاس کوئی چاقو بھی نہیں جس سے یہ رسّہ کٹ سکے۔ بڑا ہی خوفناک بڈھا ہے! پوچھتا ہے کہ میرے اوپر کون ہے ——— ہاں جو طاقتیں اس سے اوپر ہیں ان کے ساتھ بھی جمہوریت برتی جاتی ہے۔ دیکھو! اپنے سے نیچے والوں پر کیسی دھونس جماتی ہے! ہائے! مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے کہ میرا اندوہناک فریضہ کیا ہے ——— اس کا حکم بھی مانوں اور اس سے بغاوت بھی کروں۔ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ نفرت بھی کروں اور ترس بھی کھاؤں! کیونکہ اس کی آنکھوں میں مجھے کوئی ایسا اذیت ناک غم دکھائی دیتا ہے جو اگر مجھے اٹھانا پڑتا تو میرا کچومر نکل جاتا۔ پھر ابھی اُمید باقی ہے۔ وقت کا دھارا بہت وسیع ہے جس طرح چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیوں کے پاس شیشے کا گول ہوتا ہے، اسی طرح اس ملعون وہیل کے پاس پوری دُنیا کے سمندر ہیں۔ اہاب نے تو اس چیز پر کمر باندھی ہے جو کفر کا درجہ رکھتی ہے لیکن ہے خدا آڑے آ جائے اور اہاب کو اس راستے سے ہٹا دے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری ہمت بندھے، لیکن میرا دل تو سیسے کا بن کے رہ گیا ہے۔ میری تو ساری مشین ہی بگڑ گئی ہے میرا دل تو میرے لیے بھاری پتھر بن گیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اسے اپنے اوپر سے کس طرح ہٹاؤں۔

[جہاز کے اگلے حصّے کی طرف سے رنگ رلیوں کی آواز آتی ہے۔]

ہائے خدا! مجھے بھی کیسے ملعون جہازیوں کا ساتھ نصیب ہوا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انسانی ماں کے پیٹ سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ انہیں تو کہیں شارک مچھلیوں سے بھرے ہوئے سمندر نے جنم دیا ہوگا۔ انہیں تو سفید وہیل نے پاگل بنا رکھا ہے اور یہ کیا خرمستیاں ہو رہی ہیں! یہ رنگ رلیاں تو جہاز کے اگلے حصّے میں منائی جا رہی ہیں، پچھلے حصّے میں کیسی خاموشی طاری ہے! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ منظر زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ جگمگاتے ہوئے سمندر میں جہاز ہنستا کھیلتا، لہروں سے لڑتا بھڑتا چلا جا رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ بُرا انسرا اہاب کو بھی کھینچے لیے جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے اندر کسی کونے میں غلطاں و پیچاں بیٹھا ہے، اور یہ بات بھول چکا ہے کہ جہاز کے پیچھے والا پانی تو ضرور مُردہ ہے لیکن

آگ میں کے گرگ صفت گرداب اس کے انتظار میں جبڑے پھیلائے بیٹھے ہیں، سمندر کی لمبی سی غراہٹ سن کر بے
سارے بدن میں ایک سنسنی دوڑ جاتی ہے! اے دل گیلا، اب تو خاموش ہو جاؤ، اور چہرے کے کام پر لگو! آہ زندگی!
ایسے وقت کو جب روح شکستہ حال ہو کر اپنے آپ کو بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے ـــــ جیسے وحشی اور گندہ ناتراشیدہ جانور کیا
گو زہر ہی کھانا کھلایا جاتا ہے ـــــ آہ زندگی! ایسے وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر کیسی کیسی ہولناک چیزیں
بھری پڑی ہیں! لیکن یہ ہولناک چیزیں میرے اندر نہیں ہیں! میرے باہر ہیں! مجھ میں انسانوں کا سا گداز اور نرمی موجود
ہے۔ اے مستقبل کے بھیانک عفریتو! میں اب بھی کوشش کروں گا کہ ان جذبات کے سہارے تمہارا مقابلہ کروں!
اے آسمانی طاقتو! میری مدد کو آؤ، مجھے سہارا دو، مجھے تقویت پہنچاؤ!

رات کا پہلا پہرہ

[مگے سنزل کے اوپر اسٹب اکیلا بیٹھ کے رسّی کی مرمت کر رہا ہے ۔]

ہا! ہا! ہا! اُدن ہوں! لگو صاف کر دوں! —— میں جب سے اسی چیز کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور اس کا نتیجہ نکلا ہے یہ ہا ہا ہی ہی کیوں؟ کیونکہ ہر عجیب سوال کا سب سے آسان اور سب سے عقلمندانہ جواب یہی قہقہہ ہے، جو جو کچھ ہے ہو کرے، تسلی کی ایک بات ہمیشہ باقی رہ جاتی ہے —— وہ بات یہ ہے کہ سب تو پہلے سے مقدر ہو چکا ہے۔ میں نے پوری باتیں تو سنی نہیں کہ اس نے اسٹاربک سے کیا کہا، لیکن میں نے تو یہی دیکھا کہ اسٹاربک کی شکل بالکل ویسی ہی بن گئی ہے جیسی اس روز شام کو میری بنی تھی۔ مغل اعظم نے اسے ٹھیک کر کے رکھ دیا۔ میں تو پہلے ہی تاڑ گیا تھا۔ مجھے سب معلوم تھا۔ مجھے تو اس میں ملکہ حاصل ہے، میں تو پہلے سے پیشین گوئی کر سکتا تھا۔ —— اس کی کھوپڑی پر نظر پڑتے ہی میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اچھا، اسٹب، عقلمند اسٹب —— یہ میرا لقب ہے —— اچھا، اسٹب، اب ہو گا کیا ہونے والا ہے؟ میں تو اپنی لاش اٹھائے پھر رہا ہوں، پتا نہیں ابھی کیا کیا ہونے والا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو کرے، میں تو ہنسی ہی پڑھوں گا تو جتنا ہوا خوفناک سے خوفناک چیز میں بھی کوئی نہ کوئی ہنسی مذاق کی بات ضرور نکل آتی ہے۔ ارے، مجھے تو ہنسی آئے چلی جا رہی ہے۔ تانا! تھیا تھیا! میری وہ چھوٹی سی بس بھری اس وقت گھر بیٹھی کیا کر رہی ہو گی؟ وہ رو رو کے آنکھیں نکال رہی ہو گی! —— ہو سکتا ہے تازہ وارد بیچے بازوں کی دعوت کر رہی ہو اور ایسے زوروں میں ہو جیسے جہاز کا جھنڈا۔ اور میں بھی زوروں میں ہوں —— تانا! تھیا تھیا! اوہو ——

جام چلے ، جام چلے ، سا تیا
کام بنے ، کام بنے ، سا تیا

بڑے مزے کا گانا ہے —— کس نے پکارا؟ مسٹر اسٹاربک؟ جی ہاں، صاحب —— (اپنے آپ سے) یہ میرا افسر ہے، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کا بھی ایک افسر ہے —— جی ہاں، صاحب، آتا ہوں، میں کام ختم کر چکا —— آ رہا ہوں۔

آدھی رات، اگلا عرشہ

برچھے باز اور جہازی:-

[اگلا بادبان اٹھا ہے اور پہرے دار نظر آتے ہیں کچھ لوگ کھڑے ہیں، کچھ ٹہل رہے ہیں، کچھ جھکے ہوئے ہیں اور کچھ مختلف انداز سے لیٹے ہیں سب مل کے گا رہے ہیں]

اسپین کی بیگمو، الوداع، الفراق
اسپین کی بیگمو، الوداع، الفراق
ہمارے کپتان نے حکم دے دیا ہے ——۔

نین ٹکٹ کا پہلا جہازی:-

ارے یار، اتنے جذباتی مت بنو، اس سے ہاضمہ خراب ہوتا ہے! لو اب یہ اکیلا گیت، آؤ میرے ساتھ!

[گاتا ہے اور سب لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں]

ہمارا کپتان دوربین ہاتھ میں لیے عرشہ
پر کھڑا تھا،
اور ان شاندار وھیلوں کو دیکھ رہا تھا جو ہر
طرف اپنے فوارے چھوڑ رہی تھیں۔
چلو جوانو، اپنی کشتیوں میں چلو،
اور اپنے اپنے بادبان کے پاس کھڑے ہو جاؤ
ایک نہ ایک ضرور پھنسے گی،
ہاتھ پہ ہاتھ مارو، جوانو!
دل مضبوط رکھو جوانو، مست رہو!
بہادر برچھے بازوں نے وھیل پر حملہ بول دیا!

چھوٹے عرشے سے میٹ کی آواز:-

آٹھ گھنٹیاں بجاؤ، اچھو!

نین ٹکٹ کا دوسرا جہازی:- گانا بند کرو! آٹھ گھنٹیاں بجاؤ! او گھنٹی بجانے والے لونڈے، سنتا ہے!

ارے چپ، آٹھ گھنٹیاں بجا! ادھر بجنے چل جلدی! اتنے میں پہرے والوں کو پکاروں۔ اس کام کے لیے یہ ارمز بہت چوڑا ہے ——— پر اپنے کا پیشہ ہے۔ ٹھیک ہے۔ ادھر گھے میں سر ڈال دیتا ہے۔ اے پہرے ——— والا چل ——— اور بجے آٹھ گھنٹیاں بجاؤ! اوٹ پیٹ کے اُٹھ کھڑے ہو!

ہالینڈ کا جہازی :-

یار، آج رات تو نیند پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ یہ رات ہے ہی اس کام کے لیے۔ مغل اعظم کی شراب میں تاثیر ہی کچھ ایسی ہے۔ بعض لوگ تو سرور میں آجاتے ہیں اور بعض مدہوش ہو کر لڑھ جاتے ہیں۔ ہم جاگ رہے ہیں، اور وہ لوگ سو رہے ہیں ——— ہاں ایسے پڑے ہیں جیسے لکڑیوں کے لٹھے۔ انھیں پھر آواز دو! لو یہ نگی لے کے اس میں سے پکارو۔ ارے کمبخت کو کہو اپنی لونڈیوں کا خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ ان سے کہو کہ قیامت کا دن آگیا۔ جتنی عیش کرنی ہے آخری دفعہ کرلیں، اور پھر حساب دینے کے لیے خدا کے سامنے حاضر ہوں۔ ہاں، اب کے پکارا ہے ——— یہ بات بھی! ایسا گلا ایمسٹرڈم کا مکھن کھانے سے خراب نہیں ہوا۔

فرانسیسی جہازی :-

سنو، جہاز کی ایک تو کون بجے، کون مرے۔ لاؤ، ذرا ایک ناچ ہو جائیں۔ ارے کیا کہتے ہو؟ دوسرے پہرے والے آگئے۔ چلو، اب ناچنے کے لیے تیار ہو جاؤ! ارے چپ! اے لونڈے! انگل سے اپنی ڈبیں (ارے چپ! نیند کے مارے بڑا سا ہو رہا ہے)

پتا نہیں کہاں ہے؟

فرانسیسی جہازی :-

تو پھر اپنا پیٹ پیٹنے لگ، اور کان ہلا۔ چلو، جہاز و ناچ ہو جائے۔ لگ کس بات کی، ساری ہیں ہی بہن لگتا ہے بڑا! ارے لعنت، کیا تم لوگ ناچو گے نہیں؟ پھر سیدھی قطار بناؤ، اور لگاؤ دوڑ۔ ڈر کس بات کا ہے؟ بس آجاؤ! چلیں زور زور سے ٹانگیں!

آئس لینڈ کا جہازی :-

یار، مجھے تمھارا فرش اچھا نہیں لگتا۔ اس میں تو بڑی لچک ہے۔ مجھے تو برف کے فرش کی عادت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ معاف کرنا۔

مالٹا کا جہازی :-

جی مجھے بھی معاف کرنا۔ تمھاری لڑکیاں کدھر ہیں؟ یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہے کہ آدمی دائیں ہاتھ سے بایاں ہاتھ پکڑ کے اپنے آپ سے کہے، مزاج شریف! کوئی ساتھی ضرور ہونا چاہیے۔ مجھے تو ساتھی کی ضرورت ہے۔

سسلی کا جہازی :- ہاں، لڑکیاں ہوں اور گھاس کا میدان! ——— پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اچھلتا ہوں، بالکل

نذاہی جاؤں گا!

لانگ آئیلنڈ کا جہازی :-

اسے یار کیا ابھی سے بیٹھے ہو راستے آدمی تو یہیں ہیں، لوگ کتنا ہوں، تھوڑی سی فرصت ملی ہے فصل کاٹنی ہے تو کاٹ لو ورنہ تمہاری ٹانگیں موت کی رات کے نیچے آجائیں گی تو وہ باجا بھی آگیا اب شروع ہو جاؤ۔

اڈور کا جہازی :-

[اوپر آکے مکھے میں سے ڈپلی پھینکتا ہے] لے بھئی پپ! یہ تیرا حصہ آگیا۔ بجا سیدھا! اچھا جوان!

[آدھے لوگ ڈپلی کی آواز پر ناچنا شروع کر دیتے ہیں کچھ نیچے چلے جاتے ہیں کچھ سو جاتے ہیں یا رسیوں کے ڈھیر پر لیٹ جاتے ہیں۔ گالیاں، ادھر ادھر چل رہی ہیں۔]

اڈور کا جہازی :- (ناچتے ہوئے)

پپ لگے زور، اب ہے لونڈے زور سے ہاتھ چلا! اور دے، مروڑ دے، چھوڑ دے، گوڑ دے! ایسے بجا کر چنگاریاں نکلنے لگیں! چاہے سارے گھنگھرو ٹوٹ جائیں مگر کوئی پروا نہیں!

پپ :-

گھنگھرو ٹوٹ جائیں! ——— لو ایک ٹوٹ کے گرا، میں اسے کوٹ بھی تو رہا ہوں بری طرح۔

چین کا جہازی

دانت کچکچا کچکچا کر پیٹ، بالکل بھوت بن جا!

فرانسیسی جہازی :-

ہاں مست ہو جاؤ! پپ، ذرا اپنا دائرہ اونچا اٹھا۔ میں اس میں سے کود دوں گا! خوب ناچو! چاہے ٹانگیں چٹک الگ ہو جائیں۔

ناش ٹیکٹو (چپ چاپ بیٹھا تمباکو پی رہا ہے)

یہ گورا آدمی ہے! اس کی دل لگی یہ ہے ناچوں! میں اپنا سانس کیوں پھلاؤں!

اولڈ مینکس کا جہازی :-

ان دل لگی بازوں کو یہ خبر بھی ہے یا نہیں کہ کیسی خوشی میں ناچ رہے ہیں۔ میں بھی تمہاری قبر کے اوپر ناچوں گا ضرور ناچوں گا ——— رات کو تیرا ہی ہے جو عورتیں سڑک کے کنگرے پر پھرتی ہیں ان کی دیکھی ہوئی ہوتی ہے یا خدا! یہ بیچارے ملاح اور جہازی بھی کیسے اناڑی ہیں! خیر، خیر عالم لوگ کہتے ہیں کہ دنیا ایک گیند ہے جو ہر وقت ناچتی رہتی ہے تو پھر یہی ٹھیک ہے کہ ساری دنیا کو ایک ناچ گھر بنا دیا جائے۔ ناچو جوانو! تم ابھی جوان ہو، میں بھی ایک زمانے میں جوان تھا۔

ہین کنگ کا تیسرا جہازی :-

ارے رک گئی — اُف وہ! اچھے موسم میں ویل کے نیچے کشتی ڈورا بھی اتارا نہیں جتنا طوفان — لاؤ وائن، ایک گھونٹ تو دو۔

[ناچ رک جاتا ہے، اور لوگ ٹولیوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں آسمان پر اندھیرا چھا جاتا ہے، زور کی ہوا چلنے لگتی ہے]

ہندوستانی جہازی :-

جگنوں کی سوگند! جوانو، اب تو بادبان پیچھے کرنے پڑیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آکاش سے گرنے والی گنگا نے ہوا کا روپ دھار لیا ہے! شیو جی کو غصہ آگیا ہے!

مالٹا کا جہازی :-

(گھٹنوں کے سہارے لیٹا ہے اور اپنی ٹوپی ہلا رہا ہے)

لہریں بھی اٹھنے لگیں — اب ان کے ناچنے کا نمبر آیا ہے۔ دیکھنا ان کی لہروں کے پھندنے کیسے جلتے ہیں۔ اگر یہاں سب کی سب ناچنے والی عورتیں ہوتیں تو میں ابھی سمندر میں غوطہ لگا دیتا، اور ہمیشہ ہمیشہ اٹھکیلیاں کرتا پھرتا۔

سسلی کا جہازی :- (لیٹا ہے)

میرے سامنے عورتوں کے رقص کا ذکر کرو! ہائے، ہائے۔ آہ جوانی! میرے جذبات بے قابو ہوئے جاتے ہیں، رکو، رہے کا فر؟ (گھٹنوں ملتا ہے)

تاہیتی کا جہازی :- [چٹائی پر لیٹا ہے]

ہائے، ہماری ناچنے والی لڑکیوں کے من موہنے جسم! وہ کولہے ہلا ہلا کے ناچنا! ہائے، وہ نیچے نیچے نقاب اور اونچے اونچے تاڑ کے درخت! اے میرے تاہیتی میں ابھی تک تیری چٹائی پر آرام کر رہا ہوں لیکن وہ نرم نرم زمین میرے نیچے سے نکل چکی ہے، اری چٹائی جنگل میں تجھے میری نظروں کے سامنے بنا گیا تھا جس روز میں تجھے وہاں سے لایا ہوں تو بالکل ہری تھی لیکن اب گھس گھسا کے خراب ہو چکی ہے، ہائے یہ تبدیلی نہ تو مجھ سے برداشت ہوتی ہے نہ تجھ سے! پھر وہاں آسمان پر پہنچ کے کیا حال ہوگا؟ ارے کہیں مجھے اپنے جزیرے کی برچھوں جیسی تیز چٹانوں پر سے بجتے گرجتے جھٹوں کا شور تو نہیں سنائی دے رہا جو پہاڑیوں سے کود کر گاؤں کے گاؤں ڈبو دیتے ہیں؟ — ارے بجلی کا کڑکا تھا! چل رہی میری کمر! (اٹھ کے اُس کا مقابلہ کر کے اکڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے)

پرتگال کا جہازی :-

سمندر کے ٹھاٹھیں مار رہا ہے! جہاز کو دھن کے دھکے دے رہا ہے! جوانو! بادبانچے لپیٹنے کے لیے تیار رہو! ابھی تو ہوائیں تلواریں لے کر تھپیڑے بدل رہی ہیں۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوا ہی چاہتی ہے۔

ڈنمارک کا جہازی :-

پھٹ جا پرانے جہاز، پھٹ جا! پھٹنے ہی میں تیری سلامتی ہے! شاباش! بیٹ نے تجھے خوب سنبھال رکھا ہے
اسے ذرا بھی توڑ نہیں لگتا۔ وہ تو کیٹ گٹ کے جزیرے والے قلعہ کی طرح جما کھڑا ہے جس کی توپوں پر طوفانوں کے تھپیڑے
پڑتے ہیں اور سمندر کا نمک جمتا رہتا ہے لیکن پھر وہ الٹک کا مقابلہ کرتے ہی چلی جاتی ہیں!

نین ٹکٹ کا چوتھا جہازی :-

اسے حکم جو مل چکا ہے یہ بات مت بھولو۔ میں نے بڈھے اہاب کو اس سے کہتے سنا ہے کہ بجلی کڑکے تو اسے
ذرا ختم کر دو۔ جیسے پانی کے فوارے کو پستول چلا کر توڑتے ہیں ——— جہاں بجلی کڑکے جہاز وہیں لے کر پہنچو!

انگلستان کا جہازی :-

توبہ! لیکن یہ بڈھا بڑے زور کا آدمی ہے! اس کی وہیل ہم سب جوان ڈھونڈ کے نکالیں گے!

سب :-

ہاں! ہاں!

اولڈ مینکس کا جہازی :-

یہ تینوں صنوبر کے مستول کیسے کانپ رہے ہیں! صنوبر کے درختوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہیں اور لگایا جائے
تو بالکل نہیں پنپتے اور یہاں انھیں ملی بھی ہے تو ان ملعون جہازیوں کی مٹی۔ نگہبان کا خیال رکھو! ذرا ہوشیار رہو! ایسے
موسم میں تو ساحل پر بہادر سے بہادر آدمی کا دل پھٹ جاتا ہے اور سمندر میں مضبوط سے مضبوط جہاز کے ٹکڑے اُڑ
جاتے ہیں۔ ہمارے کپتان کے تو ایک پیدائشی نشان ہے ہی۔ وہ سامنے کی طرف دیکھو، جوانو! آسمان پر ایک اور
نشان نظر آ رہا ہے ——— زرد زرد ہیبت ناک۔ باقی سارا آسمان سیاہ ہے ڈیگو۔

پھر کیا ہوا؟ جو شخص سیاہی سے ڈرتا ہے وہ مجھ سے ڈرتا ہے! میں تو سیاہی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہوں!

اسپین کا جہازی :-

(اپنے آپ سے کہتا ہے) اچھا، تو یہ دھونس جما رہا ہے! ——— میری اور اس کی پرانی لاگ ڈانٹ ہے مجھے
اس کی ذرا سی بات بھی بری لگتی ہے۔

(آگے بڑھ کے) ہاں، یہاں پر بچے باز، واقعی تمھاری نسل انسانیت کا سیاہ رخ ہے ——— اور پھر جہنم کی
طرح سیاہ۔ برا مت ماننا بھی۔

ڈیگو [بگڑ کے]

نہیں

سینٹ جیگو کا جہازی :- یہ اسپین والا یا تو پاگل ہے یا نشے میں بہک رہا ہے لیکن یہ تو ہو نہیں سکتا یا پھر اس

آدمی کے سلسلے میں ہمارے سچی علم رنگ کے پانی نے اپنا پورا کام نہیں کیا۔

نین ٹکٹ کا پانچواں جہازی :-

ارے، یہ کیا چیز نظر آئی ——— بجلی، ہاں۔

اسپین کا جہازی :-

نہیں، ڈگو اپنے دانت دکھا رہا تھا۔

ڈگو - [اچھل کر]

ارے زنانے، تیرے دانت پیٹ میں اتار دوں گا! جتنی گوری چمڑی ہوگی، آدمی اتنا ہی بزدل ہوگا!

اسپین کا جہازی :- [اس کے مقابلے پر آکے]

چاقو مار کے تیرے جگر کو نکال دوں گا! چوڑے چکلے آدمی کا دل ہمیشہ تھوڑا ہوتا ہے۔

سب :-

جھگڑا ہو گیا! جھگڑا ہو گیا! جھگڑا ہو گیا!

تاش ٹیگو :- [کش لے کر]

نیچے بھی جھگڑا، اوپر بھی جھگڑا ——— دیوتا اور انسان دونوں کے دونوں جھگڑالو ہیں! ہوں!

بیل فاسٹ کا جہازی :-

جھگڑا! آہ جھگڑا! خدا کی قسم، جھگڑا! لگے ہاتھ!

انگلستان کا جہازی :-

انصاف سے کام ہونا چاہیے! اسپین والے کا چاقو چھین لو! چاروں طرف گھیرا بنا لو، گھیرا بنا لو!

اولڈ مینکس کا جہازی :-

بنا بنایا موجود ہے۔ وہ دیکھو! افق کا گھیرا! اس گھیرے میں تو قابیل نے ہابیل کو مارا تھا۔ بڑا اچھا کام ہے، ٹھیک کام ہے! نہیں! تو پھر اے خدا، تو نے یہ گھیرا کیوں بنایا؟

چھوٹے عرشے سے میٹ کی آواز

بادبانوں کی رسیاں پکڑ لو! پیچھے کے بادبان کھینچ لو! آگے کے بادبان آدھے کو تیار رہو!

سب :-

طوفان آیا! طوفان آگیا! اچھلو پیارو، دوڑو! (سب تتر بتر ہو جاتے ہیں)

پپ :- [آنچے کے نیچے دبکا بیٹھا ہے]

پیارو، اپنے پیاروں سے خدا بچے! کڑاک، کڑاک، لو، وہ لگے بادبان کا ستون ٹوٹا! دھڑام، دھڑام!

یا خدا! اسے چپ اور بیٹھے کو جھک رہا۔ اب کے بڑا سخت دن آ رہا ہے۔ سال کے آخری دن جنگل کی آگ میں بھی اتنی بری حالت نہ ہوتی ہوگی جتنی اس وقت ہو رہی ہے۔ ایسے میں پھل توڑنے کے لیے بھلا کون پیڑ پر چڑھے گا؟ لیکن یہ تو سب کے سب گیا گئے چلے جا رہے ہیں۔ اور رہی نہیں جاتا۔ بڑی خوشیاں نصیب ہونے والی ہیں انھیں جنت کے راستے پر جا رہے ہیں نا۔ رسّی کو زور سے پکڑے رہو! باپ رے، کیا جھٹکا آیا ہے! لیکن وہ لوگ تو اور بھی بڑے ہیں —— سفید جھگڑ ہی پڑے۔ سفید جھگڑ! سفید ویل! شاباش! شاباش! میں اس وقت ان کی ساری باتیں سن رہا ہوں اور سفید ویل —— شاباش! شاباش! —— اس کا ذکر تو بس ایک دفعہ آیا۔ یہ سوچ کر تو مجھے اپنی ڈھیلی کی طرح جھرجھری سی آ جاتی ہے کہ ابھی شام ہی تو اس خوفناک بڈھے نے ان لوگوں کو قسم کھلائی ہے کہ سفید ویل کو مار کے دم لیں گے!

اے زبردست سفید دیوتا! تو اس اندھیرے میں نہ جانے کہاں چھپا ہوا ہے! اس بیچارے سیاہ فام لڑکے پر رحم کر۔ لے ایسے تمام انسانوں سے محفوظ رکھ جنھیں خوف محسوس نہیں ہوتا!

موبی ڈک

میں یعنی اسمٰعیل بھی اس جہاز کے عملے میں تھا۔ اوروں کے ساتھ میرے نعرے بھی بلند ہوئے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ مل کے قسم کھائی تھی۔ میں نے اور بھی زور سے چلایا تھا۔ میں نے تو اور بھی پکا عہد باندھا تھا کیونکہ میری روح میں تو ایک خوف سمایا ہوا تھا۔ مجھے تو اپنے اور اہاب کے درمیان ایک وحشیانہ اور پراسرار قسم کی یگانگت محسوس ہو رہی تھی۔ اہاب کی دیرینہ عداوت مجھے بالکل اپنی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بڑے ذوق و شوق سے اس خونخوار عفریت کی کہانی سنی جس سے انتقام لینے اور اسے ہلاک کرنے کی میں نے اور سب لوگوں نے قسم کھائی تھی۔

کچھ دن سے یہ خلوت پسند اور یگانہ و تنہا سفید ویل وقتاً فوقتاً ان ویران سمندروں میں پھرا کرتی تھی جہاں زیادہ تر روغنی ویل کے شکاری ہی آتے جاتے تھے۔ لیکن اس کے وجود کا علم ان سب لوگوں کو نہ تھا۔ بس معدودے چند نے اسے چلتے ہوئے دیکھا تھا کہ یہ موبی ڈک ہے۔ جن لوگوں نے اسے پہچان کر اس کا مقابلہ کیا تھا، ان کی تعداد تو اور بھی کم تھی۔ بات یہ ہے کہ ویل کا شکار کھیلنے والے جہازوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ پوری سمندری دنیا میں نہایت بے ترتیبی سے بکھرے رہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے تو اپنے شکار کے سلسلے میں جرأت کر کے ایسے ویران علاقوں میں نکل جاتے کہ سال سال بھر تک بلکہ ایک جہاز بھی ایسا نہ ملتا جس سے کچھ خبریں معلوم ہوتیں۔ ہر سفر نہایت طویل طویل ہوتا۔ پھر گھر سے روانہ ہونے کا بھی کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ ان سب چیزوں نے بعض اوقات ان کے ساتھ مل کر براہ راست اور بلا واسطہ طریقے سے، ایک مدت تک دنیا بھر میں پھیلے ہوئے شکاری بیڑے میں موبی ڈک کے متعلق ایسی خبریں پھیلنے ہی نہ دیں کہ اسے کوئی امتیاز اور اختصاص حاصل ہو۔ بعض دفعہ سننے میں آتا کہ کسی جہاز کو فلاں جگہ اور فلاں وقت ایک بڑی زبردست اور خبیث روغنی ویل ملی جو اپنے حملہ آوروں کو بہت کچھ نقصان پہنچا کر صاف بچ گئی۔ یہ خبر سن کر لوگ بالکل جائز طور پر یہ فرض کر لیتے کہ یہ ویل موبی ڈک کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ادھر کچھ دن سے روغنی ویل کے شکاریوں نے اکثر یہ بات دیکھی تھی کہ جب کسی ویل پر حملہ کیا تو وہ بڑی خونخوار، چالاک اور کینہ پرور نکلی۔ چنانچہ جو شکاری اپنی لاعلمی میں اتفاقاً موبی ڈک سے جا بھڑتے، وہ عموماً اس واقعہ کو انفرادی طور سے کوئی اہمیت نہ دیتے بلکہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتے کہ ویل کا شکار کام ہی خطرناک ہے اور اس میں ایسے ہی ہولناک عفریتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ویل اور اہاب کی لڑائی میں جو حادثہ پیش آیا تھا اسے بھی فی الجملہ لوگوں نے اسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔

اچھا اب ان لوگوں کی بابت جنھوں نے پہلے سے سفید ویل کا حال سن رکھا تھا، اور اتفاقاً کہیں وہ نظر بھی آگئی، شروع شروع میں تو یہ لوگ بے دھڑک کشتی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو جاتے تھے جیسے اس قسم کی کسی اور ویل

کے پیچھے لیکن آخرکار ان لڑائیوں میں ایسے ایسے حادثے پیش آئے جن میں ہاتھ کلائی اور گھٹنے کی موچ، ٹوٹی ہوئی ٹانگ یا
کٹے ہوئے اعضا تک محدود نہ رہی بلکہ ہلاکت کے درجے تک جا پہنچی۔ لوگوں کو اتنی دفعہ زک اٹھانی پڑی کہ وہیل کی ذات
ان کی نظروں میں روز بروز بہت ہیبت ناک بنتی چلی گئی۔ غرض سفید وہیل کی کہانی ایسی مشہور ہوئی کہ بڑے بڑے جگر دار شکاریوں
کے حوصلے پست ہو گئے۔

پھر ان خوفناک لڑائیوں کی سچی کہانیوں میں خوب رنگ آمیزیاں ہوئیں۔ اور افواہوں نے ہر بات بڑھا
چڑھا کے بیان کی کیونکہ ہر خوفناک اور حیرت ناک واقعہ کے اندر سے داستانیں اور افواہیں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں
جیسے پھل کے مارے ہوئے درخت سے کھمبیاں۔ پھر سمندر کی زندگی میں خشکی والی دنیا سے بھی زیادہ یہ حال ہے کہ جہاں کہیں ذرا
سی حقیقت موجود ہو اس کے سہارے فوراً طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگتی ہیں جس طرح اس حالت میں سمندر کو خشکی پر فوقیت حاصل
ہے اسی طرح شکاری بیڑا اور تمام جہازوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہاں ایسی ایسی عجیب و غریب ہولناک افواہیں گشت کرتی
ہیں جو کہیں دیکھیں نہ سنیں کیونکہ وہیل کے شکاری ہی اس جہالت اور ضعیف الاعتقادی سے آزاد نہیں ہیں جو تمام جہازیوں
کو ورثہ میں ملی ہے بلکہ ہر قسم کے جہازیوں میں ایک یہی تو ہیں جن کا سمندر کی ہر عجیب اور حیرت ناک چیز سے براہ راست
واسطہ پڑتا ہے سمندر کے عجائبات کو شاذ و نادر دیکھنا کیا معنی یہ تو ان سے گلے پڑ کر جنگ کرتے ہیں۔ وہیل کا شکاری جن تنہا
ایسے دور دراز سمندروں میں جاتا ہے کہ اگر آپ ہزاروں میل چلیں اور ہزاروں ساحلوں سے بھی گزریں تو بھی اس علاقہ میں پہنچ
کر انسان نوازی کے آثار دکھائی نہیں دیں گے پھر اس کا جہاز بھی ایسا ہی عجیب ہے۔ غرض وہیل کا شکاری چاروں طرف سے کچھ
ایسے حالات میں گھرا رہتا ہے کہ اس کے تخیل سے نہ معلوم کیسی کیسی زبردست چیزیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

اور پھر اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے کہ سفید وہیل کے متعلق یہ مبالغہ آمیز افواہیں سمندر کے اوپر سفر کرتے کرتے
اور ضخیم ہوتی چلی گئیں۔ اور آخرکار انھوں نے اپنے اندر بالائے فطرت قوتوں کے بارے میں ہر قسم کے مریضانہ اشاروں اور
وہموں کو جذب کر لیا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے اس کے ساتھ ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں منسلک ہو گئیں جن کا تعلق کسی نظر آنے
والی چیز سے تو ہو نہیں سکتا۔ اس کے نام ہی کا لوگوں پر ایسی دہشت چھائی کہ جن لوگوں نے کچھ ان افواہوں کے ذریعے سفید وہیل
کا حال سن لیا تھا انھیں تو اس کے جبڑوں کے خطرے میں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

لیکن چند دوسرے قوی اور عملی اثرات بھی اپنا کام کر رہے تھے۔ وہیل کی دوسری قسموں کی بہ نسبت روغنی وہیل کو جو برتری
ہی جو امتیاز اور خصوصیت حاصل ہو گئی تھی وہ آج تک ختم نہیں ہوئی۔ وہیل کے شکاریوں میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو گرین لینڈ
وہیل سے لڑنے میں تو بڑی ہوشیاری اور ہمت دکھاتے ہیں۔ مگر تجربہ کاری یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے روغنی وہیل کے مقابلے
نہیں آتے بہرکیف بہت سے شکاری ایسے ہیں خصوصاً ان قوموں کے جو امریکی جہازوں میں نہیں جاتیں جنھوں نے کبھی روغنی وہیل
کا مقابلہ نہیں کیا۔ اور وہیل کے بارے میں جن کا علم بس گندی جھیل تک محدود ہے جس کا شکار شمال والے جیمز سے کھیلتے
ہے آئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بستر پر بیٹھ کے جنوب کے شکاری جہازوں کے عجیب و غریب اور وحشیانہ قصے کہانی کی طرح بھی

اور خوف کے ساتھ سنتے ہیں۔ روغنی وہیل کی عظیم الشان جسامت کے آنا بیچ اور شدید تصور کشی کو بھی حاصل نہیں جتنا ان جہاز والوں کو جو اس سے کترا کے نکل جاتے ہیں۔

اب تو یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ روغنی وہیل میں کتنی زبردست قوت ہوتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے داستان طرازی کے زمانے میں بھی حقیقت کا سایہ لوگوں پر پڑ چکا تھا چند کتابی ماہرین حیوانات ——— مثلاً اولاسن اور پوول سن ——— کہتے ہیں کہ روغنی وہیل سمندر کی تمام دوسری مخلوقات کو تو لرزہ براندام رکھتی ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر وقت انسانی خون کی بھی پیاسی رہتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے خیالات کووییئے کے زمانے تک بھی ختم نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ خود اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ روغنی وہیل کو دیکھ کر شارک سمیت ساری مچھلیاں ہیبت زدہ ہو کے رہ جاتی ہیں اور اتنی تیزی سے بھاگتی ہیں کہ اکثر چٹانوں سے ٹکرا کر فوراً کے فوراً مر جاتی ہیں"۔ ماہی گیروں کے عام تجربات کی بنا پر ان افواہوں میں چاہے کتنی ہی ترمیم کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن بعض حالات میں ان باتوں پر شکاریوں کا اعتقاد پھر زندہ ہو جاتا ہے اور وہ روغنی وہیل کو اتنا ہی خونخوار سمجھنے لگتے ہیں جتنا پاول سن نے بتایا تھا۔ ان افواہوں سے دلوں پر کچھ ایسی وحشت چھا گئی تھی کہ موبی ڈک کے سلسلے میں بہت سے ماہی گیروں کو روغنی وہیل کے شکار کا ابتدائی زمانہ یاد آ گیا جب گرین لینڈ وہیل کے پرانے تجربہ کار شکاریوں کو اس نئی اور حیرت انگیز کے خطرات کے مقابلے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل تھا۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ دوسری وہیلوں کے شکار میں تو کچھ امید بھی رہتی ہے لیکن روغنی وہیل جیسے بھوت کا پیچھا کرنا اور اسے نیزوں سے چھیدنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ تو بس اتنا ہی نکل سکتا ہے کہ آدمی فوراً دوسری دنیا میں جا پہنچے۔ اس سلسلے میں بعض بڑی قابل قدر دستاویزیں موجود ہیں جنھیں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

بہر حال کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان سب چیزوں کے باوجود موبی ڈک کا پیچھا کرنے کو تیار تھے۔ ان سے بھی زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے کسی خاص حادثے کی تفصیلات اور توہم پرستانہ افواہوں کے بغیر موبی ڈک کا حال بس مبہم طریقے سے سنا تھا۔ ان لوگوں میں اتنی ہمت تھی کہ اگر مقابلہ آ پڑے تو بھاگنے والے نہ تھے۔

یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ ضعیف الاعتقاد لوگوں نے طرح طرح کی وحشت ناک باتیں سفید وہیل سے منسوب کر رکھی تھیں۔ انھیں میں سے ایک انوکھا تصور یہ تھا کہ موبی ڈک بیک وقت ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اسے ایک ہی وقت دنیا کے بالکل مختلف حصوں میں دیکھا گیا ہے۔

یہ لوگ ضعیف الاعتقاد تو ضرور تھے مگر یہ تصور توہم کے طور پر ہی سہی لیکن تصور بہت ممکن الوقوع ضرور تھا کیونکہ جس طرح انتہائی عالمانہ تحقیق کے بعد بھی سمندری چشموں کے اسرار ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے، اسی طرح روغنی وہیل کے شکاری اس بات سے ناواقف ہیں کہ وہ سمندر کی سطح کے نیچے کیا کرتی ہے۔ البتہ وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں عجیب و غریب اور متضاد قسم کی خیال آرائیاں ضرور ہوتی رہی ہیں۔ خصوصاً اس چیز کے بارے میں کہ وہ بہت گہرا غوطہ لگا کے ایک پُراسرار طریقے سے بڑی جلدی کہیں دور دور جا نکلتی ہے۔ امریکی اور انگریز شکاری اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر اسکورزبی نے اس کی تصدیق بھی کر

دی ہے کہ بحر اٹلانٹک کے شمال میں بعض وہیلیں ایسی ہاتھ آئیں جن کے بدن میں سے وہ برچھے نکلے جو کچھ ہی دن پہلے کے سمندر میں پھینکے گئے
تھے۔ بعض حالات میں یہ بھی پتا چلا ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کچھ ایسے زیادہ دنوں کا فرق نہ تھا۔ اس سے بعض وہیل گیروں
نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شمال مغرب کا راستہ جو انسان کے لیے عرصہ دراز سے ایک مسئلہ بنا رہا ہے، وہیل کے لیے کبھی مسئلہ نہیں
بنا۔ پرانے زمانے میں عجیب و غریب داستانیں مشہور ہیں، مثلاً پرتگال میں خشکی سے گھرا ہوا اسٹریلو پہاڑ جس کی چوٹی کے قریب ایک
جھیل تھی جس میں ٹوٹے ہوئے جہازوں کے تختے ابھر کر سطح تک آ جاتے تھے۔ یا سائراکیوز کے قریب اریتھوسا کا فوارہ جس کے پانی
کے متعلق مشہور تھا کہ یہ ایک زیرِ زمین راستے کے ذریعے فلسطین سے آتا ہے۔ یہ روایتیں بھی بعینہٖ ویسی ہی سمجھی جاتی تھیں جیسے
شکاریوں کے روزمرہ تجربے کی حقیقت۔ بالکل ان کے مقابلے کی چیزیں ہیں۔ شکاری ایسی غیر معقول باتوں سے مانوس ہو چکے تھے۔
پھر یہ بھی جانتے تھے کہ اس پر بار بار جان توڑ حملے ہوئے لیکن سفید وہیل ہر دفعہ صاف بچ نکلی۔ چنانچہ توہم پرستی کے زور میں آ کے
بعض شکاریوں نے تو یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ موبی ڈک بیک وقت کئی جگہ موجود رہتی ہے (بلکہ لافانی بھی ہے کیونکہ
یہ دراصل ایک ایسی صفت ہے جو بیک وقت کئی مکانوں میں ظاہر ہوتی ہے یعنی زمان میں)۔ لوگ کہتے تھے کہ چاہے اس کے پہلوؤں میں نیزوں کے
برچھے اتار دیے جائیں لیکن اسے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ یا اگر وہ گاڑھے گاڑھے خون کا فوارہ چھوڑنے بھی لگے تو بھی یہ منظر
محض ایک ہولناک فریب ہوگا کیونکہ وہ ہزاروں میل دور پہنچ کے خون سے پاک لہروں میں پھر ایسا صاف و شفاف فوارہ
چھوڑنے لگے گی۔

لیکن ان مافوق الفطرت قیاس آرائیوں کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی اس عفریت کی جسمانی ساخت اور عجیب و غریب
ہیئت میں ایک ایسی چیز ملتی تھی کہ آدمی کا تخیل مرعوب ہو کے رہ جاتا۔ کیونکہ جو چیز اسے دوسری وہیلوں سے الگ
کرتی تھی وہ اس کی غیر معمولی جسامت نہ تھی بلکہ، جیسا پہلے کہیں بتایا جا چکا ہے، جھرّیوں دار برف جیسی سفید پیشانی اور ایک
اونچا سا اہرام نما سفید کوہان۔ یہ اس کی امتیازی خصوصیات تھیں —— وہ علامتیں جن کے ذریعے اجنبی اور ان دیکھے
سمندروں میں بھی اسے جاننے والے اس کو دور سے پہچان لیتے تھے۔

اس کے باقی جسم پر بھی ایسی کفن کے سے رنگ کے داغ اور دھاریاں تھیں۔ اسی لیے آخرکار اس کا امتیازی نام سفید وہیل
مشہور پایا اور وہ تھی بھی اسم بامسمّیٰ۔ جب وہ ٹھیک دوپہر کے وقت گہرے نیلے سمندر میں آہستہ آہستہ چلتی تو یہ منظر دیکھنے
کے قابل ہوتا۔ اس کے پیچھے دودھ جیسے سفید جھاگ کی ایک کہکشاں بنتی چلی جاتی جس میں سنہرے سنہرے تارے ناچ رہے
ہوتے۔

اگر لوگ اس کے نام سے بھی کانپتے تھے تو اس لیے نہیں کہ اس کی جسامت غیر معمولی تھی یا رنگ عجیب و غریب تھا یا
نچلا جبڑا بدوضع تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مستند روایتوں کے مطابق اس نے اپنے حملوں میں بار بار ایک بے نظیر ذہانت اور
خباثت کا مظاہرہ کیا تھا۔ سب چیزوں سے زیادہ ہولناک تو اس کی مکارانہ پسپائی تھی کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہو چکا تھا کہ پہلے
تو وہ خوف اور دہشت کی ہر علامت کے ساتھ اپنے فتحمند شکاریوں کے سامنے سے بھاگ کھڑی ہوئی لیکن پھر مڑتے مڑتے

اچانک وہیل اور حملہ کرکے بانوں کی کشتیوں کے پرخچے اڑا دیے یا انھیں واپس اپنے جہاز میں بھگا دیا۔

اس وہیل کے شکاریوں میں اس طرح کی کوئی واقعات ہو چکی تھیں۔ بہرحال جیسے اس قسم کے حادثات کی خبر ساحل پر مشہور ہو
ان کی وہ خبریں اسی گری کے پیشے میں اتنی غیر معمولی نہیں۔ تاہم ایسے موقعوں پر سفید وہیل کی سوچی سمجھی خونخواری کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ
یہی سمجھتے کہ وہیل کے ذریعے جو حادثات واقع ہو رہے ہیں ان کے پیچھے کوئی ذی عقل قوت کام کر رہی ہے۔

ذرا تصور تو کیجیے کہ جب اس وہیل کے جانباز شکاری چبائے ہوئے کشتی کے ٹکڑوں اور اپنے ساتھیوں کے کٹے
پھٹے اعضا کے درمیان تیرتے ہوئے مچھلی کے ہولناک غصے کے سفید جھاگوں میں سے ابھر کر سورج کی پرسکون اور اشتعال انگیز
روشنی میں آتے ہوں گے جو اس طرح مسکرا رہی ہو جیسے کسی کی پیدائش یا شادی کے موقع پر، تو ان کے غیظ و غضب اور
دیوانگی کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔

ایک کپتان ایسا تھا جس کی تینوں کشتیوں کے پرخچے اڑ چکے تھے، اور چپوئیں اور ملاح دونوں گرداب میں چکر
کھا رہے تھے۔ اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی میں رسی سے بندھا ہوا چاقو پکڑ لیا اور وہیل پر اس طرح جھپٹا جیسے بازار میں کوئی
آدمی اپنے دشمن پر جھپٹتا ہے۔ وہ اپنے جنون میں اندھا ہو کر چھ انچ لمبے پھل والا چاقو وہیل کے پیٹ میں گھسیڑ دینا
چاہتا تھا۔ اس کپتان کا نام اہاب تھا۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ موبی ڈک نے اپنا درانتی کی شکل کا نچلا جبڑا اچھالا اور اہاب
کی ٹانگ کتر لی گئی جیسے کسان اپنے کھیت میں گھاس کی پتی کاٹ لیتا ہے۔ کوئی ترکی کا غنڈہ بھی ایسے عناد اور خباثت کے ساتھ
اس پر وار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس میں تعجب کی کوئی بات ہے کہ اس ہلاکت خیز واقعے کے بعد سے اہاب کے دل میں اس وہیل
کے خلاف انتقام کا ایک وحشیانہ جذبہ جاگزیں ہو گیا۔ یہ جذبہ اس وجہ سے اور بھی خوفناک ہو گیا کہ اہاب نے اپنے مریضانہ
جنون میں آخر کار نہ صرف اپنے سارے جسمانی دکھ بلکہ ساری ذہنی اور روحانی پریشانیاں بھی اسی وہیل کے سر منڈھ دیں۔ اسے
مرقع میں اہاب کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان تمام خبیث اور پرفساد قوتوں نے سفید وہیل کا روپ دھار لیا ہے جو
بعض حساس آدمیوں کو اندر ہی اندر کھائے چلی جاتی ہیں اور انھیں ادھ موا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ وہ غیر مرئی خباثت جو ازل
سے موجود رہی ہے جس کا قبضہ آدمی کو کائنات پر عیسائی تقسیم کرتے ہیں، اور جس کی پوجا مشرق کی قدیم قومیں شیطان کے
مجسمے کی شکل میں کیا کرتی تھیں ـــــ اہاب ان لوگوں کی طرح اس خباثت کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوا بلکہ اپنی ہیجانی کیفیت
میں یہ تصور اس ملعون سفید وہیل کی طرف منتقل کر دیا، اور زخم خوردہ ہونے کے باوجود اس کے مقابلے پر ڈٹ کے کھڑا ہو گیا۔
وہ تمام چیزیں جو آدمی کو اذیت پہنچا کے دیوانہ بنا دیتی ہیں ـــــ جو زندگی کی تہ میں سے تلچھٹ تک نکال لاتی ہیں
ـــــ جن کی بدولت آدمی کی نسیں تڑخنے لگتی ہیں اور دماغ پک کر پھوڑا بن جاتا ہے ـــــ وہ ساری شیطانی صداقت جس
میں فساد چھپا ہوا ہو ـــــ زندگی اور فکر کی ساری پراسرار خباثت ـــــ غرض کائنات کی ساری بدی اس پاگل اہاب کے
لیے موبی ڈک کی شکل میں اس طرح مجسم ہو گئی تھی کہ وہ اس پر حملہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی ساری نسل نے حضرت آدم کے وقت سے
کے آج تک جتنی نفرت اور غصہ محسوس کیا تھا وہ اس نے وہیل کے سفید کوہان پر لاد دیا تھا۔ وہ اپنے غضبناک دل کے گولے اس

دل پر اس طرح چھوڑ رہا تھا جیسے اس کا دل ایک توپ ہو شاید یہ تو ممکن نہیں کہ اس کے اندر یہ مراق جمالی گزرتے گزرتے ہی فوراً پیدا ہو گیا ہو جب وہ چاقو لے کر وہیل کی طرف لپکا اس وقت تو وہ بس ایک شدید اور فوری جمالی دشمنی کا مظاہرہ کر رہا تھا، پھر جب اس کی ٹانگ کٹ گئی اس وقت بھی ایک شدید جسمانی کرب سے زیادہ اور کچھ محسوس نہ ہوا ہو گا لیکن جب اس تصادم نے اسے مجبوراً گھر لوٹنے پر مجبور کر دیا اور طویل مہینے جاڑوں میں ایک ویران اور سنسان سمندر میں سفر کرتے ہوئے جنوب میں اپنی اذیت سمیت بستر پر لیٹے رہنا پڑا تو اس وقت اس کا گھائل جسم اور زخمی روح ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے اور اسے پاگل بنا دیا، اہاب پر اس دیوانگی کا پورا قبضہ تو وہیل سے جھپٹ کے بعد گھر کی طرف چلتے وقت ہوا اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ سفر کے دوران میں وقتاً فوقتاً وہ ہذیان بکنے لگتا تھا حالانکہ اس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی لیکن اس کے سینے میں اب بھی اتنی قوت چھپی ہوئی تھی اکثر ہذیان کی وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس کے ساتھیوں نے مجبور ہو کر چلتے ہوئے جہاز میں ہی اسے بستر پر پیٹیوں سے جکڑ دیا یوں جکڑا ہوا وہ طوفانوں کے تھپیڑے سہتا رہا جب وہ گرم خطے میں آیا تو جہاز نے بادبان پھیلا دیا اور نہایت نرمی کے ساتھ چلنے لگا بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ بڈھے کا ہذیان وہیں طوفانی سمندروں میں رہ گیا ہے۔ اہاب اپنی اندھیری کوٹھری سے باہر ہوا اور روشنی میں نکل آیا۔ وہ زرد تو پڑ گیا تھا مگر چہرے سے وہی پرانا سکون اور استقلال ٹپکنے لگا اس نے پھر اطمینان کے ساتھ اپنے احکامات جاری کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھیوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ہولناک دیوانگی ختم ہوئی لیکن اس وقت بھی اہاب دل ہی دل میں ہذیان بکے چلا جا رہا تھا۔ انسانی دیوانگی اکثر بڑی چالاک ہوتی ہے اور بلیوں کی طرح مکاری سے کام لیتی ہے۔ آپ تو سمجھتے ہیں کہ یہ غائب ہو گئی لیکن در اصل وہ کوئی اور لطیف شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اہاب کا جنون کم نہیں ہوا گھٹ تو ضرور گیا لیکن ساتھ ساتھ گہرا بھی ہوتا چلا گیا ——— جیسے وادی میں جا کر دریائے ہڈسن کا پاٹ تنگ تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن پایاب نہیں ہوتا اہاب کی دیوانگی کا دریا بھی ذرا تنگ ہو کے بہہ رہا تھا لیکن اس کے جنون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہوا تھا پھر اس دیوانگی کے دھارے میں اس کی عظیم اور فطری ذہانت بھی پر ہو کر بہہ رہی۔ اس کی عقل پہلے تو بذات خود ایک قوت تھی لیکن اب اس کی حیثیت ایک آلہ کار کی بن گئی یہ استعارہ تو ضرور پیچیدہ ہے۔ بہرحال یوں سمجھئے کہ اس کی دیوانگی نے جذبہ دل کے اس کی عقل کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ عقل کی قوتوں سے خود کام لینے لگی چنانچہ اہاب کی قوت کا ضائع ہونا تو درکنار، اس ایک مقصد کے لیے اس کے اندر ایسی طاقت آ گئی جس کا ہزارواں حصہ بھی اس نے پہلے کبھی کسی معقول کام پر صرف نہ کیا ہو گا۔

اتنے سے بہت کچھ تو بن لیا، مگر اہاب کی وسیع تر عمیق تر تاریک تر شخصیت کا تو ابھی ذکر ہی نہیں آیا لیکن گہری باتوں کو عام فہم زبان میں ادا کرنا محال ہے اور حقیقت ہمیشہ گہری ہوتی ہے اے بلند اور خطرناک روحو، ہم اس وقت جس شاندار قلعہ میں کھڑے ہیں وہ بہت زبردست اور عجیب و غریب ہے لیکن اب اسے چھوڑو جواب اس کی گہرائیوں میں اتریں اور ان پراسرار دالانوں میں چلیں جہاں خارجی دنیا کی بے اصل میناروں سے بہت نیچے انسان کی حقیقی عظمت اس کی ہستی کا جوہر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے تخت پر متمکن ہے، یہ نادر شخصیت ہزاروں نوادرات کے نیچے دبی پڑی ہے، اور ٹوٹے ہوئے بتوں کے اوپر یہ جالوں سے پٹا ہوا تخت دے کر دیوتاؤں نے اس قیدی بادشاہ کا مذاق اڑایا ہے اور وہ نہایت صبر کے ساتھ اپنی

مجھ چیسی پر صدیوں کا بار اٹھائے بیٹھا ہے، اسے بلند اور خوفناک روح۔ اب وہاں ہو، آج بھی چھپا ہے اس خوفزدہ خوفناک بادشاہ سے پر ہو، اس کی صورت تمہاری شکل سے ملتی ہے۔ ہاں، اسے نوجوان جلاوطن بادشاہ ہو، قرابی کی اولاد ہو، اپنے اس ہیبت ناک دادا سے تمہیں، مونگکٹ معلوم ہوں گے۔

اچھا! اوابے نے اپنے دل میں اس حقیقت کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذرائع تو معقول ہیں لیکن میرا مقصد اور مدعا بالکل پاگل پن کا ہے۔ اس کے باوجود اس میں یہ طاقت نہ تھی کہ اس حقیقت کو ختم یا تبدیل یا نظرانداز کر سکے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ایک مدت سے انسانوں کے سامنے روپ بدل کے آتا ہوں، اور اب بھی ایک عمدہ شکل میں اپنی اصلی حیثیت ان کی نظروں سے چھپا رکھی ہے۔ مگر جس چیز کو اس نے چھپا رکھا تھا وہ اس کی قوت ارادی کے بس میں نہ تھی۔ البتہ وہ اسے محسوس کر سکتا تھا۔ بہرکیف اپنا راز چھپائے رکھنے میں وہ اتنا کامیاب رہا کہ آخر کار جب وہ واقعی رات کی [illegible] ساحل پر اترا تو اینگکٹ والوں نے یہی سمجھا کہ اس کے ساتھ اتنا خوفناک حادثہ پیش آیا ہے، اسے معلوم ہونا ہی چاہیے ہیں اور کوئی بات نہیں۔

سمندر میں اس کی ذہنی کیفیت کا حال سنا تو اس کو بھی بڑا عجیب سا لگا۔ جس دن سے کہ پنگ کوڑ میں اس سفر پر روانہ ہونے کے وقت تک جو مزید کچھ وقوع اس کی پیشانی پر پڑتا رہا اٹھائے بھی وہ ٹال دیا گیا۔ اوابے کو ان تاریک علاقوں کے باعث ایک اور سفر کے لیے نااہل سمجھا تو رکھا، حالانکہ اس ہیرو کے دور اندیش اور محتاط لوگوں کو خیال آیا ہو کہ ان وجوہات کی بنا پر کوئی شخص اپنے سفر کی پوری اہمیت رکھتا ہوگا، بلکہ ایسے سفر پر انحصار کرنے میں خوف ہوگا جو ویل کے شکاری کی طرح خطرناک اور وحشیانہ ہو۔ اگر کوئی ایسا آدمی جیسے کہ کوئی نٹ خیال اندر سے گھن کی طرح چاٹے چلا جا رہا ہو اور باہر سے مجلس کے رکھ رکھاؤ ہی جو وہ شخص ہو گا جو دنیا کے سب سے خوفناک جانور کے خلاف اپنا نیزہ اٹھا سکے یا مگر یہ تو کوئی وجہ سے محض طور پر اس کام کا اہل تصور نہ ہو، تو بھی اپنے ہاتھوں کو پیچ و خم کر وصول دلانے اور مجلے پر کھیلنے کے لیے نہایت کار آمد ثابت ہو گا یہ حال بھی ہو۔ آئی بات بھی ہے کہ اوابے کا عہدہ منصب کر رہا تھا بلکہ اس نے یہ راز اپنے دل کے اندر مقفل کر رکھا تھا۔ اوابے ارادتاً سفر پر اسی واحد مقصد سے روانہ ہوا تھا کہ سفید ویل کا شکار کھیلے۔ ساحل پر اس کے پرانے ملاقاتیوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ اس وقت اوابے کے دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔ ورنہ ان کی خوف زدہ اور صالح روحیں اس مخلوق سے اس کی جان فوراً چھین لیتیں۔ انھیں تو اپنے منافع سے غرض تھی ——— اس منافع سے جو اشرفیوں کی صورت میں گنا جاتا ہے۔ اوابے کو ایک جانبازانہ اور مافوق الفطرت انتقام کی دھن سوار تھی اور اس کے ارادے میں کسی قسم کی تحقیق و تفتیش داخل نہ تھی۔

غرض یہ سفید بالوں والا بے دین بڈھا گالیاں دیتا دنیا بھر میں ایک ویل کا پیچھا کرنے نکلا تھا۔ اس کے عملے میں بھی زیادہ تر لوگ خاندان برباد جلاوطن، روسے اور آدم خور تھے۔ پھر اپنے افسروں کے زیر اثر ان کی اخلاقی حالت بھی خراب ہو چکی تھی کیونکہ اسٹاربک میں اس کی نیکی اور پاکبازی ہی پاک بازی تھی، لہٰذا یہ خوبیاں بے فیض ہو کے رہ گئی تھیں۔ اسٹب کی بے اعتنائی اور کاہلی بے نام و نشان علاج تھا۔ وہ جب ہر وقت دل لگی بازی میں رہتا تھا۔ فلاسک تو وہ بالکل معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ تقریباً سبھی جہازی اور ایسے افسر خاص طور سے چھانٹ کے اہاب کے پاس بھیجے ہیں تاکہ انتقام کے جنون کی تکمیل میں اسے مدد دے سکیں۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ بھی اتنی سرگرمی سے بڈھے کے قصے میں شریک ہو گئے تھے ——— ان کی روح پر کس چیز نے جادو کر دیا تھا کہ بعض وقت اہاب کی نفرت انھیں اپنی نفرت معلوم ہوتی تھی ——— یہ سب کیسے ہوا ——— سفید وہیل ان کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتی تھی ——— یہ بھی ایک مبہم اور انجانے طریقے سے ان کے لاشعور کو زندگی کے سمندر میں تیرنے والا عظیم عفریت کس طرح معلوم ہونے لگی تھی ——— ان سب باتوں کی تشریح کے لیے ہمیں اتنی گہرائیوں میں جانا ہوگا کہ اسماعیل کی ہمت پڑتی نہیں۔ ہماری شخصیت کی تہ میں گویا ایک کان کھدتی رہتی ہے کہ اس کی چھینی اور ہر وقت چلتی رہنے والی آواز سن کر ہم کیسے بتا سکتے ہیں کہ اب یہ کھدائی کس سمت میں جاری ہے؟ وہیں کوئی طاقتور بازو کھینچے لیے چلا جاتا ہے اور ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چھوٹی سی کشتی کسی زبردست جہاز کے ساتھ بندھی ہوئی ہو تو وہ بھلا اپنی جگہ کیسے کھڑی رہ سکتی ہے؟ بہرحال اس وقت جہاز پر سپردگی کی ایسی فضا طاری ہوئی کہ میں نے بھی اپنے کو اسی رو میں بہہ جانے دیا۔ لیکن وہیل سے مقابلہ کرنے کی کشش رکھنے کے باوجود مجھے اس وہیل میں بدی اور ہلاکت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہیل کا سفید رنگ

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ اہاب کی نظر میں سفید وہیل کیا چیز تھی لیکن ابھی یہ بیان کرنا باقی ہے کہ میری نظروں میں وہ بعض اوقات کیا بن جاتی تھی۔ موبی ڈک کے سلسلے میں چند واضح چیزیں ہیں جو وقتاً فوقتاً آدمی کے دل میں خوف پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں ان کے علاوہ ایک خیال یا ایک مبہم اور بے نام خوف اور تھا جو بعض اوقات اپنی شدت کی وجہ سے ان سب پر بالکل غالب آ جاتا تھا۔ یہ چیز اتنی پراسرار اور ناقابلِ بیان تھی کہ میں اس کی تشریح کرنے سے معذور ہوں۔ جس چیز سے مجھ پر سب سے زیادہ ہیبت طاری ہوتی تھی وہ وہیل کا سفید رنگ تھا۔ بتائیے میں ایسی بات کی تشریح کس طرح کروں۔ مگر اس کو الٹا سیدھا ادا مجھے کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہ سارے باب بیکار جائیں گے۔

سفید رنگ بہت سی قدرتی چیزوں کا حسن اور نفاست بڑھا دیتا ہے جیسے خود اپنی کوئی صفت انھیں ادا کر دی ہو، مثلاً سنگ مرمر، جاپانی چھڑ اور موتی۔ مختلف قوموں نے اس رنگ کی شاہانہ افضلیت بھی تسلیم کی ہے۔ پیگو کے قدیم اور وحشی بادشاہوں نے بھی "سفید ہاتھیوں کا مالک" والے خطاب کو دوسرے تمام شاندار خطابوں سے بلند تر سمجھا ہے۔ آجکل سیام کے بادشاہوں نے اپنے شاہی جھنڈے پر بھی برف جیسا سفید چوپایہ بنا رکھا ہے۔ ہینوور کے جھنڈے پر ایک سفید گھوڑے کی تصویر ہے۔ آسٹریا کی عظیم سلطنت جو روم کی جانشین ہے، اس کا شاہی رنگ بھی یہی ہے۔ اس رنگ کی افضلیت کا اطلاق خود نسل انسانی پر بھی ہوتا ہے کیونکہ سفید فام لوگ ہر سیاہ فام قبیلے کے آقا ہیں۔ پھر سفید رنگ کو خوشی کی علامت بھی سمجھا گیا ہے۔ رومی لوگ سفید پتھر کو ایک پر مسرت دن کی نشانی خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی سفید رنگ بہت سی بلند اور اثر انگیز چیزوں کی نشاندہی کرتا ہے، مثلاً دلہن کی معصومیت، بڈھوں کی شفقت۔ امریکہ کے ریڈ انڈین لوگوں میں پوتھ کی سفید پیٹی دینا گویا ان کا پکا پن نجابت ہے۔ کئی ملکوں میں سفید رنگ منصفوں کی سفید ٹوپی کی شکل میں انصاف کے جاہ و جلال کو ظاہر کرتا ہے، اور دودھ جیسے سفید گھوڑوں کے ذریعے بادشاہوں اور ملکاؤں کی شان و شوکت میں اضافہ کرتا ہے۔ بلند ترین مذاہب کی رسومات میں اسے خدا کی طہارت اور قوت کی نشانی مانا گیا ہے۔ ایران کے آتش پرست آگ کی سے اٹھتے ہوئے سفید شعلے کو مقدس ترین چیز سمجھتے ہیں۔ یونانی دیو مالا میں زیوس ایک سفید بیل کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ایروکواس قبیلے کے لوگ بیچ جاڑے میں مقدس سفید کتے کی قربانی کرتے ہیں، یہ ان کے مذہب کا سب سے بڑا تہوار تھا۔ بہرحال یہ سب وفا کی اپنی وفاداری کا پیغام سمجھتے تھے وہ اس بے داغ اور وفادار جانور کو سب سے پاک قاصد سمجھتے تھے۔ عیسائی پادری اپنے خرقے کے نیچے جو لبادہ پہنتے ہیں وہ "البا" کہلاتا ہے، یہ نام ایک لاطینی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سفید۔ رومن کیتھولک فرقے کی رسومات میں یسوع مسیح کے صلیب پر چڑھنے کی داستان دہراتے وقت سفید رنگ خاص طور سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یوحنا کے مکاشفے میں نجات پانے والوں کو سفید کپڑے دیئے گئے ہیں۔ خداوند کا تخت بھی سفید ہے اور اس کے سامنے چوبیس بزرگ کھڑے ہیں ان کا لباس

بھی سفید ہے۔ عرض ہر شریں، مقدس اور قابلِ احترام چیز کے ساتھ سفید رنگ کا رشتہ قائم ہوتا چلا گیا ہے مگر اس کے باوجود سفید رنگ کے تصور کی گہرائیوں میں کوئی ایسی پُراسرار چیز چھپی ہوئی ہے کہ سرخ رنگ تو اس جانے خون میں ہی خوف کی لہر دوڑاتا ہے رنگی یہ ہماری روح کو لرزا کے رکھ دیتی ہے۔

یہ اسی پُراسرار صفت کا کرشمہ ہے کہ سفید رنگ کا تصور لطیف تر مناسبات سے الگ ہو کے اور کسی ایسی چیز کے ساتھ مل کر جو بذاتِ خود ہولناک ہو، اس خوف اور دہشت کو معراج پر پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً قطبین کے سفید ریچھ اور گرم ملکوں کی سفید شارک ہی کو لیجیے۔ یہاں کا چکنا چکار زردی کے مانند جیسا سفید رنگ ہی تو ہے کہ انھیں دیکھ کر ہمیں ایک اور ہی قسم کا خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ ان کی شکل میں جو گڑگا کر ناشدید پن ہے اس کے اندر بھی بھیانک سفیدی ہی تو ایک ایسی نفرت انگیز لطافت پیدا کرتی ہے جو ڈر اور اس سے زیادہ گھناؤنی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے خاندانی نشان ہو تو رنگے خونخوار درندوں والا حصہ بھی جانے جو سمجھے اس بری طرح پست نہیں کرتا جیسے یہ سفید کفن پہننے والا ریچھ یا شارک۔

ہاں، ذرا اس رعب دار البٹراس کو تو یاد کیجیے۔ ہمارے تخیل میں یہ سفید بھوت روحانی استعجاب اور خوف کے جن بادلوں میں تیرتا رہتا ہے وہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ طلسم سب سے پہلے کولرج نے اپنی نظم لکھ کر نہیں باندھا بلکہ کائنات کے عظیم شاعر یعنی فطرت نے جو کسی کی کوئی جھوٹی تعریف نہیں کرتی ہے۔

مغربی امریکہ کی تاریخ اور ریڈ انڈین لوگوں کی روایات میں سب سے مشہور چیز ہے گھاس کے میدانوں کا سفید گھوڑا۔ وہ دودھ جیسا سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹا سر، چٹان کے مانند سینہ، چال میں وہ وقار کہ ہزار بادشاہوں کو جلال میں کے

---

۱ جو لوگ اس موضوع پر اور گہری تحقیق کرنا چاہتے ہیں، شاید وہ قطب کے ریچھ کے سلسلے میں یہ کہیں گے کہ جو چیز اس جانور کو اس قدر بھیانک بناتی ہے وہ صرف دھیلا سفید رنگ نہیں ہے۔ اس چیز کا تجزیہ کرنے سے پتا چلے گا کہ یہ صورت اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اس جانور کی بے خوف درندگی اور خونخواری نے آسمانی معصومیت اور محبت کا لباس پہن رکھا ہے۔ لہٰذا سفید رنگ ذہن میں دو متضاد جذبے ایک ساتھ پیدا کرتا ہے، اور اس غیر فطری تضاد کے ذریعے ہمیں دہلا کے رکھ دیتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست سہی لیکن اگر سفید رنگ نہ ہوتا تو ہمارے دل میں اتنا شدید خوف پیدا نہ ہوا کرتا۔

۲ میں نے جو البٹراس پہلی بار دیکھی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ یہ واقعہ قطب جنوبی کے سمندر کے قریب ایک طوفان کے دوران میں پیش آیا تھا۔ فیصلے سے پہلے پہرے کے بعد میں بادلوں سے گھرے ہوئے عرشے پر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زینے کے جنگلے پر بے داغ سفید رنگ کی اور بڑی عجیب چونچ والی ایک شاندار چڑیا بیٹھی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنے فرشتوں جیسے پر سرے سے پھیلا دیتی گویا کسی مقدس چیز کو آغوش میں لینا چاہتی ہو۔ نہ معلوم کیوں اس کے سارے جسم پر ایک عجیب و غریب لرزہ طاری تھا جیسے تو بہرحال صحیح و سلامت تھی لیکن ایسے چیخ رہی تھی جیسے کسی بادشاہ کا بھوت انتہائی اذیت کے سبب چلا رہا ہو۔ اس کی حیرت انگیز اور ناقابلِ بیان آنکھوں میں جھانکا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے وہ راز دیکھ لیے ہیں جن کا سلسلہ خدا تک پہنچتا ہے۔ میں اس کے سامنے تعظیم کے لیے جھک گیا۔ یہ چڑیا اتنی سفید اور اس کے پر اتنے چوڑے تھے کہ اس دنیا سے الگ تھلگ سمندر میں قصوں اور روایتوں کی

ڈاکو کی گہری آنکھوں والے بچے کیوں نظر آنے لگتے ہیں؟

جو امریکی کبھی ملک سے باہر بھی نہ نکلا ہو اس کے تخیل پر لندن کے سفید مینار کا اثر آس پاس کی بلند عمارتوں کی بہ نسبت کیوں زیادہ ہو جاتا ہے بلکہ بند سپاہیوں اور بادشاہوں کی روایات تو اس سے ضرور وابستہ ہیں، مگر ان چیزوں سے اس اثر کی پوری توجیہ نہیں ہوتی، اور جنیا کی نیل پہاڑی کا خیال آئے تو ذہن میں خواب کی سی دھام دھام اور تر و تازہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خاص خاص حلقوں میں نیو ہیمپ شائر کے سفید پہاڑوں کا نام آتے ہی روح پر ایک پُراسرار ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ زرد سمندر کے نام سے طویل سہ پہر کی نکلی دھوپ اور اس کے بعد ہی رنگین لیکن خواب آور جھٹ پٹے کا تصور ہمیں لوری دینے لگتا ہے مگر سفید سمندر کے نام سے طول البلد یا عرض البلد کی قید کے بغیر عجیب طرح کی ایک سنسناہٹ ہوتی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے بیکار بات ہے؟ اچھا ایک بالکل غیر مادی مثال لیجئے جس کا تعلق صرف تخیل سے ہے۔ وسطی یورپ کی پرانی پریوں کی کہانیوں میں جنگلوں کے ایک لمبے زرد رو آدمی کا ذکر آتا ہے جو چپ چاپ چلتا رہتا ہے جو سرے پیڑوں کے جھنڈوں میں اس خاموشی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے کہ ذرا سی سرسراہٹ تک پیدا نہیں ہوتی۔ یہ بھوت ہمیں بلا کسی رنگ کے سامنے دھما چوکڑی مچانے والے بھوتوں سے زیادہ خوفناک کیوں معلوم ہوتا ہے؟

اگر خشک اور بے رنگ دھرتی کو دیکھا جائے تو لیما سب سے عجیب و غریب اور افسردہ شہر ہے تو صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہاں گرجاؤں کو منہدم کر دینے والے زلزلے آتے ہیں، یا وہاں کا وحشی سمندر لوگوں کو روز پریشان کرتا رہتا ہے، یا وہاں کے خشک آسمان سے پانی کا ایک قطرہ نہیں برستا، اور نہ اس وجہ سے کہ وہاں ایک پورا میدان ایسا پڑا ہے جس میں جگہ جگہ گھاس لگی ہوئی بنیادیں ہیں ٹیڑھے میڑھے محراب اور جنگلی بوٹیاں سی بیل اُگی نظر آتی ہیں جیسے بندرگاہ میں ایستادہ جہازوں کے مستول، اور اس کے مضافات میں مکانوں کی دیواریں لمبی لمبی قطاروں میں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح پڑی ہیں جیسے تاش کے گٹھے ہوئے پتے گر گئے۔ لیما عجیب و غریب شہر ہے تو اس وجہ سے کہ اس نے سفید نقاب اوڑھ لیا ہے، اور اس کے غم کی سفیدی میں کہیں زیادہ ہیبت بسی ہوئی ہے۔ یہ سفید رنگ پیزارو کے زمانے سے چلا آرہا ہے، اور شہر کے کھنڈروں کو ہمیشہ نیا بنائے رکھتا ہے اور مکمل شکستگی کے بعد جو ہریالی پھیل جاتی ہے اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے پشتوں پر مرگی کے دورے کی سی سختی اور زردی پھیلا رکھی ہے جس نے ہر چیز کو ایک عجیب طرح مسخ کر دیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ عام لوگوں کی نگاہ میں یہ بات ذرا مشکل سے آئے گی کہ سفید رنگ خوفناک چیزوں کو اور بھی زیادہ خوفناک بنا دیتا ہے جو لوگ تخیل سے عاری ہیں انہیں ان صورتوں میں کوئی ہیبت کی چیز نظر نہ آئے گی، حالانکہ بعض دوسرے ذہنوں کو بھی یہ چیزیں صرف ایک سفید رنگ کی وجہ سے ہولناک معلوم ہوں گی خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب ان میں کامل خاموشی یا کائنات جھلکتی ہو۔ میرے ان دو بیانات کا جو مطلب ہے وہ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

پہلی مثال ——— جہازران جب اجنبی ملکوں کے ساحل کے قریب پہنچتا ہے اور رات کو لہروں کا شور سنائی دیتا ہے تو وہ چوکنا ہو جاتا ہے اور اسے بس اتنی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ اس کی ساری صلاحیتیں بیدار ہو جائیں لیکن اگر ٹھیک ایسی حالت

ہیں اسے سوتے سے جگا کر یہ منظر دکھایا جائے کہ آدھی رات کو اس کا جہاز وہ جیسے سفید سمندر میں چل رہا ہے گویا اردگرد کے ساحل سے سفید ریچھوں کے غول کے غول اس کے چاروں طرف تیر رہے ہیں تو وہ ایک خاموش اور توہم پرستانہ خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ سفید پانی کا کفن پوش بھوت اس کے لیے حقیقی بھوت کی طرح خوفناک ہو جاتا ہے جہاز کا پیمانہ اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ ابھی چٹانوں سے دور ہے لیکن بے سود۔ اس کا دل ڈوب جاتا ہے اور اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ پھر نیلا پانی نہ آجائے لیکن وہ جہازراں کدھر ہے جو آپ کے سامنے اعتراف کرے کہ مجھے چھپی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا جانے کا خوف نہیں تھا بلکہ اس ہولناک سفیدی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

دوسری مثال ——— پیرو کے مقامی پیدائشی باشندوں کو اینڈیز کی برف پوش پہاڑیوں کے مستقل نظارے میں خوف کی کوئی بات نہیں ملتی البتہ یہ سوچ کر شاید انھیں کچھ ڈر لگتا ہوگا کہ اتنی زبردست اونچائی پر ان ازلی و ابدی برف کے تودوں پر کیسی ویرانی چھائی رہتی ہے اور اگر ان غیر انسانی تنہائیوں میں کوئی آدمی کھو جائے تو اسے کتنا ہولناک لگتا ہوگا۔ یہی حال امریکہ کے مغربی علاقے کے جنگلوں میں رہنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ نہایت بے اعتنائی کے ساتھ روز یہ منظر دیکھتے ہیں کہ ایک گھاس کا میدان پھیلا پڑا ہے جس کا اور نہ چھور، اس میں برف کی چادریں اڑتی پھر رہی ہیں، اور سفید رنگ کی خواب آلود کیفیت کو توڑنے کے لیے کسی درخت یا ٹہنی کا سایہ تک نہیں۔ لیکن قطب جنوبی کے سمندروں کا منظر دیکھنے والے جہازی کا حال مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات برف اور ہوا کی قوتیں بازی گری کا ایک عجیب کمال دکھاتی ہیں۔ اس کا جہاز قریب قریب ٹوٹ چکا ہے اور وہ سردی کے مارے کانپ رہا ہے۔ اس عالم میں اسے قوس قزح نظر نہیں آتی جو کچھ ڈھارس بندھائے اور امید دلائے۔ اس کے بجائے ایک لامتناہی قبرستان کا سماں دکھائی دیتا ہے جس میں شکستہ صلیبیں اور پتھر کے بچے کھچے ستون کھڑے ہوں۔

لیکن آپ کہیں گے ——— سفید رنگ کے بارے میں یہ سب رنگ باب تو ایک سفید جھنڈی ہے جو بزدل روح نے لہرا رکھی ہے۔ اسماعیل تم تو بڑی سوداویت کا شکار ہو گئے۔

اچھا ایک بات بتائیے۔ یہ ایک تندرست بچھیرا ہے جو درندوں سے بہت دور ورمونٹ کی کسی پرسکون وادی میں پیدا ہوا ہے۔ کسی دن جب سورج خوب چمک رہا ہو اور اس کے پیچھے بھینس کی کھال کا بنا ہوا کوٹ اس طرح ہلایا جائے کہ وہ دیکھ نہ سکے بس اس کی جنگلی جانوروں والی بو سونگھے ——— پھر اچھل کیوں پڑا اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ پھنکارنے کیوں لگا۔ خوف سے بے اختیار ہو کر زمین پر ٹاپیں کیوں مارنے لگا۔ اسے اپنے سرسبز وطن کا کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں کہ جب کسی جنگلی جانور نے اسے زخمی کیا ہو چنانچہ کھال کی وہ بو سونگھ کر اسے سابقہ خطرات کا تجربہ تو یاد نہیں آسکتا پھر نیو انگلینڈ کے اس بچھیرے کو دور دراز اوریگن کے سیاہ بھینسوں کی کیا خبر!

نہیں لیکن یہاں آپ دیکھیں گے کہ بے زبان جانور میں بھی اس شیطنت کا جبلی علم موجود ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہ اوریگن سے ہزاروں میل دور سہی لیکن وہ جنگلی بو سونگھتے ہی بھینسوں کے خونخوار جھنڈ اس کی نظروں کے سامنے بالکل اس طرح آجاتے ہیں جیسے گھاس کے میدانوں کی اس ہولناک جنگلی گھوڑے کی نظروں کے سامنے جیسے پیروں تلے روندتے

ہوں۔

چنانچہ وہ ویرانہ، سمندر، کہا کا خشک پہاڑوں پر دھند کے بچھوں کی سرسراہٹ، گھاس کے میدانوں میں اڑتے ہوئے برف کے غلغلے ——— یہ ساری چیزیں اسمٰعیل کے لیے وہی حکم رکھتی ہیں جو خوف زدہ بچھڑے کے لیے بھیڑیے کی کھال، اوپر جو اسرار چھایا ہوا جن بے نام چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ کہاں ہیں، اس کا تو مجھے علم ہے نہ بچھڑے کو۔ لیکن ہم دونوں کو یقین ہے کہ یہ دونوں چیزیں کہیں نہ کہیں ہیں ضرور۔ موجود دنیا میں نظر آتی ہے روحانی حیلوں سے کچھ اس طرح لگتی ہے جیسے اس کی تشکیل دہشت کے ذریعے ہوتی ہو۔ مگر جو دنیا نظر نہیں آتی اس کی تشکیل خوف کے ذریعے ہوئی ہے۔

لیکن ابھی تک ہمیں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ملا کہ سفید رنگ اتنا تحیر انگیز کیوں ہے، یہ روح کو اتنی شدت سے کیوں متاثر کرتا ہے اور سب سے زیادہ عجیب اور زبردست چیز یہ کہ سفید رنگ ایک طرف تو روحانی حقیقتوں کی سب سے معنی خیز علامت بلکہ عیسوی خدا کا پردہ ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ حال کہ جو چیزیں انسان کے لیے سب سے زیادہ ہولناک ہیں ان کی ہیبت اور بڑھا کے دیتا ہے۔

کہیں یہ بات تو نہیں کہ سفید رنگ اپنے ابہام کے ذریعے کائنات کی بے رحم خلاؤں اور وسعتوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دیتا ہے اور جب ہم کہکشاں کی سفید گہرائیوں کے نظارے میں کھو جاتے ہیں تو پیچھے سے فنا کا خیال ایک خنجر کی طرح چلتا اور ہراساں کرتا ہے؟

یا پھر یہ بات ہے کہ سفید رنگ درحقیقت ایک رنگ نہیں بلکہ رنگ کی غیر موجودگی کا دوسرا نام ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سارے رنگوں کا مجموعہ بھی ہے۔ لہٰذا ہمیں برف کے وسیع میدان میں ایک گونگی لیکن معنی خیز خلا نظر آتی ہے ——— لامذہبیت کی ہمہ رنگ بے رنگی جس سے ہم آنکھ چراتے ہیں۔ اور جب ہم سائنس دانوں کے اس نظریے پر غور کرتے ہیں کہ زمین کے سارے رنگ خواہ وہ جاہ و جلال کے مظہر ہوں یا حسن کے ——— جنگلوں اور غروب آفتاب کے وقت آسمانوں کے حسین رنگ، تیتریوں کے مخملی اور سنہرے پر، دوشیزاؤں کے گلابی رخسار ——— یہ سب رنگ محض فریب ہیں، چیزوں کے اندر موجود نہیں بلکہ باہر سے لگائے گئے ہیں، یعنی فطرت کسی دیوی طوائف کی طرح اپنا چہرہ رنگتی ہے، اس کے سارے سنگھار میں ایک پردہ ہے جس نے ایک کال کوٹھری کو ڈھک رکھا ہے، اور جب ہم آگے بڑھ کر سوچتے ہیں کہ فطرت کے تمام رنگ جس پراسرار مصالحے سے بنتے ہیں یعنی روشنی کا اصول، وہ بذات خود بے رنگ یا سفید ہے۔ اگر روشنی کسی واسطے کے بغیر مادے پر عمل کرے تو ہر چیز کو یہاں تک کہ گل و لالہ کو بھی اپنے خالی رنگ میں رنگ دے ——— جب ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں فالج زدہ کائنات ایک کوڑھی کی لاش معلوم ہوتی ہے جس طرح لیپ لینڈ میں بعض ضدی سیاح رنگ دار چشمہ لگانے سے انکار کر دیتے ہیں، اسی طرح کم بخت بے دین آدمی اس سفید کفن کو دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے جس نے ساری کائنات کو لپیٹ رکھا ہے۔ سفید وہیل ان ساری چیزوں کی علامت تھی پھر بھی آپ کو تعجب ہے کہ ہم نے اس کے شکار میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

باب ۔ ۴۴

نقشہ

جس رات اہاب نے طیش بھرے جہازیوں سے عہد لیا تھا اس رات طوفان آیا۔ اگر آپ طوفان کے بعد کپتان کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے میں جاتے تو آپ دیکھتے کہ اس نے ایک الماری میں سے سمندروں کے گول گول لپٹے ہوئے شکن آلود اور زرد نقشے نکالے اور فرش میں جڑی ہوئی میز پر اپنے سامنے پھیلا دیئے۔ پھر وہ بیٹھ کر نقشوں کی لکیروں کو غور سے مطالعہ کرنے لگا جو خالی حصے تھے ان پر وہ آہستہ آہستہ مگر بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ پنسل سے نئی لکیریں بناتا جاتا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ جہازوں کے پرانے روزنامچے اٹھا کر دیکھنے لگتا جن میں یہ بات درج تھی کہ مختلف جہازوں کے مختلف سفروں میں وہیل مچھلیاں کس وقت اور کس جگہ پکڑی یا دیکھی گئیں۔

اس دوران میں اس کے سر پر لٹکا ہوا لیمپ جہاز کی جنبش کے ساتھ برابر ہل رہا تھا اور اس کی شکن آلود پیشانی پر شکنوں کے داغ اور لکیریں بنا رہا تھا بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شکن آلود نقشوں پر لکیریں اور راستوں کے نشان بنا رہا ہے کوئی نظر نہ آنے والی پنسل خود اس کی پیشانی کے گہرے نقشے پر لکیریں لگا رہی ہے۔

لیکن یہ کوئی اسی رات کی خصوصیت نہ تھی کہ اہاب اپنے کمرے کی تنہائی میں نقشے لے کر بیٹھا ہو۔ یہ نقشے تو روز رات کو نکالے جاتے، روز رات کو پنسل کے کچھ نشان مٹائے جاتے اور ان کے بجائے کچھ نئے نشان بنائے جاتے۔ کیونکہ اہاب چاروں سمندروں کے نقشے سامنے رکھ کر گرداب اور پانی کی دھاروں کی بھول بھلیاں کا مطالعہ کر رہا تھا تاکہ اسے جس بات کی دھن سوار تھی وہ مکمل ہو سکے۔

جو لوگ وہیل کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں انہیں یہ بات بالکل مہمل معلوم ہو گی کہ ایک اکیلی مچھلی کی تلاش میں زمین کے سارے سمندر چھانے جائیں، لیکن اہاب کی رائے مختلف تھی وہ سمندر کی دھاروں اور مد و جزر کے انداز سے پوری طرح واقف تھا چنانچہ وہ حساب لگا لیتا تھا کہ وہیل مچھلی کی غذا بہتی ہوئی کہاں پہنچی ہو گی۔ پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ فلاں فلاں علاقے میں اس کا شکار فلاں فلاں موسم میں ہوتا ہے۔ اس طرح وہ پکے ثبوت یقین کے ساتھ یہ اندازہ لگا لیتا تھا کہ اپنے شکار کی تلاش میں فلاں علاقے میں پہنچنے کا بہترین دن کون سا ہو گا۔

وہیل مچھلی ہر علاقے میں ایک خاص وقت پر پہنچتی ہے یہ بات اتنی یقینی ہے کہ بعض شکاریوں کی رائے میں تو اگر اس کا مشاہدہ اور مطالعہ ساری دنیا میں غور کے ساتھ کیا جائے، اور پورے شکاری بیڑے کے ایک سفر کے روزنامچے آپس میں ملائے جائیں تو پتا چلے گا کہ وہیل مچھلیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹھیک مقررہ وقت پر جاتی ہیں جیسے ابابیلیں یا ہیرنگ مچھلیاں۔ اسی اشارے کی بنیاد پر ایسی کئی کوششیں ہو چکی ہیں کہ وہیل مچھلی کے کوچ اور سفر کا تفصیلی نقشہ بنایا جائے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور ہے، جب وہیل مچھلیاں ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف جاتی ہیں تو کسی بے خطا جبلت یا خدا کی پوشیدہ ہدایت کے ذریعے عام طور سے ایک مقررہ راستے پر چلتی ہیں جسے رگ کہا جاتا ہے۔ وہ اس لکیر سے

جو اسے بدحواسی کے عالم میں بستر پر سے کھینچ لائی تھی۔ یہ قوت تو ایک ازلی اور زندہ اصول یعنی اس کی روح تھی جو جاگتے میں اور اب
کام ہوا سے ایک خارجی ذریعہ یا آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتا تھا لیکن جس وقت یہ روح اس سے الگ ہو کے بے ساختہ یہ کوشش کر رہی
تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ رابطہ ٹوٹ گیا ہے تو اس قوت کو جس نے اس پر ایک وحشت ناک حیرت سے ڈر رہی ہے لیکن چونکہ دماغ روح کے
علاوہ منسلک ہوئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اب اس کے سامنے یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس نے اپنے تمام خیالات اور تصورات
ایک عظیم مقصد کے حوالے کر دیئے۔ پھر یہ مقصد خود ہی سنگین قوت ارادی کے بل پر دیوتاؤں اور شیطانوں سب کے مقابلے پر اٹھ
کھڑا ہوا۔ اور ایک بے حد خونخوار جو وہیں بیٹھا نہیں بلکہ جیتے جیتے لگا مگر اس کے ساتھ جو عام انسانوں جیسی قوت شامل تھی، وہ اس
بن جائے اور اپنے آپ پیدا ہو جانے والے بچے سے ڈر کر جاگ کھڑی ہوتی چنانچہ جب وہ اب تو چپڑا اپنے کمرے سے نکلتی تو
اس کی بھیانک آنکھوں میں سے جو اذیت ناک روح باہر جھانکتی وہ فی الحال محض ایک خالی برتن کی طرح ہوتی ——— یہ گئے
میں چلنے والا بے ہیئت وجود۔ زندہ روشنی کی ایک کرن لیکن ہر ایسی چیز سے محروم جسے وہ منور کر سکے۔ اور اسی لیے بذات خود ایک
خلا ہے۔ خدا تیرے اوپر رحم کرے۔ تیرے خیالات نے خود تیرے اندر ایک نئی مخلوق بنا کے کھڑی کر دی ہے جس شخص کا شیوہ
فکر ہے یوں پرومی تھیس بنا کے رکھ دے۔ اس کے دل پر ایک گدھ ہمیشہ ہمیشہ ٹھونگیں مارتا رہتا ہے ——— اور گدھ
بھی ایسا جو خود اسی نے تخلیق کیا ہو۔

حلفی بیان

اگر اس کتاب میں کوئی گمانی بیان کی گئی ہے تو اس کے سلسلے میں اور بلاواسطہ طور پر زخمی ریچھوں کی دو ایک انتہائی دلچسپ اور عجیب و غریب عادتوں کے ضمن میں پچھلے باب کا ابتدائی حصہ اتنا ہی اہم ہے جتنا اس کتاب کا کوئی اور باب بلکہ اس میں جو خاص بات کہی گئی ہے اس کا بیان تفصیل کے ساتھ اور عام فہم انداز میں ہونا چاہیے تاکہ آپ اسے اچھی طرح سمجھ سکیں اور اس پورے موضوع سے لاعلمی کی بنا پر بعض لوگوں کے ذہن میں جو میرے بیانات کی صداقت پر جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ بھی دور ہو جائے۔

میں یہ کام کسی ترتیب کے ساتھ نہیں کروں گا بلکہ ریچھ کے شکاری کی حیثیت سے جو باتیں مجھے حوالہ اور وثوق کے ساتھ معلوم ہیں ان میں سے الگ الگ کر کے ایک مختصر تذکرہ پیش کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جس نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں وہ ان مثالوں سے بخوبی برآمد ہو جائے گا۔

پہلی بات ——— مجھے ذاتی طور پر تین ایسے واقعات معلوم ہیں کہ ریچھ پر چیا کھا کے صاف بھاگ نکلا پھر کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ تو تین سال کے بعد، دوبارہ وہ اسی شخص کے ہاتھوں زخمی ہوا اور مار دیا گیا اور اس کے پیٹ سے دونوں بار پچھلے برآمد ہوئے جن پر اس آدمی کا نشان بنا ہوا تھا جب میں نے بتایا ایک دفعہ تو وہ پچھلے تین سال کے وقفے سے پیچھے گئے تھے بلکہ شاید اور زیادہ وقت گزر گیا ہو۔ ایک چھاتو جس شخص نے ریچھ پر چھرے چلائے تھے وہ اس عرصے میں اتفاق سے ایک تجارتی جہاز میں ملازم ہو کے افریقہ گیا اور سال بھر وہاں رہنے کے بعد ایک بیاباتوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ اس نے اندرونِ ملک میں بہت دور دور کی خاک چھانی اور دو سال تک سانپوں، شیروں، وحشیوں، زہریلی جھاڑیوں اور اس قسم کی اور بھی سرزمین کے دوسرے خطرات کے درمیان سفر کرتا رہا۔ اس نے جس ریچھ کے پیچھے وار کیا تھا وہ بھی اس عرصے میں سفر کرتی رہی ہوگی۔ بلکہ اس نے تو تین دفعہ دنیا کے گرد چکر لگا لیا ہوگا۔ اور اپنے پچھلوں سے افریقہ کے تمام ساحلوں کو گرد گرد بھی ہو گئی ہے سو، وہ شخص اور ریچھ کا پھر آمنا سامنا ہوا، اور ایک نے دوسرے کو گرا دیا۔ ان تینوں کو ریچھ کی ملاقات میں اسی قسم کی تین مثالوں سے واقف ہوں۔ دو دفعہ تو میں نے ریچھ پر وار ہوتے بھی دیکھا ہے، اور دوسرے مہینے کے بعد مری ہوئی مچھلی کے پیٹ سے دونوں نشان لگے ہوئے پچھلے برآمد ہوتے ہوئے بھی دیکھے ہیں۔ تیسری دفعہ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ میں بھی وہ دوسری دونوں مرتبہ اسی کشتی میں تھا اور جگہ بھی وہی، ریچھ کی گھنگ کے پیچھے وہ بڑا سا مسا میں نے صاف پہچان لیا جو تین سال پہلے دیکھا تھا۔ میں نے تین سال کے عرصے کو اگر مجھے پورا یقین ہے کہ اس سے کہیں زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ میں دونوں واقعات کی میں خود تصدیق کر سکتا ہوں، لیکن جو میں نے اس قسم کے بہت سے واقعات ایسے لوگوں سے سنے ہیں جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

دوسری بات ——— چاہے حلفی بیان دینے والے اس سے واقف نہ ہوں لیکن زخمی ریچھ کے شکاریوں میں تو یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ ایسی بہت سی زندہ اور کارآمد مثالیں موجود ہیں کہ اگر کسی خاص ریچھ کو دور دور تک اور ایک زمانے تک عام طور سے پہچانا جاتا ہے۔

آخر وہ جو بہت ہی منطقی اور واضح نظر رکھتی ہیں، اور نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ایسے حادثات کس کثرت سے پیش آتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہیل کے شکار میں جو حادثات اور جو واقعات ہوتے ہیں وہ اس طرح ضبط تحریر میں نہیں آتے کہ ان کی خبر دنیا کے لوگوں تک پہنچ سکے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ایسی چیزیں پڑھ کر لوگ فوراً ہی بھول جاتے ہیں مگر یہاں تو سرے سے ان باتوں کا کہیں اندراج ہوتا ہی نہیں۔ دیکھیے، اس وقت ہو سکتا ہے کہ ساحل سے دور کہیں کوئی بیچارا آدمی رسی میں الجھ گیا ہے، اور وہیل اسے سمندر کی تہ میں گھسیٹے لیے جا رہی ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کل صبح ناشتے کے وقت جو اخبار پڑھیں گے اس میں اس بیچارے کے گھسٹنے کی خبر ہوگی؟ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ یہاں سے ڈاک باقاعدہ نہیں آتی بلکہ آپ نے کبھی کوئی ایسی چیز سنی ہے جسے واقعی خبر کہا جا سکے۔ بہرحال آپ مجھ سے لیجیے۔ ایک دفعہ بحرالکاہل کے سفر میں ہماری ملاقات کوئی تیس مختلف جہازوں سے ہوئی ہر جہاز میں ایک نہ ایک آدمی وہیل کے ہاتھوں ضرور ہلاک ہو چکا تھا بلکہ بعض جہازوں میں تو ایک سے بھی زیادہ۔ اور تین جہازوں میں ایک پوری کشتی کے آدمی غرق ہو گئے۔ خدا کے لیے اپنے چراغ اور موم بتیاں ذرا کفایت شعاری کے ساتھ جلائیے! آپ جتنا تیل جلاتے ہیں اس کے ہر گیلن کے لیے انسانی خون کا کم سے کم ایک قطرہ ضرور بہا ہوگا۔

دوسری بات ——— خشکی والوں کے ذہن میں بس یہ مبہم سا تصور ہے کہ وہیل ایک عظیم الجثہ مخلوق اور عظیم قوت کی مالک ہوتی ہے۔ مگر میں نے جب کبھی اس دوہری عظمت کی کوئی مثال سنائی تو ان لوگوں نے یہ شبہ کیا کہ گویا میں کوئی بڑا دل لگی باز ہوں۔ میں قطعاً حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے دل لگی بازی کا ایسے موقعوں پر خیال تک نہیں آتا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں یہاں جو خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ وہ بغیر شہادت کے بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بات یہ ہے ——— کہ عنبر وہیل بعض اوقات ایسی طاقت ور، ہوشیار اور کینہ توز ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے جہاز کو ٹکر مار کر توڑ سکتی ہے۔ بالکل تہس نہس کر سکتی ہے گویا پہلے سے پورا منصوبہ تیار کر لیا ہو پھر اس سے بھی بڑی چیز یہ ہے کہ عنبر وہیل ایسی حرکتیں کر بھی چکی ہے۔

پہلی مثال ——— ۱۸۲۰ء میں نین ٹکٹ کا جہاز ایسیکس کپتان پولارڈ کے زیر کمان بحرالکاہل میں سفر کر رہا تھا۔ ایک دن جہاز والوں کو فوارے چھوٹتے نظر آئے انھوں نے کشتیاں فوراً سمندر میں ڈالیں اور عنبر وہیلوں کے غول کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں کئی وہیلیں زخمی ہو گئیں۔ اتنے میں یکایک ایک بہت بڑی وہیل کشتیوں کے نرغے سے نکل اور غول سے الگ ہو کے سیدھی جہاز کی طرف چلی۔ اس نے جہاز کو نہایت ہوشیاری سے ایسی ٹکر ماری کہ وہ دس منٹ کے اندر الٹ گیا۔ اس جہاز کا ایک تختہ بھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ بچے کھچے جہازی بہت خرابی اٹھا کر کشتیوں میں خشکی پر پہنچے۔ گھر واپس آنے کے بعد کپتان پولارڈ ایک دفعہ پھر کوئی اور جہاز لے کر بحرالکاہل میں گیا۔ لیکن دیوتاؤں نے اس کا جہاز کسی انجانی سمندری چٹان سے ٹکرا دیا۔ اب کے اس نے ہمیشہ کے لیے سفر سے توبہ کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن اسے پھر سمندر میں جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کپتان پولارڈ آج کل نین ٹکٹ میں رہتا ہے۔ میں اوون چیس کو دیکھ چکا ہوں جو اس حادثہ کے وقت ایسیکس جہاز کا چیف میٹ تھا۔ میں نے اس کی سیدھی سادی اور سچی داستان بھی پڑھی ہے۔ اس کے بیٹے سے باتیں بھی کی ہیں اور اس مقام سے چند میل کے فاصلے پر جہاں یہ المناک واقعہ پیش آیا تھا۔

دوسری مثال ——— ینی گنگ کا ایک اور جہاز یونی آؤرڈ کے قریب اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوا تھا لیکن اس حادثے کے مستند حالات مجھے کہیں دستیاب نہ ہو سکے البتہ وہیل کے شکاریوں سے کبھی کبھی اس کا ذکر سنا ہے۔

تیسری مثال ——— کوئی اٹھاون برس کا ذکر ہے کہ کوورز ——— جو اس زمانے میں ایک امریکی جنگی جہاز کا افسر اعلیٰ تھا۔ ایک دن جہاز سینٹ ڈومنگو کی بندرگاہ اوا آمو میں شکاری جہازوں کے چند کپتانوں کے ساتھ ینی گنگ کے ایک جہاز میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اتنے میں وہیل کا ذکر چھڑ گیا۔ پیشہ ور شکاری بتانے لگے کہ وہیل میں بڑی حیرت انگیز قوت ہوتی ہے۔ کوورز کو اس بات میں شک تھا۔ چنانچہ اس نے دعویٰ کیا کہ جیسے جنگی جہازوں پر اگر وہیل حملہ کرے تو اس میں چھوٹی کشتی کی برابر بھی چھید نہ ہو۔ پھر وہاں کھانے کے بعد چند ہفتے بعد کوورز اپنے اس جنگی جہاز میں بیٹھ کر جزیرہ کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں اسے ایک زبردست وہیل نے آلیا اور چند لمحے کے لیے جھگڑے میں کچھ بات کرنی چاہی۔ وہ تکلیف کی بات یہی کہ وہیل نے جہاز کے پیندے پر ایسی ضرب لگائی کہ کپتان کو پانی نکالنے کے لیے سارے پمپ چلانے پڑے اور بہت قریب زمین بندرگاہ میں جا کر جہاز کی مرمت کرانی پڑی۔ تو ہم یہ بات تو نہیں جانتے لیکن یہ حال ہے کہ وہیل سے کوورز کی ملاقات میں جا بے انداز تھی۔ لاگس کا سوال بھی تو اس قسم کے واقعے سے خوف زدہ ہو کر ایمان لایا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ وہیل کی طرح کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتی۔

اب میں ایک چھوٹے سے واقعے کی خاطر جو مصنف کے لیے نہایت دلچسپ ہے پڑھنے والوں کی توجہ لانگس ڈورف کے سفر نامہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ چلتے چلاتے یہ بھی بتا دوں کہ اس صدی کے اوائل میں لانگس ڈورف روسی امیر البحر کروزنسٹرن کی مشہور و معروف جہازرانی مہم کے ساتھ منسلک تھا جو سیاحی کے لیے نکلی تھی۔ کپتان لانگس ڈورف اپنا سترھواں باب یوں شروع کرتا ہے

"مئی تک ہمارا جہاز چلنے کے لیے تیار ہو گیا اور اگلے دن ہم کھلے سمندر میں پہنچ گئے۔ ہمارا رخ اوکوٹسک کی طرف تھا۔ موسم نہایت صاف اور نفیس تھا لیکن سردی اتنی سخت کہ ہمیں اپنے پشم سے بنے ہوئے کپڑے پہننے پڑے تھے۔ دو چار دن تک تو ہوا کا کام ہنسانہ تک رفتار اسی میں کے بعد جہاز کے شمال مغرب کی طرف سے تیز ہوا چلنی شروع ہوئی۔ ایک غیر معمولی طور پر لمبی چوڑی وہیل جو جہاز سے بھی زیادہ تھی پانی کی سطح کے برابر پر ہی تھی لیکن کسی کی نظر بھی نہ پڑی۔ یہاں تک کہ ہمارا جہاز جو نہایت تیزی سے اڑا چلا جا رہا تھا، بالکل اس کے اوپر آ پہنچا۔ چنانچہ ہم جہاز اور وہیل کی ٹکر سے نہ روک سکے۔ اس وقت ہم سخت خطرے میں پھنس گئے تھے کیونکہ اس وہیل نے اپنی کمر جہاز کے نیچے لگا کے اسے پانی سے کوئی تین فٹ اوپر اٹھا دیا۔ مستول لٹکنے لگے اور بادبان تو بالکل گر ہی پڑے۔ ہم لوگ نیچے تھے فوراً لپک کے عرشے پر پہنچے۔ ہم سمجھے کہ جہاز کسی چٹان سے ٹکرا گیا لیکن اس کے بجائے دیکھا کہ وہیل نہایت سنجیدگی اور تمکنت کے ساتھ تیرتی چلی جا رہی ہے۔ کپتان ڈوولف نے فوراً جہاز کا معائنہ کیا کہ دھکے سے جہاز کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ جہاز بالکل صحیح سلامت رہا۔"

یہاں جو کپتان ڈوولف کا ذکر آیا ہے وہ اس جہاز کے افسر اعلیٰ تھے۔ یہ نیو انگلینڈ کے رہنے والے ہیں اور بحری کپتان کی حیثیت سے ایک زبردست معرکہ آرائی کی زندگی بسر کرنے کے بعد آج کل بوسٹن کے قریب ڈورچیسٹر کے گاؤں میں مقیم ہیں۔ مجھے

ان کا جا بجا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈگلس وُڈورف کے اس بیان کے متعلق میں نے خاص طور پر ان سے جرح کی ہے۔ وہ ایک
ایک واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ البتہ جہاز اتنا بڑا نہ تھا، وہ تو سائبیریا کے ساحل پر بنا ہوا ایک معمولی روسی جہاز تھا جسے وہیل
نے اپنا جبڑا مار کر تباہ کر دیا تھا۔

لارڈ بل وِتّی کا سفرنامہ پرانے طرز کی اردو میں سیدھی سادی کتاب ہے۔ لیکن اس میں مردانگی کے بڑے زبردست
واقعات اور نہایت سچے تجربات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مجھے ایک ایسی چیز ملی جو ڈگلس وُڈورف کے بیان سے ملتی
جلتی ہے۔ چنانچہ میں اسے اپنی بات کی تصدیق کے لیے ایک اور مثال کے طور پر پیش کیے دیتا ہوں، حالانکہ اس کی کچھ ایسی ضرورت
تو ہے نہیں۔

لارڈ بل جو آن فورڈ لینڈ کی طرف جا رہا تھا جسے آجکل جو آن فرنانڈیز کہتے ہیں، وہ لکھتا ہے ——— جب ہم امریکہ کے
ساحل سے سات آٹھ سو میل دور نکل چکے تھے تو ایک دن صبح کے ساڑھے چار بجے ہمارے جہاز کو ایک بڑے زور کا دھکا لگا جس سے
جہاز کے لوگ اتنے گھبرا گئے کہ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ ہوا کیا۔ لیکن ہر آدمی مرنے کو تیار ہو بیٹھا۔ یہ دھکا اتنا شدید اور
غیر متوقع تھا کہ ہم یہی سمجھے جہاز کسی چٹان سے ٹکرا گیا ہے۔ لیکن جب سمندر کی گہرائی ناپی گئی تو ہم نے جہاز کو پانی میں اتنا گہرا پایا کہ زمین نہ ملی......
یہ جھٹکا ایسے زور کا تھا کہ توپیں اچھل پڑیں۔ اور کئی آدمی اپنے بستروں سے گر پڑے۔ کپتان ولیمس ایک توپ کے اوپر سر
رکھے سو رہا تھا، وہ اچھل کے کیبن سے باہر آگیا۔ آگے چل کے لارڈ بل اس جھٹکے کو زلزلے سے منسوب کرتا ہے اور اس بات کی تائید
میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ اتفاق سے اسی وقت لیما کے ساحل پر ایک زبردست بھونچال آیا تھا جس سے بہت نقصان ہوا تھا۔ لیکن مجھے تو کچھ
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وہیل نے جہاز کے پیندے میں نیچے سے ٹکر ماری تھی جس سے یہ جھٹکا لگا۔ لیکن اتنے صبح سویرے اندھیرے کی
وجہ سے لوگ اسے دیکھ نہ سکے۔

ابھی تو مجھے وحشی وہیل کی قوت اور کینہ توزی کی اور بہت سی مثالیں یاد ہیں جو مختلف ملاحوں سے پوچھ گچھ کی ہیں۔ ایسا
کئی دفعہ ہو چکا ہے کہ وہیل نے حملہ آور کشتیوں کو نہ صرف ان کے جہازوں کی طرف دھکیل دیا بلکہ خود جہاز کا پیچھا کرنے لگی اور اس کے
اوپر جتنے بھی ہتھیار پھینکے گئے سب کو اطمینان سے سہتی رہی۔ انگریزی جہاز پوسی ہول کے لوگ آپ کو اس سلسلے میں ایک پوری
کہانی سنا سکتے ہیں۔ رہا وہیل کی قوت کا معاملہ تو ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ وحشی وہیل نے رسیوں میں پھنسنے کے بعد بھاگ نکلنا چاہا۔
لیکن لوگوں نے موسم پرسکون دیکھ کر ان رسیوں کو جہاز میں باندھ لیا اور وہیل جہاز کو اس طرح کھینچنے لگی جیسے گھوڑا
گاڑی کو لے کے بھاگتا ہے۔ پھر یہ بات اکثر مشاہدہ میں آئی ہے کہ اگر وحشی وہیل کو زخمی ہونے کے بعد سنبھلنے کا وقت مل جائے تو وہ غصے
میں اندھی ہو کے حملہ نہیں کرتی بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اپنے حملہ آوروں کو نیست و نابود کر دینے کے ارادے سے ہی کرتی ہے۔ وہیل کے کردار کا
اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ اکثر اپنا خوفناک منہ کھول دیتی ہے اور اسے کئی کئی منٹ تک
یونہی پھیلائے رکھتی ہے۔ لیکن اب میں صرف ایک آخری مثال اور پیش کروں گا جو نہایت معنی خیز اور قابل غور ہے۔ اس سے
آپ کو ایک نیا اندازہ ہوگا کہ اس کتاب میں جو سب سے عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کی تصدیق روزمرہ کے [illegible] سامنے

حقائق سے ہوتی ہے۔ اور دوسرے آپ دیکھیں گے کہ یہ عجائبات ایسی چیزیں ہیں جن کا صدیوں سے اعادہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہمیں حضرت سلیمان کی اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں کہ جب جسٹینین شہنشاہ اور بلی سیریس سپہ سالار تھا قسطنطنیہ میں ایک مصنف پروکوپیس نامی تھا اس شخص نے اپنے زمانے کی تاریخ لکھی ہے۔ اور یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے مستند لوگوں کی رائے ہے کہ یہ مورخ ثقاہت قابل اعتماد ہے۔ اور وہ ایک ایسی باتوں کو جن کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں لکھیں اس نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔

اچھا تو یہ پروکوپیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ جن دنوں وہ قسطنطنیہ کا گورنر تھا قریب کے بحیرہ مارمورا میں ایک بحری عفریت پکڑا گیا جو کوئی پچاس سال سے دکھائی دیتا تھا اور اس سمندر میں جہاز ڈبو رہا تھا۔ جو بات ایک مستند تاریخ میں بیان ہوئی ہو اس پر شک کرنا آسان نہیں۔ مجھے اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نظر نہیں آتی۔ کتاب میں یہ تو لکھا نہیں کہ یہ عفریت کس نوعیت کا تھا۔ لیکن چونکہ وہ جہاز ڈبویا کرتا تھا۔ اور اس کے علاوہ کئی اور وجوہات کی بنا پر یہ عفریت یقیناً وہیل ہی ہوگا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں روغنی وہیل ہی تھا۔ اور میں کیوں۔ ایک مدت تک یہ خیال تھا کہ بحیرہ روم اور اس جیسے گھرے سمندروں میں روغنی وہیل کبھی نظر نہیں آتی۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ یہ سمندر اس قابل نہیں اور نہ موجودہ حالات میں بھی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ روغنی وہیل کے غول یہاں آ کر رہیں لیکن حال ہی میں مزید تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج کل بحیرہ روم میں روغنی وہیل کی موجودگی کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں۔ مجھے مستند طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ انگلستان کے بیڑے کے ایک کروزر آریون کو سالونیکا پر روغنی وہیل کا ایک ڈھانچا ملا تھا۔ چونکہ گشتی جہاز نہایت آسانی کے ساتھ درہ دانیال میں سے گزر جاتا ہے۔ اس لیے روغنی وہیل بھی اسی راستے بحیرہ روم میں سے بحیرہ مارمورا میں آ سکتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے بحیرہ مارمورا میں گرین لینڈ وہیل کا وجود نہیں پایا گیا جا نہیں اتنے بہت سکتے ہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ شاذ مچھلیاں جو روغنی وہیل کا چارہ ہیں، اس سمندر کی تہ میں بھی رہتی ہیں کیونکہ اس قسم کی بڑی بڑی مچھلیاں اس علاقے میں وہاں کی سطح پر پائی گئی ہیں چنانچہ اگر آپ ان سب بیانات کو ایک جگہ رکھ کر ان پر منطقی انداز سے غور کریں تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ علم انسان کے لحاظ سے تو پروکوپیس کا بحری عفریت جو پچاس سال تک رومی شہنشاہ کے جہاز ڈبوتا رہا روغنی وہیل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

قیاس آرائیاں

اہاب نے جو بات دل میں ٹھان لی تھی، ہر وقت اسی کی آگ میں جلتا بھنتا رہتا۔ اس کے ہر خیال اور ہر عمل کا منشا یہی ہوتا کہ موبی ڈک کسی نہ کسی طرح ہاتھ آ جائے۔ اس ایک جذبے پر وہ ساری انسانی دلچسپیاں قربان کرنے کو تیار تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود کچھ تو فطرتاً اور کچھ عادتاً اس کے اندر آتش جو شکاریوں کے طور طریقے ایسے رچ بس گئے تھے کہ وہ اس سفر کے دوسرے مقاصد سے پوری طرح بے نیاز نہ ہو سکتا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بھی ایسے محرکات کی کمی نہ تھی جن کا اثر اس کے اوپر کہیں زیادہ تھا۔ وہ ایک جنون میں تو ضرور مبتلا تھا لیکن شاید یہ بات ذرا دقیق اور مبالغہ آمیز ہو جائے گی کہ سفید وہیل کے خلاف اس کا جذبۂ انتقام پھیل کر کسی حد تک تمام روئے زمین کی وہیلوں پر پھیلا ہوا تھا، اور وہ سمجھتا تھا کہ میں جتنی وہیلیں ماروں گا اس چیز کے امکانات اتنے ہی بڑھتے جائیں گے کہ اگلی دفعہ جس وہیل سے مڈبھیڑ ہو وہ یہی موذی وہیل نکلے جس کی تلاش ہے لیکن اگر آپ کو یہ قیاس کچھ نامناسب معلوم نہیں ہوتا تو بھی کچھ اور وجہیں ایسی موجود تھیں جو چاہے اس کے دل پر حکمرانی کرنے والے جذبے کی وحشت سے مطابقت نہ رکھتی ہوں، مگر اسے متاثر تو ضرور کر سکتی تھیں۔

اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اہاب کو ایک ایک آلۂ کار تو استعمال کرنا ہی تھا لیکن دنیا میں جتنے بھی آلات ہیں ان میں انسان سب سے جلدی خراب ہوتا ہے۔ مثلاً اہاب کو معلوم تھا کہ اپنی مقناطیسی قوت کے زور پر اسے بعض اعتبار سے اسٹاربک کے اوپر کتنا ہی غلبہ کیوں نہ حاصل ہو لیکن جس طرح صرف جسمانی برتری ذہنی فرمانروائی کی ضامن نہیں ہو سکتی اسی طرح اس غلبے میں اسٹاربک کی روحانی شخصیت شامل نہ تھی کیونکہ روحانی عنصر اور ذہنی عنصر میں وہی نسبت ہے جو ذہنی عنصر اور جسمانی عنصر میں۔ جب تک اسٹاربک کا ذہن اہاب کے مقناطیس کی گرفت میں ہے اس کا جسم اور اس کی عقل بھی اہاب کے زیر نگیں رہیں گی لیکن اس کے باوجود اہاب جانتا تھا کہ میرے چیف میٹ کی روح اپنے کپتان کے مقصد سے نفرت کرتی ہے، اور اگر اس میں اتنی ہمت ہو تو اسٹاربک اس سے الگ ہو جائے، بلکہ اسی کام میں کھنڈت ڈالے۔ ہو سکتا تھا کہ ایک عرصہ دراز تک سفید وہیل نظر ہی نہ آئے۔ اگر کچھ دور اندیشی نہ، اور روزمرہ کے اثرات کام میں نہ لائے جاتے تو اندیشہ یہ تھا کہ اس طویل وقفے میں وہ اپنے کپتان کے خلاف بالکل کھلم کھلا بغاوت کرے گا صرف اتنا ہی نہیں بلکہ موبی ڈک کے سلسلے میں اہاب کی ہذیان میں دیوانگی سب سے زیادہ اس چیز سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے نہایت سمجھداری اور فراست کے ساتھ یہ بات تاڑ لی کہ فی الحال اس جستجو میں وہ تخیل اور کا فوق الفطرت رنگ باقی نہیں رہنا چاہیے جو اس میں فطری طور پر موجود تھا۔ اہاب یہ بھی سمجھ گیا کہ عمل کے بغیر مسلسل غور و فکر کرتے رہنے سے آدمی پر اتنا زور پڑتا ہے کہ ہمت جواب دے جاتی ہے۔ چنانچہ اس سفر کی پوری حقیقت ابھی نظروں سے پوشیدہ رہنی چاہیے، اور اس کے افسر اور جہازی جب رات کو دیر تک پہرہ دینے کے لیے کھڑے

ہوں تو ان کے پاس غور و فکر کے لیے موبی ڈک کے بجائے قریب کی کوئی اور چیز ہونی چاہیے کیونکہ ان وحشی جہازیوں نے اس کے اعلان کا خیر مقدم نہایت اشتیاق اور جوش کے ساتھ کیا تھا لیکن جہازی لوگ کچھ ناقابل اعتبار اور متلون مزاج ہوتے ہیں۔ وہ سمندر کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ اس کی ناپائیداری اپنے اندر جذب کرتے رہتے ہیں۔ اگر انھیں کسی ایسے کام پر مامور کیا جائے جس کی تکمیل میں بہت دیر لگے اور بیچ میں کچھ کرنے کو نہ ہو تو چاہے بالآخر یہ کام کتنا ہی حیات افزا کیوں نہ لگے۔ اگر یہ چیز نہایت لازمی ہوتی ہے کہ انھیں عارضی دلچسپیاں اور مصروفیتیں فراہم کی جائیں اور انھیں آخری مقصد کے لیے اس طرح محفوظ رکھا جائے کہ ان کے اندر کسی طرح کی گریز پیدا نہ ہونے پائے۔

اہاب ایک اور بات سے بھی بے خبر نہ تھا شدید جذبے کے وقت انسان معمولی اور ادنیٰ باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے لیکن یہ موقعے گزر جاتے ہیں۔ اہاب کی رائے تھی کہ جس مخلوق کو انسان کہتے ہیں اس کے خمیر میں جو گندگی اور ذلالت ہے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ سفید وہیل نے میرے وحشی جہازیوں کے دل میں ہیجان برپا کر دیا ہے، اور میں نے ان کے جنگجو پن کو شعلہ ور کر کے ان کے اندر وفاداری اور بلند نظری پیدا کر دی ہے چنانچہ موبی ڈک کا پیچھا تو وہ پورے جوش کے ساتھ کریں گے ہی مگر ان کی عام اور روزمرہ کی دلچسپیوں کا سامان بھی ہونا چاہیے کیونکہ زمانہ قدیم میں صلیبی جنگوں کے جانباز اور وفادار مجاہد بھی ارض مقدس کے لیے لڑنے دو ہزار میل کو ضرور جاتے تھے لیکن ساتھ ساتھ چوری چکاری سے یا جیبیں کاٹ کر یا دوسرے طریقوں سے مال غنیمت بھی جمع کرتے چلتے تھے۔ اگر ان کے سامنے اس عظیم اور رومانی مقصد کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تو بہت سے لوگ بیزار ہو کے واپس بھاگ آتے۔ اہاب دل میں کہتا ہے انھیں روپیہ پیسے کی امید سے محروم نہیں کروں گا —— ہاں، روپے کی امید سے۔ اس وقت تو وہ روپے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں لیکن اگر دو چار مہینے گزر جانے کے بعد بھی انھیں روپیہ ملنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو یہ خواہش جو ابھی چپ چاپ پڑی ہے ان کے اندر ایک دم بغاوت کر بیٹھے گی، اور یہ روپیہ اہاب کا بیڑا کر دے گا۔

پھر دور اندیشی ایک اور چیز کی متقاضی تھی جس کا تعلق خود اہاب کی ذات سے تھا اضطراری طور پر اہاب یہ حرکت کر بیٹھا تھا کہ پیکوڈ کے سفر کا سب سے بڑا اور اصلی مقصد اس نے لوگوں کو قبل از وقت بتا دیا۔ اب اہاب کو ہوش آیا کہ میں تو ایسی حرکت کر بیٹھا ہوں جس سے مجھ پر قبضہ غاصبانہ کا الزام آسکتا ہے، اور اگر اس کے جہازی چاہیں تو انھیں اخلاقی اور قانونی حق حاصل ہوگا کہ اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیں، بلکہ اسے زبردستی معزول کر دیں۔ ابھی تو لوگوں کے دل میں یہ احساس دبا ہوا سا تھا لیکن اگر کسی نے اشارۃً بھی اس کا ذکر کر دیا تو لوگوں میں یہ بات پھیل جائے گی۔ لہٰذا اہاب کو یقیناً بے چینی ہوگی کہ اپنے آپ کو ان خطرات سے بچانے کا انتظام کرے۔ جو حفاظت کا سامان خود اس کے لوگوں پر حکومت کرنے والے دل و دماغ اور ہاتھوں میں موجود تھا۔ اور دوسری ترکیب یہ بھی کہ جہازیوں کو موسم اور ہوا کی ذرا ذرا سی تبدیلیوں پر نظر رکھنے میں لگا دیا جائے۔

ان اسباب کے علاوہ بعض اور بھی وجوہات تھیں جو اتنی دقیق ہیں کہ بیان ان کی تفصیل ممکن نہیں۔ بہرحال اہاب نے ابھی طے کر لیا کہ مجھے اپنی حرکت میں سفر کے فطری اور برائے نام مقصد کا لحاظ رکھنا چاہیے اور جہاز کے معمولات میں کوئی

فرق نہ آنا چاہیے بلکہ اپنے اوپر زور ڈال کے اپنے پیشے سے اس شدید دلچسپی کا اظہار بھی کرنا چاہیے جس کے باعث ہیلم لوگوں میں مشہور ہے۔

خیر ہو بھی جو، اب اس کی آواز اکثر سنائی دینے لگی کہ وہ مستول کے اوپر والوں کو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ سمندر کو اچھی طرح نظر میں رکھو اور اگر سنگ ہی بھی دکھائی دے تو بھی بتاؤ۔ اس نگرانی کا صلہ بھی جلدی ہی مل گیا۔

باب - ۴۷

چٹائی بننے والا

ایک دن تیسرے پہر کو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بڑا امس تھا جہازی بے فکری سے عرشوں پر ٹہل رہے تھے یا
سیسے کے رنگ کے پانی کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی کوئیگ اور میں اپنی کشتی میں لگانے کے لیے وہ چیز بن رہے تھے
جسے تلوار والی چٹائی کہتے ہیں۔ منظر اتنا پرسکون، دھیما دھیما لیکن پراسرار تھا اور خواب ناک فضا میں کچھ ایسی ٹھگی سی بسی ہوئی تھی کہ ہر
خاموش جہازی کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اپنے غیر مرئی وجود میں تحلیل ہو کے رہ گیا ہو۔

چٹائی بنتے ہوئے میں کوئی کوئیگ کے خادم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں تانے کی لمبی لمبی رسیوں میں سے بانے کی رسیاں
گزار رہا تھا اور اپنے ہاتھ کو ٹھرکی کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کوئی کوئیگ ٹیڑھا کھڑا پانی کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت بے اعتنائی سے
اپنا ڈنڈا رسیوں میں ڈال کر انھیں ٹھونک رہا تھا۔ سارے جہاز اور سارے سمندر پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی جس میں بس
کبھی کبھی ڈنڈے کی بھاری آواز خلل ہوتی تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے یہ وقت کا کرگھا ہے اور میں ایک نلی ہوں جو مشین کی طرح قسمت
کا جال بن رہی ہے۔ تانے کی رسیاں اپنی جگہ قائم تھیں۔ ان میں بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہی ایک جنبش پیدا ہوتی تھی، اور جنبش بھی
اتنی کہ بس ان میں آڑی رسیوں کو گوندھنے کے لیے کافی ہو۔ یہ تانا گویا جبر تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ میں خود اپنے ہاتھ سے ان
جبر کی بیڑیوں میں اپنی قسمت کا جال بن رہا ہوں۔ ادھر کوئی کوئیگ کا بے نیاز ڈنڈا کبھی تو بانے میں پڑ جاتا کبھی ترچھا، کبھی زور
سے کبھی آہستہ سے اور اسی آخری چوٹ کی مناسبت سے چٹائی کی بناوٹ میں بھی فرق آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وحشی کا بے نیاز
ڈنڈا جو تانے اور بانے دونوں کو آخری شکل دیتا ہے یہ گویا اتفاق ہوا۔ ہاں، اتفاق، جبر اور اختیار بے جوڑ چیزیں نہیں ہیں، یہ
ایک ساتھ مل کر عمل کرتی ہیں۔ جبر کا سیدھا تانا اپنے راستے سے بالکل نہیں ہٹتا۔ اس کی ہر دوسری جنبش اسے اور مستحکم بنا دیتی ہے۔
اختیار کو یہ آزادی حاصل ہے کہ مقررہ تاگوں کے درمیان نلی چلائے۔ اتفاق جبر کی سیدھی لکیروں کے درمیان مقید ہے، اور دائیں
بائیں اس کا راستہ اختیار متعین کرتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں کا پابند ہے لیکن باری باری سے دونوں کے اوپر اپنا حکم چلاتا ہے اور
واقعات کی تشکیل اسی کی آخری چوٹ سے ہوتی ہے۔

غرض ہم چٹائی بننے کے کام میں لگے ہوئے تھے کہ میں ایک لمبی عجیب و غریب شیریں، وحشیانہ اور غیر ارضی آواز سن کر
ایک دم ایسا چونکا کہ اختیار کا گولا میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں کھڑا ہو کے بادلوں کی طرف تکنے لگا جدھر سے وہ آواز آتی معلوم
ہوتی تھی۔ وہاں مستول کی اونچی چوٹی پر وہ پگلا ٹاشٹیگو بیٹھا تھا —— ہاتھ ڈنڈے کی طرح اٹھا ہوا اور جسم ایک اشتیاق کے
عالم میں آگے کو جھکا ہوا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ آواز لگا رہا تھا۔ یہ آواز ایسی تھی جو اس وقت سارے سمندر میں

میں سیکڑوں شکاری جہازوں کے اونچے اونچے مستولوں پر سے سنائی دے رہی ہوگی لیکن کسی اور کے گلے میں یہ لوچ اور شیرینی کہاں ہوگی جو اس ریڈ انڈین ناشش ٹیگو کے گلے میں تھی۔

وہ ہوا میں یوں اُٹھا ہوا کھڑا تھا اور اُفق کی طرف ایسے پُراشتیاق اور وحشیانہ انداز میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی ولی یا عارف ہے جسے قسمت کے جلوے نظر آ رہے ہیں اور جو نعرے لگا لگا کر ان کی آمد کا اعلان کر رہا ہے۔

"وہ فوارہ چھوڑ رہی ہے! وہاں! وہاں! وہاں! فوارہ چھوڑ رہی ہے! فوارہ چھوڑ رہی ہے!"

"کدھر؟"

"ہوا کی مخالف سمت میں۔ کوئی دو میل دور! پورا غول ہے!"

جہاز میں فوراً ہل چل مچ گئی۔

روغنی وہیل اتنی باقاعدگی کے ساتھ فوارہ چھوڑتی ہے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ اس کے معمول میں سرِمو فرق نہیں آتا۔ شکاری اس وہیل کو اسی بات سے پہچانتے ہیں۔

"لو، وہ چلی دیں!" ناشش ٹیگو نے پکارا، اور وہیلیں غائب ہو گئیں۔

"داروغہ، جلدی چلو!" اہاب نے کہا۔ "وقت بتاؤ! وقت!"

داروغہ بھاگا بھاگا نیچے گیا اور گھڑی دیکھ کر اہاب کو بالکل صحیح وقت بتایا۔

اب جہاز کو ہوا کے راستے سے ہٹا لیا گیا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ناشش ٹیگو نے بتایا تھا کہ وہیلیں پانی میں غوطہ لگا کر ہوا کے خلاف چل رہی ہیں، چنانچہ ہمیں امید تھی کہ وہیلیں تھوڑی ہی دیر میں ہمارے جہاز کے آگے چلتی نظر آ جائیں گی۔ بعض وقت روغنی وہیل بڑی چالاکی دکھاتی ہے۔ وہ پہلے تو ایک سمت میں غوطہ لگاتی ہے لیکن پانی کے نیچے پہنچ کے مڑ جاتی ہے اور مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیتی ہے۔ مگر اس وقت اس فریب کاری کا کوئی موقع نہ تھا کیونکہ غالباً جس مچھلی کو ناشش ٹیگو نے دیکھا تھا وہ ذرا بھی چوکنی نہ ہوئی تھی اور نہ اسے یہ علم تھا کہ ہم اس کے اتنے قریب ہیں۔ کچھ لوگ کشتیوں پر تعینات کر دیے گئے اور بعض لوگوں کو پہرے کا کام ملا۔ انھیں میں سے ایک آدمی ناشش ٹیگو کی جگہ مستول پر جا پہنچا اور وہ نیچے آ گیا۔ اگلے اور پچھلے مستولوں پر جو لوگ تھے وہ بھی اتر آئے۔ رسیوں کی ناندیں اپنی اپنی جگہوں پر رکھ دی گئیں، جرثقیل لٹکا دیے گئے۔ آگے کا بادبان بند کر دیا گیا اور تینوں کشتیاں سمندر میں ڈولوں کی طرح اتار دی گئیں۔ پشتوں کی دوسری طرف ان کشتیوں کے ملاح ایک ہاتھ سے جنگلا پکڑے کھڑے تھے اور ایک پیر جہاز کے بالائی کنارے پر تھا جیسے کسی چیز کا انتظار ہو۔ جنگی جہاز کے لوگ جب دشمن کے جہاز میں کودنے کے لیے لمبی سی قطار بنا کے کھڑے ہوتے ہیں تو بالکل ایسے ہی لگتے ہیں۔

لیکن اس نازک وقت میں دفعۃً ایک چیخ سنائی دی، اور لوگوں کی نظریں وہیل کی طرف سے ہٹ گئیں۔ انھوں نے چونک کر سر اہاب کی طرف دیکھا، اس کے چاروں طرف پانچ کالے کالے بھتنے کھڑے تھے جو ایسے لگتے تھے جیسے ابھی ہوا میں سے برآمد ہوئے ہوں۔

کشتیاں اتاری جاتی ہیں

یہ بھوت عرشے کی دوسری طرف اچھل کود رہے تھے اور چپ چاپ پھرتی کے ساتھ اس کشتی کی زنجیریں کھول رہے تھے جو اس طرف لٹکی ہوئی تھی۔ یہ کشتی جہاز کے پچھلی طرف لٹکی رہتی تھی۔ اسی لیے یہ کپتان کی کشتی کہلاتی تھی مگر اس کے باوجود اسے فالتو کشتیوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ اس کشتی کے کنارے پر اس وقت ایک لمبا تڑنگا اور کالا بھجنگ آدمی کھڑا تھا جس کے کالے ہونٹوں میں سے ایک سفید دانت بھونڈے انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے سیاہ سوتی کپڑے کی گھٹنوں تک پہنچنے والی جیکٹ اور اسی طرح کا پتلون پہن رکھا تھا لیکن اس کے جسم کے اوپر ایک سفید اور چمکدار پگڑی چمک رہی تھی۔ بیو داعی میں اس کے بال تھے جو اس نے گول کر کے سر کے اوپر لپیٹ رکھے تھے۔ اس شخص کے ساتھیوں کا رنگ ذرا کم سیاہ اور زرد پتے کی طرح زرد تھا۔ یہ رنگ منیلا کے قدیم باشندوں سے مخصوص ہے۔

جہاز کے لوگ ان اجنبیوں کو حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اتنے میں اہاب نے سفید پگڑی والے بڈھے سے پکار کر کہا "سب ٹھیک ہو گیا، فیض اللہ؟"

"سب ٹھیک" سرسراتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

"تو پھر کشتیاں اتار دو۔ سنتے ہو، کشتیاں اتار دو۔"

اہاب کی آواز میں ایسی کڑک تھی کہ جہازی اپنی حیرانی کے باوجود جنگلے کے اوپر سے کود گئے۔ چرخیوں میں زنجیریں گھڑ گھڑ چلنے لگیں۔ تینوں کشتیاں شڑاپ شڑاپ سمندر میں گر پڑیں۔ جہازیوں نے وہ تیزی اور چستی دکھائی جو کسی دوسرے پیشے میں نظر نہ آئے گی اور جھٹ سے جہاز کی دیوار پر سے نیچے اچھلتی ہوئی کشتیوں میں بکروں کی طرح کود گئے۔

یہ کشتیاں ابھی جہاز سے الگ بھی نہ ہوئی تھیں کہ ایک چوتھی کشتی ہوا کے رخ کی طرف سے ادھر آتی نظر آئی جس میں وہ پانچوں اجنبی پتوار چلا رہے تھے اور اہاب پیچھے کی طرف تنا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے چلا کے اسٹاربک، اسٹب اور فلاسک کو پکارا اور کہا کہ دور دور تک پھیل جاؤ تاکہ پانی کا بہت سا حصہ گھیرے میں آجائے۔ لیکن جو لوگ دوسری کشتیوں میں تھے ان کی نظریں کالے بھجنگ فیض اللہ پر گڑی رہیں اور انھوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔

"کپتان اہاب؟" اسٹاربک نے کہا۔

"دور دور پھیل جاؤ" اہاب نے پکار کے کہا۔ "چاروں کشتیوں والو، چلو دور دور پھیلو۔ فلاسک، تم ذرا اور جہاز کے قریب آجاؤ۔"

"اچھا صاحب، اچھا" پست قامت فلاسک نے اپنی بڑی پتوار گھماتے ہوئے بڑی خوش دلی سے کہا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بولا "لگے زور! ——— وہ رہی ——— وہ رہی! ——— وہ نظر آئی! وہ سامنے فوارہ چھوڑ رہی ہے۔"

اتنے میں خوشنما بحری جہاز ایک عجیب انداز سے حرکت میں آیا اور پھر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ساتھ کشتی کی بائیں جانب ہی لگ گئیں۔
کشتی اور ملاح دونوں کے دونوں سمندر میں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔

جونہی کشتیاں پیچھے آ رہی تھیں وہ بھی ایک دم ٹھہر گئیں۔ وہیں تیز تیز لہروں کے نیچے نیچے پانی میں بیٹھ گئی تھیں اور دور سے ان کی حرکت
کے کوئی آثار نظر آ رہے تھے لیکن اب بہت زیادہ قریب تھا، لہٰذا وہ تازگی تھا۔

"سب لوگ ابھی اپنی جگہ چھوڑ کے اس پاس سمندر میں دیکھیں!" اسٹاربک نے پکار کر کہا "کیا گیت ٹو
کھڑا ہو جا!"

یہ جنگلی بڑی پھرتی سے کچھ کے کنارے پر کھڑے ہو کر کشتی کے اوپر جا چڑھا تھا اور پُراشتیاق نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا جہاں وہیل
آخری دفعہ دکھائی دی تھی۔ کشتی کے پچھلے حصے میں بھی اسی طرح کا دیوار کے برابر اونچا اور تکونا سا چبوترہ بنا ہوا تھا جہاں اسٹاربک کشتی کے ہچکولوں
کے باوجود نہایت ہوشیاری سے اپنا توازن قائم رکھے اطمینان کے ساتھ کھڑا تھا اور چپ چاپ سمندر کی عظیم الشان نیلی وسعتوں کو دیکھ رہا تھا۔

یہاں سے تھوڑی دور فلاسک کی کشتی بھی بالکل ساکن تھی۔ اس کا کمانڈر نہایت بے جگری کے ساتھ ایک کھونٹے کے اوپر کھڑا تھا
جو فرش سے ہی لگا ہوا تھا اور پچھلی طرف والے چبوترے سے کوئی دو فٹ اونچا تھا۔ یہ وہیلوں کے شکار کے وقت رسیاں لپیٹنے کے کام آتا ہے۔
بظاہر یہ اس قدر اونچا نہ تھا جتنی آدمی کے ہاتھ کی ہتھیلی۔ اس قسم کی جگہ کھڑا ہوا فلاسک کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈوبے ہوئے جہاز کے
مستول پر ٹنگا ہوا ہو۔ پست قد تو ضرور تھا لیکن اس کے حوصلے نہایت بلند تھے، لہٰذا وہ موجودہ حالت میں بھی مطمئن نہیں تھا۔

"یہاں سے تو کچھ زیادہ دور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ چلو ایک پتوار کھڑی کر دو اور مجھے اس کے اوپر چڑھاؤ۔"

یہ سن کر ڈیگو نے سہارے کے لیے ہاتھ کشتی کے دونوں کناروں پر رکھے اور جلدی سے پچھل کے آگے چلا آیا۔ پھر سیدھے کھڑے
ہو کے اپنے کندھے پائیدان کے طور پر پیش کر دیے۔

"جی، میرے کندھوں کو ہی مستول سمجھیے۔ آپ چڑھیں گے؟"

"ہاں ضرور، تمہارا بہت بہت شکریہ دوست۔ کاش کہ تم پچاس فٹ اور لمبے ہوتے۔"

اب ڈیگو نے اپنے دونوں پیر کشتی کے دو تختے سامنے والے تختوں پر مضبوطی سے جما دیے اور تھوڑا سا جھک کر ہتھیلی فلاسک
کے پیر کے سامنے پیش کر دی۔ پھر فلاسک کا ہاتھ اپنے بھرے سر کے اوپر رکھ کے اس سے کہا کہ میں اچھلتا ہوں آپ بھی اچھلیے۔ اور فلاسک
کو ایسی استادی سے اچھالا کہ وہ ٹھنگنا آدمی صاف اس کے کندھوں پر آ رہا۔ اب فلاسک اس کے کندھوں پر کھڑا تھا اور ڈیگو نے اپنا ایک ہاتھ
اوپر اٹھا رکھا تھا تاکہ وہ اس کے سہارے جما رہے۔

ناتجربہ کار لوگوں کو یوں تو اس بات پر ہمیشہ ہی تعجب ہوتا ہے کہ وہیل کا شکاری انتہائی تلاطم اور شرارت پسند سمندر کے ہچکولوں
میں بھی بالکل غیر شعوری مہارت کے ساتھ سیدھا کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس سے بھی عجیب چیز یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں لٹھے کے اوپر بھی جم جاتا
ہے لیکن ٹھنگنے فلاسک کے دیوقامت ڈیگو پر چڑھ کے کھڑا ہونے کا منظر تو اور بھی انوکھا تھا کیونکہ یہ حبشی نہایت اطمینان، بے نیازی اور
ایک طرح غیر شعوری وجاہت شان کے ساتھ سیدھا کھڑا تھا اور اس کا حسین جسم سمندر کے ہر ہچکولے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کے لہریں لے رہا تھا۔

اس کی چوٹی پر کے اوپر سرخ جلوں والا فلاسک ایسا لگ رہا تھا جیسے برف کا گولا ٹیگ رہا کے زیادہ شاندار تھا نہ دھل
جگمگ رہا ہو۔ دانش نے فلاسک بار بار سے چھین جھک کر پیر پیٹنے لگا۔ مگر کشتی کے شلوار سے کہ جنبش تک نہ ہوئی۔ اسی طرح میں نے
دیکھا ہے کہ غضب ناک اور جنگجو لوگ زندہ اور رو رہا دل زمین کے سینے پر کودوں رہتے ہیں مگر اس کے باوجود زمین کے منجمد اور دھوں میں کوئی
فرق نہیں آتا۔
مگر تیسرے دیٹ اسٹب کے دل میں دُور دُور تک نظر دوڑانے کی کوئی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ شاید دہلوں نے ڈر کے مارے
طور پر خود میں لگا لیا تھا بلکہ اپنی عادت کے مطابق سمندر کی تصویر چلی گئی تھی۔ اگرچہ بات تھی تو اسٹب نے حسب دستور سیٹی کر لیا تھا کہ
اس بے کاری کے وقت میں پائپ پی کر دل بہلاؤں گا۔ چنانچہ اس نے ٹوپی کے نیچے میں سے پائپ نکال لیا جہاں وہ اسے برکی طرح بھیجا
کر رکھتا تھا۔ پھر اسے بھرا اور تمباکو کا انگوٹھے سے دبایا لیکن اس نے ابھی جیبی کے دیگ دل پر رگڑ کے دیا سلائی جلائی ہی تھی کہ اس کا ہر جیسا
"تاشتیگو" جس کی آنکھیں دو گڑے ہوئے ستاروں کی طرح ہوا کے رُخ پر لگی رہی تھیں، بلا اکا ایک دم سے اپنی نشست پر گر پڑا اور ایک
جنون وحشت کے عالم میں چلّایا "چلو کام پر ! چلو کام پر ! لنگڑ زور ! ——— وُہ نظر آ رہی ہیں !"
اس وقت کسی خشکی پر رہنے والے کو دہیل آ وہیل کسی مچھلی کے آثار تک نظر نہ آتے۔ اسے تو بس ہری مائل سفید رنگ کا تھوڑا
سا تلاطم پانی دکھائی دیتا اور اس کے اوپر منڈلاتے ہوئے بھاپ کے نیچے نیچے اور بکھرے بکھرے سے گچھے جو سفید لہریں لیتے ہوئے
سمندر کے پریشان جھاگ کی طرح بکھل بکھل کے ہوا کی طرف جا رہے ہوتے۔ آس پاس کی ہوا ایک دم سے گرم ہو کر تھرتھرا اٹھی جیسے لوہے
کی سرخ انگارہ چادروں کے اوپر ہوا ہو۔ فضا کی اس پیچ و تاب کھاتی لہروں اور پانی کی ایک ہلکی سی تہہ کے نیچے وہلیں تیر رہی تھیں۔ وہلیں
بھاپ کے جو گچھے چھوڑ رہی تھیں وہ دوسرے تمام آثار سے پہلے نظر آ گئے تھے۔ یہ گویا ان کا ہراول دستہ تھا یا ہوا میں اُڑنے والا ہراول دستہ تھا۔
چاروں کشتیاں تلاطم پانی اور ہوا کے اس حصے کا تیزی سے تعاقب کر رہی تھیں لیکن یہ ان کو قریب نہ پہنچنے دیتا تھا اور اس
طرح اُڑا چلا جا رہا تھا جیسے کسی تیز پہاڑی چشمے کے اندر بلبلوں کا گچھا ہوتا ہے۔
"کھینچو ! جوانو کھینچو !" اسٹار بک نے بہت ہی دبی لیکن نہایت شدید اور کڑکتی آواز میں کہا۔ اس کی نظریں بالکل ایک سیدھ
میں سامنے کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھیں لیکن وہ اپنے آدمیوں سے زیادہ بات نہ کر رہا تھا۔ نہ ملاح کچھ کہہ رہے تھے۔ کشتی کی خاموشی
میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بس اس کی کھسر پھسر خلل ہوتی کبھی تو کھردرا حکم کے ساتھ اور کبھی دبی دبی نرمی کے ساتھ۔
جنہ جنگ فلاسک اس سے کتنا مختلف تھا۔ "کھینچو پیارو ! کچھ تو کہو ! میرے شیرو ! زور زور سے دوڑاؤ اور کھینچ لے چلو ! ان
کی کالی کالی کمر پہ جا مارو ! جوانو ! بس میرا اتنا کام کر دو اور میں اپنی جاگیر تمہارے نام لکھ دوں گا۔ بلکہ بیوی بچے بھی ہاں ہاں جاؤ دو۔ بڑھو آگے
بڑھو آگے ! یا خدا ! میں تو بالکل پاگل ہو جاؤں گا مارے ——— دو دیکھو ! وہ سفید پانی دیکھو !" اسی طرح چیختے چلاتے اس نے اپنے سر
سے ٹوپی اتاری اور اسے پیروں سے کچلنے لگا۔ پھر اسے اٹھا کے دور سمندر میں پھینک دیا اور آخر کار کشتی کے پچھلے حصے میں فرش پہ
گر کے پاگل بچھڑے کی طرح دولتیاں جھاڑنے لگا۔
اسٹب نے ابھی تک اپنا پائپ جلایا نہ تھا بس اپنے دانتوں میں دبا رکھا تھا اس کی کشتی فلاسک والی کشتی سے تھوڑی

دور پیچھے چلی آرہی تھی۔ وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا: "ذرا اس طرح سے یاد کرو دیکھو۔ اس خلاسنگ کو دورے پڑتے ہیں، اور دورے ؟ ہاں!
اسے تو دورے ہی چاہئیں ——— ارے یہ لفظ بڑا اچھا نکالا یا ——— ایسے دورے سے ہاتھ چلاؤ کر کشتی کو دور رہ جائے
ہاں ابھی چھوڑو، جس جس کے ہاتھ پیچھے، جس جس کے حصے کا کام، وہ جادو سے کھینچ رہا ہو۔
کھینچو تو ——— سب کھینچو لیکن تم اتنے تیز کیوں چل رہے ہو؟ آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ۔ دوائیم کے جوان اس ہاتھ چلتا
ہے، اور زیادہ نہیں چاہئے۔ ٹوٹ جانے دو کر چاقوؤں کو کاٹ کاٹ کے دو ٹکڑے کر دو ——— میں ہی چاہتے آرام سے چلو۔
——— میں کہتا ہوں آرام سے کیوں نہیں بیٹھتے اپنے گدے اور صیغے کیوں چھاڑے ڈال رہے ہو"

لیکن پراسرار آواب نے اپنے تھیٹرے جیسے زرد ملاحوں سے جو باتیں کیں ان میں تو یہاں حذف کر دینا ہی مناسب ہے کیونکہ آپ ایک بابرکت ملک میں رہتے ہیں۔ ان الفاظ کی تاب تو بے جگر سمندروں میں رہنے والی وہی شارک مچھلیاں ہی لا سکتی ہیں۔ ان الفاظ کی جو آواب نے اپنے شکار کا تعاقب کرتے ہوئے طوفانی آواز کی پیشانی لاتا۔ سرخ سرخ آنکھوں اور کف آلود ہونٹوں کے ساتھ کہے۔

اس دوران میں ساری کشتیاں لہروں کو چیرتی پھاڑتی آگے بڑھتی رہیں۔ خلاسنگ بار بار خاص طور سے اس وہیل کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی مراد ایک ذہنی عفریت سے تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہیل ہماری کشتی کے کنارے پر اپنی دم سے حملہ کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کے الفاظ بعض وقت اتنے جاندار اور رنگین ہو جاتے کہ اس کے دو ایک ملاح خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑ کے دیکھنے لگتے لیکن یہ بات قاعدے کے خلاف تھی کیونکہ پتوار چلانے والوں کو تو اپنی آنکھیں نکلوا دینی چاہئیں اور گردن میں سیخ ٹھونک لینی چاہئے۔ دستور کا یہی تقاضا ہے کہ ایسے نازک لمحوں میں سماعت کے سوا سارے حواس، اور بازوؤں کے سوا سارے اعضا رخصت ہو جائیں۔

یہ منظر نہایت حیرت انگیز اور پرجلال تھا۔ تند سمندر کی اشتعال بڑھتی رہیں۔ اٹھتی کشتیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی گڑگڑاہٹ جیسے توپیں چھوٹ رہی ہوں لہریں ہیں دھار دار کہ معلوم ہوتا کشتیوں کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دیں گی جب کشتی تھم کر پیچھے کسی چاقو کے پھل جیسی لہر پر چڑھ جاتی تو اس تعطل کے عالم میں اس کی مختصر سی اذیت پانی کی وادیوں اور گھاٹیوں میں اچانک گر رہے گرے غرقے۔ سامنے والی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے جان توڑ مہمیز بازی، اس پہاڑی کے دوسری طرف برف کی گاڑی کی طرح اندھا دھند پھسلنا، افسروں اور برچھے بازوں کی چیخیں، پتوار چلانے والوں کا ہانپنا ہانپنا، ہاتھی دانت کے سے رنگ والے پیکوڈ کا بادبان پھیلائے اپنی کشتیوں کے پیچھے پیچھے آنا جیسے کوئی جنگلی مرغی اپنے چیختے چلاتے جنگلی بچوں کے پیچھے پیچھے آئے ——— یہ ساری چیزیں بڑی سنسنی خیز تھیں۔ جو نیا رنگروٹ اپنی بیوی سے جدا ہو کر پہلی دفعہ لڑائی کی آگ میں جا رہا ہو، دوسری دنیا میں جو عفریت کی روح پہلی مرتبہ کسی انجانی روح سے مل رہی ہو ——— ان دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات اتنے شدید اور عجیب و غریب نہیں ہو سکتے جتنے اس شخص کے جو دودھیا وہیل کا شکار کھیلتا ہوا اس متلاطم اور جھاگ اڑاتے حلقے میں پہلی مرتبہ داخل ہو رہا ہو۔

سمندر کے اوپر بادلوں کے جو دھندلے دھندلے سائے پڑ رہے تھے ان کی وجہ سے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا چنانچہ وہیل کے پیچھے پانی کی ناچتی ہوئی سفید دھاریں اور بھی نمایاں ہو چلی تھیں۔

جہاز کے تختے اب ایک دوسرے میں جذب ہو رہے تھے بلکہ دائیں یا بائیں طرف مڑ جاتے تھے۔ شاید وہیں اب لگ گئی چل رہی تھیں کشتیاں بھی اب ذرا دور دور ہو گئیں۔ اور اسٹاربک تینوں کا تعاقب کرنے لگا جو ہوا کے خلاف جا رہی تھیں۔ ہمارا بادبان چڑھا دیا گیا تھا اور وہیل بڑھتی ہوئی ہوا کے ساتھ ہم اڑے چلے جا رہے تھے کشتی پانی میں یوں پاگلوں کی طرح چل رہی تھی کہ چپواریں لٹکی جا رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم کہرے کے چاروں طرف پھیلتے ہوئے پردے میں سے گزرنے لگے۔ اب تو جہاز دکھائی دے رہا تھا نہ کوئی کشتی۔

"لگاؤ زور جوانو" اسٹاربک نے اپنا بادبان کشتی کے اگلے حصے کی طرف اور ڈنگے کو سرکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"طوفان کے آنے سے پہلے ابھی تو ایک آدھ وہیل مار لینے کا وقت ہے۔ سفید پانی پھر دکھائی دے رہا ہے۔ اسے جلدی چلو! لپکو ــــــ!"

اس کے صرف چیخنے کے بعد ہی گئے دو نعرے ہماری کشتی کے دونوں طرف گونجے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری کشتیاں قریب پہنچ گئیں۔ نعرے بلند ہوتے ہی تھے کہ ان میں اسٹاربک نے آہستہ سے گھگیائی ہوئی تندی کے ساتھ کہا "کھڑے ہو جاؤ!" اور کوئی کوئیگ برچھا ہاتھ میں لیے اچھل کے کھڑا ہو گیا۔

نعرے کا وقت قریب آ گیا تھا لیکن ہمارے دلوں کے سامنے ابھی موت اور زندگی کا سوال نہ تھا کہ کشتی کے پچھلے حصے میں کھڑے ہوئے میٹ کا متفکر چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ اب وقت آگیا۔ پھر پانی سے چپ چپ کی ایک زبردست آواز سنائی دی جیسے کوئی پچاس ہاتھی اپنی گھاس بچھونوں میں چل پھر رہے تھے۔ ہمارے چاروں طرف کہرے میں لہکا کر یوں سانس لیتی کر رہی تھیں۔ جیسے غضب ناک سانپ۔

"اسے وہ کوہان نظر آیا۔ وہ رہا۔ وہ رہا لگے ایک اس کے!" اسٹاربک نے چپکے سے کہا۔

کشتی میں سے ایک تھوڑی سی سنسناتی ہوئی آواز پیدا ہوئی۔ یہ کوئیگ نے اپنا برچھا پھینکا تھا۔ اب کشتی کے پچھلے حصے کی طرف سے ایک دھکا لگا۔ اور ہم پر گویا دو ہو کے رہ گئی۔ پھر آگے کی طرف ایسا معلوم ہوا جیسے کشتی کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہو بادبان گر پڑا اور آپ دھماکے کی سی آواز آئی۔ ہمارے قریب کھولتی ہوئی سحاب کا ایک فوارہ اچھلا کشتی کے نیچے کوئی چیز ایسے دھکیلنے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ہم سارے تتر بتر ہو کے سمندر میں جا پڑے۔ اور سفید سفید جھاگوں میں بچکولے کھانے لگے اور ان کا دم گھٹنے لگا۔ طوفان، وہیل اور برچھا ان سب نے مل کے یہ تماشا دکھایا تھا۔ وہیل کے برچھا بس چھونے لگا۔ اور وہ صاف بچ نکلی۔ حالانکہ کشتی پر سے پانی کی موج گزر گئی تھی لیکن اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر ہم نے تیرتی ہوئی چپواریں اٹھائیں اور ان کو کشتی کے اندر پھینک کر اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے۔ ہمارے گھٹنے سمندر میں غرق تھے کیونکہ کشتی کا ایک ایک تختہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جا بجا ہماری پیچھے کی طرف پانی برس رہی ہوئی لکڑیوں کی لہروں پر کھلی ہوئی کشتی ایک ڈوبنے کی آواز دے رہی تھی جو سمندر کی تہ میں سے ابھر کے ہمارے پاس تک آ پہنچی ہو۔

ہوا تیز بڑھتی گئی کہ اب تو ماحول فراٹے لگی۔ موجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ طوفان ہمارے گرد گہری شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا رہا تھا جیسے گھاس کے میدان میں سفید آگ۔ جس میں ہم جلے بغیر بھٹکے چلے جا رہے تھے ــــــ موت کے منہ میں دانائی بنے بیٹھے تھے۔ جب نئے ڈوبتا

کسی کو وقت اور دن ہی کا پتہ نہ تھا۔ اس طوفان میں کشتیوں کو کھونا بالکل ایسا تھا جیسے وہ جھاگ اور جھلی ہوئی روئی میں سے گزر رہی ہوں اور رات
کے اندھیرے کی وجہ سے جھاگ اور کہرے کا رنگ سیاہ پڑ رہا تھا اور جہاز کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ سمندر زوروں پر تھا اور کشتی میں سے پانی پھینکنا مشکل
تھا۔ کشتیاں اس وقت کھینچنے کا فرض انجام نہ دے سکتی تھیں اور جہاز پہنچانے والی چپو کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ کئی دفعہ کوشش کرنے
کے بعد اسٹاربک کو لالٹین جلانے میں کامیابی ہوگئی۔ پھر اسے ایک بانس میں باندھ کے کوئیکویگ کو دے دیا گیا کہ وہ اسے جھنڈے
کی طرح اٹھائے رکھے۔ اور ہماری کچھ امید بندھ گئی۔ چنانچہ اس ہولناک تنہائی میں کوئیکویگ بے سروسامانی کے عالم میں لالٹین اٹھا کے بیٹھ گیا۔ اس وقت
وہ ایسے انسان کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو یقین کے بغیر امید باندھے ہوئے مایوسی کے درمیان امید کی شمع جلائے رکھے۔

ہم پانی میں بھیگ کے شرابور ہو چکے تھے اور سردی کے مارے ہمارے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ ہمیں کشتی یا جہاز کے آنے کی
ذرا امید نہ رہی تھی۔ آخر جب پو پھٹی تو ہم نے آنکھیں اٹھا کے دیکھا۔ سمندر پر ابھی تک دھند چھائی ہوئی تھی اور وہ لالٹین کشتی کی تہ میں
ٹوٹی پڑی تھی۔ یکایک کوئیکویگ اچھل کے کھڑا ہو گیا اور کان پر ہاتھ لگا کے سننے لگا۔ ہمیں رسیوں اور بانسوں کے چٹخنے کی ہلکی آواز سنائی دی
جو ابھی تک طوفان کے شور میں دبی ہوئی تھی۔ یہ آواز قریب سے قریب تر آتی چلی گئی۔ اور کہرے کو چیرتا ہوا دھند میں سے کوئی زبردست اور مبہم سی چیز
باہر نکلنے لگی۔ آخر ہم نے دیکھا کہ جہاز ہماری طرف چلا آرہا ہے۔ اور بس اتنی دور ہے جتنی اس کی لمبائی۔ ہم ڈر کے مارے سمندر میں کود گئے۔
لہروں پر تیرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ ہماری چھوڑی ہوئی کشتی تھوڑی دیر تو جہاز کے کنارے کے نیچے ڈگمگاتی رہی جیسے آبشار کے
نیچے کوئی تنکا اور پھر جہاز کے زبردست سینے نے اسے سمندر میں ڈبو دیا۔ پھر وہ کشتی ہماری نظروں سے غائب ہوگئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد
جہاز کے پچھلے حصے کی طرف پانی سے ابھری۔ ہم نے تیر کے اسے پکڑنا چاہا لیکن لہروں نے ہمیں دھکا دے کر اس سے جا ٹکرایا۔ آخر جہاز
والوں نے ہمیں اوپر کھینچ لیا اور ہم صحیح سلامت عرشے پر جا پہنچے۔ طوفان کے آنے سے پہلے دوسری کشتیاں وہیل کا خیال چھوڑ کے ٹھیک وقت
پر جہاز کی طرف واپس آگئی تھیں۔ جہاز والے ہماری طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن تلاش ابھی تک جاری تھی کہ شاید اتفاق سے
کوئی چپو رہا ہو یا ہمارے برباد ہونے کی کوئی اور نشانی دکھائی دے جائے۔

غرض یہی غیر جانبدار گواہوں کی زبانی مجھے اس حادثے کی حقیقت معلوم ہوئی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ طوفان بادل جو کشتیوں کو اور جہازوں کو ڈبونے پر تلا ہوا ہے، یہ ساری باتیں تو اس پیشے میں روزمرہ کی چیزیں ہیں، اور جب میں ویل کے پیچھے چلوں تو اس احتمال کا رنگ بھی قطعے پر مجھے اپنی زندگی اس شخص کے سپرد کر دینی چاہئے جو کشتی کا سکان سنبھالے بیٹھا ہو، پھر یہ شخص بھی کچھ ایسی حیثیت کا ہوتا ہے کہ کل ہی اپنی حرکتوں سے وہ پیٹ پیٹ کر خود ہی کشتی ڈبو دے۔ مجھے یاد آیا کہ ہماری کشتی کو جو حادثہ پیش آیا وہ اس وجہ سے کہ اسٹاربک طوفان کے باوجود ویل کے پیچھے چل پڑا ——— حالانکہ اسٹاربک اپنی احتیاط اور دور اندیشی کے سبب اس پورے پیشے میں مشہور تھا۔ میں اس دوراندیش اسٹاربک کی کشتی سے منسلک تھا اور جلیہ ویل کا شکار کھیلنے کی لاسٹ میں لگ گئی تھی۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اپنے وصیت نامہ کا خاکہ تیار کروں۔ میں بولا: کوئی کوئیگ، ذرا اِدھر آؤ، تم ہی میرے وکیل ہو، تم ہی میرے وارث اور تم ہی متوفی۔

یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی کہ لوگ کسی کو بھی نہیں جہازیوں کو اپنے وصیت نامہ کی فکر پڑی رہتی ہے لیکن اس دل لگی کا جتنا شوق جہازیوں کو ہوتا ہے اتنا دنیا میں کسی کو نہیں ہوتا۔ میں اپنی پوری زندگی میں یہ حرکت چوتھی مرتبہ کر رہا تھا، اس دفعہ جب یہ ختم ہوئے کے بعد مجھے کچھ ایسی راحت محسوس ہوئی جیسے میرے سینے پر سے کوئی پتھر ہٹ گیا ہو۔ اس کے علاوہ اب جتنے دن بھی زندہ رہوں میرا حال کچھ ایسا ہو گا جیسے لعزر دوبارہ زندہ ہونے کے بعد جی رہا ہو۔ مجھے اتنے ہفتے یا مہینے جتنے بھی ملیں گے۔ میں گویا مرجانے کے بعد بھی زندہ تھا۔ میری موت اور تجہیز و تکفین گویا میرے صندوق میں بند تھی۔ میں اپنے چاروں طرف اطمینان و سکون کے ساتھ دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بھوت آرام سے اپنے خاندان کے قبرستان میں بیٹھا ہو۔

میں نے غیر شعوری طور پر قمیص کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے کہا کہ اب بالکل بے فکر ہو کے موت سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔

نے غم دُزد نے غم کالا۔

باب — ۵۰

اہاب کی کشتی اور ملاح فیض اللہ

"بھلا کوئی تصور میں آنے والی بات ہے، فلاسک!" سٹب نے کہا۔ "اگر میری ایک ٹانگ نہ ہو تو کشتی میں کبھی نظر نہ آؤں لیکن اگر کبھی کوئی سوراخ ہو جائے تو اپنی لکڑی کی ٹانگ سے اسے بند کرنے پہنچ جاؤں۔ اف! وہ بڈھا تو بڑا غضب کا آدمی ہے۔"

"اس میں تعجب کی بات کوئی نہیں ہے،" فلاسک نے کہا۔ "اگر اس کی پوری ٹانگ غائب ہوتی تو پھر دوسری بات تھی، پھر تو وہ اپاہج ہو جاتا۔ لیکن اس کا ایک گھٹنا تو صحیح سلامت ہے اور دوسرا بھی تھوڑا بہت باقی ہے۔"

"پتا نہیں، یار۔ لیکن میں نے اسے آج تک گھٹنے ٹیکتے نہیں دیکھا!"

• ——— • ——— •

جو لوگ وہیل کے شکار سے واقف ہیں ان میں اس بات پر اکثر بحث رہی ہے کہ سفر کی کامیابی کے لیے کپتان کی موجودگی نہایت ضروری ہے، اس لیے کیا یہ بات مناسب ہے کہ وہ شکار میں عملی طور پر حصہ لے کر اپنی جان خطرے میں ڈالے۔ تیمور لنگ کے سپاہی بھی اکثر آبدیدہ ہو کر یہی بحث کیا کرتے تھے کہ اس گراں قدر ہستی کو گھمسان کی لڑائی میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں۔

لیکن اہاب کے معاملے میں اس سوال نے ایک ترمیم شدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اول تو خطرے کے وقت دو ٹانگوں والا آدمی بھی بس ایک لنگڑا بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر وہیل کے شکار میں تو ہمیشہ غیر معمولی مشکلات پیش آتی ہیں اور کوئی نہ کوئی خطرہ ہر گھڑی سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ ان حالات میں کیا یہ عقلمندی کی بات تھی کہ ایک معذور آدمی کشتی میں اتر کے وہیل کا پیچھا کرے؟ پیکوڈ کے مالکوں کی رائے تو یہی ہوگی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

اہاب اچھی طرح جانتا تھا کہ گو وہ شکار کے منظر سے قریب رہنے کی خاطر کبھی کبھار کشتی میں اتر جائے تاکہ میدان جنگ سے قریب رہے اور اپنے احکام بذات خود صادر کر سکے تو اس کے دوستوں کو چنداں اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر وہ ایک کشتی خاص طور سے اپنے لیے رکھے اور شکار میں سربراہی کے لیے پانچ زائد ملاح اپنے لیے مانگے تو پیکوڈ کے مالک اتنی فیاضی پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس نے ان سے زائد ملاحوں کا مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ اس سلسلے میں اپنی خواہشات ان پر ظاہر ہونے دی تھیں۔ بہرحال اس نے ذاتی انتظامات ضرور کر لیے تھے۔ بندرگاہ سے روانہ ہونے کے تھوڑے دن بعد ہی جہازی حسب معمول کشتیوں کو شکار کے لیے تیار کرنے میں لگ گئے تھے لیکن جب تک کباکو نے اپنی دریافت کا اعلان نہیں کیا انھیں اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہ ہوا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد جہازیوں نے دیکھا کہ جس کشتی کو فالتو کشتیوں میں سے سمجھا جاتا ہے اس کے لیے خود اہاب اپنے ہاتھ سے چپو والی کیلوں کے کھونٹے بنا رہا ہے پھر رسے کی نال کے ساتھ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کھونٹیاں کاٹ رہا ہے جو دوڑتی رسی کے وقت لگانے میں کام دیتی ہیں۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے کشتی کے فرش پر تختوں کی ایک اور تہ چڑھوا دی تاکہ وہ اس کی ہاتھی دانت والی ٹانگ کا دباؤ برداشت کرنے کے لیے تیار رہے

اس آدھی رات والے فوارہ کو ہم لوگ بھول بھال چکے تھے کہ چند دن بعد ٹھیک اسی وقت پھر اس کا اعلان ہوا۔ اس دفعہ بھی سب ہی نے دیکھا لیکن جب اس کے پیچھے جہاز ڈالا تو پھر ایسے غائب ہو گیا جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ یہ تماشا روز ہوتا رہا یہاں تک کہ ہم نے اس کی طرف توجہ ہی کرنی چھوڑ دی۔ البتہ ہمیں اس پر تعجب ضرور ہوتا رہا۔ یہ فوارہ صاف شفاف چاندنی راتوں کی روشنی میں ایک عجیب پراسرار طریقے سے نمودار ہو جاتا اور پھر ایک دن یا دو دن یا تین دن غائب رہتا مگر جب کبھی نظر آتا ہر دفعہ پہلے سے بھی دور دکھائی دیتا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اکیلا تنہا فوارہ ہمیں پھسلا پھسلا کر آگے بڑھانے لیے چلا جا رہا ہے۔

ملاحوں کی نسل ہمیشہ سے ہی توہم پرست چلی آ رہی ہے۔ پھر بہت سی ماورائے فطرت باتیں پیکوڈ سے وابستہ کی جاتی تھیں چنانچہ ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو خیال کرتے تھے کہ یہ فوارہ دور سے دور جس جگہ بھی اور جب کبھی نظر آئے تو اسے چھوڑنے والی بس ایک ہی وہیل ہوتی ہے یعنی موبی ڈک۔ کچھ دن تک اس گریزپا سائے کی بدولت ہم لوگوں پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری رہا جیسے یہ پرفریب فوارہ ہمیں آگے بڑھائے چلا جا رہا ہو تاکہ وہ عفریت پلٹ پڑے اور آخر کار ہمیں کسی دور دراز اور وحشیانہ سمندر میں لے جا کے چیر پھاڑ ڈالے۔

اس قسم کی ہولناک عارضی اندیشوں نے موسم کے متضاد سکون سے ایک عجیب و غریب قوت حاصل کر لی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس نیلی پیلی صعوبت کے پیچھے ایک مافوق الفطرت حسن چھپا ہوا ہے کیونکہ متواتر کئی دن سے ہم ایسے پرسکون سمندر میں چلے جا رہے تھے کہ طبیعت گھبرا چلی تھی اور ہم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے انتقامی مقصد سے متنفر ہو کے فضا ہمارے سامنے سے ہر قسم کی زندگی ہٹاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن آخر کار جب ہم مشرق کی طرف مڑے تو راس امید ہمارے چاروں طرف چنگھاڑنے لگی اور ہم متلاطم لہروں پر اٹھنے اور گرنے لگے۔ ہاتھی دانت کے بے رنگ کا پیکوڈ ہوا کے سامنے جھک جھک جاتا اور اپنی وحشت میں سیاہ لہروں پر پرواز کرنے لگتا یہاں تک کہ جھاگ چاندی کے ٹکڑوں کی طرح پشتوں پر برسنے لگتے۔ اب زندگی کی وہ بے رنگی اور ویرانی دور ہو گئی لیکن اس کے بجائے اب ہم اور بھی ہولناک منظر سے دوچار ہوئے۔

ہمارے کنارے کے آس پاس پانی پر عجیب و غریب شکلیں ابھرنے اور تیرنے لگیں اور پیچھے کی طرف پراسرار سمندری کوے منڈلانے لگے۔ ہر روز صبح کو جہاز کی رسیوں پر ان چڑیوں کی قطاروں کی قطاریں بیٹھی نظر آتیں اور ہمارے چیخنے چلانے کے باوجود دیر تک وہیں جمی رہتیں گویا وہ ہمارے جہاز کو ٹوٹا ہوا ناکارہ اور غیرآباد سمجھتے تھے ———— یعنی ایسی جگہ جو ویرانی کا مسکن ہو اور اس لیے ان بے خانماں پرندوں کے بسیرے کے لیے نہایت مناسب۔ اور سیاہ سمندر ایک دم کو بھی نہ رکتا تھا۔ بس زیر و زبر ہوئے چلا جا رہا تھا گویا اس کا عظیم الشان مد و جزر ایک ضمیر تھا اور یہ زبردست ارضی روح ان گناہوں اور مصیبتوں کی وجہ سے اذیت اور ندامت میں مبتلا تھی جنھیں اسی نے جنم دیا تھا۔

لوگ اسے راس امید کہتے ہیں! اسے کو ہم تو راس اذیت ہی کہا چاہتے۔ جیسے ایک زمانے میں واقعی تھا پہلے تو فریب کارانہ خاموشی ہمارے ساتھ ساتھ رہی اور ہمیں بہلا پھسلا کر یہاں لے آئی۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اپنے آپ کو اس پر اذیت سمندر میں زیر و زبر ہوتے

پیدا ہوں گے اور وہ بھی چیزوں اور جسموں کی شکل میں تبدیل ہو کر اس جنت میں گردش کرتی ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ گھومتا پیدا کی دوسری تبدیلی میں۔ پاس لا متناہی کالی فضا میں نمک کی ذرّیں اور کریں لیکن وہ بیکراں سنسان اور وہ سب بھی وقتاً فوقتاً نظر آتا رہتا تھا ـــــ اسی طرح پر سکون، بے نیاز، سفید اور تعمیر پذیر اپنی رفتار آسمان کی طرف پھیلتا ہوا ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہوا۔

وہاب نے تو اپنی آنکھیں بھینچے ہوئے اور خطرناک حرکت کی کرن تو ضرور محسوس کی تھی لیکن وہ فضا کی اس سیاہی میں استقلال کم آمیزی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اپنے بیٹے لوگوں سے شاذ و نادر ہی بات کرتا۔ ایسے طوفانی زمانے میں کہ جب سارے بادبان باندھ دیئے گئے ہوں اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ چپ چاپ بیٹھ کر طوفان ختم ہونے کا انتظار کیا جائے۔ ایسے زمانے میں کپتان اور جہازی سبھی سب تقدیر پرست ہو جاتے ہیں چنانچہ وہاب حسب معمول سوراخ میں ہاتھی دانت والی ٹانگ ڈالے اور ایک ہاتھ سے بادبان پکڑ کے گھنٹوں کھڑا ہو کر گھورا کرتا اور جس وقت ژالہ باری سے اس کی پلکیں تک جم کے رہ جاتیں اور ہوا اتنی خطرناک ہو گئی تھی کہ اُسے اُٹھ کے جہاز کے اندر آتی جہازی نیں کی ہو سے گھبرا کر جہاز کے اگلے حصے میں سے ہٹ آتے تھے اور درمیانی حصے میں پشتوں کے ساتھ قطار لگا کر کھڑے رہا کرتے۔ بپھرتی ہوئی لہروں سے بچاؤ کی طرح محفوظ رہنے کے لیے ہر آدمی نے اپنے ہی رسی کا ایک حلقہ سا باندھ دیا تھا اور اس کے اندر کھڑا جھولتا رہتا تھا۔ ان لوگوں میں بات چیت بالکل نہ ہوتی۔ بالکل یوں لگتا جیسے موم کے بنے جہازی کھڑے ہوں۔ اس حالت میں ہمارا دلکش جہاز جنگلی لہروں کی مسرت اور پاگل پن کے درمیان بھٹکا چلا جا رہا تھا۔ رات کو بھی سمندر کی چیخوں کے مقابلے میں انسانوں کا سکوت اسی طرح قائم رہتا۔ لوگ رسیوں کے حلقے میں چپ چاپ جھولتے رہتے اور وہاب سگار، وسعت ہوا کے سامنے ڈٹا کھڑا رہتا۔ جب فطرت آرام کی متقاضی ہوتی، اس وقت بھی وہ اس آرام کی تلاش میں بستر پر نہ جاتا۔ ایک شام اسٹار بک نے جو بھولے نہیں سکتا، ایک رات کو وہ مقیاس الحرارت دیکھنے کپتان کے کمرے میں جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا وہاب اپنی کرسی میں گڑی ہوئی کرسی پر سیدھا بیٹھا ہے۔ وہ بارش اور ژالہ باری میں سے تھوڑی دیر پہلے اندر آیا ہے لیکن ٹوپی اور کوٹ ابھی تک نہیں اتارا۔ ان پر سے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ ٹپک رہے ہیں۔ اس کے پاس والی میز پر سمندر کے مدوجزر کا ایک نقشہ کھلا ہوا رکھا تھا اور داہنے ہاتھ میں جھولتی ہوئی قندیل بھی تھی۔ جسم تو سیدھا تھا لیکن سر پیچھے ڈال رکھا تھا۔ چنانچہ اس کی بند آنکھوں کا بھی رخ اس قطب نما کی سوئی کی طرف تھا جو چھت کی کڑی میں لگی ہوئی تھی۔

اسٹار بک لرز اٹھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا ـــــ غضب کا بڈھا ہے۔ اس طوفان میں سو رہا ہے لیکن آنکھیں برابر اپنے مقصد کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

جہاز کے دوسرے جہاز کے پاس پہنچ گئے، اور اس کے آگے پیچھے ایک قطار بنا کر تیرنے لگے۔ چونکہ اب وہ گرم سمندر میں سفر کر رہا تھا اور اس نے اس طرح کے نظارے بہت دیکھے ہوں گے لیکن مرجانی کیڑوں اور ایسی چیزوں میں عجیب عجیب شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔

"میرے پاس سے ہٹ گئیں! اچھا!" راجا نے جھک کر پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ خود ان الفاظ میں کچھ نہ تھا لیکن اس پاگل بڈھے کے لہجے میں ایک بے چارگی اور افسردگی تھی کہ پہلے کبھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اب وہ اس آدمی کی طرف مڑا جو سکان سنبھالے ہوئے تھا اور جس نے جہاز کا رخ ہوا کے خلاف کر رکھا تھا تاکہ اس کی رفتار تیز نہ ہونے پائے۔ اس سے راجا نے اپنی شیر جیسی آواز میں اونچا کر کہا ـــــــ "مشرق تھا اور اب تو پوری دنیا کے گرد چکر لگانا ہے!"

دنیا کے گرد! ان الفاظ کی آواز میں کوئی ایسی چیز ہے جس سے بڑے فخر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن دنیا کے گرد یہ سفر ہمیں کہاں لے جاتا ہے؟ یہیں بے شمار خطرات میں سے گزار کر وہیں لے آتا ہے جہاں سے ہم چلے تھے اور جن لوگوں کو ہم صحیح سلامت پیچھے چھوڑ گئے تھے وہ اس تمام عرصے آگے کی طرف رہے تھے۔

اگر یہ دنیا ایک لامتناہی میدان ہوتی اور مشرق کی طرف چل کر ہمیں ہمیشہ نئے افق اور عجیب و غریب مناظر ملتے رہتے تب تو سفر کے کوئی معنے بھی تھے لیکن ہم جن پُراسرار چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں یا جو حسرتیں کبھی کبھی ہر انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہیں اس کو دنیا کے گرد تعاقب کرتے ہوئے ہم آخر کسی ویران بھول بھلیاں میں جا پہنچتے ہیں یا راستے ہی میں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

باب-۵۲

جہازوں کی ملاقات

اب کے اس جہاز پر نہ جانے کی ظاہری وجہ تو یہی تھی کہ ہوا اور سمندر طوفان کی دھمکی دے رہے تھے۔ لیکن اگر یہ بات نہ بھی ہوتی تو بھی ایسے حالات میں آگے چل کے اس کا جو رویہ دیکھتے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سوال کا جواب نفی میں ملتا تو وہ اس جہاز پر کبھی نہ جاتا۔ آخر میں یہی پتہ چلا کہ اگر اسے وہ اطلاعات حاصل ہونے کی اُمید نہ ہوتی جن کی فکر میں وہ ہر وقت لگا رہتا تھا تو کسی دوسرے جہاز کے کپتان سے وہ پانچ منٹ کے لیے بھی نہ ملتا۔ اب اس چیز کی اہمیت کو پوری طرح اندازہ نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جب دو شکاری جہاز اجنبی سمندروں میں، اور خصوصاً مشترکہ شکارگاہوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کیا رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

اگر امریکہ یا انگلستان کے کسی بنجر میدان میں اتفاق سے دو اجنبیوں کی مڈبھیڑ ہو جائے تو لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کریں، دو چار منٹ رک کر خبریں سنائیں بلکہ شاید تھوڑی دیر ساتھ بیٹھ کے آرام بھی کریں۔ پھر یہ تو اور بھی فطری بات ہے کہ دنیا کے آخری کنارے پر سمندر کے لامتناہی جنگلوں میں دو شکاری جہاز ایک دوسرے کو دیکھیں تو آواز دیں، ایک دوسرے کے قریب آ جائیں بلکہ یار ہو کر ملنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز اس حالت میں اور بھی لازمی ہو جاتی ہے کہ جب دونوں جہاز ایک ہی بندرگاہ کے ہوں، ان کے کپتان، افسر اور بہت سے جہازی ایک دوسرے سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور انھیں آپس میں طرح طرح کی گھریلو باتیں کرنی ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ جو جہاز اتنے دنوں سے غائب رہا ہے اس کے لیے سفر پر نکلنے والا جہاز خط لا رہا ہو۔ بہر حال وہ اسے کچھ دیکھا اخبار تو ایسے دے گا ہی جو اتنے پرانے نہ ہوں جتنے اس جہاز میں رکھے ہوئے زرد اور میلے کچیلے اخبار۔ اس عنایت کے بدلے میں سفر پر جانے والے جہاز کو اس شکارگاہ کی اطلاعات حاصل ہوں گی جدھر وہ جا رہا ہے اور یہ خبریں اس کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ بات ایک حد تک ان جہازوں پر بھی صادق آتی ہے جنھیں گھر سے چلے ایک ہی سی مدت گزر چکی ہو اور جن کی ملاقات خود شکارگاہ کے اندر ہو کیونکہ ممکن ہے ان میں سے ایک جہاز کو کسی تیسرے جہاز سے جو اب بہت دور پہنچ چکا ہے، کچھ خطوط ملے ہوں اور ان میں سے بعض خط اس جہاز والوں کے لیے ہوں جس سے اب مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک دوسرے کو شکار سے متعلق اطلاعات بہم پہنچائیں گے اور ایک دوسرے سے گپ شپ ہوگی کیونکہ یہ لوگ جہازیوں کی سی باہمی ہمدردی کے ساتھ تو ملتے ہی ہیں لیکن اوپر سے وہ ہم مزاجی ہے جو مشترک پیشے اور ایک جیسی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر دونوں طرف والے ایک زبان بولتے ہوں، جیسے انگریز اور امریکن، تو ملکوں کے اختلاف سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ چونکہ انگریزوں کے شکاری جہاز تعداد میں کم ہیں، اس لیے ایسی ملاقاتیں کم ہی پیش آتی ہیں اور جب پیش آتی ہیں تو انگریزوں اور امریکنوں کے درمیان ایک جھجک سی حائل رہتی ہے کیونکہ انگریز کم آمیز ہوتے ہیں اور امریکنوں کو اپنے سوا یہ چیز کسی اور میں پسند نہیں آتی۔ اس کے علاوہ انگریز بعض اوقات امریکی جہازوں پر شہریوں جیسی فوقیت جتاتے ہیں اور غیر ملک کے لمبے اور پتلے جہازوں

کان کے سسم سے اتفاق ہی کی وجہ سے سمندر کے ویرانوں کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ انگریزی جہازوں کو فوقیت کس بات میں حاصل ہے حالانکہ انگریزی جہاز کو دس سال میں جتنی وہیلیں مارتے ہیں اتنی امریکی جہاز ایک دن میں مار لیتے ہیں لیکن یہ انگریزی جہازوں کی ایک بے ضرر سی کمزوری ہے جس کو نینٹ کٹ والے بالکل برا نہیں مانتے۔ شاید اس وجہ سے کہ انہیں معلوم ہے ہمارے اندر بھی دو چار کمزوریاں ہیں۔

غرض کہ جتنے جہاز سمندر میں الگ الگ چلتے ہیں ان میں سب سے زیادہ شکاری جہازوں کو ملنسار ہونا چاہیے —— اور واقعی وہ ہوتے بھی ہیں ملنسار۔ اس کے برخلاف جب تجارتی جہاز بحر اوقیانوس کے بیچوں بیچ آمنے سامنے آتے ہیں تو اکثر سلام دعا کیے بغیر ہی گھوڑوں کی طرح نکل جاتے ہیں جیسے نیویارک کی سڑک پر دو بانکے۔ اور شاید ساتھ ساتھ تو ایک دوسرے کے سازو سامان پر صنف گستاخیاں بھی کرتے چلتے ہیں۔ رہے جنگی جہاز تو جب سمندر میں ان کی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو وہ نہایت احمقانہ طریقے سے آداب تسلیمات بجا لاتے ہیں اور واقعی دنڈ جھنڈے جاتے ہیں کہ اس حرکت میں خلوص اور برادرانہ محبت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ غلاموں کی تجارت کرنے والے جہازوں کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ ایسی عجلت میں ہوتے ہیں کہ جلدی سے جلدی ایک دوسرے کے پاس سے بھاگ جاتے ہیں۔ اچھا جب ڈاکوؤں کے جہازوں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو وہ سب سے پہلے پکار کر پوچھتے ہیں —— "کتنی کھوپڑیاں ہیں؟" —— یعنی جس طرح شکاری جہازوں کا نعرہ ہوتا ہے "کتنے پیپے ہیں؟" اس سوال کا جواب ملتے ہی سمندری ڈاکو ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں کیونکہ دونوں طرف کے لوگ زبردست بدمعاش ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دیدار کی سعادت سے زیادہ دیر مستفیض نہیں ہونا چاہتے۔

لیکن ذرا ایماندار، خدا ترس، منکسر مزاج، مہمان نواز، ملنسار اور آزاد وضع شکاری جہازوں کو ملاحظہ فرمائیے! جب دو شکاری جہاز خوشگوار موسم میں ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو ان لوگوں کے ہاں ایک دستور ہے جسے گیم کہتے ہیں۔ دوسرے جہازوں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا اور اگر اتفاق کہیں سن بھی لیں تو مسکرا مسکرا کر وہیل کا شکار کھیلنے والوں پر فقرہ بازی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ تجارتی جہازوں والے، بحری ڈاکو، جنگی جہازوں کے لوگ اور غلاموں کی تجارت کرنے والے جہازوں کے ملاح شکاری جہازوں کی طرف سے اتنے حقارت آمیز جذبات رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کیونکہ مثال کے طور پر بحری ڈاکوؤں کو ہی لیجیے۔ کیا ان کے پیشے میں کوئی خاص شان کی بات ہے؟ اس پیشے میں انجام کار ضرور غیر معمولی بلندی حاصل ہوتی ہے —— لیکن سولی کے اوپر چڑھ کے۔ جب آدمی کو اس عجیب و غریب بلندی حاصل ہو تو اس کا احساس برتری بالکل بے بنیاد چیز ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سمندری ڈاکو وہیل کے شکاری سے افضل ہونے کی شیخی بگھاریں بگھاریں لیکن یہ خالی دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

لیکن گیم کیا چیز ہے؟ لغت کے صفحوں میں چھان بین کرتے کرتے آپ کی انگشت شہادت گھس جائے گی لیکن یہ لفظ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر جانسن کے علم کی بھی رسائی یہاں تک نہیں ہو سکی۔ ویبسٹر کے خزانے میں بھی یہ لفظ آپ کو نہ ملے گا۔ بہرحال یہ معنی خیز لفظ کئی ہزار صحیح النسل امریکی ایک مدت سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اب تو یہ لفظ لغت میں شامل ہو جانا چاہیے اور اس کی تعریف بھی متعین کر دینی چاہیے۔ اس مقصد کے پیش نظر میں نہایت عالمانہ انداز سے اس کی تعریف پیش کروں گا۔ گیم: اسم —— وہیل شکار گاہ

ہیں۔ دو یا زیادہ شکاری جہازوں کی ملاقات جب ہوتی ہے تو دونوں طرف سے نعرے بلند ہوتے ہیں پھر ایک جہاز کے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر دوسرے جہاز میں جاتے ہیں اور اس دوران میں دونوں کپتان ایک جہاز میں رہتے ہیں اور دونوں چیف میٹ دوسرے جہاز میں۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہئے یہ ہے کہ ہر پیشے میں دو چار چھوٹی موٹی خصوصیات ہوتی ہیں یہی حال اس ویل کے شکار کا ہے۔ ڈاکوؤں کے جہاز یا جنگی جہاز یا غلاموں کے جہاز میں جب کپتان کشتی میں سوار ہو کر کہیں جاتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف ایک نہایت آرام دہ اور بعض اوقات گدے دار نشست پر بیٹھتا ہے اور اکثر سکان خود ہی چلاتا ہے جس میں رنگ برنگے فیتے بندھے رہتے ہیں لیکن شکاری جہاز کی کشتی میں نہ تو نشست ہوتی ہے نہ سکان ہوتا ہے کیا اچھا لگے گا کہ شکاری جہازوں کے کپتان سمندر میں ایسے چلیں جیسے گٹھیا کے مارے بڈھے بیٹھ کر کرسی پر چلتے ہیں۔ رہا سکان تو شکاری کشتی میں اس نہایت کا موقع نہیں ہوتا چونکہ دو جہازوں کی ملاقات میں کشتی کا پورا عملہ چلا جاتا ہے اور برچھے باز بھی ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس وقت کشتی کے رخ کی دیکھ بھال وہی شخص کرتا ہے کپتان کے بیٹھنے کی کوئی جگہ تو ہوتی نہیں، اس لیے وہ صنوبر کے درخت کی طرح سیدھا کھڑا ہو کے چلتا ہے۔ اکثر اوقات کپتان کو احساس ہوتا ہے کہ دونوں جہازوں کے لوگوں کی نظریں میری طرف لگی ہوئی ہیں چنانچہ اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے وہ ٹانگیں مضبوطی سے جمائے رہتا ہے۔ یہ بات ایسی آسان بھی نہیں کیونکہ ایک بھاری چپو پیچھے کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس کی کمر میں لگتی رہتی ہے اور دوسری جانب آگے کا چپو اس کے گھٹنے سے ٹکراتی ہے۔ غرض وہ آگے اور پیچھے دونوں طرف سے پھنس کے رہ جاتا ہے۔ اگر پھیل سکتا ہے تو بس آڑا آڑا لیکن کشتی کے ہچکولوں کے مارے توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جب تک پیر جمانے کے لیے کافی چوڑی جگہ نہ ہو ٹانگیں دور دور پھیلا کے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آپ بس دو بانسوں کو ایک دوسرے سے ملا کے پھیلا دیں تو وہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ پھر جب ساری دنیا کے دیکھ رہی ہو تو ٹانگیں پھیلا کے کھڑے ہونے والے کپتان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہوتا کہ وہ سب کی نظروں کے سامنے ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ کے اپنا توازن ٹھیک کرے بلکہ اپنے بدن کی لچک اور مضبوطی دکھانے کے لیے وہ تو اپنے ہاتھ پتلون کی جیبوں کے اندر ڈالے رکھتا ہے لیکن عام طور سے کپتان کے ہاتھ بہت بڑے بڑے اور بھاری ہوتے ہیں، اس لیے شاید وہ انھیں وزن کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بہرحال چند ایسی مستند مثالیں موجود ہیں کہ جب کپتان نے کسی نازک وقت میں ———— مثلاً اچانک طوفان آ جانے پر ———— پاس والے ملاح کے سر کے بال پکڑ لیے اور انھیں سے چپک گیا۔

ٹاؤن ہو کی کہانی

جس طرح سنہری سرائے میں سنائی گئی

راس امید اور اس کے آس پاس کا بحری علاقہ کسی بہت بڑی شاہراہ کے مشہور و معروف چوراہے کی طرح ہے جہاں آپ کی اتنے آدمیوں سے ملاقات ہوتی ہے کہ اور کہیں بھی نہیں ہو سکتی۔

گونی سے ملاقات ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد ہمیں گھر کی طرف جاتا ہوا ایک اور شکاری جہاز ملا جس کا نام ٹاؤن ہو تھا۔ اس میں تقریباً سارے کے سارے ہی ملاح بحر الکاہل کے مشرقی جزیروں کے رہنے والے تھے۔ ان لوگوں نے تھوڑی دیر کی ملاقات میں ہمیں موبی ڈک کے متعلق بڑی گرما گرم خبریں سنائیں۔ ان لوگوں کی کہانی میں ایک ایسی بات تھی جس کے ذریعے سفید وہیل خدا کے اس عذاب سے متعلق ہو جاتی تھی جو کہتے ہیں کہ بعض آدمیوں پر نازل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ بری ڈک سے بعض لوگوں کی دلچسپی بے انتہا بڑھ گئی۔ یہ چیز اس المناک کہانی کا گویا پوشیدہ حصہ تھی جو میں ابھی سنانے والا ہوں۔ لیکن یہ بات کپتان اہاب اور اس کے تینوں میٹوں کے کانوں تک نہیں پہنچنے پائی کیونکہ ٹاؤن ہو کے کپتان کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ یہ واقعہ اس جہاز کے تین سفید فام ملاحوں کی ذاتی ملکیت تھا جن میں سے ایک نے اسے ٹاشٹیگو کو سنایا اور قسم دے دی کہ اسے پوشیدہ راز میں رکھا جائے لیکن اگلے دن رات کو ٹاشٹیگو سوتے میں بڑبڑانے لگا اور اتنا کچھ کہہ گیا کہ جاگنے کے بعد باقی حصہ پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ بہرحال پیکوڈ کے جن جہازیوں کو اس کا علم ہو گیا ان کے دل پر ایسا اثر ہوا اور انھوں نے اس معاملے میں اتنی احتیاط سے کام لیا کہ بات صرف اپنے ہی تک رکھی اور پیکوڈ کے ملاحوں سے آگے کسی کو اس کی ہوا تک نہ لگی۔ اب میں وہ کہانی بیان کرتا ہوں جو سب کے سامنے جہاز پر سنائی گئی تھی اور مناسب موقع پر اس پُر اسرار واقعے کا حال بھی سنا دوں گا۔

ایک دفعہ میں نے یہ کہانی لیما کی سنہری سرائے میں ایک تہوار کے دن ٹائل دار فرش والے شہ نشین پر تنہا بیٹھے ہوئے اپنے چند ہسپانوی دوستوں کو سنائی تھی۔ اپنی دل لگی کی خاطر میں وہی انداز بیان برقرار رکھوں گا۔ ان پانچ بانکے نوجوانوں میں سے پیڈرو اور سیباسٹین مجھ سے خاصے بے تکلف تھے انھوں نے بیچ بیچ میں جو سوال پوچھے وہ بھی میں نے لکھ دیے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے جواب بھی۔

حضرات! جو واقعات میں آپ کو سنانے والا ہوں جب مجھے ان کا علم ہوا تو اس سے کوئی دو سال پیشتر کا ذکر ہے کہ جہاز ٹاؤن ہو آپ کے بحر الکاہل میں اس سرائے سے مشرق کی طرف چند دن کی مسافت کے فاصلے پر وہیلوں کی تلاش میں چلا جا رہا تھا۔ جہاز خط استوا سے کچھ شمال کی طرف تھا۔ ایک دن صبح کو سب دستور لوگ پانی کے پمپ لے کے پہنچے تو دیکھا کہ آج پانی کچھ زیادہ ہی جمع ہوا ہے۔ ان لوگوں نے سوچا شاید کوئی مچھلی تختے میں سوراخ کر گئی ہو گی لیکن نہ معلوم کیوں کپتان کو خیال تھا کہ اس علاقے میں اتنا شکار ہے کہ اگر اس کا نصیب جاگ اٹھے گا چنانچہ وہ یہاں سے چلنے کو راضی نہ ہوا۔ حالانکہ سوراخ کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کے باوجود یہ کسی طرح ہاتھ نہ آیا لیکن اسے کوئی خطرناک چیز نہیں سمجھا گیا۔ جہاز برابر چلتا رہا اور جہازی نہایت آرام کے ساتھ لمبے لمبے وقفوں کے بعد پمپ چلا کر پانی اُلیچتے رہے۔ مگر کپتان کا نصیب برابر سوتا ہی رہا۔ اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ سوراخ ابھی تک نہ مل سکا لیکن پانی اور زیادہ اندر آنے لگا۔

یہاں تک کہ کپتان بھی ڈر گیا۔ اس نے سارے بادبان اتروا دیئے اور ان جزیروں میں کسی بندرگاہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا کہ وہاں جا کے
جہاز کی مرمت کرائے۔

حالانکہ جہاز کو لمبا سفر درپیش تھا لیکن کپتان کو اس بات کا ذرا بھی ڈر نہ تھا کہ راستے میں جہاز ڈوب جائے گا کیونکہ اس کے
تلے نہایت مضبوط تھے اور جیسے جہازی جاری باری سے کام کر کے نہایت آسانی سے پانی نکال سکتے تھے یعنی اگر سوراخ لگ گیا ہو جائے
تو بھی جہاز کو ایسا خطرہ نہ تھا۔ راستے بھر ہوا اچھی موافق رہی تھی کہ لالن بغیر کسی حادثے کے بغیر سلامتی کے ساتھ تقریباً اپنی بندرگاہ میں
پہنچ ہی گیا تھا لیکن جہاز کے ہیٹ ٹریلی کے تجربے اور اسٹیل کٹ کے شدید اشتیاق جذبے نے سب سیتا اس کر کے رکھ دیا۔ ریلی
دلیر ڈاکو رہنے والا تھا، اور اسٹیل کٹ بفیلو کا چھٹا ہوا شہدا۔

"بفیلو ایک جگہ کدھر ہے؟" نتاسٹیفن نے اپنی بھولی بھولی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر۔

"جھیل ایری کے مشرقی کنارے پر بھی صاف کیجئے گا، یہ سب باتیں تو میں ابھی آپ کو بتا دوں گا، غیر حضرات، آدم بیسر
مطلب اس شخص نے امریکہ کے وسط میں جنگل سے گھری ہوئی جھیلوں کے اندر سفر کیا تھا اور تین ستونوں والے یا چوکور بادبانوں
والے اتنے ہی مضبوط اور بڑے جہازوں میں جتنے آپ کے کالاؤ سے بفیلو جانے والے جہاز ہوتے ہیں۔ وہاں اُسے انہیں جنگلی
تجربوں سے سابقہ پڑا تھا جنہیں کھلے سمندر سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ جہاں پر ایک دوسرے سے ملی ہوئی زبردست
جھیلیں ــــ ایری، اونٹاریو، ہیورن، سپیریر اور مشیگن ــــ سب مل کر ایک سمندر کی وسعت اور اس کی کئی بہترین خصوصیات
کی حامل ہیں۔ ان کے کنارے ہر طرح کی آب و ہوا اور ہر طرح کی نسلیں بستی ہیں۔ بحر الکاہل کی طرح جہاں بھی نہایت دوسرے قسم کے جزیرہ
کے جھنڈ ہیں جس طرح بحر اوقیانوس کے دونوں کناروں پر دو دو ریاست قریب آباد ہیں اسی طرح یہاں بھی ان کے کناروں پر بڑی
چھوٹی چھوٹی آبادیات واقع ہیں۔ جہاں تک جہاز باسانی پہنچ سکتے ہیں پھر جگہ جگہ چٹانوں پر توپ خانے چڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔
ان جھیلوں نے بڑی فتوحات کی گرج سنی ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے ساحلوں پر وحشی جنگلیوں کو جگہ دی ہے جن کے لال لال رنگے چہرے
ان کے خیموں میں سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دونوں طرف میلوں تک پرانے جنگل پھیلے ہوئے ہیں جہاں آج تک آدمی کا
قدم نہیں گیا اور جہاں صنوبر کے تنے تنے درخت شاہانہ وقار کے ساتھ کھڑے ہیں۔ انہی جنگلوں میں تو خونخوار درندے بستے ہیں اور وہ
وحشی جانور بھی جن کی سمور سے تاتاری شہنشاہوں کا لباس تیار ہوتا ہے۔ ان جھیلوں کا پانی گاؤں کی بھی قدر کرتا ہے اور بفیلو اور کلیو لینڈ
کے شاندار صدر مقام بھی ہیں۔ ان میں تجارتی جہاز بھی چلتے ہیں، جنگی جہاز بھی۔ انجن بھی اور کشتیاں بھی، یہاں اتنی ہی خوفناک اور
ہلاکت خیز ہوائیں چلتی ہیں جتنی سمندر میں۔ یہ جھیلیں ڈوبتے ہوئے جہازوں سے بھی واقف ہیں کیونکہ یہ کھلے اندر ہیں مگر انہوں نے
ایسی ایسی جگہ جہاں جنگل کا نام و نشان تک نہ تھا آدھی رات کو بہتیرے جہاز چٹانوں سے ٹکراتے ڈوبتے دیکھے ہیں۔ تو حضرات میرا مطلب
یہ ہے کہ اسٹیل کٹ اندرون ملک کا باشندہ تھا مگر وہ ایک وحشی سمندر میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ یہ شخص اتنا ہی اچھا
اور دلیر جہازران تھا جتنا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف ریڈنی حالانکہ اپنے بچپن میں من کٹ کے ویران ساحل پر پلا بڑھا ہوگا
سمندر ہی کا دودھ پیا کر بڑا ہوگا اور بڑے ہونے کے بعد اس کی ساری زندگی درشت مزاج اوقیانوس اور صوفی منش بحر الکاہل میں

گزرتی تھیں وہ اتنا ہی کینہ پرور اور جھگڑالو تھا جتنا کوئی ان جگہوں میں رہنے والا جہازی جہاں آپس میں جنگ کرتے رہنے والے جہاز چلتے ہیں۔ تاہم اس شخص میں چند خوبیاں بھی تھیں۔ سٹیل کٹ تھا تو بدصورت لیکن اگر اس کے ساتھ سختی برتی جاتی اور ساتھ ساتھ اس شرافت اور انسانیت سے بھی کام لیا جاتا جو تھوڑے سے تھوڑے غلام کا بھی حق ہے، تو وہ ایک حد تک فرمانبردار اور بے ضرر ہی رہتا۔ بہرحال اب تک تو وہ جہازی رہا تھا لیکن ریڈنی کی شامت آئی اور اس نے غضب کا پاگل پن دکھایا۔ ادھر اسٹیل کٹ ـــــ لیکن خیر ابھی آپ سنتے جائیے۔ جہاز تو جب شاہی جزیروں میں کسی بندرگاہ کی تلاش میں چل دیا تو اس کے دو ایک دن بعد کا ذکر ہے کہ سوراخ اور بڑھنے لگا۔ گو پمپ مشکل ہی روزانہ دو ایک گھنٹے زیادہ چلانے پڑیں۔ آپ کو جاننا چاہئے کہ بحر اوقیانوس جیسے آباد اور تہذیب یافتہ سمندر میں بعض دفعہ تو جہاز میں پارے اس بادبانوں سے پانی نکالتے چلے جاتے ہیں اور انھیں ذرا گھبراہٹ نہیں ہوتی البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر رات کی خاموشی اور نیند میں عرشے کی نگرانی کرنے والا افسر اس سلسلے میں اپنا فرض بھول جائے تو اغلب امکان ہے کہ ان لوگوں کو اسے یاد رکھنے کی پھر ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ وہ آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں بیٹھتے چلے جائیں گے۔ حضرات آپ کے ملک سے مغرب کی طرف بہت دور جو ویران اور وحشی سمندر ہے وہاں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ لمبے سے لمبے سفر میں جہاز کے سارے پمپ سنگت میں لگے کھڑے رہیں ـــــ یعنی اگر جہاز کسی ساحل کے قریب سفر کر رہا ہو یا کوئی پناہ گاہ نزدیک ہو البتہ جب سوراخ کسی ایسی جگہ پہنچ کے ہو جہاں دور دور تک خشکی نظر نہ آئے تو اس وقت کپتان ضرور پریشان ہوجاتا ہے۔

کچھ یہی معاملہ ٹاؤن ہو کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ جب اس کا سوراخ بڑھنے لگا تو بعض آدمیوں کو تھوڑی بہت گھبراہٹ ہوئی خصوصاً جہاز کے چیف ریڈنی کو۔ اس نے حکم دیا کہ اوپر والے بادبان اچھی طرح پھیلا دیئے جائیں اور ہوا کے رخ پر کر دیئے جائیں۔ اس شخص کو بزدل نہ سمجھئے۔ اسے اپنی جان کی اتنی ہی کم فکر تھی جتنی کسی پاتری میں بے دھڑک اور لاابالی آدمی کو ہو سکتی ہے چنانچہ جب اس نے جہاز کی سلامتی کے متعلق اتنی فکرمندی دکھائی تو بعض جہازیوں نے کہا کہ اسے اتنی پریشانی اس وجہ سے ہے کہ یہ بھی جہاز میں حصہ دار ہے۔ چنانچہ اس روز شام کو جب وہ پمپ چلانے کھڑے ہوئے تو اس سلسلے میں بڑی چہ میگوئیاں اور فقرے بازیاں ہوئیں۔ ان کے پیر بھاری ہتھوڑوں کی طرح کے اٹھتے ہوئے اور صاف شفاف پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور پانی نالوں میں سے گر کر عرشے پر سے بہتا ہوا اگلی طرف والے نالوں میں سے پھر سمندر میں جا رہا تھا۔

حضرات شکل ہو یا نہ ہو، ہماری روایت پرست دنیا کا جو دستور ہے اس سے تو آپ واقف ہی ہوں گے، جب کوئی شخص اپنے کسی ماتحت کو مردانگی میں اپنے آپ سے افضل پاتا ہے تو اس کی آگ اور نفرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا اور وہ موقع ملتے ہی اپنے ماتحت کے غرور کو خاک میں ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرات میرا یہ خیال درست ہو یا نہ ہو، بہرحال سٹیل کٹ لمبا تڑنگا، چوڑا چکلا اور رنج روغ کا آدمی تھا ـــــ روس لوگوں کا سا سر، لہراتی ہوئی سنہری ڈاڑھی جیسے آپ کے وائسرائے کے اصیل گھوڑے کی ایال، دل و دماغ اس نے ایسا پایا تھا کہ اگر وہ شارلیمین کے باپ کے ہاں پیدا ہوتا تو واقعی شارلیمین ہی بنتا۔ لیکن ریڈنی ایسا بدصورت تھا جیسے خچر، بھونڈا، ناک پچکا، اڑیل اور کینہ پرور۔ اسے اسٹیل کٹ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور یہ بات اسٹیل کٹ کو بھی معلوم تھی۔

وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نل چلا رہا تھا کریٹ کو ادھر آتے دیکھا لیکن یہ بیان گیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو اور جس جس کے بے ٹھکانے کو
اسی طرح پھبتیاں کستا رہا۔

"ہاں ہاں پیارو، یہ سوراخ تو بڑے زور کا ہوا ہے۔ ذرا تمام لوٹ لگا کے تھوڑا سا پانی تو نچوڑ کے تو دیکھیں یہاں سے یہ تو
اس لائق ہے کہ ڈونگوں میں بھر کے رکھ لو۔ میں سچ کہتا ہوں یار، بچارے ریگی نے جتنا روپیہ لگایا ہے وہ سب اسی کی بھینٹ چڑھ
جائے گا۔ اس کے لیے تو یہی اچھا ہے کہ جہاز کا جتنا ٹکڑا اس کے حصے میں پڑتا ہے اسے کاٹ لے اور رسی میں باندھ کے کھینچتا ہوا
گھر لے جائے۔ جانو تو اصل بات یہ ہے کہ یہ کام شروع ہو گیا تھا مچھلی نے لیکن اب وہ آرا مچھلی، بیگی مچھلی اور نہ معلوم کون کون سی مچھلیوں کی
پوری فوج لے کے آگئی ہے اور جہاز کے پیندے میں کاٹ چھانٹ کر رہی ہے ہو راج کی دوستی بھی ہو رہی ہوگی۔ اگر ریگی یہاں ہوتا تو
میں اس سے کہتا کہ سمندر میں کود پڑو اور ان مچھلیوں کو بھگا دو۔ یہ تو اس کی جائیداد کا ستیاناس کیے دے رہی ہیں لیکن ریگی بے چارہ
سیدھا آدمی اور جس بھی کس بلا کا پایا ہے یار، سنتا ہے کہ اس نے اپنا باقی روپیہ انگوروں کی تجارت میں لگا رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ
تھوڑے دن کے لیے اس کی ناک تو میں ہی گھسا دوں۔"

"ارے کم بخت، یہ کیا ہو رہا ہے! تم کیوں رک گیا؟" ریگی یہ بیان گیا جیسے جہازیوں کی باتیں سنی ہی نہیں، اور چنگھاڑ کے
بولا۔ "زور سے چلاؤ!"

"بہت اچھا جناب!" اسمیل کٹ نے اسی جنونی پن کے ساتھ کہا۔ گھنے زور زور سے چلانے لگے زور زور سے اور نل کھڑکھڑاتے زور سے
چلنے لگا جیسے آگ بجھانے والے پچاس انجن۔ جہازیوں نے اپنی ڈبیاں [illegible] کے پھینک دیں اور تھوڑی دیر میں ہانپنے کی آواز سنائی
دینے لگی جس سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کی پوری قوت سے پمپ کر رہے ہیں۔

آخر کار اپنی ٹکڑی کے لوگوں کے ساتھ نل کے پاس سے ہٹ کر اسمیل کٹ ہانپتا ہوا آگے کی طرف چل دیا اور ایک تختے پر بیٹھ گیا۔
چہرہ سرخ، آنکھیں لال انگارہ، پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا۔ پتا نہیں اس وقت ریگی کو کس شیطان نے انگلی دکھائی کہ وہ
اس شخص کو چھیڑ بیٹھا جو تکان سے چور تھا۔ بھرا ہوا ہی بیٹھا تھا [illegible] کر اٹھایا اور اسے حکم دیا کہ جہاز کے تختے صاف کرے
اور کیچڑ سے وہ نجاست ہٹائے جو ایک سور نے پھیلا دی تھی۔

اچھا حضرت، عرشے پر جھاڑو دینا ایک ایسا گھریلو کام ہے جو طوفان کے سوا ہر روز نہایت باقاعدگی کے ساتھ شام کو
انجام دیا جاتا ہے۔ بعض شاید آپ بھی یہی کہ لوگوں نے ڈوبتے ہوئے جہاز میں جھاڑو دی ہے۔ سمندر کے رسوم ورواج اتنے اٹل
ہیں اور جہازیوں میں صفائی کا خیال ایسی عادت ثانیہ بن گیا ہے کہ بعض لوگ تو ڈوبنے سے پہلے منہ ہاتھ دھوتے ہیں لیکن سب جہازوں
میں یہ کام خلاصیوں کے سپرد ہوتا ہے —— یعنی اگر خلاصی ہوں تو۔ اس کے علاوہ ڈاؤن ہو میں جتنے طاقتور آدمی تھے انھیں چھوٹی چھوٹی
ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور وہ باری باری سے نل چلاتے تھے چونکہ اسمیل کٹ سب سے زیادہ ورزشی بدن کا آدمی تھا، اس لیے
وہ ایک دستے کا سردار مقرر ہوا تھا۔ لہٰذا ان چھوٹے چھوٹے کاموں کا تعلق جہاز رانی سے نہ تھا انھیں اس کے ذمے نہیں ڈالا جاتا
تھا۔ آخر اس کے ساتھیوں کو بھی اس فرض سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ یہ ساری تفصیلات اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ اچھی طرح سمجھ لیں

ان دو آدمیوں کے درمیان یہ جھگڑا کس طرح پیش آیا تھا۔

لیکن بات اس سے کچھ زیادہ تھی۔ عرشے کو صاف کرنے کا کام اس مقصد سے دیا گیا تھا کہ ایشل کٹ کی توہین ہو اور وجہ یہ یعنی
ریڈلی نے گویا اس کے چہرے پر تھوک دیا تھا۔ جس شخص نے شکاری جہاز میں کام کیا ہو یہ بات اس کی سمجھ میں فوراً آجائے گی۔ بیٹ
نے حکم دیا تو ایشل کٹ سب کچھ سمجھ گیا لیکن وہ لمحہ بھر خاموش بیٹھا رہا۔ بیٹ کی کیفیت یہ تھی کہ آنکھوں میں بارود کے پیپے رکھے نظر آتے
میں جو آگ لگنے کو تھی اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جو لوگ واقعی بہادر اور دلیر ہوتے ہیں ان میں ایک عجب قسم کا تحمل ہوتا ہے۔
اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچی ہو تو بھی وہ اپنے غصے کو روک سکتے ہی رہتے ہیں۔ جب ایشل کٹ نے جلی طور پر ساری بات سمجھ لی تو اس پر بھی
بے نام اور پر اسرار حیرت طاری ہو گئی۔

چنانچہ اپنے عام لہجے میں جو خستگی اور تھکن کی وجہ سے کچھ شکستہ سا ہو گیا تھا، ایشل کٹ نے جواب دیا کہ عرشے پر جھاڑو دینا
میرا کام نہیں اور میں ایسی بات کروں گا جس کے لیے مجھے نجاست ہٹانے کا کام کرنے کے تین غلاموں کی طرف اشارہ کیا جن سے جنگلی کا کام
لیا جاتا تھا چونکہ انھیں کل چلانے پر نہیں لگایا گیا تھا اس لیے یہ لوگ دن بھر خالی رہتے تھے۔ اس کے جواب میں ریڈلی نے نشے کی گڑگڑ
اور تحکمانہ انداز میں گالی دے کر اپنا حکم پھر دہرایا اور ایک پیپے پر سے ہتھوڑا اٹھا کر خاموش بیٹھے ہوئے ایشل کٹ کی طرف بڑھا۔

ایشل کٹ تحمل سے تو ضرور کام لے رہا تھا لیکن کل چلانے کی جاں گسل محنت کے بعد وہ اتنا گرم اور چڑچڑا ہو رہا تھا کہ بیٹ
کا یہ انداز برداشت نہ کر سکا پھر بھی اس نے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی اور چپ چاپ اپنی جگہ جما رہا۔ ریڈلی نے بڑھ کر اپنا ہتھوڑا
اس کے چہرے کے پاس لا کے ہلایا اور خوفناک لہجے میں حکم دیا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے فوراً کرو۔

اب تو ایشل کٹ اٹھ کھڑا ہوا اور پیچھے ہٹ کر آہستہ آہستہ عرشے کی دوسری طرف چلا گیا۔ بیٹ بھی ہتھوڑے سے دھمکی دیتا
پیچھے پیچھے چلا۔ ایشل کٹ نے دیکھا کہ میرے تحمل کا ذرا بھی اثر نہ ہوا چنانچہ اس نے مٹھی باندھ کر نہایت خوفناک انداز میں ہاتھ ہلایا۔
اور اس احمق کو بازرکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس طرح ان دونوں آدمیوں نے عرشے کے گرد ایک مرتبہ اور چکر لگایا۔ ایشل کٹ
نے سوچا کہ اب بات میری برداشت سے باہر ہو چلی۔ لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا کہ اب میں ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا اور رک کے
اپنے افسر سے بولا:

"مسٹر ریڈلی! میں آپ کا حکم نہیں مانوں گا۔ آپ یہ ہتھوڑا ہٹا لیجیے ورنہ آپ کی خیر نہیں۔" لیکن بیٹ کی تو شامت آئی تھی۔ وہ
اور قریب آگیا اور گندی گندی گالیاں دے کر اس کے دانتوں کے قریب اپنا ہتھوڑا ہلانے لگا۔ ایشل کٹ اپنی جگہ سے بال بھر بھی نہ
سرکا اور اپنی نظر بے خوف ہو کر اس کی آنکھوں میں اتارنے لگا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی باندھ لی اور اسے آہستہ آہستہ پیچھے کھینچ کر
اس کمینگی بازی سے بولا کہ اگر تمھارا ہتھوڑا مجھے چھو بھی گیا تو میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔ لیکن حضرات، اس احمق کے لیے ایشل کٹ
کے ہاتھ سے ذبح ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اس کا ہتھوڑا ایشل کٹ کے گال سے چھو گیا۔ بس ایک لمحہ تھا، اس کے وہ مکا پڑا کہ جبڑا اکھڑ کر
میں اتر گیا۔ وہ پیچھے گرا اور اس کے منہ سے ابل ابل کر خون بہنے لگا۔

ابھی لوگوں کے منہ سے چیخ بھی نہ نکلی تھی کہ ایشل کٹ نے پچھلی طرف کے رستے چڑھنے شروع کر دیے جو ان مستولوں تک

جاتے تھے جہاں اس کے ساتھی پہرہ دے رہے تھے۔ یہ دونوں تھروالے تھے۔

"تھروالے؟" پیڈرو نے کہا۔ "ہم نے اپنی بندرگاہوں میں بہت سے شکاری جہاز دیکھے ہیں لیکن تھروالوں کا نام کبھی نہیں سنا۔ معاف کیجئے گا یہ کون سی مخلوق ہے؟"

"جی، یہ وہ ملاح ہیں جو ابرکی بحر کے علاقے میں رہتے ہیں۔ آپ نے اس کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔"

"نہیں لیونور، ہمارا ملک تو کتابوں، عقیدوں اور روایت پرست لوگوں کا ہے۔ آپ شمال والے لوگ بڑے چاق چوبند ہوتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے متعلق بہت ہی کم جانتے ہیں۔"

"اچھا، خیر، ذرا میرا پیالہ بھریے، آپ کی شراب بڑی زوردار ہے۔ آگے قصہ سنانے سے پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ ہمارے تھروالے کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں کیونکہ ان باتوں سے میری کہانی پر بھی کچھ روشنی پڑے گی۔

"ریاست نیپا لنگ کی پوری چوڑائی میں، تین سو ساٹھ میل تک بہت سے آباد شہروں اور زرخیز دیہاتوں میں، لمبی لمبی ویران اور غیر آباد دلدلوں میں، سونا اگلنے والے کھیتوں میں، شراب خانوں اور عبادت گھروں میں، مقدس جنگلوں میں، ریڈ انڈینوں کی روحیں طوفانوں کے اوپر، دھوپ میں اور سائے میں، خشک دریاؤں میں اور ٹوٹے ہوئے دلوں میں، ہر ایک علاقے کے متضاد مناظر ہیں، اور مقدس گرجاؤں کی برف جیسی سفید میناروں کی قطاروں کے درمیان وحشی کی طرح ناسدا اور لاقانون زندگی کا بھی ایک دھارا متوازی بہتا ہے۔ حضرات، اہل ریڈ انڈین جیسے ملتے ہیں بے دین جنگلی ہیں شور و شر مچاتے ہیں۔ آپ لوگ انہیں ہمیشہ اپنے پڑوس میں پائیں گے ―― گرجاؤں کی سرپرستی میں، ان کے لمبے لمبے سایوں کے نیچے یہ بھی ایک فوجی تقدیر ہے کہ شہروں میں لٹیرے عدالتوں کے قریب بسیرا لیتے ہیں اور گرجا گھر سب سے زیادہ مقدس مقامات پر نظر آتے ہیں۔"

"ارے، کیا یہ کوئی راہب گزر رہا ہے؟" پیڈرو نے سڑک کے ہجوم کی طرف ایک ملامت آمیز فکرمندی کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلیے ہمارے امریکی دوست کے لیے یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تیپا میں گرجا کا محکمہ احتساب ختم ہوگیا!" سباسٹین نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا سینور، آگے سنیے۔"

"گستاخی معاف، آپ کا قطع کلام ہوتا ہے" حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا۔ "میں تیپا کے تمام باشندوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اتنی شائستگی سے کام لیا اور فاسد زندگی کا ذکر کرتے ہوئے تیپا کے بجائے دور دراز وینس کا نام لیا۔ اوہو، اس آداب و تسلیمات کو رہنے دیجیے۔ اتنے تعجب کی ضرورت نہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس سارے ساحل پر کیا شے مشہور ہے ―― تیپا کی طرح گندہ۔" اس سے آپ کی بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ یہاں گرجا تعداد میں عبادت گھروں سے بھی زیادہ ہیں اور ہر وقت گھنٹے بجتے رہتے ہیں، پھر بھی تیپا کی طرح گندے ہیں۔ وینس کا بھی یہی حال ہے۔ میں وہاں گیا ہوں جناب یہ حضرت مرقس کا شہر ہے ―― خدا اس پر رحم کرے۔ خیر! اپنا پیالہ ادھر لائیے۔ شکریہ، لیجیے میں نے پھر بھر دیا۔ ہاں اب آپ اپنا قصہ آگے سنائیے۔"

نہر کے علاقے کا آدمی اتنا شرارت پسند اور عجیب و غریب ہوتا ہے کہ اگر اس کی کارروائیوں کا حال آزادی سے بیان کیا جائے تو وہ کسی ڈرامے کا ہیرو معلوم ہوگا۔ اس کا حال بالکل دریا کی مچھلی کا سا ہے۔ وہ اپنے جھاؤوں بھرے اور لہلہاتے ہوئے کناروں والے دریا سے جنگل میں کسی کی گان انتہائی آرام طلبی کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ اپنی شعر و تولہ پانی سے کھیلتا ہے اور کشتی کے عرشے پر اپنی جوانی کے سے رنگ کی دراز دھوپ میں تپاتا ہے لیکن کنارے پر پہنچ کے اس کی یہ شائستگی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ پرانے شعلے کے ساتھ ٹکڑوں کے سے کپڑے پہنتا ہے۔ اس کے رنگین بیتوں والی تنگ سی ٹوپی اس کے شاندار خدوخال کا پتا دیتی ہے۔ جن گاؤں میں سے گزرتا ہے وہاں کی سکڑتی ہوئی صورتیں اسے دیکھ کر ڈر کے مارے سہم جاتی ہیں۔ شہروں میں بھی اس کے سیاہ چہرے اور اس کی کرتوں سے کچھ کم نفرت نہیں کی جاتی۔ ایک زمانے میں مجھے اسی نہر کے کنارے آوارہ گردی کرنی پڑی تھی۔ وہاں ایک مہرو اللہ میرے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آیا تھا۔ میں تہ دل سے اس کا شکرگزار بلکہ احسان مند ہوں۔ ان بچھٹ لوگوں میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں لیکن ایک خوبی ضرور ہوتی ہے۔ وہ مالدار اجنبیوں کو لوٹنے میں تو تیز ہوتے ہی ہیں لیکن مصیبت زدہ اجنبیوں کی مدد کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ حضرات، اس علاقے کی زندگی کتنی وحشیانہ ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ماہی گیری کے پیشے میں ان کے علاوہ انھیں لوگوں کی تعداد وقت زیادہ ہوتی ہے، اور شکاری جہازوں کے کپتان دوسری نسل کے لوگوں کے سوا اور کسی کو ایسا ناقابل اعتبار نہیں سمجھتے جیسا ان لوگوں کو۔ اس نہر کے کنارے ہزاروں لڑکے ایسے پیدا ہوتے ہیں جو پہلے تو آبادار لوگوں کی طرح کھیتی باڑی کرتے ہیں اور پھر انتہائی وحشی سمندروں میں جاکر لہروں کی چھاتی پر مونگ دلتے ہیں۔ اس کام کے لیے نہر کی زندگی گویا تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیتی ہے۔"

"میں سمجھ گیا!" پیٹرزن نے اپنے نقرئی جھاڑوں پر شراب چھلکاتے ہوئے اضطراری انداز میں کہا، "اسے طول دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ساری دنیا کا یہی حال ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ کا ملک متمدن علاقہ ہے۔ وہاں کے لوگ تو مزاج کے ٹھنڈے اور نیک ہوتے ہوں گے ——— خیر کہانی سنائیے۔"

"اچھا حضرات، تو میں یہ بتا رہا تھا کہ جبل کک نے رسیاں ڈھیلی شروع کر دیں۔ اتنے میں تین بیٹ اور چار بچے باز کر پہنچے اور انھوں نے جبل کے عرشے پر سے گزرتے لیکن اوپر سے وہ دوسرے والے بھی کوئی دم دار ستاروں کی طرح رسیوں پر سے پھسلتے ہوئے پہنچ گئے اور اس فساد میں شامل ہو گئے۔ وہ کوشش کرنے لگے کہ اپنے ساتھی کو گھسیٹ کر جہاز کے اگلے حصے کی طرف لے جائیں۔ دوسرے جہازی بھی اسی کوشش میں لگ گئے، اور بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہمارا کپتان دور کھڑا ہاتھ میں سلاخ لیے جبل کو ڈرا رہا تھا، اور اپنے افسروں سے پکار پکار کے کہہ رہا تھا کہ اس بدمعاش کی مشکیں کس لو، اور اسے کھینچ کے پیچھے عرشے پر لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد وہ کشمکش کے حلقے کے قریب آ گیا اور اپنی سلاخ اس کے بیچ میں ڈال کر اس شخص کو کھینچنے کی کوشش کرنے لگا جس پر اسے غصہ آ رہا تھا لیکن جبل کک اور اس کے ساتھی ان لوگوں کے بس میں آنے والے نہ تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح آگے والے عرشے پر جا ہی پہنچے اور جلدی جلدی انجن کے سامنے تین چار تختے رکھ کر ان کے پیچھے چھپ گئے جیسے انقلاب فرانس میں پیرس والوں نے مورچے بنا لیے تھے۔

"نکلو باہر حرام زادو!" کپتان چنگھاڑ رہا تھا۔ اس عرصے میں ہمارا وہ جہاز کے پستول اٹھا لایا تھا چنانچہ کپتان دونوں ہاتھوں میں پستول لیے انھیں ساتھ ساتھ دھمکی بھی دیتا جاتا ہے: "باہر نکلو، بدمعاشو!"

اسٹیل کٹ کود کر عرشے پر چڑھ گیا اور ایسے ٹہلنے لگا جیسے اُسے پستولوں کی کوئی پروا ہی نہ ہو۔ اس نے کپتان کو صاف صاف سمجھا دیا کہ اگر مجھے ذرا بھی گزند پہنچا تو سارے جہازی بغاوت کر بیٹھیں گے اور افسروں کا خون پی جائیں گے۔ کپتان دل ہی دل میں ڈرا کہ یہ بات کہیں سچ ہی نہ نکلے۔ چنانچہ وہ ذرا ٹھٹک گیا۔ بہرحال اس نے ملاحوں کو حکم دیا کہ فوراً اپنے کام پر واپس چلے جائیں۔

"اچھا آپ وعدہ کیجئے کہ اگر ہم کام پر چلے گئے تو ہمیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔" ان لوگوں کے سرغنے نے کہا۔

"چلو کام پر، چلو کام پر ——— میں کوئی وعدہ نہیں کرتا ——— کام پر چلو! کیا تم ایسے وقت کام چھوڑ کے جہاز ڈبونا چاہتے ہو؟

کام پر چلو!" اور اس نے ایک خوفناک پستول اٹھا کے دھمکی دی۔

"جہاز ڈوب جائے گا؟" اسٹیل کٹ نے چلا کر کہا۔ "اچھا ڈوب جانے دیجئے۔ جب تک آپ یہ قسم نہ کھائیں کہ ہمارے ایک [illegible] پڑے گی، اس وقت تک ہم میں سے ایک آدمی یہاں سے نہیں ہٹے گا۔ بولو، جہازو کیا کہتے ہو؟" اس کے جواب میں جہازیوں نے ایک وحشت ناک شور بلند کیا۔

ہنر والا سوچ بچار میں پڑ گیا۔ اس کی نظر کپتان پر لگی ہوئی تھی۔ اور وہ برابر کچھ اس قسم کی باتیں کیے جا رہا تھا ——— "اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم کبھی جھگڑا کرنا چاہتے ہی نہ تھے۔ میں نے تو اس سے اپنی تنخواہ کا ایک حصہ مانگا تھا۔ یہ تو خواہ مخواہ کا الزام تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ اس کے جبڑے پر گھونسا مارنے سے میری انگلی بھی ٹوٹ گئی۔ دیکھیں، جہازو یہ سب سامنے کھڑے ہیں۔ یہ گواہ ہیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کپتان کہ ذرا ہوش میں آ جائیے۔ بس ایک لفظ کہہ دیجئے۔ بے وقوفی نہ کیجئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے بھول جائیے۔ ہم کام پر جانے کو تیار ہیں۔ ہمارے ساتھ شریفوں کا سا سلوک کیجئے تو ہم آپ کے غلام ہیں لیکن ہم یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے کوڑے لگائے جائیں۔"

"کام پر چلو! میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں کام پر چلو!"

اسٹیل کٹ نے اس کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اچھا دیکھئے، یہاں کئی آدمی ایسے ہیں، اور میں بھی ان میں ہوں، جو پورے سفر کے لیے بھرتی ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاز کے بندرگاہ پر پہنچتے ہی ہم اپنی ملازمت چھوڑنے کا حق رکھتے ہیں؛ اس لیے ہم لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتے۔ اس میں ہمارا کیا فائدہ۔ ہم تو صلح صفائی چاہتے ہیں۔ ہم کام کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے کوڑے لگائے جائیں۔"

"کام پر چلو!" کپتان چنگھاڑا۔

اسٹیل کٹ نے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھا کپتان صاحب اب میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں۔ ہمیں یہ بات منظور نہیں کہ ہمارے ہاتھوں آپ کا خون ہو اور ایک ایسے بدمعاش آدمی کی وجہ سے ہم پھانسی پر لٹکیں۔ جب تک آپ جہاز اوپر چلا رہے ہیں ہم انگلی تک نہ اٹھائیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ ہمیں کوئی سزا نہ ملے گی تو ہم میں سے ایک آدمی بھی کام پر نہیں جائے گا۔"

"اچھا، تم قریب کی کوٹھری میں جاؤ۔ چلو کوٹھری میں، میں تمھیں وہیں بند رکھوں گا جہاں تک کہ اپنی جان سے بیزار ہو جاؤ گے۔
چلو کوٹھری میں۔"

جیس ڈی ان کے سرغنے نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔ زیادہ تر لوگ اس بات کے خلاف تھے لیکن کوکار و اسٹل کٹ کا کہنا ان
گئے اور ڈراتے ہوئے اس کے آگے آگے اندھیری کوٹھری میں اس طرح اُتر گئے جیسے ریچھ اپنے غار میں جاتے ہیں۔

جب اسٹل کٹ کا سر تختوں کے نیچے غائب ہوتا نظر آیا تو کپتان اور اس کے ساتھی جو پیچھے ہٹ کر کوڑے کی دوسری طرف پہنچے
اور ڈھکنے کا تختہ بند کر کے سب نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر انھوں نے داروغہ کو پکار کر تانبے کا بڑا تالا لاؤ۔ اس کے بعد کپتان نے تھوڑا
سا تختہ کھول کر سوراخ میں کچھ کہا اور ڈھکنا بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس طرح دس آدمی تو اندر بند ہو گئے اور بیس اوپر رہ گئے جنھوں نے
اب تک مکمل غیر جانبداری سے کام لیا تھا۔

جہاز کے اگلے اور پچھلے دونوں حصوں میں سارے افسران پہرہ دیتے رہے خصوصاً آگے کی طرف والے ڈھکنے پر
اور زینے کے قریب، کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ باقی تختے توڑ کر اوپر آ جائیں گے لیکن رات کا وقت اطمینان کے ساتھ گزر گیا۔ جو لوگ اوپر تھے
وہ بڑی رات سے مل جاتے رہے ہیں کی کھڑکھڑاہٹ اس بے رنگ اندھیرے میں رہتا تو کبھی گونج کر اُسی پھیلاتی رہی۔

صبح کو کپتان اس طرف گیا اور حوصلہ افزا بات کہہ کر قیدیوں کو کام پر بلایا لیکن انھوں نے ایک زور کا نعرہ لگایا اور
انکار کر دیا۔ چنانچہ انھیں تھوڑا سا پانی پہنچا دیا گیا اور دو ایک سخت بسکٹ نیچے پھینک دیئے گئے۔ اس کے بعد کپتان نے تالا لگا کے چابی
جیب میں ڈالی اور چلا آیا۔ تین دن تک دروازہ وہ ڈھکنا بند رہا۔ اچھا خاصا، لیکن چوتھے دن جب انھیں پکارا گیا تو کھینچا تانی کی سی آواز
آئی اور پھر ایک شخص سے چار آدمی اوپر آ گئے اور کہنے لگے کہ ہم کام پر چلنے کو تیار ہیں۔ اندر کی گھٹن، بدبو اور بھوک نے شاید سزا کے خوف کے
ساتھ مل کر انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بات سے کپتان کی ذرا ہمت بندھی اور اس نے باقی لوگوں کے سامنے پھر اپنا مطالبہ پیش کیا لیکن
اسٹل کٹ نے اپنی غضبناک آواز میں چلا کے کہا کہ اس کو بند کرو اور جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ پانچویں دن تین اور باقی ان بازوؤں
سے چھوٹ کر جو انھیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے، اوپر آ گئے۔ اب صرف تین آدمی رہ گئے۔

"اب بھی کام پر چلتے ہو یا نہیں؟" کپتان نے ایک بے رحم تمسخر کے ساتھ کہا۔

"تالا لگا کے بھاگ جاؤ" اسٹل کٹ نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" کپتان نے کہا اور چابی پھر تالے میں گھوم گئی۔

اسٹل کٹ اس اندھیری قبر میں رہتے رہتے پاگل ہو چکا تھا۔ اپنے سات ہمراہیوں کی غداری سے وہ آگ بگولا ہو گیا۔ پھر
اس آواز کے تمسخر نے اسے اور بھڑکا دیا۔ چنانچہ اسٹل کٹ نے اپنے دونوں ساتھیوں کے سامنے جو اب تک بظاہر جوش سے متفق رہتے تھے یہ
تجویز پیش کی کہ اگلے دن صبح کو جب ہمیں پکارا جائے تو ہم اپنے لمبے لمبے تیز چاقو لے کر اس کوٹھری میں سے نکل آئیں اور جہاز میں ادھر سے
ادھر تک بڑھ جائیں بلکہ اس طرح جان توڑ کے لڑیں کہ جہاز پر پوری قبضہ کر لیں۔ وہ کہنے لگا کہ چاہے تم میرا ساتھ دو یا نہ دو میں تو یہی کروں گا
اور آج رات کے بعد اس کوٹھری میں نہیں رہوں گا لیکن اس کے ساتھیوں نے بھی اس تجویز کی مخالفت نہ کی۔ انھوں نے تو قسم کھا کے

کہ ہم تو ہتھیار ڈالنے کے سوا ہر چیز کے لیے تیار ہیں چاہے کیسی ہی ہنگامی کیوں نہ ہو۔ اس سے بھی زیادہ دو بکر دوان اسی بات پر اڑے ہوئے تھے کہ جب باہر نکلنے کا وقت آئے گا تو عرشے پر چلے ہی جائیں گے۔ اس بات کی ان کے سرغنے نے بڑی سختی سے مخالفت کی اور چلے جانے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھا، خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کے دونوں ساتھی اس حالت میں پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے لیکن دونوں ایک ساتھ جا بھی نہ سکتے تھے کیونکہ سیڑھی پر ایک وقت میں ایک ہی آدمی چڑھ سکتا تھا۔ اچھا جناب اب ان بے وقوفوں کی بے ایمانی دیکھیے۔

اپنے سرغنے کی یہ ضد دیکھ کر دونوں کے دل میں ایک بے ایمانی کا خیال آیا، یعنی سب سے پہلے باہر نکل آئیں، ناکارہ دس آدمیوں میں سے ان تین آدمیوں میں سب سے پہلے اپنے آپ کو کپتان کے حوالے کر کے اس حرکت کے انعام میں معافی حاصل کر لیں لیکن جب اسمتھ کی تک نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ آخر تک ان کا سرغنہ رہے گا تو معصوم بدمعاشی کے کسی بنیادی اصول کے مطابق انھوں نے آپس میں سازش کا خطرناک ... جب ان کا سرغنہ اونگھنے لگا تو انھوں نے دبی جبلتوں میں ایک دوسرے کو اپنے دل کا حال کہہ سنایا اور اسے رسیوں سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا، پھر آدھی رات کے وقت کپتان کو پکارا۔

کپتان نے سمجھا کہ معصوم کیا مصیبت آئی، چنانچہ وہ اپنے مسلح ملاحوں اور بڑھے ملازوں کو ساتھ لے کر اندھیرے میں خون کی بو سونگھتا اس طرف لپکا۔ دو چار منٹ میں تالا کھول کر ان دو غداروں اور ان کے رسیوں سے بندھے ہوئے لیکن ابھی تک ہاتھ پیر مارتے ہوئے سرغنے کو باہر نکال لیا۔ ان دونوں نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ ہم نے اس شخص کو قید کیا ہے جو پھانسی پانے کے لائق ہے مگر کپتان کے ساتھی تینوں کو گریبان پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے لے چلے اور بادبان کی رسیوں میں ذبح کیے ہوئے جانوروں کی طرح لٹکا دیا اور وہ صبح تک اسی حالت میں رہے۔ کپتان ان لوگوں کے سامنے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بولا۔

"لعنت ہو تم پر، بدمعاشو! تمھیں تو گدھوں نے بھی نہیں کھایا!"

سورج نکلنے کے بعد اس نے سب جہازیوں کو اکٹھا کیا۔ جن لوگوں نے بغاوت کی تھی انھیں ایک طرف کھڑا کیا، اور جن لوگوں نے اس میں حصہ نہ لیا تھا انھیں دوسری طرف۔ پھر باغیوں سے کہا کہ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ تم سب کے کوڑے لگواؤں، بلکہ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن چونکہ تم نے اپنے آپ کو جلدی ہی میرے سپرد کر دیا اس لیے میں تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کے چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ اس نے ان لوگوں کو نہایت غلیظ زبان میں خوب جھاڑا۔

اس کے بعد وہ رسیوں میں لٹکے ہوئے تین آدمیوں سے مخاطب ہوا اور بولا کمینو، حرام زادو، میں تمھاری بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاؤں گا۔ اس نے یہ اشارہ کر کے دونوں غداروں کی کھال ادھیڑنی شروع کر دی یہاں تک کہ ان کا جینا محال ہو گیا اور ان کا سر مردوں کی طرح ایک طرف کو ڈھلک گیا یعنی جیسے حضرت عیسیٰ کے ساتھ صلیب پانے والے چوروں کی حالت ہوئی تھی۔

"میری تو کلائی میں جھٹکا آ گیا!" آخر وہ رکنے لگا۔ "لیکن پہچان رہا ہوں تمھیں، نہیں بخشوں گا، ابھی مجھ میں بہت جان باقی ہے۔ تم بہت اکڑ رہے تھے، اچھا، اس کے منہ سے کپڑا نکالو دیکھیں یہ کیا کہتا ہے۔"

اس خستہ حال باغی کے جبڑے ایسے اکڑ گئے تھے کہ پہلے تو اس کے ہونٹ بس لرز کے رہ گئے، پھر اس نے بڑی مشکل کے ساتھ اپنا سر گھما کے نہایت آہستہ سے کہا: "کان کھول کے سن لو، میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے مار ڈالا تو میں تمھیں قتل کر ڈالوں گا!"

"اچھا، تو تم ہی، خیر تمھیں بھی دیکھتا ہوں" ——— اور کپتان نے مارنے کے لیے رسّی اٹھائی۔

"چھوڑ دو اسے" اسٹیل کنگ نے کہا۔

"میں ماروں گا ضرور" ——— اس نے پھر رسّی اٹھائی۔

اب اسٹیل کنگ نے آہستہ سے کوئی ایسی بات کہی جو کپتان کے سوا کسی کو سنائی نہ دی، لیکن سب لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کپتان چونک کر پیچھے ہٹ گیا، وہ تین دفعہ عرشے پر بڑی جلدی جلدی ٹہلا، اور پھر ایک دم سے رسّی پھینک کے بولا "میں نہیں مارتا ——— اسے جانے دو ——— رسّیاں کھول دو سب کی"

لیکن جب چھوٹے میٹ اس حکم کی تعمیل کے لیے بڑھے تو ایک دو ورکروں نے انھیں روک لیا، جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ چیف میٹ ریلی تھا جو چوٹ کھانے کے بعد سے آج تک وہ بستر پر پڑا رہا تھا، لیکن آج عرشے پر شور و غل سن کر وہ دیکھنے باہر آ گیا تھا اور یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر کی ایسی بری حالت تھی کہ ابھی بھی درد ہو رہا تھا لیکن اس نے من ہی من میں کہا کہ میں وہ کام کرنے کو تیار ہوں جس کی ہمت کپتان کو بھی نہ پڑی، چنانچہ اس نے رسّی اٹھائی اور اپنے قیدی دشمن کی طرف بڑھا۔

"تم بزدل ہو" اسٹیل کنگ نے کہا۔

"بزدل ہی سہی، لیکن تم سنبھل جاؤ" میٹ رسّی مارنے ہی والا تھا کہ ایک سسکاری جیسی سی آواز آئی، اور وہ ٹھٹک کے رہ گیا۔ لمحہ کے لیے تو وہ رکا لیکن پھر جو کہا تھا وہ کر دکھایا، اور یہ کہہ کر کہ اسٹیل کنگ کیا دھمکی دے رہا ہے، اب تینوں آدمیوں کو کھول دیا گیا، اور سب لوگ مرجھائے ہوئے سے اپنے اپنے کام پر لگ گئے، اور ایسے کے بل چلنے کی طرح پھر کھڑ کھڑ چلنے لگے۔

اس روز اندھیرا ہونے کے بعد جب پہرے والے پیچھے چلے گئے تو جہاز کے اگلے حصے میں ایک شور ہوا، دونوں غدار چیختے چلاتے کپتان کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ ہمیں دوسرے جہازیوں کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑتی، منت سماجت اور دھکے کھانے سے بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ وہاں سے نہ ٹلے، چنانچہ ان کی درخواست پر انھیں پچھلی کوٹھری میں بھیج دیا گیا، تاکہ انھیں کوئی خطرہ نہ رہے۔ بہرحال باقی لوگوں میں بغاوت کے آثار دوبارہ نظر آئے، اس کے خلاف معلوم ہوا تھا کہ اسٹیل کنگ کے سمجھانے بجھانے سے انھوں نے عہد کر لیا ہے کہ امن و امان قائم رکھیں گے، ہر حکم بجا لائیں گے اور جب جہاز بندرگاہ پر پہنچے گا تو سب مل کر ملازمت چھوڑ دیں گے۔ لیکن اس سفر کو جلد سے جلد ختم کرنے کے لیے انھوں نے ایک اور بھی بات طے کر لی تھی ——— یعنی اگر کوئی وہیل نظر آئے تو نکلیں گے نہیں، کیونکہ جہاز میں تیل تو ضرور رہا تھا پھر اس کے علاوہ بھی کئی اور خطرے تھے، لیکن ستاروں کے اوپر پہرہ برابر دیا جا رہا تھا جہاز کا کپتان کشتی میں بیٹھ کے مچھلی کا پیچھا کرنے کو آج بھی ویسا ہی تیار تھا جیسا اس روز کہ جب جہاز شکار گاہ میں پہنچا اور ریلی بھی اپنا بستر چھوڑ کر کشتی میں اترنے اور رسّیوں سے بندھے ہوئے برچھے وہیل کے منہ میں برچھا پھینکنے کو تیار تھا۔

حالانکہ اسٹیل کنگ نے دوسرے جہازیوں کو یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر مائل کر لیا تھا، لیکن اس نے اپنا یہ راز آج تک کسی کو بھی نہ بتایا کہ مجھے ذاتی طور پر اس شخص سے انتقام لینا ہے جس نے میرے دل کو سسک کے دکھ دیا ہے۔ وہ ریلی کے دستے میں تھا۔ یہ حق ابھی کم بخت خود مار رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد کپتان نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ میں اپنے دستے

کے ساتھ رات کے وقت پہرہ دوں گا۔ اس چیز اور دو ایک دوسری باتوں کی بنا پر ایمل کک نے انتقام کا منصوبہ بڑی باقاعدگی سے تیار کر لیا۔

بیڈلی کی ایک عجیب عادت تھی جو جہازیوں میں کبھی نہیں ہوتی۔ رات کے وقت وہ پچھلے عرشے کے تختوں پر بیٹھا کرتا اور پیا زدہ اس کشتی کی دیوار پر رکھ لیتا جو جہاز کی دیوار سے ذرا اونچی اور ترنگی ہوئی تھی۔ یہ مشہور بات تھی کہ وہ اس طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے بھی لگتا ہے۔ کشتی اور جہاز کے درمیان خاصی جگہ چھوٹی ہوئی تھی اور نیچے سمندر تھا۔ ایمل کک نے وقت کا حساب لگا کے پتا چلایا کہ جس دن اس سے غداری کی گئی تھی اس کے تیسرے روز صبح کے دو بجے اس کی سنتری چلانے کی باری آئے گی۔ چنانچہ اس دوران میں وہ پیچھے چھٹا ہوا بڑی کلھیان کے ساتھ کوئی چیز بناتا رہا۔

"یہ تم کیا بنا رہے ہو؟" ایک جہازی نے پوچھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا چیز لگتی ہے۔"

"یہ تو تمھارے بچھے کا ترا معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ عجیب سا ہی ہے۔"

"ہاں عجیب ہی ہے۔" ایمل کک نے اسے اپنے سامنے سے اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کام چل جائے گا۔ یار میرے پاس سُتلی نہیں رہی ——— تمھارے پاس ہے؟"

مگر جہازیوں کے پاس ذرا بھی سُتلی نہ تھی۔

"اچھا تو میں ریڈ سے جا کے لاتا ہوں۔" اور وہ اٹھ کے چل دیا۔

"ارے کیا اس سے جا کے بھیک مانگو گے؟" ایک ملاح نے کہا۔

"کیوں نہیں؟ کیا وہ میرا اتنا سا بھی کام نہیں کرے گا؟ آخر وہی کا تو قصور ہے۔" تو اس نے ریڈ کے پاس جا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ مجھے میرے بچھونے کی مرمت کے لیے تھوڑی سی ستلی دے دو۔ ستلی مل گئی ——— لیکن پھر وہ ستلی نظر آئی نہ ترا لیکن اگلے دن رات کو جب ایمل کک اپنے کرٹ کے طور پر بچھونے میں دکھ رہا تھا، اس کی جیب میں ایک وزنی گولی کی پڑی جس پر جال چڑھا ہوا تھا۔ پچیس گھنٹے بعد اس کی سنتری چلانے کی باری آنے والی تھی ——— ایمل کک کو اس شخص کے قریب بیٹھنا تھا جسے جہازیوں کی تیر کے کنارے اونگھنے کی عادت تھی۔ ایمل کک نے اپنا منصوبہ پہلے ہی تیار کر لیا تھا اور اسے بیڈلی کی لاش پھڑکتے ہوئے صرف نظر آ رہی تھی۔

لیکن حضرات، ایک شخص نے اس آدمی کو اپنے جرم کا ارتکاب کرنے سے بچا لیا، لیکن انتقام لیے بغیر اسے انتقام حاصل ہو گیا کیونکہ تقدیر نے خود آگے وہ کام سنبھال لیا، جو ایمل کک کرتا۔

دوسرے دن کی صبح کا ذکر ہے کہ صبح صادق کے وقت عرشے دھوئے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک احمق جہازی پانی کھینچتے کھینچتے چلایا: "وہ جا رہی ہے! وہ جا رہی ہے! یا خدا! کیسی زبردست دریل ہے! وہ اصل میں بڑی ڈوگ تھی۔"

"بڑی ڈوگ" اسے ساتھیوں نے کہا۔ "واہ جناب واہ!"

"ارے جہازی صاحب کہیں دیکھیں کو بھی نام ہوتا ہے، وہ بچے بڑی ڈوگ کے کہہ رہے ہیں؟"

"یہ ایک بہت سفید، مشہور و معروف، خونخوار اور لافانی وہیل ہے ــــ لیکن اسے چھوڑیئے یہ بہت لمبی کہانی ہے۔"

"کیسے ہو گئے؟" سارے جہازی نوجوانوں نے بہت قریب آتے ہوئے کہا۔

"جی صاحب ــــ نہیں، نہیں، یہ قصہ میں اس وقت نہیں سنا سکتا، ذرا پیچھے ہٹیئے، ہوا آنے دیجئے۔"

"شراب لاؤ، شراب!" بیٹیڈ ور نے پکارا، "ہمارے دوست تھک گئے ــــ ان کا گلاس بھرو!"

"نہیں حضرات، مجھے ضرورت نہیں۔ اپنے حصے کی پی میں ابھی سناتا ہوں ــــ اچھا تو جناب، حالانکہ جہازیوں میں سازش ہو چکی تھی، پھر تینوں مستولوں پر پہرے دار اس وہیل کو دیکھ رہے تھے لیکن جب اس جہازی نے سفید وہیل کو پاس آ کے نقطے پر دیکھا تو سب کچھ بھول گیا، اور اضطراری طور پر چلا اٹھا اب تو بچے سب پاگل ہو گئے۔ کپتان، ریڈنی اور بیچے باز سب ہی نعرے لگانے لگے ــــ

ــــ "سفید وہیل، سفید وہیل" ــــ حضور صاحب مجھے یاد ہے کہ اس مشہور و معروف اور گراں قیمت مچھلی کو شکار کرنے کو بہت بیتاب تھے۔ ادھر وہ ہر صورت ہو کر گالیاں دیتے ہوئے زخمی نظروں سے اس سفید وہیل کے حیرت انگیز حسن کا نظارہ کر رہے تھے جس پر صبح کے سورج نے دھاریاں سی بنا دی تھیں اور جو نیلے سمندر میں دودھ کی طرح چمک رہا تھا۔ حضرات معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات میں تقدیر کا ہاتھ تھا اور ان چیزوں کا خاکہ دنیا کے بننے سے بھی پہلے تیار ہو چکا تھا۔ باغی اسی طرح ریڈنی کی کشتی میں سکان سنبھالے بیٹھا تھا۔ اور اس کا فرض تھا کہ جب وہیل پر نیزے گرا کر کھڑا ہو تو اس کے پاس رہے اور اس کا ہاتھ پاتے ہی رسی کو گھٹائے یا بڑھائے۔ جب چاروں کشتیاں نیچے اتاری گئیں تو ریڈنی کی کشتی سب سے آگے رہی۔ اس پر پاسٹیل گن نے چپو چلاتے ہوئے خوشی کا ایک نعرہ [illegible] کشتی چلانے میں بہت لطف پڑ رہی تھی لیکن آخر یہ لوگ مچھلی کے قریب آہی گئے۔ ریڈنی برچھا لے کر ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ کشتی میں وہیل کا تعاقب کرتے ہوئے اسے ہمیشہ ایسا ہی جوش آجاتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے منہ سے پکار رہا تھا: مجھے جلد وہیل کی کمر پر اتار دو۔ اسٹیل گن کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ کشتی کو اڑائے لیے چلا جا رہا تھا حالانکہ جھاگ اتنے تھے کہ سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا اور وہ سفید وہیل کی کمر ایک ہو گئی تھیں، پھر کشتی جیسے کسی چیز سے ٹکرائی ہو کوئی ڈوبی ہوئی چٹان معلوم ہوتی تھی۔ کشتی ایک طرف سے اوپر کو اٹھ گئی اور ریڈنی گر پڑا۔ جب وہ وہیل کی کمر پر گرا تو کشتی سیدھی ہو گئی اور لہروں نے دھکا دے کر اسے ایک طرف جما دیا۔ ریڈنی پھسل کر وہیل کے دوسری طرف سمندر میں گیا۔ اس نے جھاگوں کے درمیان تیرنے کی کوشش کی۔ اس پردے میں سے لمحہ بھر کے لیے وہ لوگوں کی نظر سے بچنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہوا نظر بھی آیا۔ لیکن وہیل اپنے چاروں طرف ایک گرداب بناتی ہوئی پلٹی اور تیرنے والے کو جبڑوں میں دبا لیا۔ اس کے بعد اسے منہ میں لے کر اوپر اٹھی، پھر سر کے بل غوطہ لگا کے سمندر میں غائب ہو گئی۔

جب کشتی ٹکرائی تو اسٹیل گن نے رسی ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ اس دوران میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا۔ لیکن جب ایک دم سے کشتی کو دھکا لگا تو اس نے تیز چاقو نکال کر رسی کاٹ دی اور وہیل آزاد ہو گئی۔ لیکن تھوڑی دور جا کے وہ ذرا سی ابھری۔ وہ ریڈنی کو کھا چکی تھی اور اس کے دانتوں میں لال اونی قمیص کے کچھ چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے۔ چاروں کشتیاں پھر اس کے پیچھے چلیں۔ لیکن وہیل جلد ہی ٹکر دے کر نکل گئی اور پھر نظر نہ آئی۔

آخر کار ٹاؤن ہو ایک بندرگاہ میں جا پہنچا۔ یہ جگہ بالکل ویران اور وحشیوں کی بستی تھی۔ یہاں کوئی مہذب آدمی بھی نہ رہتا تھا، البتہ ایک

کی سرگرمی میں پانچ چھ کے سوا سب جہازی جہاز سے اتر کے بجری کے درختوں میں جا چھپے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے وحشیوں کی ایک بڑی سی کشتی پر قبضہ کر لیا اور اس میں بیٹھ کر سیدھے اور بندرگاہ میں جا پہنچے۔

جہاز میں اب دو چار آدمی باقی رہ گئے تھے۔ اس لیے کپتان نے جہاز کو کنارے پر لا کے سوراخ بند کرنے کے وقت طلب کم میں جزیرے والوں سے مدد مانگی تھی۔ ان خطرناک کھاڑیوں کی دن رات نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ پھر وقت کا کام تھی محنت کا تھا کہ جب جہاز سمندر میں چلنے کے قابل ہو گیا تو جہازی اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ کپتان نے ان جہازیوں ایسے لوگوں کے ساتھ چلنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اپنے افسروں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے جہاز کو ساحل سے کچھ دور گہرے پانی میں ہو سکا کھڑا کر دیا۔ پچھلی طرف توپیں چڑھا دیں۔ آگے کی طرف بندوقیں رکھ دیں اور جزیرے والوں کو تنبیہ کر دی کہ اگر جہاز کے قریب آئے تو تمھاری خیر نہیں۔ پھر اپنے ساتھ ایک آدمی لے کر اپنی بہترین کشتی میں بیٹھا اور ہوا کے رخ چل پڑا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پانچ میل دور تاہیتی جائے اور اپنے جہازیوں کے لیے کمک لائے۔

روانہ ہونے کو ہوتے تھے کہ ایک بڑی سی ڈونگی دکھائی دی جو مونگے کے ایک چھوٹے سے جزیرے کے پاس کھڑی تھی۔ کپتان نے اس سے بچ کے نکلنا چاہا لیکن وحشیوں کی ناؤ نے آ لیا۔ اب اسے اسٹیل کٹ کی آواز سنائی دی کہ وہ پکار کے کہہ رہا ہے ——— رک جاؤ ورنہ میں دھکا دے کے تمھاری کشتی ڈبو دوں گا۔ کپتان نے پستول نکال لیا۔ دونوں کشتیاں برابر برابر آ گئی تھیں۔ اسٹیل کٹ نے ایک پیر اس کشتی پر رکھا اور دوسرا اس کشتی پر اور نہایت حقارت کے ساتھ قہقہے لگانے لگا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر پستول کو کھٹکا بھی ہوا تو میں تمھیں سمندر کے جھاگ میں دفن کر دوں گا۔

"آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" کپتان نے پوچھا۔

"تم کدھر جا رہے ہو اور کام کیا ہے؟" اسٹیل کٹ نے کہا۔ "دیکھو جھوٹ مت بولنا۔"

"میں نئے جہازی لینے تاہیتی جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مجھے ایک منٹ کے لیے اپنی کشتی میں آنے دو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سمندر میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کی کشتی کے پاس پہنچ کے دیوار پر چڑھ گیا اور کپتان کے سامنے اکڑا ہوا۔

"اچھا جناب، آپ اپنے بازو دراز کیجیے اور سر پیچھے کی طرف کر لیجیے۔ اب میرے ساتھ ساتھ کہتے جائیے" اسٹیل کٹ کہے جاتا ہی میں اپنی کشتی سامنے والے جزیرے کے پاس ٹھہرا دوں گا۔ اور قسم کھاتا ہوں کہ چھ دن تک وہیں رہوں گا۔ اگر عہد توڑوں تو مجھ پر اور خدا کا غضب نازل ہو۔"

"خوب، ٹھیک ہو گیا ہے،" اسٹیل کٹ نے قہقہہ لگایا۔ "اچھا خدا حافظ۔" وہ سمندر میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا۔

جب تک کپتان کی کشتی ساحل پر ناریل کے درختوں کے نیچے پہنچ کے نظر سے غائب نہ ہو گئی وہ دیکھتا رہا اس کے پیچھے چل پڑا اور اپنی منزل پر پہنچ کے تاہیتی جا پہنچا۔ وہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ دو جہاز واقعی جانے والے تھے۔ اور اتفاق سے انھیں اتنے ہی آدمیوں کی ضرورت تھی جتنے اس کے ساتھ تھے۔ چنانچہ یہ لوگ بھرتی ہو گئے۔ مگر ان کو سابق کپتان انھیں قانونی طور پر سزا دلانا ہی چاہتا تھا ہمیشہ کے لیے

سے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ مثلاً گیڈو کی تصویر لیجیے جس میں دکھایا گیا ہے کہ پرسیوس اینڈرومیڈا کو سمندری عفریت یا وہیل کے منہ سے
بچا رہا ہے۔ گیڈو کو ایسے عجیب و غریب جانور کی شکل کہاں دیکھنے کو ملی! ہوگارتھ کی عظیم الجثہ مچھلی بھی ... ہے لیکن اس کے پیچھے بل
بالکل سپاٹ ہے۔ اس کی کمر پر ایک پُراسرار کوہان ہے، اور اس کا چپٹا جبڑا بڑے بڑے دانتوں والا ہے جس کے اندر لہریں بنتی ہوئی جا رہی
ہیں دیکھنے میں یہ تیز کا جہاز سا لگتا ہے۔ پھر سکاٹ لینڈ کے مشہور مصنف سبلڈ نے وہیل کی کچھ تصویریں بنائی ہیں اور انجیل کے قدیم نسخوں اور
نیز پرانی کتابوں میں بھی حضرت یونسؑ اور وہیل کی تصویریں ملتی ہیں بھلا بتائیے ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ جلد ساز بھی کتابوں کی
جلد پر وہیل کی سنہری تصویریں بناتے ہیں جن میں وہیل جہاز کے لنگر یا انگور کی بیل کی طرح لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بات دلچسپ تو ضرور
ہے لیکن اس قسم کا جانور بالکل فرضی ہے۔ قدیم زمانے کے گرجوں پر جو تصویریں بنائی جاتی تھیں غالباً یہ انھی کی نقل اتاری گئی ہے۔ عام طور سے
جلد سازوں والی مچھلی کو ڈولفن کا نام دیا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہیل کی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ جب یہ تصویر
پہلی مرتبہ پیش کی گئی تو نیت یہی تھی۔ اس کا موجد ایک قدیم ناشر تھا جس کا زمانہ کوئی پندرھویں صدی کے قریب ہے۔ اس زمانے
میں بلکہ کچھ بعد تک ڈولفن کو عام طور سے وہیل ہی کی ایک قسم سمجھا جاتا تھا۔

پرانی کتابوں کی چھوٹی چھوٹی تصویروں میں بعض اوقات آپ کو وہیل کی طرح کے عجیب و غریب جانور نظر آئیں گے جن کے
سروں سے ہر طرح کے فوارے اور گرم پانی کے چشمے ابل رہے ہوں گے لیکن کئی مشہور و معروف کتب کے سب سے پہلے نسخے پر
بھی آپ کو بڑی اوٹ پٹانگ وہیلیں ملیں گی۔

خیر یہ کوششیں تو ایسے لوگوں کی تھیں جو پیشہ ور نہ تھے انھیں چھوڑیے۔ اب ان تصویروں کو لیجیے جن کے متعلق دعویٰ
کیا جاتا ہے کہ یہ بڑی سنجیدہ اور عالمانہ ہیں اور انھیں ایسے لوگوں نے بنایا ہے جو وہیل سے واقف تھے۔ ہیرس نے سفرناموں کا جو مجموعہ
چھاپا ہے اس میں وہیلوں کی تصویریں ہیں جو ۱۶۷۱ء کے ایک سفرنامے میں سے لی گئی ہیں۔ یہ سفرنامہ ہالینڈ کے کسی آدمی نے
لکھا ہے۔ اس کتاب کی ایک تصویر میں وہیلوں کو برف کے جزیروں کے درمیان لکڑی کے لٹھوں کی طرح لیٹے دکھایا گیا ہے اور
سفید ریچھ ان کی کمر پر دوڑ بھاگ رہے ہیں۔ ایک اور تصویر میں یہ زبردست غلطی کی گئی ہے کہ وہیلوں کی دم عمودی شکل کی
بنائی ہے۔

پھر ایک اور بڑی زوردار کتاب ہے جو انگریزی بیڑے کے ایک کپتان کولنیٹ نے لکھی ہے اس کا نام ہے:
"روغنی وہیل کی تلاش میں جنوبی سمندروں کا سفر" اس کتاب میں ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جس کے متعلق دعویٰ ہے کہ یہ روغنی
وہیل کی تصویر ہے اور اگست ۱۷۹۳ء میں میکسیکو کے ساحل پر جو وہیل شکار ہوئی تھی اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی ناپ کے مطابق
بنائی گئی ہے۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ کپتان صاحب نے یہی تصویر اپنے جہازیوں کے فائدے کے لیے بنوائی ہوگی لیکن
صرف ایک بات عرض کروں گا۔ اس تصویر میں جو آنکھ بنائی گئی ہے اگر اسی پیمانے کے مطابق روغنی وہیل کی آنکھ کا تصور کیا جائے تو کوئی پانچ
فٹ لمبی کھڑکی بنے گی۔ خوب کپتان صاحب۔ خوب! آپ نے ساتھ تصویر بھی کیوں نہ دکھایا کہ اس آنکھ میں سے ایک آدمی جھانک رہا ہے۔
لڑکوں کے لیے علم حیوانات کے متعلق جو کتابیں نہایت دیانتداری کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ بھی ایسی خوفناک غلطیوں سے خالی

جیمس موریس نے گولڈ سمتھ کی مقبول عام کتاب۔ اس کی جو طبع ۱۸۰۷ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے، اس میں وہیل اور نارویل کی دو مرقع تصویریں ہیں جن کی ناشائستہ کہ زبان سے نہیں نکالا جا سکتا۔ نہیں، یہ بدصورت وہیل تو تصویر ایسی لگتی ہے جس کی ٹانگیں کاٹ دی گئی ہوں اور نارویل کی تصویر دیکھنے پر تعجب ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں ایسے عجیب و غریب جانور کو اچھے خاصے ذہین لوگوں کے سامنے اصلی نارویل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

پھر ۱۸۲۵ء میں ایک عظیم سائنسدان کاؤنٹ لاسے پیدے نے وہیلوں کے متعلق ایک نہایت باقاعدہ اور اچھی کتاب مرتب کی ہے، جس میں وہیل کی مختلف قسموں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ یہ سب کی سب غلط ہیں۔ بلکہ گرین لینڈ وہیل کی تصویر کے متعلق تو اسکورزبی جیسا آدمی جسے اس قسم کی وہیلوں کا پرانا تجربہ تھا کہتا ہے کہ فطرت میں ایسی کسی چیز کا وجود ہی نہیں۔

اوروں نے جو غلطیاں کی ہیں وہ تو خیر کی ہیں، مگر سائنسدان فریڈرک کوویئے نے تو کمال ہی کر دکھایا ہے۔ ۱۸۳۶ء میں اس نے وہیلوں کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے جس میں ایک تصویر روغنی وہیل کی بنا کر پیش کی ہے کہ جس میں ٹکٹ والے کو یہ تصویر دکھانے سے پہلے وہاں سے باہر بھاگنے کے لیے اپنا بستر بوریا تیار رکھیے۔ قصہ مختصر کوویئے کی وہیل روغنی وہیل نہیں، کوئی اور چیز ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ان حضرت کو وہیل کے شکار پر جانے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اس قسم کے لوگوں کو یہ موقع دو کم ہی ملتا ہے، لیکن یہ تصویر کہاں سے دستیاب ہوئی، خدا ہی جانے۔ شاید اس کا ماخذ بھی وہی ہوگا جہاں سے اس کے طالب علم دیگر مصنفین نے اپنی مستند کو اس حال کی تھی ——— یعنی کسی چینی تصویر سے۔ اور یہ چینی لوگ مصوری میں کیا دل لگی بازی کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے بنائے ہوئے عجیب و غریب پیالوں اور طشتریوں سے ہو سکتا ہے۔

اچھا تو گھر کے تیل بیچنے والوں کی دکانوں کے سائن بورڈوں پر جو وہیل کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، وہ کیسی ہوتی ہیں؟ یہ وہیلیں بڑی وحشی، خونخوار اور دودو کوہان والی ہوتی ہیں، ناشتے میں ایک ساتھ تین تین چار چار جہازیوں کو کھا لیتی ہیں، اور گوبھی کے پھولوں اور نیلے رنگ کے سمندروں میں غلطاں رہتی ہیں۔

لیکن وہیل کی تصویریں بنانے میں جو غلطیاں ہوتی ہیں ان میں تعجب کی بات بھی نہیں۔ ذرا غور فرمائیے! یہ تصویریں بھولی بھٹکی مچھلیوں کو دیکھ کر بنائی گئی ہیں۔ اگر کوئی ٹوٹی ہوئی کرونی ہوئی شکستہ جہاز کی تصویر اس کے حسن اور شان و شوکت کی نمائندگی کر سکتی ہے تو ان تصویروں کو بھی صحیح سمجھ لیجیے۔ ہاتھیوں نے تو سامنے کھڑے ہو کر تصویریں کھنچوائی ہیں، لیکن زندہ وہیل کبھی اپنی تصویر کھنچوانے نہیں آئی۔ زندہ وہیل اپنی پوری شان و شوکت اور عظمت کے ساتھ بس اتھاہ سمندروں میں نظر آتی ہے۔ جب وہ تیرتی ہے تو جنگی جہاز کی طرح اس کا زبردست جسم نظروں سے غائب رہتا ہے۔ اور یہ کام انسان کے بس کا نہیں کہ اسے پانی سے نکال کر ہوا میں اس طرح اٹھائے کہ اس کے سارے نشیب و فراز قائم رہیں۔ شیر خوار وہیل اور پختہ عمر کی وہیل میں خد و خال کا جو فرق ہونا چاہیے اسے تو خیر چھوڑیے لیکن جو شیر خوار وہیلیں جہاز کے عرشے پر لائی جاتی ہیں ان کی شکل بھی اتنی عجیب و غریب، لچک دار، تغیر پذیر ہوتی ہے کہ شیطان بھی ان کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا۔

لیکن آپ کہیں گے کہ بھولی بھٹکی وہیل کے برہنہ ڈھانچے سے اس کی اصل شکل کا تو اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ جی ذرا بھی نہیں۔ اس فطرت میں یہ عجیب بات ہے کہ اس کے ڈھانچے سے اس کی شکل و صورت کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جیرمی بینتھم کا

وارث کے کتب خانے میں نوادس کے بجائے اس کا جو ڈھانچہ لٹکا ہوا ہے وہ بیرنگ کی ساری ذاتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک گٹھا ڈ
پیشانی والے افادیت پرست بڑھے شخص کا تصور پوری طرح پیش کر دیتا ہے لیکن وہیل کی ہڈیوں سے اس قسم کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا جیسا
جیفرے کے کتب خانے وہیل کے ڈھانچے کا مجرے ہوئے بھولا پن عنقریب وہیل سے وہی تعلق ہے جو کیڑے کا اپنے خول سے ہوتا ہے۔ وہیل کے سر سے یہ
خصوصیت پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے جیسا آپ اس کتاب میں آگے چل کر دیکھیں گے۔ پھر اس بات کا پتا اس پر سے بھی چلتا ہے جو وہیل
کے جسم میں ہوتا ہے۔ اس پر کی ہڈیاں انگوٹھے کو چھوڑ کر انسانی ہاتھ کی ہڈیوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اس میں انگشت شہادت بیچ والی
انگلی، انگوٹھی کی انگلی اور کنی انگلی سب کی ہڈیاں موجود ہوتی ہیں لیکن جس طرح انسانی انگلیوں کے اوپر ایک مستقل خول ہوتا ہے، اسی طرح یہ
ہڈیاں بھی مستقل طور پر گوشت کے اندر چھپی رہتی ہیں۔ ایک دن صاحب نے بڑے مزے کی بات کہی ——— وہیل چاہے ساتھ بدسلوکی
تو ضرور کرتی ہے لیکن دستانوں کے بغیر ہمیں کبھی نہیں چھوتی۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ جس نقطہ نظر سے بھی چاہیں غور کر لیں لیکن اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دنیا میں یہ ایک جانور ہے جس کی تصویر
کبھی نہیں بنے گی۔ یہ ضرور ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہو لیکن پوری طرح درست کوئی بھی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ بات
معلوم کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں کہ وہیل دراصل کیسی لگتی ہے۔ زندہ وہیل کی شکل کا تھوڑا بہت اندازہ لگانے کا اگر کوئی طریقہ ہو سکتا ہے تو بس
یہ کہ آپ خود وہیل کے شکار کو جائیں لیکن اس میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہیل آپ کا جہاز برباد کر کے آپ کو ڈبو دے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ
آپ وہیل کے سلسلے میں زیادہ تجسس نہ برتیں۔

وہیلوں کی نسبتہً درست تصویریں

اور وہیل کے شکار کی سچی تصویریں!

وہیلوں کی خوفناک تصویروں کے ضمن میں جی چاہتا ہے کہ چند اور بھی خوفناک قصے سناؤں جو بعض قدیم اور جدید کتابوں میں ملتے ہیں خصوصاً لنی، ہیریاس، ہیکلیٹ، ہیرس، کوویئے وغیرہ کے سفرناموں میں لیکن خیر اب انہیں چھوڑیئے۔

جہاں تک مجھے پتہ ہے روغنی وہیل کے صرف چار خاکے شائع ہوئے ہیں ———— کولنیٹ کا، ہگنز کا، فریڈرک کوویئے کا اور بیل کا۔ پچھلے باب میں کولنیٹ اور کوویئے کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہگنز کی تصویر ان دونوں سے کہیں بہتر ہے لیکن سب سے اچھی تصویر بیل کی ہے۔ بیل کی ساری ہی تصویریں نہایت نفیس ہیں لیکن دوسرے باب کی پیشانی پر مختلف پہلوؤں سے تین وہیلوں کی جو تصویر بنائی گئی ہے اس میں بیچ والی مچھلی کچھ ٹھیک نہیں۔ اس کی کتاب کے اوپر والی تصویر جس میں کشتیوں کو روغنی وہیلوں پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کی بابت تو گمان یہی ہے کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والوں کو اس منظر کی درستی پر شک پیدا ہو لیکن یہ تصویر بالکل درست اور اصل کے مطابق ہے۔

روس براؤن کی کتاب میں روغنی وہیل کی جو تصویریں ہیں ان کے خاکے درست ہیں لیکن طباعت بری ہوئی ہے۔ بہرحال اس میں اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں۔

رائٹ وہیل کے سب سے اچھے خاکے اسکورسبی کی کتاب میں ہیں لیکن ان کا پیمانہ اتنا چھوٹا ہے کہ جو تاثر پیدا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔ وہیل کے شکار کی اس نے بس ایک تصویر دی ہے۔ اس کی کتاب میں یہ بات بڑی خامی ہے کیونکہ صرف ایسی ہی تصویروں کے ذریعے آپ کو تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے کہ جیتے جاگتے شکاریوں کو کوئی جیتی جاگتی وہیل کیسی لگتی ہے۔

لیکن فی الجملہ وہیلوں اور شکار کے متعلق بہترین عکاسی دو فرانسیسی تصویروں میں کی گئی ہے۔ ان کی بعض تفصیلات تو ضرور غلط ہیں لیکن مجموعی طور پر نہایت اچھی ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر تو روغنی وہیل کے شکار کی ہے، دوسری رائٹ وہیل کے شکار کی۔ پہلی تصویر میں ایک زبردست روغنی وہیل اپنی پوری شان کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔ وہ سمندر کی گہرائیوں میں سے کشتی کے نیچے سے ابھی ابھی ابھری ہے اور اس کی ٹکر پر ٹوٹے ہوئے تختوں کا انبار ہے۔ کشتی کا اگلا حصہ ابھی تک ٹوٹا نہیں ہوا اور مچھلی کی کمر پر ٹکا ہوا ہے۔ جہاں ایک کشتی ران وہیل کے فوارے کے پیچھے آدھا چھپا ہوا کھڑا ہے اور اس طرح کودنے والا ہے جیسے کسی چٹان سے چھلانگ لگا رہا ہو۔ اس سارے واقعے کی نہایت صحیح اور عجیب و غریب تصویر پیش کی گئی ہے۔ رسیوں کی ٹوکری قریب خالی، ناند سفید سمندر پر تیر رہی ہے۔ ٹوٹے ہوئے برچھوں کے ڈنڈے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں۔ وہیل کے چاروں طرف تیرتے ہوئے جہازیوں کے سر نظر آ رہے ہیں اور پس منظر میں طوفان کے مختلف آثار نمایاں ہیں۔ سیاہ طوفان کے اس پار جہاز اس طرف آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس وہیل کی جسمانی تفصیلات میں بہت سی خامیاں نکالی جا سکتی ہیں لیکن چھوڑیئے، میں کبھی اتنی اچھی تصویر بنا نہیں سکتا۔

دوسری تصویر میں کشتی کو ایک جاگتی ہوئی زبردست رائٹ وہیل کے خاردار پہلو کے قریب آتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

یہ عظیم الجثہ کالی مچھلی سمندر میں اس طرح چل رہی ہے جیسے پہاڑی پر سے کالی آندھیاں اٹھتی ہے۔ اس کے فوارے کی دھار سیدھی
بھورا اور سیاہ ہے۔ اس کی آنکھوں سے اتنا دھواں نکلتا دیکھ کر آپ یہی کہیں گے کہ بچے اس کے پیٹ میں بہت زوروں میں کڑا
پک رہا ہے۔ سمندری چڑیاں دو چھوٹے چھوٹے گھونگے ایکڑے اور دوسری سمندری مخلوقات چمٹ رہی ہیں جو ڈیڈ ویل اپنی
خوش مگر پر اٹھائے پھرتی ہے۔ یہ موٹے موٹے ہونٹوں والی وہیل اپنے پیچھے موتی جیسے سفید دودھ کی گرداب چھوڑتی سمندر میں دوڑی چلی
جا رہی ہے۔ اس نے ہلکی سی کشتی کو اوروں پر اس طرح اچھال دیا ہے جیسے کوئی نادر دخانی جہاز کی پتواروں کے پاس آ کے پھنس گئی ہو۔ غرض
تصویر میں آگے کی طرف طوفان اور تلاطم ہے لیکن پیچھے کی طرف نہایت فنکارانہ تناسب کے ساتھ پر سکون سمندر کی شیشے جیسی سطح ہے جس میں
جہاز کے لنگر ڈالے ہوئے ہیں اور ایک مری ہوئی وہیل کا بے حس و حرکت جسم دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی ایک ستون جلنے کی طرح لگ رہی ہے اور
اس کے فوارے والے سوراخ میں برچھا بھونک کر فتح کا جھنڈا لگا دیا گیا ہے۔

جس مصور گارنری نے یہ تصویر بنائی ہے وہ کون تھا اور کون ہے؟ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یا تو وہ بذات خود
اپنے موضوع سے واقف تھا یا کسی تجربہ کار شکاری نے اس کی تربیت کی تھی جہاں تک تصویر میں وہیل دکھانے کا تعلق ہے۔ فرانسیسی لوگ ہی
ہیں جو طوفانی دکھاتے ہیں۔ اپنے سارے یورپ کی تصویریں دیکھ جائیے کہیں جیتے جاگتے اور طوفانی عمل کا ایسا نگار خانہ آپ کو کہیں نہیں ملے گا
جیسا فرانس کے عجائب گھروں میں۔ یہاں تماشائی دھکا کھاتا یورپ کی ساری عظیم جنگوں میں سے گزر جائے گا ———— یہاں ہزار
ہا شمال رومنیوں کی جھلک ہوگی اور مسیح شہنشاہ نظروں کے سامنے اس طرح کھنچتے چلے جائیں گے جیسے قدیم داستانوں کی مخلوق گارنری
نے بحری لڑائیوں کی یہ جو تصویریں بنائی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ورسائی کے اس نگار خانے میں لٹکا دیا جائے۔

فرانسیسیوں کو ہر چیز کے نادر پہلو دیکھ لینے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس خوبی کا اظہار خصوصاً ان تصویروں میں ہوتا ہے
جن میں وہیل کا شکار دکھایا گیا ہے۔ فرانسیسیوں کا ماہی گیری کا تجربہ انگریزوں کے مقابلے میں دسواں حصہ بھی نہیں اور امریکیوں کے
مقابلے میں تو ہزارواں بھی نہیں لیکن انہوں نے دونوں قوموں کو ایسی تصویریں فراہم کی ہیں جن میں وہیل کے شکار کی اصل روح اتر آئی
ہے۔ فی الجملہ انگریز اور امریکی مصوروں نے ماہی گیری کے منظر کا ایک سیدھا سادا سا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ مثلاً ایک رخ سے وہیل
کی بے حس سی تصویر بنا دی ہے جہاں تک منظر کشی کا تعلق ہے یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے ایک رخ سے اہرام مصر کا خاکہ کھینچ دیا جائے۔
اسکورزبی جیسے مشہور و معروف شکاری نے بھی گرین لینڈ وہیل کی ایک بے جان سی تصویر اور نارووہیل اور سنگ ماہی کے نیم جاں سی
سے چھوٹے چھوٹے خاکے پیش کرنے کے بعد کشتی کے لنگروں اور چاقوؤں وغیرہ کی تصویریں بنانی شروع کر دی ہیں۔ اور بڑی محنت اور
باریک بینی کے ساتھ قطب شمالی کے برف کے گالوں کی چھیانوے تصویریں جو ہو بہو اصل کے مطابق ہیں بڑے دعوے کے ساتھ
دنیا کے سامنے رکھی ہیں۔ مجھے اس عظیم سیاح کی شان میں گستاخی منظور نہیں بلکہ میرے دل میں تو اس تجربہ کار آدمی کی بڑی عزت
ہے لیکن ایسے اہم معاملے میں اس سے یہ بڑی فروگذاشت ہوئی کہ ہر برف کے گالے کی گواہی کے طور پر اس نے ایک حلفی بیان شامل نہیں
کیا ———۔

گارنری کی ان دو عظیم تصویروں کے علاوہ دو اور فرانسیسی تصویریں قابل ذکر ہیں جو کسی "دیوراں" نامی شخص نے بنائی

ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی لیکن کچھ دوسری وجوہات سے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس تصویر میں بحرالکاہل کے جزیروں میں وہیل کا پُرسکون شکار پیش کیا گیا ہے۔ ایک فرانسیسی شکاری جہاز ساحل پر لنگر کی طرف ٹھہرے ہوئے پانی میں کھڑا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ جہاز میں پانی پہنچایا جا رہا ہے۔ جو بالکل خاموش ہے۔ جہاز کے بادبان اور پیچھے کی طرف ناریل کے درختوں کے لمبے لمبے پتّے نیچے لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ تصویر نہایت اثر انگیز ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جفاکش ماہی گیروں کو گرم ملکوں کے سے آرام واطمینان کی حالت میں دکھایا گیا ہے جس کا موقع ان لوگوں کو بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ دوسری تصویر بالکل مختلف قسم کی ہے۔ جہاز کھلے سمندر میں جا رہا ہے اور ایک وہیل سے مقابلہ آپڑا ہے۔ چنانچہ جہاز اس عفریت کی طرف اس طرح بڑھ رہا ہے جیسے گھاٹ کی جانب۔ ایک کشتی اس میدانِ جنگ سے جلدی جلدی ہٹ کر دور دور وہیلوں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔ نیزے اور برچھے بس اب استعمال ہونے ہی والے ہیں۔ تین جہازی مستول کو اس کے سوراخ میں گھونپ رہے ہیں۔ اور ایک دم سے کچھ ایسی پھیری ہیں کہ ایک چھوٹی سی کشتی پانی میں سے ابھر کر الٹی کھڑی ہو گئی ہے جیسے الف گھوڑا۔ جہاز پر سے گھٹتی ہوئی وہیل کا دھواں آسمان کی طرف اس طرح جا رہا ہے جیسے دیہات کے گاؤں میں بھٹیوں کا دھواں۔ ادھر اندھیاری بھی چلی آ رہی ہے۔ بارش اور طوفان آنے والا ہے۔ چاروں جوشیلے جہازیوں کی سرگرمیاں تیز ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ویل مختلف شکلوں میں

جب آپ لندن میں بندرگاہ کی طرف چلیں تو نائلز پر ایک ایسا فقیر نظر آئے گا اس کے گلے میں ایک تختہ لٹکا ہوا ہے جس پر یہ دردناک منظر دکھایا گیا ہے کہ اس کی ٹانگ کیسے ضائع ہوئی۔ اس تصویر میں تین وہیلیں ہیں اور تین کشتیاں۔ ایک کشتی کو جس میں وہ فقیر بھی صحیح سلامت ٹانگیں لیے موجود ہے، اگلے والی وہیل چبا رہی ہے۔ سنا ہے کہ یہ شخص دس سال سے یہی تصویر لیے بیٹھا ہے اور ایک بے اعتبار دنیا کو اپنی لکڑی کی ٹانگ دکھا رہا ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اسے سچا ثابت کر دکھایا جائے۔ اس تصویر کی تینوں وہیلیں واقعی اعلیٰ ہیں کم سے کم ایسی صحیح تصویر اور کوئی نہیں چھپی۔ اور اس کی لکڑی کی ٹانگ بھی واقعی لکڑی ہی کی ہے حالانکہ وہ ہمیشہ اسی لکڑی کے سہارے کھڑا رہتا ہے لیکن یہ بیچارا شکاری خطابت سے کبھی کام نہیں لیتا بس آنکھیں جھکائے پلکیں چھوڑے اپنی مصیبت پر غور کرتا رہتا ہے۔ تین ملک میں ہر جگہ فرد ہیں، سنگ بار بردار ہیں، بلکہ سارے بحر الکاہل میں اپنے کو وہیلوں اور شکار کے مناظر کی بڑی جاندار تصویریں ملیں گی جو خود ان گیروں نے روغنی وہیل کے دانت پر یا رائٹ وہیل کی ہڈی سے بنے ہوئے عورتوں کے بکسوں پر اسی قسم کی بیل بوٹے جیسی فرصت کے اوقات میں بنائی ہیں بعض جہازیوں کے پاس چھوٹے چھوٹے بکس ہوتے ہیں جن میں دندانے کے سے آلات رکھے رہتے ہیں یہ اوزار اسی کام آتے ہیں لیکن عموماً وہ اپنے چاقو ہی سے یہ سارا کام کرتے ہیں اور جہازیوں کے اس ہمہ مطلق ہتھیار سے اپنے جو بھی کہیں بنا کے رکھ دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص بہت دن تک مہذب ملکوں سے دور جاہلیت میں زندگی بسر کرے تو وہ اس حالت کو پہنچ جاتا ہے جس میں خدا نے اسے پیدا کیا تھا —— یعنی جس چیز کو وحشت اور بربریت کہتے ہیں۔ وہیل کا سچا شکاری اتنا ہی وحشی ہوتا ہے جتنا کوئی ریڈ انڈین یعنی خود وحشی ہوں اور آدم خوروں کے بادشاہ کے سوا کسی کا فرمانبردار نہیں ہوں بلکہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کو بھی ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ اچھا وحشی گھر میں بیٹھا ہو تو اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی محنت مشقت کر سکتا ہے۔ جزیرہ ہوائی کا کوئی قدیم گرز یا چپو جس پر نہایت پیچیدہ نقش و نگار ہوتے ہیں، انسانی استقلال کی اتنی ہی زبردست یادگار ہے جتنی لاطینی زبان کی لغت کیونکہ نقش و نگار کا یہ جال کسی ٹوٹی ہوئی کوڑی یا شارک کے دانت سے بنایا گیا ہے، اور اس پر برسوں کی محنت اور جانفشانی صرف ہوئی ہے۔

ہوائی کے وحشی کی طرح سفید فام وحشی ملاح کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی اسی حیرتناک استقلال کے ساتھ کام کرتا ہے اور محض اپنے معمولی چاقو سے ہڈی کا مجسمہ تیار کر سکتا ہے جس میں اس یونانی وحشی اخیلیز کی ڈھال کی سی کاریگری دکھائی دے گی مگر نقش و نگار ویسے ہی پیچیدہ ہوں گے اور اتنی ہی خوبصورت اور تیزی و تندی ہوگی جتنی ولندیز کے اس نفیس وحشی ڈیورر کی تصویروں میں۔ امریکہ کے شکاری جہازوں میں ملاحوں کے پاس لکڑی کے چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑوں پر نقش کی ہوئی وہیلوں کی ایک رخی تصویریں اکثر نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو نہایت صحیح اور درست ہوتی ہیں۔

دیہات میں سڑک کے کنارے والے پرانے مکانوں میں اپنے دروازے پر وہیل کی ہڈیاں دم کی طرف سے لگی ہوئی دیکھیں گے۔
ان سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ دربان سو رہا ہو تو باہر کے سوال ویل ہی کام آتی ہے لیکن ان ویلوں کے خد و خال پوری احتیاط کے
ساتھ نہیں بنائے جاتے۔ پرانی طرز کے گرجاؤں کے میناروں پر بھی آپ کو لوہے کی ویلیں نظر آئیں گی جو مرغ باد نما کا کام دیتی ہیں۔ لیکن یک
زاویتی ہمت ہوتی ہیں پھر گرجا ان پر دو باش؟ نکھار جاتا ہے چنانچہ آپ نہیں ترشتے نہیں دیکھ سکتے اور نہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کیسی
زمین کے چھریرے اور تنگ صحن میں جہاں اونچی اونچی شکستہ چٹانوں کے نیچے میدان پر بڑے بڑے پتھر عجیب و غریب شکلوں
میں پڑے رہتے ہیں۔ آپ کو اکثر ویل کے ٹکڑے گھاس میں دبے ہوئے ملیں گے اور تیز ہوا چل رہی ہو تو سبزے کی ہری ہری لہریں
ان سے ٹکرا رہی ہوں گی۔

پھر جہازی ملکوں میں جہاں سمندر کے چاروں طرف ڈھلوان اونچائیاں ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو خوش قسمتی سے کسی مناسب مقام پر جانے
کو بعض ڈھلوان اونچی ہموار چٹانوں پر ویل کی جھلکیاں سی نظر آئیں گی لیکن یہ نظارہ دیکھنے کے لیے آپ کو پکا شکاری ہونا چاہئے بلکہ اگر آپ ان کی نظر
دوبارہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس جگہ کا طول البلد و عرض البلد بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ ورنہ پہاڑیوں کے یہ نظارے اس طرح
اتفاقات پر مبنی ہوتے ہیں کہ دوبارہ ڈھونڈنے میں بڑی محنت کرنی پڑے گی ——— جس طرح جزیرہ سوآن کا آج تک کسی کو پتا نہیں
حالانکہ مینڈانا وہاں جا چکا ہے اور ... گوتیر نے ان کا حال بھی لکھا ہے۔

مشرق کی قومیں وقت تنگ جنگ کے بارے میں سوچتے بادلوں میں قوموں کی لڑائی دیکھنے لگی تھیں اسی طرح اگر
آپ اپنے موضوع پر غور کرتے ہوئے عالم جذب میں آ جائیں تو آپ کو بھی نادر ابھرے آسمان پر ویلیں اور ان کا شکار کھیلنے والی کشتیاں
دکھائی دینے لگیں گی چنانچہ قطب شمال کے قریب میں نے بھی چمکدار نقطوں میں ویل دیکھ کر ان کی گردش کے ساتھ ساتھ ان کا تعاقب کیا
کیا ہے۔ قطب جنوبی کے چمکدار آسمانوں کے نیچے میں خیالی کشتی میں بیٹھ کر ستاروں والی ویل کے پیچھے برج ہوا سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔
اگر میں جہاز کے لنگروں کو لگام اور برچھیوں کو مہمیز بنا کر اس ویل پر سوار ہو سکتا تو میں اس سے دوڑتا ہوا اعلیٰ علیین تک جاتا
اور دیکھتا کہ یہ افسانوی آسمان اپنے بے شمار عجوبوں سمیت میری انسانی نظروں کی پہنچ سے باہر ہیں یا نہیں!

ویل کا چارا

جزیرہ کورزٹ سے شمال مشرق کی طرف چلے تو ہمیں ویل کے چارے کی ایک بہت بڑی چراگاہ ملی۔ یہ ایک زرد زرد مادہ ہوتا ہے اور رائٹ ویل زیادہ تر اسی کو کھاتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف میلوں تک یہی مادہ سمندر میں تیر رہا تھا چنانچہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم گیہوں کے سنہرے سنہرے کھیتوں میں چل رہے ہیں۔

دوسرے دن بہت سی رائٹ ویلیں نظر آئیں۔ پیکوڈ تو صرف سپرم ویلوں کے شکار کو نکلا تھا اس لیے انھیں اس طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ منہ کھولے تیرتی جاتی تھیں۔ رائٹ ویل کے منہ میں جو ایک کھڑکی سی ہوتی ہے اس کے ریشوں میں یہ چارا اٹک جاتا اور پانی ہونٹوں میں سے بہہ نکلتا۔

جس طرح دلدلی چراگاہوں میں صبح کے وقت کسانوں کی قطار اپنی درانتیاں لیے لمبی اور گیلی گھاس میں آہستہ آہستہ اور برابر آگے بڑھتی ہے، اسی طرح یہ ویلیں ایک عجیب طرح گھاس کاٹنے کی سی آواز نکالتی ہوئی چل رہی تھیں اور زرد سمندر میں نیلے رنگ کے بے شمار نشان چھوڑتی جا رہی تھیں۔

لیکن چارا کھاتے ہوئے ان کے منہ سے جو آواز نکلتی تھی بس اسی کو سن کر گھاس کاٹنے والے کی یاد آتی تھی۔ ورنہ مستول کے اوپر سے دیکھا جاتا، خصوصاً اس وقت کہ جب وہ رک جاتی تھیں تو ان کے سیاہ زبردست جسم بے جان چٹانوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

ہندوستان کی شکارگاہوں میں ابھی بیٹھے ہوئے ہاتھیوں کو دور سے دیکھ کر اجنبی اونچے سیاہ ٹیلے سمجھتا ہے اور گزر جاتا ہے یہی حال اس شخص کا بھی ہوتا ہے جو سمندر میں اس قسم کی ویلوں کو پہلی مرتبہ دیکھے۔ اور پہچان بھی لے تو ان کی زبردست جسامت دیکھ کر بڑی مشکل سے یقین آتا ہے کہ ان دیوہیکل جانوروں میں بھی زندگی ویسی ہی اور ویسی ہی ہوگی جیسی گھوڑے یا کتے میں ہوتی ہے۔

دوسرے پہلوؤں سے بھی آپ سمندر کی مخلوق کو ان جذبات کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے جن کے ساتھ خشکی کے جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ چند پرانے ماہرین حیوانات نے یہ تو ضرور کہا ہے کہ خشکی کے سارے جانور سمندر کے جانوروں کی نسل سے ہیں اور ممکن ہے عام حیثیت سے یہ بات ٹھیک بھی ہو مگر خصوصیات کے ساتھ ذرا بتائیے کہ سمندر میں کوئی ایسی مچھلی ہے جس کے مزاج میں کتے کی سی دانائی اور نرمی ہو۔ جنسی اعتبار سے سمندر میں کتے کا کوئی مثیل ڈھونڈا جائے تو بس ایک منحوس شارک ہی ملے گی۔

عام طور سے خشکی والوں نے سمندری مخلوق کو ہمیشہ کراہت اور تنفر کے جذبات کے ساتھ دیکھا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں سمندر ہمیشہ ہمیشہ ایک نامعلوم سرزمین رہا ہے اور کولمبس نے بے شمار انجانی دنیاؤں میں سفر کر کے بس ایک سطحی سی مغربی دنیا دریافت کی ہے۔ علاوہ ازیں قدیم سے بلا تمیز ہولناک حادثے ان ہزاروں انسانوں کو پیش آتے رہے ہیں جو سمندر کے سفر کو نکلے تھے۔ چاہے یہ بچہ انسان اپنے علم اور ہنرمندی کی کتنی ہی شیخیاں کیوں نہ بگھارے اور آگے چل کے ان باتوں میں کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے لیکن سمندر خدا کے غضب کی طرح ہمیشہ

انسان کو اس نیس کرتا رہے گا اس کے بنائے ہوئے شاندار سے شاندار جہاز کے پرخچے اڑاتا رہے گا اور انسان کے غرور کو خاک میں ملاتا رہے گا۔
بہرحال یہ ہے کہ انسان کے دل میں خواہ ... پیدا ہوتے ہیں کہ سمندر کی وہ ہیبت زائل ہو چکی ہے جو شروع ہی میں محسوس ہوا کرتی تھی۔

انسان کی تاریخ میں سب سے پہلے جس کشتی کا ذکر آتا ہے وہ ایک ایسے سمندر میں تیر رہی تھی جس نے بڑے بڑے نگلیوں کے سے انتہائی جذبے کے ساتھ ساری دنیا کو ڈبو کے رکھ دیا تھا اور ایک بیڑہ تک کو باقی نہ چھوڑا تھا یہی سمندر آج بھی سمندر رہا ہے۔ اسی سمندر نے پچھلے سال جہازوں کو برباد کیا تھا۔ ہاں اصل افسانہ حضرت نوح کا ہے جب ابھی ختم نہیں ہوا دنیا کے وہ تمام تختے کو اس نے ابھی تک ڈھانپ رکھا ہے۔

آخر سمندر اور خشکی میں وہ کونسا فرق ہے کہ ہر چیز ایک جگہ جو بھی جاتی ہے وہ دوسری جگہ جو نہیں ہوتی۔ جب ٹائٹن اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے زمین پھٹی اور وہ اس میں سما گئے تو وہاں نے اسے ایک ہولناک غیر فطری واقعہ سمجھا لیکن آج تک کوئی دن ایسا نہیں ہوا کہ سمندر بالکل اسی طریقے سے جہازوں اور ملاحوں کو نہ نگلتا ہو۔

انسان تو خیر ہے سمندر اس کے ساتھ دشمنی برتے تو برتے لیکن وہ تو اپنی اولاد کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتا ہے۔ وہ اس ہرن سے بھی برا ہے جس نے اپنے بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ سمندر تو ان جانوروں کو بھی نہیں بخشتا جو اس کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح جنگل میں شیر خود اپنے بچوں کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح سمندر زبردست سے زبردست وہیلوں کو چٹانوں پر دے مارتا ہے اور انہیں ٹوٹے ہوئے جہازوں کے ڈھانچوں کے ساتھ وہیں پڑا رہنے دیتا ہے۔ سمندر کے دل میں تو رحم نہیں۔ اپنے سوا اس پر کسی کا اختیار نہیں۔ بعض اوقات سمندر سارے کرۂ زمین پر اس پاگل جنگلی گھوڑے کی طرح ہانپتا اور پھنکارتا پھرتا ہے جس کا سوار کھو گیا ہو۔

ذرا سمندر کی چالاکی پر غور کیجیے ———— اس کی سب سے خوفناک مخلوق انسان کی نظروں سے دور پانی کے نیچے تیرتی ہے اور نہایت حسین قسم کے نیلے رنگوں کے پیچھے چھپی رہتی ہے۔ پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ سمندر کے سب سے بے رحم و سنگدل جانور بھی کی طرح حسین اور چمکدار ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض قسم کی شارک مچھلیوں کی رنگ اور نفیس شکل۔ ہاں سمندر کی عالمگیر خونخواری پر غور کیجیے جس کی اولاد ایک دوسرے کو کھاتی رہتی ہے اور جس دن سے دنیا بنی ہے ایک ابدی جنگ میں مصروف ہے۔

ان سب باتوں پر غور کیجیے اور پھر اس سرسبز، شریف، نرم اور سیدھی سادی زمین پر نظر ڈالیے۔ سمندر اور زمین دونوں کے متعلق غور کیجیے۔ کیا آپ کو اپنے اندر کسی چیز سے مطابقت نظر نہیں آتی؟ جس طرح سرسبز زمین کے چاروں طرف ہولناک سمندر ہے، اسی طرح انسان کی روح میں بھی ایک چھوٹا سا تاہیتی ہے جہاں سکون اور مسرت کا راج ہے۔ لیکن اس کے چاروں طرف انتہائی دہشت ناک اور نامعلوم مخلوق بستی ہے۔ تجھ پر خدا کی امان ہو! اس جزیرے سے کبھی باہر نہ نکل، ورنہ تو کبھی واپس نہ آ سکے گا!

سکوئڈ

پیکوڈ ان چراگاہوں میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ شمال مشرق کی سمت جزیرہ جاوا کی طرف تھا۔ ہوا نہایت ہلکی اور موافق تھی چنانچہ اس پرسکون ماحول میں اس کے تینوں بے ستول لطیف ہوا کے ساتھ ساتھ ایسے ہل رہے تھے جیسے میدان میں تاڑ کے درخت اور اس خاموش رات میں پہلے جیسے وقفوں کے بعد وہ چمکتا ہوا روپہلا فوارہ اب بھی نظر آ جاتا تھا۔

لیکن ایک دن کوئی دس بجے کے وقت آسمان بالکل نیلا اور صاف شفاف تھا۔ سمندر پر ایک ساکن سکوت طاری تھا لیکن پانی میں ایسا ٹھہراؤ نہ آیا تھا کہ جہاز کے چلنے میں خلل ہو۔ لہروں پر سمندر کی چمک اور روشنی اس طرح پڑ رہی تھی جیسے کوئی سنہری انگلی رازداری کا حکم دے رہی ہو موجیں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھیں۔ ساری دنیا پر ایک عجیب سکوت کا عالم طاری تھا۔ اس کیفیت میں بڑے مستول کے اوپر سے ڈگو کو ایک عجیب و غریب اور خوفناک چیز نظر آئی۔

ہمارے جہاز سے بہت دور ایک بڑی سی سفید چیز آہستہ آہستہ پانی میں سے ابھری اور اوپر اٹھتی چلی گئی پھر جیسے پانی سے الگ ہو کر ہمارے سامنے اس طرح چمکنے لگی جیسے پہاڑیوں پر سے کوئی برف کی چٹان پھسل کر ابھی ابھی نیچے آئی ہو۔ تھوڑی دیر تک چمک دکھانے کے بعد پھر آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ گئی اور پانی میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد پھر اٹھی اور ہوا میں خاموشی سے جگمگ جگمگ کرنے لگی۔ یہ وہیل تو معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ڈگو نے سوچا ——— کہیں یہ موبی ڈک نہیں ہے؟ وہ عجیب و غریب چیز دوبارہ پانی میں غوطہ لگا گئی لیکن جب ایک بار پھر نظر آئی تو حبشی اس بری طرح چیخا کہ اس کی آواز بجلی کی طرح ہر ایک آدمی کے دل میں اترتی چلی گئی ——— "وہ رہی! وہ نظر آئی! ابھی پانی میں سے ابھری ہے! وہ سامنے! سفید وہیل، سفید وہیل!"

یہ سن کر جہازی پشتوں کی طرف اس طرح بھاگے جیسے بہار کے موسم میں شہد کی مکھیاں ڈالیوں کی طرف لپکتی ہیں۔ اہاب ننگے سر تپتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر جہاز کے اگلے حصے میں کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیا جیسے سکان چلانے والے کو حکم دینے کی تیاری کر رہا ہو اور بڑے اشتیاق سے اس طرف دیکھنے لگا جدھر ڈگو کا بے حس و حرکت اور اوپر اٹھا ہوا بازو حرکت کر رہا تھا۔

وہ خاموش اور یکہ و تنہا فوارہ اتنے دنوں سے وقتاً فوقتاً نظر آ رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے آہستہ آہستہ اہاب کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا ہو کہ وہ بھی کچھ چکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے وہیل کے ساتھ اہاب نے سکون اور نرمی کے تصورات وابستہ کر لیے تھے۔ یا ممکن ہے کہ اس کے اشتیاق نے اسے دھوکا دیا ہو۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ سفید ٹیلہ دیکھتے ہی اس نے بڑی شدت کے ساتھ حکم دے دیا کہ سمندر میں کشتیاں ڈالی جائیں۔

چاروں کشتیاں فوراً پانی میں پہنچ گئیں اور اپنے شکار کی طرف تیزی سے بڑھنے لگیں۔ اہاب کی کشتی سب سے آگے تھی۔ وہ چیز ڈوب چکی تھی۔ ہم چپو اٹھا کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں وہ اسی جگہ جہاں ڈوبی تھی وہیں آہستہ آہستہ اوپر ابھرتی چلی آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے

تو ہم جوں ہی آگے کو بالکل ہی بھول گئے اور اس چیز کو دیکھنے لگے جس سے زیادہ حیرت انگیز مخلوق شاید ہی کبھی انسان کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ ایک دیو قامت چپٹا سا ڈھیر کئی سو گز لمبائی اور چوڑائی میں پھیلا ہوا اس کا رنگ بے شمار لمبے بازو جو کیکڑے کی طرح چھوٹ رہے تھے وہ ایسے پیچ و تاب کھا رہے تھے جیسے سانپ۔ گویا جو چیز بھی سامنے آ جائے اُسے وہ دبوچ کر کھانا چاہتے ہیں۔ اس کا زرد گول گول کا پیچیدہ دکھائی دے رہا تھا، نہ چہرہ اور نہ ہی کسی قسم کے آثار نظر آتے تھے کہ اس میں کوئی حس بھی ہوگی۔ یہ چیز آہستہ پانی پر پڑی لہریں لیے جا رہی تھی۔ اس کی شکل و وضع تھی کہ حیرت معلوم ہوتا تھا کہ زمین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں اور یہ بالکل اتفاقیہ طور پر پیدا ہو گئی ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ چیز ایک ہلکی سی غڑاپ کے ساتھ پھر غائب ہو گئی۔ اسطرح کہ اس تمام پانی کو پیچھے چلا جا رہا تھا جہاں پر تیرتی ہوئی تھی، وہ ایک دم سے دھنسا ڈالا زمین چلا گیا ——— اس عجیب مخلوق کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ میرا مقابلہ ہی اٹک سے سر ہو جاتا؟"

"کیا چیز تھی جناب؟" فلاسک نے کہا۔

"ایک بہت بڑا زندہ سکوئڈ تھا۔ سنا ہے کہ شکاری جہاز اسے دیکھنے کے بعد مشکل ہی سے اپنے بندرگاہ واپس پہنچتے ہیں۔"

لیکن اس نے کچھ دیر کے اس نے اپنی کشتی موڑی اور جہاز کی طرف چل دیا۔ دوسروں نے بھی چپ چاپ اس کی پیروی کی۔

روغنی ویل کے شکاریوں میں اس چیز کو دیکھنے کے متعلق طرح طرح کے توہمات رائج ہیں۔ بہرحال اتنی بات ضرور ہے کہ سکوئڈ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے اتنا پُراسرار سمجھا گیا ہے اور لوگ اس سے شگون لینے لگے ہیں۔ یہ اتنا کم دکھائی دیتا ہے کہ لوگ سارے جہازی کہتے تو یہی ہیں کہ سمندر میں اس سے بڑا جانور کوئی نہیں لیکن اس کی شکل و صورت کے متعلق عام طور سے ان کے ذہن میں ایک دھندلا سا نقشہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کا خیال ہے کہ روغنی ویل اس کی چیز کھاتی ہے۔ دوسرے قسم کی ویلیں اپنی غذا پانی کی سطح کے اوپر حاصل کرتی ہیں اور انھیں کھاتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن روغنی ویل پانی کی تہ میں اپنی غذا نہ معلوم کہاں سے حاصل کرتی ہے اور ہم میں تیار سا ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ غذا ہوتی کیا ہے۔ جب روغنی ویل کا دوروں سے پیچھا کیا جاتا ہے تو بعض وقت وہ قے کر دیتی ہے جس میں سے ایسی چیزیں نکلتی ہیں جنھیں سکوئڈ کے کٹے ہوئے بازو سمجھا جاتا ہے۔ یہ بازو بعض بیس بیس فٹ سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بازو جس جانور کے ہیں وہ عام طور سے ان کے ذریعے سمندر کی تہ میں چپکا رہتا ہے۔ اور دوسری ویلوں کے برعکس روغنی ویل کے دانت ہوتے ہیں اسی سے یہ اس جانور کو پھاڑ کے کھاتی ہے۔

کئی واقعے ہیں جن کی بنا پر یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ پادری پونٹوپیڈن نے جس زبردست جانور کراکن کا ذکر کیا ہے وہ شاید آخر میں سکوئڈ ہی نکلے۔ پادری صاحب نے بتایا ہے کہ یہ جانور کبھی پانی میں سے ابھر آتا ہے، کبھی پھر ڈوب جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کراکن کی کئی اور خصوصیات ایسی بتائی ہیں جو سکوئڈ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر پادری صاحب نے کراکن کی جسامت اتنی زبردست بتائی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ یہاں البتہ کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔

یہاں جس پُراسرار جانور کا بیان ہوا اس کے متعلق ادھر ادھر کی افواہیں سن کر بعض ماہرین حیوانات نے اسے دوش مچھلی کے قبیلے میں شامل کر دیا ہے جس میں بعض ظاہری باتوں کے لحاظ سے تو یہ چیز درست معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ صداقت بس ظاہری ہے۔

باب - ۶۰

ڈور

اب وہیل کے شکار کا ایک منظر بیان ہونے والا ہے۔ اس قسم کے قصّے آگے چل کر بھی سنائے جائیں گے چنانچہ یہاں میں وہیل کی ڈور کا حال سنانا چاہتا ہوں جو بڑی سحر انگیز چیز ہے لیکن کبھی کبھی جان لیوا بھی بن جاتی ہے اس طرح آپ کو یہ سارے واقعات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ابتداء ماہی گیری کے کام میں بہترین سن کی رسی استعمال کی جاتی تھی عام طور سے رسیوں کو تارکول پلایا جاتا ہے مگر ان رسیوں پر بس ہلکا سا تارکول چھڑکا جاتا تھا عام طور سے تارکول کے ذریعے رسی بٹنے والے کے لیے سن ملائم پڑ جاتا ہے اور ملاحوں کو بھی اس رسی کے استعمال میں آسانی ہوتی ہے مگر وہیل کی ڈور کو کشتی کے حوالے کیا جاتا ہے چنانچہ اگر اس رسی میں تارکول زیادہ ہو تو رسی اتنی سخت ہو جائے گی کہ کام میں نہ آ سکے پھر اب جہازیوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ تارکول سے رسی میں چمک اور کساوٹ آ جاتی ہے لیکن مضبوطی یا پائیداری نہیں پیدا ہوتی۔ پچھلے چند سال سے امریکہ کے شکاری جہازوں میں سن کی رسی کے بجائے منیلا کی رسی استعمال ہونے لگی ہے۔ یہ سن کی طرح پائیدار تو نہیں ہوتی لیکن اس میں لچک زیادہ ہے چونکہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی بانکپن ضرور ہوتا ہے اس لیے میں ایک بات اور کہوں گا منیلا کشتی میں سن کی رسی سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ سن کا رنگ گہرا اور حبشی سا لگتا ہے لیکن منیلا گورا چٹا اور سنہرے بالوں والا لگتا ہے۔

یہ ڈور دو تہائی انچ موٹی ہوتی ہے۔ پہلی نظر میں یہ اتنی مضبوط نہیں لگتی جتنی واقعی ہوتی ہے۔ آپ تجربہ کر کے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ اس کے ڈیڑھ سو ریشے اتنے مضبوط ہیں کہ ہر ایک تقریباً ایک سو بیس پاؤنڈ وزن سہار سکتا ہے۔ چنانچہ پوری رسی تین ٹن بوجھ اٹھا سکے گی۔ لمبائی میں عام طور سے یہ ڈور دو سو فیدم سے بھی زیادہ ہوتی ہے کشتی کے پچھلے حصے میں یہ رسی ناند کے اندر چکر دار شکل میں لپٹی رکھی رہتی ہے۔ جس وقت ڈور چھوڑنی پڑی ہو اگر اس میں ذرا سی بھی گانٹھ پڑ جائے تو خطرہ یہ رہتا ہے کہ کسی کا بازو یا ٹانگ یا سارا جسم ضرور اس کی لپیٹ میں آ جائے گا چنانچہ رسی کو ناند میں رکھتے وقت انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے۔ بعض ہارپونیئر تو صبح کا سارا وقت اسی کام میں لگا دیتے ہیں۔ پہلے تو رسی کو بہت اونچا لے جاتے ہیں پھر گراری کے تختے میں سے گزار کے نیچے ناند میں چھوڑتے ہیں تاکہ کہیں سے الجھی ہوئی نہ رہ جائے۔

انگلستان کی کشتیوں میں ایک کے بجائے دو ناندیں استعمال ہوتی ہیں اور ایک ہی رسی کو ٹکڑے کر کے ان دونوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس میں ایک فائدہ بھی ہے۔ یہ دو ناندیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ آسانی سے کشتی میں آ جاتی ہیں اور کشتی پر اتنا زور بھی نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف امریکی ناند کا قطر تقریباً تین فٹ اور گہرائی بھی اسی مناسبت سے ہوتی ہے۔ ایک ایسی کشتی کے لیے جس کے تختے بس آدھ انچ موٹے ہوں یہ بوجھ بہت ہے کیونکہ شکاری جہاز کی کشتی برف کی پتلی تہہ کے مانند ہوتی ہے جو بکھرا ہوا بوجھ تو بہت سا برداشت کر سکتی ہے لیکن اگر سارا بوجھ ایک جگہ جمع ہو جائے تو اسے نہیں سہار سکتی۔ جب امریکی ناند کے اوپر کینوس کا رنگ دار کپڑا بچھا دیا جاتا ہے تو کشتی میں یوں لگتی ہے جیسے وہیل کے لیے ایک زبردست کیک لے کر جا رہی ہو۔

ڈور کے دونوں سرے کھلے رہتے ہیں۔ پیچھے والے سرے کی شکل ایک پھندے کی سی ہوتی ہے جو پھندے کی طرف سے آگے نکلے
کنارے پر تمام چیزوں سے الگ لٹکتا رہتا ہے۔ یہ اہتمام دو باتوں کی وجہ سے ضروری ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر مچھلی ایسی طاقتور ہو اور لگا لے
کہ پیچھے بندھی ہوئی ساری ڈور کے اس کے ساتھ کھنچے چلے جانے کا خطرہ ہو تو پاس والی کشتی کی ڈور جلدی سے اس پھندے میں باندھ
دی جائے۔ ایسے موقع پر وہیل کو ایک کشتی سے دوسری کشتی میں اس طرح بھیج دیا جاتا ہے جیسے شراب کا دور چل رہا ہو۔ البتہ پہلی کشتی الگ پہنچانے کے
لیے قریب ہی منڈلاتی رہتی ہے۔ دوسرے یہ انتظام کشتی کی حفاظت کے لیے بھی ناگزیر ہے کیونکہ اگر رسی کا پچھلا سرا کشتی میں بندھا ہوا رہ جاتا
بعض اوقات ہوتا ہے، وہیل چشم زدن میں پوری ڈور کھینچ لے جائے تو معاملہ یہیں تھوڑے ہی ختم ہوگا۔ ہماری مصیبت زدہ کشتی بھی اس
کے ساتھ ساتھ سمندر کی گہرائیوں میں جا پہنچے گی، اور اس کے بعد تو اللہ نام لینے سے رہی۔

شکار کے لیے سمندر میں کشتی اتارنے سے پہلے ڈور کا اوپر والا سرا ناند میں سے نکال کے پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہاں گھومتے
ہوئے کھمبے کے گرد کر کے اسے پھر کشتی کی پوری لمبائی میں آگے کی طرف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسی ہر آدمی کی پتوار کے ہتھے پر پڑی رہتی ہے اور کشتی کے بیچ میں کلائی
سے رگڑ کھاتی ہے۔ پھر یہ ڈور کشتی کی دیواروں کے پاس بیٹھے ہوئے ملاحوں کے درمیان سے بھی گزرتی ہے اور پیشانی کے اوپر بنی ہوئی نالیوں
تک جا پہنچتی ہے۔ وہاں سے ایک قلم کے برابر پتلی لکڑی میں اٹکا دیا جاتا ہے تاکہ نالی میں سے پھسلنے نہ پائے۔ نالی میں سے یہ ہار کی طرح لٹکتی رہ
گئی ہے اور پھر کشتی میں داخل ہو جاتی ہے کوئی سو سوا سو فٹ رسی کانٹے کے صندوق پر لپیٹ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ پچھلی طرف دیوار
کے پاس سے جا کے اس چھوٹی سی رسی پر باندھ دیا جاتا ہے جو برچھے میں لگی رہتی ہے۔ پھر یہ چھوٹی سی رسی کو بھی ایسے الجھاوے دیے جاتے ہیں کہ اگر
آپ کو ساری تفصیلات سناؤں تو آپ بے زار ہو جائیں گے۔

غرض ڈور سانپ کی طرح کشتی کے چاروں طرف لپٹ جاتی ہے، اور اسے اپنے پیچوں میں جکڑے رکھتی ہے۔ پتوار چلانے والے اس کے
خطرناک پیچ و خم کے اندر الجھے رہتے ہیں۔ چنانچہ خشکی پر رہنے والوں کی بزدلانہ نظروں کو وہ بالکل جنتر منتر والے سپیرے معلوم ہوتے ہیں جن کے جسم پر
زہریلے سانپ ہار کی طرح لپٹے ہوئے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں۔ کون ماں کا لال ایسا ہوگا جو رسی کے ان پیچوں میں پل بھر بیٹھ کے بھی بغیر ڈرے
پتوار چلا رہا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ بس اب کوئی دم میں برچھا پھینکا جائے گا تو یہ ساری گنجلک پیچ دار رسیوں کی طرح حرکت میں آجائے گی۔ یہ
سب جانتا ہو اور خوف کے مارے اس کی ہڈیاں نہ گلنے لگیں۔ لیکن عادت بھی عجیب چیز ہے۔ یہ سب کچھ کر دکھاتی ہے۔ اپنے مہمان بھی
ایسی اکھڑوں اور ان ایسے لطیفے، ایسی فقرے بازی کہیں کھانے کی میز پر بھی نہ دیکھی ہوگی جیسی شکاری کشتی میں ان دو انچ موٹے دیودار کے
تختے پر بیٹھ کے ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ چھ ملاح گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے سیدھے موت کے منہ میں جا رہے ہوتے ہیں۔

اپنے کبھی دیکھو وہیل کے شکاریوں میں کئی نے ایسے حادثات کا ذکر تو سنا ہی ہوگا کہ فلاں شخص ڈور کی لپیٹ میں آ کے کشتی سے
گر پڑا اور سمندر میں ڈوب گیا۔ اب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد آپ خود سمجھ جائیں گے کہ ان حادثات کی وجہ کیا ہے کہ جب ڈور چل رہی ہو تو کشتی کے اندر
بیٹھنا ایسا ہے جیسے پورے زور سے گھومتے ہوئے انجن کے بیچ میں بیٹھنا کہ جب ہر گھومتا ہوا پہیہ ہر دھرا اور ہر سلاخ آپ کو رگڑ رہی ہو،
بلکہ یہ تو اور بھی برا ہے کیونکہ ان خطرات کے درمیان آپ بے حس و حرکت بھی نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ کشتی تو پالنے کی طرح جھولتی رہتی ہے اور آدمی کو خبر بھی نہیں
ہونے پاتی اور وہ جھونکے سے ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کی قوت ارادی اور قوت عمل دونوں ایک ساتھ کام نہ کر رہی ہوں اور آپ

کو تمام تحریر توازن قائم نہ رکھتے تو اپنے سر کے بل گر کے اسی جگہ پہنچیں گے جہاں سے سورج کی عالمگیر کشش بھی پتہ تلاش کر کے واپس نہیں لاسکتی۔

طوفان سے پہلے جو گہرا سکون ہر طرف چھا جاتا ہے اور اس کی پیش گوئی کرتا ہے وہ شاید خود طوفان سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سکون تو اس طوفان کا غلاف ہے اور اسے اپنے اندر بند رکھتا ہے جیسے بے ضرر سی بندوق کے اندر ہلاکت خیز بارود، گولی اور دھماکا چھپا رہتا ہے۔ اسی طرح رسّی کے حرکت میں آنے سے پہلے اسے ملاحوں کے گرد سانپ کی طرح خوابیدہ سکون اور حسن کے ساتھ لپٹے دیکھ کر جتنا خوف محسوس ہوتا ہے اتنا اس خوفناک چیز کے کسی اور پہلو کو دیکھ کر نہیں ہوتا۔ لیکن اب آگے کہنے اور رکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمام انسان رسّی کی کنڈلیوں میں لپٹے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوتا ہے لیکن جب اچانک موت کا جھٹکا لگتا ہے تب انسانوں کو زندگی کے ان خاموش خطروں کا پتا چلتا ہے جو ہمیشہ سے موجود رہے تھے۔ اگر آپ نے فلسفیانہ طبیعت پائی ہے تو چاہے آپ شکاری کشتی میں بیٹھے ہوں، لیکن آپ کو اتنا بھی ڈر محسوس نہیں ہوگا جتنا رات کے وقت اپنے گھر میں آگ کے سامنے برچھا نہیں بلکہ چمٹا پاس رکھ کے بیٹھنے میں ہوتا ہے۔

باب - ۶۱

اسٹب نے ایک وہیل ماری

اسٹاربک تو سکوئڈ کو دیکھ کر شگون بیان کرتا تھا لیکن کوئی کوگ اس کا کچھ اور ہی مطلب سمجھتا تھا۔

اس جنگلی نے جہاز کے پہلو میں لگی ہوئی کشتی کے کنارے پر برچھا چھوتے ہوئے کہا۔ "سکوئڈ دکھائی دے تو پھر فوراً وہیل دیکھو گے۔"

اگلے دن سمندر نہایت پرسکون رہا اور آج بڑا حبس تھا۔ خالی خالی سمندر کو دیکھ کر نیند آتی چلی جا رہی تھی۔ سامنے کوئی ایسی چیز ہی نہ تھی جسے دیکھیں۔ چنانچہ جہازی اونگھنے لگے۔ ہم اس وقت بحر ہند کے اس حصے میں چل رہے تھے جو کوئی شکار گاہ وغیرہ نہیں ہے۔ یہاں شنگ، ڈالفن، اڑتی ہوئی مچھلیاں اور تمام قسم سمندروں کی دوسری جی دار مخلوق شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

میں مستول کے اوپر والی مچان پر پہرہ دے رہا تھا۔ میرے کندھے جھکے ہوئے تھے اور میں اسی جگہ کھڑا ہوا میں بڑے مزے سے جھول رہا تھا۔ آدمی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے اس ہوا کے جادو سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس خواب کی کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے میری روح میرے جسم میں سے نکل گئی اور جسم اسی طرح جھکولے کھاتا رہا جیسے گھڑی رک جانے کے بعد بھی پنڈولم ہلتا رہتا ہے۔

بے خودی طاری ہونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا کہ باقی دونوں مستولوں پر پہرہ دینے والے بھی اونگھ رہے ہیں۔ چنانچہ آخر کار ہم تینوں بے جان سے ہو کر ہوا میں جھولنے لگے۔ ہم جیسے ساتھ ساتھ نیچے وہ شخص بھی جو سکان پکڑے کھڑا تھا اونگھ رہا تھا۔ ادھر لہروں کے سر بھی نیند سے بوجھل تھے۔ سارا سمندر نیند کے نشے میں پڑا ہوا تھا۔ مشرق کا سر مغرب کی طرف گر رہا تھا اور مغرب کا مشرق کی طرف اور ان سب چیزوں کے اوپر سورج بھی اونگھ رہا تھا۔

دفعتاً میری بند آنکھوں کے نیچے بلبلے سے پھوٹنے لگے۔ میں نے جلدی سے اوسان پکڑ لیے۔ خدا کا ہی فضل تھا ورنہ میں گرنے ہی والا تھا۔ جھٹکا سا لگا تو میرے ہوش و حواس ایک دم سے بجا ہو گئے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو جہاز سے کوئی ستر گز کے فاصلے پر ایک زبردست وہیل کسی ڈوبے ہوئے جہاز کے جنگلے کی طرح پانی میں لڑھک رہی ہے۔ اور اس کی چوڑی چکنی چمکدار جھونپڑی جیسی کالی پشت سورج کی روشنی میں آئینے کی طرح جھلملا رہی ہے۔ وہ سمندر کی نالیوں میں نہایت آرام سے بیٹھی لہریں لے رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد چپ چاپ اپنے فوارے کی بھاپ جیسی دھار چھوڑنے لگتی تھی۔ اس حالت میں وہ بالکل ایسی لگتی تھی جیسے تیسرے پہر کے وقت کوئی تو ندل دکاندار پائپ پی رہا ہو۔ مگر اس بیچاری وہیل کو پھر کبھی پائپ پینا نصیب نہ ہوا۔ سوتے ہوئے جہاز میں ایک دم سے جاگ ہو گئی۔ اور ہر طرف کا شور اور بڑبڑ ہونے لگی۔ جیسے کسی جادوگر نے اپنی چھڑی گھما دی ہو۔ مستولوں کے اوپر سے جو تین آوازیں آئیں ان کے ساتھ ساتھ جہاز کے ہر حصے میں نعرے بلند ہونے لگے۔ سامنے وہ زبردست مچھلی نہایت اطمینان کے ساتھ ہوا میں اپنا چمکدار فوارہ چھوڑ رہی تھی۔

"کشتیاں ذرا جلدی چلاؤ" آواب چلایا، اور خود اپنے حکم کی تعمیل میں دوسروں سے بھی پہلے سکان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

شاید جہازیوں کے نعرے سے اس کو ویل بھاگ گئی ہو گی۔ ابھی کشتیاں تیرنے بھی نہ پائی تھیں کہ وہ نہایت شان کے ساتھ ہوا اور موجوں کے خلاف چل پڑی تھی، وہ اتنے سکون کے ساتھ تیر رہی تھی اور اس کے پیچھے اتنی کم لہریں اٹھ رہی تھیں کہ آہاب نے سمجھا شاید ابھی اسے خبر نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ خبردار رہیں، احتیاط رکھی جائے اور کوئی آنکھ زور سے نہ لے۔ ہم کشتیوں کی دیواروں پر ریڈ انڈین لوگوں کی طرح بیٹھے چپ چاپ لیکن نہایت تیزی کے ساتھ اسے پیچھے جا رہے تھے۔ سمندر اتنا پُرسکون تھا کہ ہم پتوار چلاتے تو اس سے بھی شور پیدا ہوتا چنانچہ ہم بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ہم مچھلی کے تعاقب میں جا رہے تھے کہ اتنے میں ویل نے اپنی دم ہوا میں چالیس فٹ اونچی اٹھا دی اور پھر اس طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی جیسے لہروں نے کسی مینار کو نگل لیا ہو۔

جہازیوں نے نعرہ لگایا "وہ بھاگ گئی" یہ اعلان ہوتے ہی اسٹب نے دیا سلائی نکالی اور اپنا پائپ سلگا لیا کیونکہ اب تھوڑی دیر کے لیے اسے مہلت تھی۔ ویل پانی میں غوطہ لگانے کے بعد جتنی دیر غائب رہتی ہے جب اتنا وقت گزر چکا تو وہ پھر ابھری۔ مچھلی اسٹب کی کشتی سے آگے اور دوسری کشتیوں کی بہ نسبت اس سے قریب تھی۔ چنانچہ اسٹب کو یقین تھا کہ اس کو پکڑنے کا فخر مجھ ہی کو حاصل ہو گا۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب ویل اپنے شکاریوں کی موجودگی سے خبردار ہو گئی ہے۔ اب احتیاط اور خاموشی رہنا فضول تھا چنانچہ ہم زور زور سے پتوار چلانے لگے اور اسٹب پائپ سے دھواں اڑاتے ہوئے اپنے جہازیوں کا دل بڑھانے لگا۔

وہاں مچھلی میں ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اسے خطرہ کا پورا احساس تھا اور اس کے تیرنے سے جو بلبلے پیدا ہو رہے تھے ان میں سے اپنا سر باہر نکالے سیدھی آگے چلی جا رہی تھی۔

"اس کا پیچھا کرو، جوانو، اس کا پیچھا کرو! اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ بڑا وقت چاہو لگاؤ لیکن اسے دھر لو! اس پر بجلی کی طرح گرو۔ بس میں تو اتنی بات چاہتا ہوں" اسٹب دھوئیں کے بادل اڑاتا ہوا بولا۔ "اس کے پیچھے چلو شاباش، گرو، ذرا اٹھو، شیر کی طرح جیسے پانی کاٹتے ـــــ اس پر ٹوٹ پڑو، لیکن ذرا اطمینان کے ساتھ ـــــ اطمینان کے ساتھ ـــــ اتنی گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ـــــ شیطان کی طرح پیچھے جاؤ کہ اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ ایسے جیسے مُردے بھی قبر سے اٹھ آئیں ـــــ ہاں یہ بات ہے جوانو! پیچھے چلو اس کے پیچھے۔"

"ووہو ہو! ـــــ" ہی آگے جیسے کا جنگلی جواب میں چلایا، اور اس کا جنگلی نعرہ آسمان تک بلند ہوتا چلا گیا۔ اس نے کچھ ایسے جوش کے ساتھ پتوار چلایا کہ ہر جہازی اچھل پڑا۔

اس کی وحشیانہ حرکتوں کے جواب میں کچھ اور وحشیانہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ "کی ہی! کی ہی!" ڈگو چلایا اور اپنی نشست پر اس طرح آگے پیچھے ہلنے لگا جیسے کوئی چیتا اپنے پنجرے میں چکر لگا رہا ہو۔

"کلا! کو! لُو!" کوئی کوئیگ اس طرح چلایا جیسے کسی مزیدار کھانے کو کھانے کے بعد ہونٹ چاٹ رہا ہو۔ غرض ان نعروں کے ساتھ اور پتواروں کے زور پر کشتیاں لہروں کو کاٹتی آگے جا رہی تھیں۔ اسٹب ابھی تک سب سے آگے تھا اور منہ سے دھوئیں کے بادل اڑاتا اپنے آدمیوں کو بڑھانے پر لگا ہوا تھا۔ جہازیوں نے سوچ کر بازی لگا دی تھی اور اپنی پوری طاقت سے پتوار چلا رہے تھے۔ اتنے میں وہ نعرہ سنائی دیا جس کا سب کو انتظار تھا۔

پھولا ہوا کشتی کو دیکھا —— وہیل کے قریب لاؤ! اور کشتی وہیل کے پہلو سے جا لگی۔ اسٹب نے نشانہ لے کر اور جھک کر وہیل کے بدن میں برچھا گھونپا تو اسے
وہیں سے پیادہ رسی سمیت کھینچ کر ساتھ ہی دوبارہ گھمانے لگا۔ گویا وہیل کے اندر کوئی سونے کی گھڑی گم گئی ہے جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں پہنچنے سے
پہلے کہیں ٹوٹ نہ جائے لیکن اسٹب جو سونے کی گھڑی ڈھونڈ رہا تھا وہ وہیل کی جان تھی۔ اب اس پر بھی وار ہو چکا تھا کیونکہ وہیل کی بے خودی ختم ہو گئی تھی
اور وہ انتہائی کرب کے ساتھ اپنے خون میں لوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کھولتے ہوئے وحشیانہ جھاگ کے پردے میں لپیٹ لیا تھا جس میں سے
وہ تلاطم میں دکھائی دیتی کشتی سخت خطرے میں پھنس گئی تھی۔ وہ جس جھاگ کے جال سے ہیجان اور اچھلتے میں سے باہر نکل کر دن کی صاف روشنی میں آ گئے۔
وہیل کی اذیت اب کچھ کم ہوئی، اور وہ پھر نظر آنے لگی۔ وہ ادھر ادھر لوٹ پوٹ رہی تھی۔ فوارے کا سوراخ اپنے پھیلاؤ اور سکڑاؤ رہا تھا
جیسے تشنج کے دورے پڑ رہا ہو۔ سانس تکلیف کے ساتھ اور تیز تیز چل رہا تھا اور اب فوارے میں کھنکھناتی آواز آتی تھی۔ کٹ کٹ کر جمے ہوئے لال لال خون کی
دھاریں ششر ابل کر بھیجی کی طرح فضا میں اچھلنے لگیں، اور نیچے گر کے وہیل کے بے حس و حرکت پہلوؤں پر سے بہتی ہوئی سمندر میں قطرہ قطرہ ٹپک
ٹپکنے لگیں۔ وہیل کا دل پھٹ چکا تھا!

"مسٹر اسٹب! یہ تو مر گئی" ڈیگو نے کہا۔

"ہاں، دونوں ہی پائپ چل کے ختم ہو گئے" اسٹب نے اپنا پائپ منہ سے نکال لیا اور راکھ پانی کے اوپر بکھیر دی۔ پھر وہ ذرا جھک کے
بے شک کے اس زبردست لاش پر غور کرنے لگا جو خود اس کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچی تھی۔

برچھا

پچھلے باب کے ایک واقعے کے سلسلے میں مجھے دو ایک نکتے کہنے ہیں۔

ماہی گیروں میں یہ ایک اٹل دستور چلا آ رہا ہے کہ جب شکاری کشتی جہاز سے روانہ ہوتی ہے تو سکان سنبھالنے کا کام عارضی طور پر اس کشتی کے سردار یا وہیل مارنے والے کے سپرد ہوتا ہے اور برچھے مارنے والا سب سے آگے والی پتوار کے پاس بیٹھتا ہے۔ مچھلی کے اندر برچھا مارنے کے لیے بازو ذرا مضبوط اور گٹھیلا ہونا چاہیے کیونکہ برچھا اکثر بیس یا تیس فٹ کے فاصلے سے پھینکنا پڑتا ہے لیکن مچھلی کا شکار چاہے کتنا ہی طویل اور صبر آزما کیوں نہ ہو جائے، برچھے مارنے والے سے توقع یہی کی جاتی ہے کہ وہ اس دوران میں پوری طاقت سے پتوار چلاتا رہے گا۔ اس سے تو یہی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ صرف پتوار چلا کر ہی نہیں بلکہ بار بار اونچی آواز میں دلیرانہ نعرے لگا لگا کر بھی جہازیوں کے سامنے غیر معمولی جانفشانی کی مثال قائم کرے۔ جس وقت بدن کے سارے عضلات پر زور پڑ رہا ہو تو نعرے لگانے اور زور سے چلاتے رہنا کیا معنی رکھتا ہے ——— اس کا حال تو کسی سے پوچھیے جس نے یہ کام کر کے دیکھا ہو۔ کم سے کم مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ جان توڑ مشقت بھی کروں اور ساتھ ہی ساتھ [illegible] چلاؤں بھی۔ غرض اس طرح محنت کرتے اور چیختے چلاتے ہوئے تھکے ماندے برچھے باز کو دفعتاً جوشیلا نعرہ سنائی دیتا ہے ——— "کھڑے ہو جاؤ، پھینکو برچھا!" اب وہ اپنی پتوار ہاتھ سے رکھ کر اسے باندھ دیتا ہے، پھر اپنی جگہ آدھا مڑ کر کانٹے پر سے اپنا برچھا اٹھاتا ہے اور جو تھوڑی بہت طاقت بدن میں باقی ہو اس کی مدد سے برچھے کو کسی نہ کسی طرح وہیل کے اندر اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر شکاری جہازوں کے پورے بیڑے پر بحیثیت مجموعی غور کریں تو یہ کوئی تعجب کی بات معلوم نہیں ہوتی کہ برچھا نشانے پر بٹھانے کے پچاس موقعوں میں سے پانچ بھی بار آور نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ بدقسمت برچھے بازوں پر لعنتیں پڑتی ہیں اور ان کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں کی تو رگیں ہی پھٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہیل کے بعض شکاری چار چار سال غائب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شکاری جہازوں کے اکثر مالکوں کی نظروں میں یہ کام گھاٹے کا ہے کیونکہ صرف کامیابی کا دارومدار اس برچھے باز پر ہوتا ہے اگر آپ اس کے بدن کا سارا دم نکال لیں تو ضرورت کے وقت اس میں طاقت کہاں سے آئے گی!

اگر برچھا نشانے پر بیٹھا تو اب دوسرا نازک لمحہ آتا ہے یعنی وہیل بھاگنا شروع کر دیتی ہے، ساتھ ساتھ کشتی کا سرغنہ اور برچھے باز آگے پیچھے دوڑ لگانے لگتے ہیں۔ اور اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی بھی جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس وقت وہ آپس میں جگہیں تبدیل کرتے ہیں اور کشتی کا سردار کشتی میں اس مقام پر جا کھڑا ہوتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہے۔

کوئی چاہے کچھ کہا کرے، مجھے یہ ساری باتیں احمقانہ اور غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ کشتی کے سردار کو شروع سے آخر تک آگے رہنا چاہیے۔ برچھا اور نیزہ دونوں اسی کو پھینکنے چاہئیں اور اس سے پتوار چلانے کا مطالبہ نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جو ہر ماہی گیر کو معلوم ہیں تو اور بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح کشتی کی رفتار میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہو جائے گی لیکن کئی قوموں کے شکاری جہازوں میں لمبے طویل تجربے میں نے یہی دیکھا ہے کہ وہیل شکاریوں کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہیل بہت تیز بھاگتی ہے، بلکہ اس کا سبب

یہ جہاں چھا کر ہر چھپے باز نکلے پکار پڑتا ہے۔

اگر بچے کو ٹھیک ٹھیک پڑھانا منظور ہے تو اس دنیا کے ہر چھپے بازوں کو اپنا ادراک کرنے کے لیے نت مشقت کرتے ہوئے نہیں اٹھا

یا چھنکار کام کرتے ہوئے۔

باب - ۶۳

کانٹا

وقت گذرنے کے ساتھ ہی نئے مسئلے پیدا ہوتے ہیں، اور ان میں سے ڈھیلیں نکلتی ہیں۔ موضوع یا لکڑی جو آس میں سے ایک باب بھی اسی طرح نکلتے ہیں۔

پچھلے صفحے پر جس کانٹے کا ذکر کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کو یہاں الگ سے بیان کیا جائے۔ یہ کوئی دو فٹ لمبی اور ایک عجیب شکل کی دو شاخہ لکڑی ہوتی ہے جو دونوں طرف والی دیواروں میں کانٹے کے قریب میخوں میں گڑی رہتی ہے۔ بریچے کا لکڑی والا سرا اس کانٹے پر رکھا جاتا ہے اور دوسرا خم دار سرا کشتی کی پٹیاں پر سے ذرا سا باہر کو نکلا رہتا ہے۔ اس کانٹے کا فائدہ یہ ہے کہ بریچے باز اپنے ہتھیار کو اتنی ہی آسانی سے اٹھا سکتا ہے جیسے جنگل کے شکاری دیوار پر سے بندوقیں اٹھا لیتے ہیں۔ دستور یہ ہے کہ کانٹے میں دو بریچے رکھے رہتے ہیں۔

لیکن یہ دونوں بریچے اپنی اپنی رسی کے ذریعے ڈور سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو ایک ہی وہیل پر بیک وقت دونوں پھینکے جا سکیں۔ تاکہ جب مچھلی بھاگے اور اتفاق سے ایک بریچا نکل جائے تو دوسرا اس کے بدن میں ہی رہے۔ اس طرح مچھلی کو مارنے کا دوہرا انتظام ہوتا ہے۔ لیکن کثر وہیل جب بریچا گڑنے کے بعد وہ تڑپ کے اس تیزی سے بھاگتی ہے کہ بریچا باز بجلی کی سی رفتار کی بنا دکھاتے ہوئے بھی وہیل کے اندر دوسرا بریچا نہیں مار سکتا۔ بہر حال دوسرا بریچا بھی ڈور میں بندھا ہوا ہے اور ڈور کشتی سے باہر جا رہی ہے۔ چنانچہ لازمی ہو جاتا ہے کہ اس ہتھیار کو کسی طرح اور کسی بھی جگہ سے باہر پھینک دیا جائے ورنہ تمام جہازی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ لہٰذا ایسے حالات میں اسے پانی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات صندوق کے اوپر پڑی ہوئی ڈور کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ لیکن یہ مرحلہ اتنا نازک ہے کہ بعض اوقات بڑے ہولناک اور ہلاکت خیز حادثے پیش آجاتے ہیں۔

ہاں، ایک بات اور یاد رکھیے۔ دوسرے بریچے کو باہر پھینک دیا جائے تو پیچھے لٹکتا ہوا یہ تیز ہتھیار بڑا خوفناک بن جاتا ہے۔ کبھی جھٹکا کھا کر کشتی کی طرف آتا ہے کبھی وہیل کی طرف جاتا ہے۔ ڈور کو الجھا دیتا ہے یا اسے کاٹ ڈالتا ہے۔ غرض ہر طرف ایک ہنگامہ برپا کیے رکھتا ہے۔ پھر جب تک وہیل مر نہ جائے اس بریچے کو پکڑ کے باندھنا دشوار ہوتا ہے۔

ذرا تصور تو کیجیے کہ جب ایک غیر معمولی طور پر تیز، بھاری اور طاقتور مچھلی کے پیچھے چار کشتیاں چلیں تو کیا حال ہوتا ہوگا ——

خصوصاً ایسے وقت کہ جب وہیل کی ان صفات کے باعث اور اس گھمسان لڑائی کے ہزاروں اتفاقات کی بنا پر مچھلی کے چاروں طرف ایک ساتھ آٹھ دس بریچے لٹک رہے ہوں۔ کیونکہ ہر کشتی میں کئی کئی فالتو بریچے ہوتے ہیں۔ اگر چلا بریچا مچھلی کے نہ لگے اور دوبارہ وہیل بھی نہ نکلے تو اس وقت ان زائد بریچوں کو ڈور میں باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ آپ آگے چل کر بعض نازک اور الجھے ہوئے مقامات کو بھی اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اسٹب کا کھانا

اسٹب کی وہیل جہاز سے کچھ فاصلے پر مری تھی۔ سمندر در اصل پرسکون تھا، چنانچہ ہم نے تینوں کشتیوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیا اور اپنے شکار کو آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے جہاز کی طرف لے جانے لگے۔ ہم اٹھارہ آدمی اپنے چھتیس بازوؤں اور ایک سو اسی انگوٹھوں اور انگلیوں کے ساتھ اس لاغر اور بے جان لاش پر گھنٹوں سے محنت کر رہے تھے لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ بس لمبے لمبے وقفوں کے بعد تھوڑی سی آگے کو سرک آتی تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ لاش کتنی زبردست ہے۔ چین کی عظیم ہونگ ہو میں سامان سے لدی ہوئی کشتی کو چار یا پانچ مزدور پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کوئی ایک میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کھینچتے ہیں۔ مگر ہم جہاز کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ اس مشکل سے کھسک رہا تھا جیسے اس میں سیسے کی اینٹیں بھری ہوں۔

اتنے میں رات ہو گئی لیکن پیکوڈ کی رسیوں پر جلتی ہوئی اور نیچے لگی ہوئی قندیلیں ہمیں تھوڑا بہت راستہ دکھا رہی تھیں لیکن جب ہم زیادہ قریب آئے تو دیکھا کہ اہاب نے چشموں کے اوپر کچھ قندیلیں لٹکا دی ہیں۔ ملاحوں کے اوپر جھانکتی ہوئی وہیل کو دم بھر خالی خالی نظروں سے دیکھنے کے بعد اہاب نے معمول کے مطابق حکم دیا کہ اسے رات بھر کے لیے رسیوں سے جکڑ دو۔ پھر وہ اپنی لالٹین ایک جہازی کو دے کر کیبن میں چلا گیا اور صبح تک باہر نہیں نکلا۔

جہاز کا اس وہیل کے تعاقب میں کپتان اہاب نے خصوصی دلچسپی دکھائی تھی لیکن اب جب ہم نے وہیل مار لی تو کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے اندر ایک قسم کی بے اطمینانی اور بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ گویا وہیل کی لاش دیکھ کر اسے یاد آگیا ہے کہ موبی ڈک ابھی تک زندہ ہے اور چاہے ہزاروں دوسری وہیلیں جہاز پر آ جائیں لیکن اس کے عظیم اور جنون آمیز مقصد کی تکمیل پھر بھی نہ ہو سکے گی۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز کے عرشے پر کچھ ایسی آوازیں ہونی شروع ہوئیں کہ جیسے سارے جہازی سمندر میں لنگر ڈالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ عرشے پر بھاری بھاری زنجیریں کھڑکھڑا رہی تھیں اور بعض سوراخوں میں سے باہر نکالا جا رہا تھا لیکن ان کھڑکھڑاتی ہوئی زنجیروں سے جہاز نہیں بلکہ وہیل کی زبردست لاش کو باندھنا مقصود تھا۔ وہیل کا سر جہاز کے پچھلے حصے کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اور دم اگلے حصے کے ساتھ۔ اب جہاز اور وہیل دونوں کا سیاہ وجود برابر برابر آ گیا۔ رات کی تاریکی میں جس نے اوپر بادلوں اور رسیوں تک کو چھپا رکھا تھا جہاز اور وہیل ایسے لگتے تھے جیسے دو زبردست بیل ایک ساتھ جتے ہوئے ہوں اور ان میں سے ایک آ بیٹھا ہو اور ایک کھڑا ہو۔

جہاں اہاب قدرے افسردہ تھا کہ گویا غم زدہ اہاب کو قرار آگیا ہے لیکن اس کا نائب اسٹب اپنی فتح مندی کے نشے میں سرشار تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے بھی جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی بے قراری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس کے افسر اعلیٰ سنجیدہ مزاج اسٹاربک نے اس وقت جہاز کا سارا انتظام چپ چاپ اس کے سپرد کر دیا۔ اس زندہ دلی کی ایک ثانوی اور چھوٹی سی وجہ جلدی ہی ظاہر ہو گئی۔ اسٹب بڑا خوش باش آدمی تھا اور وہیل کا گوشت اسے بڑا لذیذ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اکثر وہ اس کا شائق تھا۔

کباب ! کباب ! مرنے سے پہلے کباب ہو جائے۔ ویگی ذرا ٹھہرو بھی ! اُدھر جا کے وہیل کے گوشت کا کچا ٹکڑا کاٹ کے لا۔“

ایک بات اور سن لیجیے۔ یہ وحشی مچھیرے عام طور سے اور قومی اصول کے مطابق کم سے کم اس کا نسخہ حاصل کرنے سے پہلے ، اپنے دشمن سے تاوان جنگ وصول نہیں کرتے لیکن بعض دفعہ ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن میں چند لوگ ایسے بھی نکل آتے ہیں جنھیں وہیل کے گوشت کا شوق ہوتا ہے۔ خصوصاً اس حصے کا جو کہ دُم کہلاتا ہے۔

کوئی آدھی رات کے وقت وہیل کے کباب تیار ہو گئے اور وہیل کے روغن کی دو لالٹینیں سامنے رکھ کے اسٹب گٹھری بنا کے اپنے چرخے کے پاس بیٹھ گیا جیسے کھانے کی میز ہو۔ اس رات وہیل کے گوشت کی ضیافت اڑانے والوں میں اسٹب ہی اکیلا نہ تھا۔ اس کے منہ کی چپڑ چپڑ میں کچھ اور آوازیں بھی شامل ہو رہی تھیں۔ بلا مبالغہ ہزاروں شارک مچھلیاں وہیل کی لاش کے گرد جمع ہو گئی تھیں، اور اس کی چربی دار گوشت کا مزہ چٹخارے لے لے کر اڑا رہی تھیں۔ نیچے کوٹھری میں جو وہ چار آدمی سو رہے تھے وہ اپنے دل کے بالکل قریب جہاز کے چوبی ڈھانچے سے مچھلیوں کی دُموں کی چٹ چٹ سن کر دہل رہے تھے اور چونک اٹھتے تھے۔ اگر آپ جہاز کی دیوار پر سے جھانکتے تو آپ کو دکھائی دے جاتا کہ وہ بے رنگ پانی میں شارک مچھلیاں وحشی بنی پھر رہی ہیں اور جب وہیل کی لاش میں سے انسان کے سر کی برابر بڑے بڑے اور گول ٹکڑے کاٹ لاتی ہیں تو گویا کسی کو ٹکڑا مل جاتا ہے۔ شارک مچھلیوں کا یہ کرتب بھی ایک معجزہ ہے۔ وہیل کی کھال تو اس طرح لگتی ہے جیسے کٹ ہی نہ سکتی ہو مگر وہ کھود کھود کے گوشت نکال ہی لاتی ہیں اور ہر ٹکڑے کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ بھی کائنات کے عالمگیر مسئلے کا کچھ خاصا حصہ ہے۔ مچھلیوں کے کاٹنے سے وہیل کے جسم پر جو نشان بنتا ہے اسے کسی سوراخ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو بڑھئی پیچ کسنے کے لیے بناتے ہیں۔

اگر عرشے پر وہیل کا گوشت کٹ رہا ہو تو بھوکے کتے چاروں طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اسی طرح بحری لڑائی کی ہیبت اور شیطنت کے درمیان شارک مچھلیاں للچائی ہوئی نظروں سے جہاز کی طرف دیکھتی رہتی ہیں اور اس تاک میں لگی رہتی ہیں کہ کوئی مقتول گرے اور پیٹ کی تہ میں نکل جائیں۔ جہاز کے عرشے پر تو دیر تک طبق دار اور چھنٹے والی چھریاں لیے آدم خوروں کی طرح ایک دوسرے کا گوشت کاٹتے ہیں اُدھر سمندر میں شارک مچھلیاں اپنے جواہرات کے قبضے والے جبڑے لیے ایک دوسرے سے وحشی پن سے جھگڑتی ہیں۔ اگر آپ اس بات کو بے تعلقی سے بھی دیکھیں تو اسی ایک نتیجے پر پہنچیں گے یعنی یہ دونوں جماعتوں کے لیے ایک اتفاقی شریک اور قدرتی مرحلہ ہے۔ جب غلاموں کے جہاز بحر اوقیانوس میں سے گزرتے ہیں تو مچھلیاں نہایت پابندی اور شوق کے ساتھ جہاز کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہیں تاکہ اگر کوئی پارسل کہیں لے جانا ہو یا کسی مردہ غلام کو عزت کے ساتھ دفن کرنا مقصود ہو تو فوراً حاضر خدمت ہو جائیں۔ ہم کچھ ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ شارک مچھلیاں ایک خاص موسم اور خاص مقامات پر جمع ہو کے دعوت اڑاتی ہیں اور رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ لیکن ان کے جھنڈ اور ان کی زندہ دلی کی یہ کیفیت تو کسی جگہ دیکھی گئی بھی نہیں ہوتی جیسی مردہ وہیل کے گرد جو سمندر میں رات کو شکاری جہاز سے بندھی ہو۔ اگر آپ نے یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا تو شیطان کی پوجا کے مناسب یا نامناسب ہونے اور شیطان کی بارگاہ میں روئے گڑگڑانے کی موزونی یا ناموزونی کے متعلق ابھی سے کوئی فیصلہ نہ کیجیے۔

لیکن اسٹب نے ابھی تک اس ضیافت کے شور و شر کی طرف دھیان نہ دیا تھا جو اس کے بالکل قریب جاری تھی اور نہ شارک مچھلیوں نے اس کے عیش پسند ہونٹوں کی چپڑ چپڑ کو غور سے سنا تھا۔

”باورچی ! باورچی ! ——— یہ بڈھا کہاں گیا؟“ اسٹب چیخا۔ اس نے اپنی ٹانگیں اور چوڑی کر لیں تاکہ کھانے کے لیے زیادہ

گلگلی گئے اور تالاب میں کاشانیاں سی رہیں جیسے بربچا گھونپ رہا ہو۔ "باورچی! ادھر آؤ، باورچی!"

بڈھے حبشی کو جسے ابھی گرم گرم بستر میں سے زبردستی اٹھایا گیا تھا اور وہ کچھ ایسی ترنگ میں نہ تھا، وہ اپنے بستر سے اٹھ کے لڑکھڑاتا ہوا چلا کیونکہ بستر سے اٹھتے حبشیوں کی طرح اس کے گھٹنے کی ہڈیاں بھی کچھ گڑبڑ تھیں اور وہ انھیں ایسے ماتھے پر رکھ کے رگڑتا تھا جیسے دوسرے دونوں کو پیڑ کے پاس لنگڑاتا آیا۔ سہارے کے لیے اس کے ہاتھوں میں چپٹا لوہے کے حلقوں کو سیدھا کر کے بنایا گیا تھا۔ غرض وہ کل آنکھیں میں حاضر ہو گیا اور اسٹب کی پیڑ کے دوسری طرف لگ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ دونوں ٹانگوں والی چھڑی پر رکھ لیے، کمر اور آگے کو جھکا دی اور دوسری طرف کو لٹکا دیا، مگر جو کان ٹھیک تھا وہ اسٹب کی طرف ہے۔

اسٹب نے اپنے لال لال زبان منھ میں رکھتے ہوئے کہا "باورچی تم نے یہ کباب بہت گلا دیے۔ شاید تم نے اسے بہت باریک کوٹا تھا کہ بہت نرم ہو گئے۔ کیا میں نے تم سے ہمیشہ یہی نہیں کہا کہ ویل کے کباب تو خستہ اور سخت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اب ان شارک مچھلیوں ہی کو دیکھو، انھیں بھی ویل کا گوشت خستہ اور سخت پسند ہے۔ انھوں نے کیا طوفان بپا کر رکھا ہے! باورچی، ذرا جا کے ان سے بات تو کرو۔ ان سے کہو کہ وہ افلال اور تمیز کے ساتھ جتنا جی چاہے شوق سے کھائیں لیکن خاموش رہیں۔ لعنت ہے مجھے تو اپنی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جاؤ باورچی میرا پیغام دے آؤ۔ یہ لو لالٹین لیتے جاؤ۔ اچھا اب جاؤ اور انھیں نصیحت کرو۔"

باورچی نے بے دلی سے لالٹین پکڑی اور لنگڑاتا ہوا پشتوں کی طرف چل دیا۔ وہاں اس نے ایک ہاتھ سے آگے سمندر پر روشنی ڈالی تاکہ اپنے سامعین کو اچھی طرح دیکھ سکے، اور دوسرے ہاتھ سے بڑی متانت کے ساتھ چھڑی ہلانے لگا۔ اس نے دیوار پر جھک کر غنی ہوئی آواز میں مچھلیوں کے سامنے تقریر شروع کر دی، اور اسٹب چپکے چپکے پیچھے سے آ کر سننے لگا۔

"ہم جنس بھائیو! مجھے حکم ہے کہ تم سے کہوں کہ یہ شور اتنا نہ مچاؤ۔ سنا تم نے؟ یہ چیڑ چیڑ بند کرو۔ اسٹب صاحب کہتے ہیں کہ تمھارا جی چاہے تو ناک تک ٹھونس کے کھاؤ لیکن خدا کے لیے یہ ہنگامہ بند کرو۔"

"باورچی!" اسٹب نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور ساتھ ساتھ اس کے کندھے پر ایک چپت رسید کیا۔ "باورچی! ارے ظالم، وعظ کہتے ہوئے تو بدکلامی نہیں کرنی چاہیے۔ گنہگاروں کو راہِ راست پر لانے کا یہ طریقہ تھوڑا ہی ہے؟"

"یہ کون ہے؟ اچھا تو آپ خود انھیں نصیحت کر لیجیے۔" باورچی بگڑ کے چل دیا۔

"نہیں، باورچی۔ بولو، بولو۔"

"اچھا تو، میری پیاری بہنو ———"

"ٹھیک ہے" اسٹب نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "ہاں، انھیں ذرا پیار سے سمجھاؤ۔" اور حبشی پھر بولنے لگا۔

"تم سب شارک مچھلیاں ہو، تمھاری قوم ہوتی ہی ہے پیٹو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں میری بہنو، یہ پیٹو پن ——— یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم اس طرح چپٹ چپٹ مت کرو، یہ چپٹ چپٹ اور چیڑ چیڑ لیتی رہیں تو میری بات کیسے سنو گی؟"

"باورچی!" اسٹب نے اس کا گریبان پکڑ کے کہا۔ "میں بدکلامی کی اجازت نہیں دوں گا۔ ان سے شریفوں کی طرح باتیں کرو۔"

وعظ پھر شروع ہو گیا۔

"میری جنو! میں تمھیں اس بات کا الزام نہیں دیتا، خدا نے تمھیں بنایا ہی ایسا ہے۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں، لیکن اس بری عادت کو قابو میں رکھنا تمھارے بس میں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم شارک مچھلیاں ہو، لیکن تمھارے اندر جو شارک ہے اگر تم اسے قابو میں رکھو تو پھر تم فرشتہ بن جاؤ گی کیونکہ فرشتہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ شارک کو اچھی طرح قابو میں رکھا جائے۔ اچھا، اب دیکھو، جنو! تم اس وہیل کا گوشت کھا رہی ہو، ضرور کھاؤ لیکن ذرا تمیز سے کام لو۔ اپنے پاس والی مچھلی کے منہ سے بوٹی مت چھینو۔ اس وہیل پر تم سب کا حق برابر ہے، بلکہ اس پر تم میں سے کسی کا حق نہیں۔ یہ وہیل تو کسی اور کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے بعض کے منہ دوسری مچھلیوں سے زیادہ بڑے ہیں، لیکن بعض دفعہ بڑے منہ والوں کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے۔ تمھارا منہ اس لیے بڑا نہیں بنایا گیا کہ جو سامنے آئے نگل جاؤ۔ اس منہ کا کام تو یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جو بھیڑ کے پیچھے ہٹ گئی ہیں انھیں گوشت کاٹ کاٹ کے دو۔"

"شاباش بڑے میاں، شاباش!" اسٹب چلایا۔ "عیسائیت اسی کا نام ہے۔ ہاں، بولتے رہو۔"

"بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بدمعاش مچھلیاں تو برابر ایک دوسرے کو نوچے چلی جا رہی ہیں۔ یہ تو ایک طرح سے حقیقت ہے کہ جب تک ان کا پیٹ نہ اٹ جائے، ایسے جیتوں کو نصیحت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن ان کے پیٹ کا اور بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا، پھر جب ان کا پیٹ بھر جائے گا تو یہ ہماری بات کاہے کو سنیں گی، پھر تو یہ سمندر میں غوطہ مار جائیں گی اور مونگے کی چٹان پر جا سوئیں گی۔ اس کے بعد یہ کب کسی کی سننے والی ہیں۔"

"یار، میری بھی یہی رائے ہے۔ اچھا بڑے میاں، اب انھیں دعا دے دو، میں تو اپنا کھانا کھانے جاتا ہوں۔"

اب بڈھے حبشی نے مچھلیوں کے جھنڈ کے اوپر دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنی بھرائی ہوئی آواز بلند کرتے ہوئے بولا ——

"میری کمبخت جنو! تم سے جتنا غل غپاڑہ مچایا جائے مچاؤ، جتنا ٹھونسا جائے ٹھونسو، پیٹ پھٹتا ہے تو پھٹنے دو —— جاؤ مرو۔"

"اچھا باورچی،" اسٹب نے چرخی کے پاس کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "جہاں پہلے کھڑے تھے وہیں میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ اور غور سے سنو۔"

"جی سن رہا ہوں۔" باورچی نے مطلوبہ مقام پر کھڑے ہو کر اپنے چمچے کے سہارے جھکتے ہوئے کہا۔

اسٹب نوالے پر نوالہ اڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ بولا "اچھا، اب میں پھر اس کباب کی بات شروع کرتا ہوں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمھاری عمر کیا ہے؟"

"اس بات کو کباب سے کیا تعلق؟" بڈھے نے چڑ کے کہا۔

"خاموش رہو! بولو، تمھاری کیا عمر ہے؟"

"سنتے ہیں کوئی نوے سال کے قریب۔" بڈھا رنجیدہ صورت بنا کے بڑبڑایا۔

"تمھیں اس دنیا میں رہتے کوئی سو سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک تمھیں وہیل کے کباب پکانے نہیں آتے؟" اسٹب نے آخری لقمے کے ساتھ ساتھ ایک اور سوال جڑ دیا جو ایسا معلوم ہوا جیسے سوال کا ایک حصہ ہو۔ "باورچی، تم پیدا کہاں ہوئے تھے؟"

"ایک کشتی میں زینے کے پیچھے۔ اس وقت کشتی رو آنوک کی طرف جا رہی تھی۔"

"کیا یہیں پیدا ہوئے تھے؟ بڑی عجیب بات ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ تم کس ملک میں پیدا ہوئے تھے؟"

"میں نے بتایا تو تھا کہ روآنوک کے ہیں۔" بڈھا ذرا تیزی سے بولا۔

"نہیں تم نے نہیں بتایا۔ عجیب بات ہے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ باورچی! تم گھر جاؤ اور دوبارہ پیدا ہو تمہیں ابھی تک ویل کے کباب پکانا بھی نہیں آئے۔"

"مگر اب کے پکوان تو پھر بھی لذت ..." وہ خفا ہو کے غرایا اور مڑ کے چلنے لگا۔

"باورچی! ادھر آؤ ____ یہاں آؤ، اور مجھے اپنا چمچا دو ____"

"اچھا یہ کباب لو اور مجھے بتاؤ کہ بھلا یہ ٹھیک پکے ہیں؟ اچھا یہ کباب لو ____ ذرا چکھ کے بتاؤ۔"

بڈھا حبشی اپنے سر ہلاتے ہوئے ہونٹ چٹخاتے ہوئے بولا ____ "بہت ہی اچھے پکے ہیں میں نے تو ایسے کبھی نہیں کھائے بڑے ہی مزے کے ہیں۔"

اسٹب نے ایک دم پوچھتے ہوئے کہا "باورچی! تم کبھی گرجا میں گئے ہو؟"

"ہاں کیپ ٹاؤن میں ایک دفعہ گرجا کے پاس سے گزر آیا تھا" بڈھے نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اچھا تو تم اپنی عمر میں ایک بار گرجا کے پاس سے گزرے ہو اور پادری صاحب کو تم نے سنا ہے۔ میری بات غور سے سنو" کہہ کر اپنے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہنے لگا، "ٹھیک ہے؟ باورچی، اور اس کے بعد تم میرے سامنے ایسا سفید جھوٹ بولتے ہو! باورچی آخر تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"جی میں اب بستر پر جانا چاہتا ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے بڑھ چلا پڑا۔

"ارے رکو! ابھی ذرا ٹھہرو، میرا مطلب ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا چاہتے ہو۔ سوال تو ٹیڑھا ہے لیکن تمہارا کیا جواب ہے؟"

حبشی کا سارا انداز ہی بدل گیا اور وہ کہنے لگا ____ "جب یہ کالا آدمی مرے گا تو اپنے پیچھے کوئی بھی نہیں چھوڑ جائے گا بس ایک فرشتہ آکے اسے لے جائے گا۔" "دیکھے ہوا گھوڑوں کی گاڑی میں بٹھا کے، اور لے کہاں جائے گا؟"

"وہاں اوپر" حبشی نے چمچا اپنے سر کے اوپر اٹھایا اور بڑی متانت کے ساتھ اسے یوں ہی پکڑے رہا۔

"اچھا تو تمہارا خیال ہے کہ جب تم مرو گے تو بڑے مستول کے اوپر جاؤ گے لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ جتنے اوپر جاؤ اتنی ہی سردی بڑھتی جاتی ہے، بڑے مستول کے اوپر تو؟"

"میں نے تو یہ نہیں کہا" بڈھے نے پھر گڑگڑا کے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہاں اوپر، کہا تھا نا! اب ذرا دیکھو تو تمہارے چمچے کا اشارہ کس طرف ہے۔ لیکن باورچی شاید تمہارا خیال ہے کہ تم بادبان چڑھنے کی ڈالی ہی سے رینگ کے جنت میں جا پہنچو گے مگر نہیں بڑے میاں نہیں۔ اگر صحیح راستے سے جاؤ تو وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں جانے کے لیے تو تمہیں پرچی جانا پڑتا ہے، یہ کام تو ویسے کے چھٹے جانے کے برابر ہے لیکن ابھی ہم لوگ جنت میں نہیں پہنچے۔ باورچی اپنا چمچا پھینکو اور میرا حکم سن سکتے ہو؟ باورچی جب میں حکم دوں تو ایک ہاتھ سے ٹوپی اتار کر اور دوسرا ہاتھ دل پر رکھ کر ... ہیں! اچھا یہ تمہارا دل ہے! ارے او احمق!

وہ تو اوپر! اور اوپر! ____ ہاں ٹھیک ہے ____ اب دل لگا بس! ہاتھ وہیں رکھو اور غور سے سنو۔"

باب ۔ ۶۵

وہیل ایک کھانے کی حیثیت سے

یہ بات بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ انسان بھی جانوروں کو بھی غذا بناتا ہے جس کی جسامت سے اس کو حیرانی ہوتی ہے اور دوست کی طرح سے
تمام آدمی کی روشنی میں کھانے کے طور پر اس چیز کی تاریخ اور فلسفہ پر تھوڑا سا علم ہونا چاہیے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ تین صدی پہلے فرانس میں وہیل کی زبان ایک بڑی نعمت سمجھی جاتی تھی اور بڑی قیمتی تھی جو ہنری ہشتم کے زمانے
میں ایک شاہی باورچی کو ایک خاص ہدایت کے ساتھ انعام و اکرام ملتا تھا جو تمام ملک میں کے ساتھ کھائی جاتی تھی اور پکاتا تھا ۔ وہیل کی
قسم ہے مگر یہاں تک کہ کھال بھی بڑی چیز اور خوشبو دار بھی جاتی ہیں۔ ان کا گوشت کاٹ کر ٹکیوں کی شکل کے برابر بنا لیتے ہیں جنھیں خوب مصالحے
لگا کر بھونا جاتا ہے یہ ہرن کا گوشت معلوم ہوتا ہے۔ اور فرانس کے بدلے اب یہی کھانے کے لیے شوقین ہے بلکہ نہیں بادشاہوں کی طرف سے
کھانے کے لیے وظیفہ ملتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ وہیل کا گوشت اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے شکاری اسے عام طور پر کھانا سمجھتے لیکن اگر ایک کی موٹا ہے
کباب کے سامنے بیٹھے ہوں تو بھوک اڑ جاتی ہے۔ اس لیے آج کل دوست کی خاطر کے لیے وہ لوگ وہیل کا گوشت پکا کر کھاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ اس
قدر تیز ہوتے ہیں۔ ان کا تو گویا وہ وہیل ہے اور وہ اس کی دم کو تیل میں پکا کر رکھتے ہیں ان کے ایک مشہور شکاری کا ذکر ہے کہ وہ دو چیزیں
کے لیے وہیل کی چربی کے ٹکڑے چن کر رکھتے ہیں کیونکہ ان میں لذت بہت ہوتی ہے۔ ہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جب ہوا کہ اس جہاز میں چند اتفاق سے اپنے
شکاری جہاز میں سوار تھے اور وہیں رہ گئے جہاز والوں نے چربی نکالنے کے بعد وہیل کے بڑے بڑے ٹکڑے وہیں چھوڑ دیے۔ لوگ کئی دن تک اسی پر
گزارہ کرتے رہے۔ وہیل کے شکاری ان ٹکڑوں کو پارچے کہتے ہیں اور واقعی جب یہ تازہ ہوں اور خستہ ہوں تو ان میں سے ایسی خوشبو آتی ہے
جیسے باورچی کی بھی خوشبو آتی ہے۔ انھیں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے اور بھوک سے بے صبر ہو کر آدمی بھی اپنا ہاتھ نہیں روک سکتے۔

لیکن اگر مہذب یا ترقی یافتہ ملکوں میں وہیل کا گوشت نہیں کھایا جاتا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بہت چکنا ہوتا ہے۔ وہیل کو سمندر کا خنزیر بھی
کہا جاتا ہے جس میں اتنی چربی ہوتی ہے کہ نفاست پسند لوگوں کو گراں گزرتی ہے مثلاً اس کے کوہان کو دیکھیے چربی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ
بات نہ ہو تو بعض کے ٹکڑوں کا مزہ ایسا ہی ایک نعمت ہے جتنا کہ وہیل کا روغنی۔ تمام سفید صاف شفاف اور گاڑھا ہوتا ہے جیسے جمنے کے بعد گھی ہے لیکن
بہت سے لوگوں کو اس اگر یہ شوق ہوتا ہے کہ کشتی کے بجائے استعمال نہیں ہو سکتا ہے بلکہ بہت سے شکاری اسے کسی اور چیز میں ملا کر کھاتے ہیں۔ رات کے لمبے
پہروں میں جہازوں کے لیے یہ ایک عام بات ہے کہ وہ اپنے بسکٹ وہیل کے روغن میں ڈال دیتے ہیں اور انھیں تھوڑی دیر تک پکنے دیتے ہیں۔
خود میں نے اپنے لیے اس طریقے سے بڑے مزے کا کھانا تیار کیا ہے۔

بعض اوقات وہیل کا بھیجا بھی استعمال کیا جاتا ہے کھوپڑی کو کلہاڑی سے توڑ کے دو موٹے موٹے سفید لوتھڑے نکال لیتے ہیں جن کی شکل چھوٹے
کدو کی سی ہوتی ہے بھیجوں میں کدو کا ایک بڑا لقمہ ملا کر ایک لذیذ سالن بنایا جاتا ہے اس کا مزہ بچھڑے کے بھیجے کا سا ہوتا ہے جسے خوش باش لوگ بڑے

شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ جانتے ہی ہوں گے کہ بعض شوقین مزاج لوگ بچھڑے کا بھیجا اس قدر کھاتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کے سر میں بھیجا پیدا ہو جاتا ہے۔
یہاں تک کہ وہ بچھڑے کے سر اور اپنے سر میں تمیز کرنے لگتے ہیں ——— اور اس کام کے لیے کافی دماغی زرخیزی بھی درکار ہے۔ جو چاہیئے بھی
یہی سبب ہے کہ جب کوئی ذہین نوجوان اپنے سامنے بچھڑے کا ذہانت بھرا سر رکھے بیٹھا ہے تو یہ منظر بڑا المناک ہوتا ہے۔ بچھڑے کا سر اس کی طرف ملامت آمیز
نظروں سے دیکھتا ہوا زبان حال سے یہ کہتا معلوم ہوتا ہے ——— "ارے ظالم تو بھی ہے دغا باز!"

خشکی پر بسنے والوں کو وہیل کا گوشت کھانے کے خیال سے اتنی گھن آتی ہے تو شاید اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہیل میں حد سے زیادہ چربی
ہوتی ہے۔ شاید اس کا سبب تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوا ——— یعنی آدمی سمندر کے کسی جانور کو قتل کر کے کھاتے اور وہ بھی اسی کی روشنی میں۔ لیکن
جس شخص نے بیل کو سب سے پہلے قتل کیا اسے بھی قاتل سمجھا گیا ہو گا بلکہ اسے پھانسی بھی دی ہو گی۔ اگر اس کا مقدمہ بیلوں کی عدالت میں پیش ہوتا تو پھانسی
ضرور ملتی۔ اور وہ بھی اگر دوسرے قاتل اس کے مستحق ہیں تو وہ بھی تھا۔ ذرا ہفتے کی رات کو گوشت کے بازار میں جا کے دیکھئے۔ دو ٹانگ والے جانوروں
کا پورا ہجوم مردہ چوپایوں کی لمبی لمبی قطاروں کو تک رہا ہو گا۔ کیا یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی آپ آدم خوروں کو اتنا ہی مردود سمجھیں گے؟ آدم خور؟
آدم خور کون نہیں ہوتا؟ میں سچ کہتا ہوں۔ فیجی کا وہ جنگلی جو کسی دبلے پتلے پادری کو نمک لگا کے قحط کے زمانے کے لیے تہ خانے میں محفوظ رکھتا ہے
قیامت کے دن اس دور اندیش جنگلی کی اتنی بری حالت نہ ہو گی جتنی آپ کی صاحب۔ روشن دماغ اور خوش خوراک لوگوں کی جو بچاری بطخوں کو گردنوں سے
زمین پر گاڑ دیتے ہیں اور اس کے کلیجی گردے خوب بھون بھون کے کھاتے ہیں۔

اچھا اسٹب وہیل کو خود اس کی روشنی میں کھاتا ہے اور ایک تو نقصان پہنچایا، اوپر سے مذاق اڑایا۔ یہی تو بات ہوئی نا؟ صاحب، روشن دماغ
اور خوش خوراک لوگو! گائے کے کباب کھاتے ہوئے ذرا چھری کے دستے کو تو دیکھو یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ تم جو گائے کھا رہے ہو اسی کے کسی بھائی بند
کی ہڈیوں کا بنا ہوا ہے کہ نہیں؟ اچھا تم لوگ موٹی مرغابی چٹ کرنے کے بعد دانت میں خلال کس چیز سے کرتے ہو؟ اسی پرندے کے پر سے۔ اور انجمن انسداد
بے رحمی بطخاں نے اپنا اعلان کس قلم سے لکھا تھا؟ بس دو ایک مہینے پہلے ہی تو اس انجمن نے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ لوہے کے قلم کے سوا کوئی اور چیز استعمال
نہیں ہوگی۔

باب - ۶۸

کمبل

میں نے اس پریشان کن موضوع یعنی وہیل کی کھال کے متعلق تحقیق اور غور و خوض کیا ہے۔ سمندر میں تجربہ کار ملاحوں اور خشکی پر علم حیوانات کے مستند ماہرین سے میری اس سلسلے میں خوب گرما گرم بحثیں رہی ہیں۔ لیکن میں نے شروع میں جو رائے قائم کی تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر صرف ایک رائے ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہیل کی کھال کیا ہے اور کہاں ہے؟ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ اس کی چربی کیا چیز ہے۔ یہ گائے کے گوشت کی طرح ٹھوس اور باریک ریشے کی ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ سخت، لچکدار اور گٹھی ہوئی اور دو تین انچ سے لے کر دس بارہ انچ تک۔

پہلی نظر میں یہ بات کچھ عجیب و غریب معلوم ہوگی کہ اتنی موٹی اور ٹھوس چیز کو کسی جانور کی کھال قرار دیا جائے لیکن اس دلیل سے چارہ نہیں۔ اس وہیل میں ظاہر ہے کہ اس چربی کے سوا اپنے بدن کے جسم پر کسی اور چیز کی موٹی تہہ نہیں اتار سکتے۔ ہمارے ہاں مخالف کی طرح چڑھی ہوئی جو جانور کے اوپر چڑھی ہوئی تہہ جو ہوتی ہے کھال نہیں تو اور کیا کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر وہیل کی لاش خراب نہ ہوئی ہو تو آپ اپنے ہاتھ سے ایک نہایت باریک اور صاف شفاف جھلی اتار سکتے ہیں جو ساٹن کی طرح ملائم اور لچکدار ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ جھلی خشک ہو گئی تو سکڑنے لگتی ہے اور ذرا سخت اور بھربھری ہو جاتی ہے۔ میرے پاس ایسے کئی خشک ٹکڑے ہیں جنہیں میں وہیل کی کتابوں پر نشان کے طور پر رکھتا ہوں۔ اس جھلی میں سے آر پار دکھائی دیتا ہے۔ میں نے بعض دفعہ اسے کتاب پر رکھ کے اس کے نوش میں مبتلا ہونے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح الفاظ بڑے نظر آتے ہیں۔ بہرحال میں یہی ایک مرتبہ کہ وہیل کے متعلق گہری ایسی کی ٹھیک سے پڑھا جائے لیکن میں وہیل کی جھلی کا حوالہ دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے تسلیم ہے کہ یہ پتلی جھلی وہیل کے سارے جسم پر چڑھی ہوتی ہے لیکن اسے وہیل کی کھال نہیں بلکہ کھال کی کھال سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر یہ کہیں کہ عظیم الجثہ وہیل کی کھال نوزائیدہ بچے کی کھال سے بھی زیادہ پتلی اور نرم و نازک ہوتی ہے تو یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ خیر اب یہ ذکر چھوڑیے۔

اچھا اب یہ سمجھئے کہ چربی ہی وہیل کی کھال ہوتی ہے۔ بڑی وہیل بہت بڑی ہو تو اس کی کھال میں سے تیل کے سو پیپے نکلتے ہیں پھر بھی یہ سمجھ کر کہ تیل نچوڑنے کے بعد اس چربی کا صرف تین چوتھائی رہ جاتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس جانور کی صرف کھال کے ایک حصے میں سے تیل کی پوری جھیل آ جاتی ہے۔ اس کی جسامت کیا ہوگی۔ اگر دس پیپوں میں ایک ٹن تیل ہو تو اس حساب سے وہیل کی کھال کے تین چوتھائی حصے میں سے دس ٹن تیل نکلتا ہے۔

یوں تو وہیل ہمارے سامنے طرح طرح کے عجائبات پیش کرتی ہے لیکن جیتی جاگتی وہیل کا وہ حصہ پانی میں سے باہر نکلا نظر آتا ہے وہ بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کے اوپر بے شمار سیدھی لکیریں بنی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی جیسی ترتیب میں جیسے کوئی کشش تصویریں میں لیکن یہ نشانات جھلی پر بنے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ جیسے جھلی میں سے نظر آتے ہوں ——— گویا وہ جسم کے اوپر نقش ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض اوقات تیز اور باریک سیدھی لکیروں کے ان لکیروں میں کچھ کھدا ہوا سا دکھائی دیتا ہے یہ ایک پراسرار نقش ہے۔ اگر آپ اہرام مصر کی دیواروں پر بنے

ہوئے نقوش کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں بھی یہی لفظ استعمال کرنا پڑے گا خاص طور سے مجھے وہ تصویر آج تک یاد ہے جو میں نے ایک [illegible] دیکھی
تھی جس میں مسسی سپی کے کنارے چٹانوں کے اوپر ریڈ انڈین لوگوں نے اپنے رسم الخط میں کچھ کھود رکھا ہے میں اس عبارت کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا،
ان چٹانوں کی طرح وہیل کے اوپر بنے ہوئے پراسرار نشانات کو بھی آج تک کوئی نہیں پڑھ سکا۔ ریڈ انڈین لوگوں کی چٹانوں کے ذکر سے مجھے ایک اور بات
یاد آئی ہے۔ یوں تو سپرم وہیل میں دیکھنے کے قابل باتیں ہیں لیکن اس کی کمر اور خاص طور سے پہلوؤں پر سے بعض اوقات یہ نشان مٹے ہوئے نظر آتے ہیں،
اور ان کے بجائے بے ترتیب سی کھرچنیں ہیں جیسے کہ بے ڈھنگے نشان بنے ہوتے ہیں۔ نیو انگلینڈ کے ساحل پر کچھ ایسی چٹانیں ہیں جن پر آگاسس کی رائے کے
مطابق برف کے بڑے بڑے تودوں کی رگڑ کے نشان پڑ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں وہ چٹانیں بھی سپرم وہیل سے مشابہ ہیں۔ مجھے کچھ
ایسا لگتا ہے کہ وہیل کے یہ کھرونچ دوسری وہیلوں سے لڑتے ہوئے آتی ہوں گی کیونکہ میں نے یہ نشانات خاص طور سے پختہ عمر کی بڑی بڑی وہیلوں
کے اوپر دیکھے ہیں۔

وہیل کی کھال یا چربی کے متعلق میں دو ایک باتیں اور کہوں گا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ بڑے بڑے ٹکڑوں کی شکل میں اتاری جاتی ہے جنہیں
کمبل کہتے ہیں۔ دوسری بحری اصطلاحات کی طرح یہ بھی نہایت موزوں اور معنی خیز ہے کیونکہ وہیل اپنی چربی میں اس طرح لپٹی رہتی ہے جیسے کمبل میں، بلکہ یوں کہیے
کہ سر سے پیر تک ریڈ انڈین لوگوں کا سا پونچو لپٹا رہتا ہے۔ اسی آرام دہ کمبل کی وجہ سے وہیل ہر موسم اور ہر سمندر میں نہایت اطمینان کے ساتھ رہ سکتی ہے۔
اگر گرین لینڈ کی وہیل کے اوپر یہ گرم لبادہ نہ ہو تو شمال کے برفیلے سمندروں میں اس کا کیا حشر ہو۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بعض مچھلیاں ایسی ہیں جو ان سرد
میں بھی خوب چاق و چوبند رہتی ہیں لیکن اتنی بات یاد رکھیے کہ ان مچھلیوں کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے ان کے پھیپھڑے نہیں ہوتے ان کا پیٹ برف خانہ
ہوتا ہے جس طرح جاڑوں میں مسافر سرائے میں جاکے آگ تاپتا ہے اسی طرح یہ مچھلیاں برف کے پہاڑ کے نیچے جاکر اپنے آپ کو گرم کرتی ہیں۔ اس
کے برخلاف انسانوں کی طرح وہیل کے پھیپھڑے ہوتے ہیں اور خون گرم۔ اس کا خون جم جائے تو وہ مر جاتی ہے۔ یہ تشریح کے بعد تو شاید آپ کا تجسس
ختم ہو جائے لیکن یہ کتنی حیرت انگیز چیز ہے کہ یہ عظیم الشان جانور جس کے لیے جسمانی حرارت اتنی ہی لازمی ہے جتنی انسان کے لیے، قطب شمالی کے سمندر
میں نہایت اطمینان سے رہتا ہے ———— اس جگہ جہاز والوں میں سے اگر کوئی گر پڑے تو مہینوں بعد برف کے اندر جمے ہوئے سیدھے کھڑے ملتے ہیں
جیسے گوند میں مکھی چپک جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جیسا تجربے سے ثابت ہو چکا ہے قطب شمالی کی وہیل کا خون بورنیو کے
حبشی کے خون سے بھی زیادہ گرم ہوتا ہے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہمیں انفرادی قوت کی نادر خوبیاں، موٹی دیواروں کی نادر خوبیاں اور اندرونی کشادگی کی نادر
خوبیاں نظر آتی ہیں۔ آ اے انسان، تو وہیل کو دیکھ اور اس جیسا بن تو بھی برف میں گرم رہ۔ اس دنیا کے اندر بھی رہ اور اس سے الگ بھی۔
خط استوا کے پاس ٹھنڈا رہ قطب شمالی کے پاس اپنے خون کو رواں رکھ۔ اے انسان سینٹ پیٹر کے گرجا کے عظیم گنبد کی طرح اور اس عظیم وہیل کی طرح
ہر ایک موسم میں اپنی حرارت قائم رکھ۔

یہ باتیں ہیں تو بڑی اچھی لیکن کتنا آسان ہے اور کتنا مشکل۔ عمارتوں میں سے کتنی ایسی ہیں جن کا گنبد سینٹ پیٹر کے گرجا کا سا بلند ہو اور [illegible]
میں سے کتنے ایسے ہیں جو وہیل کی طرح چوڑے چکلے ہوں!

تدفین

"زنجیریں اوپر کھینچو اور ڈھانچے کو پیچھے کی طرف جانے دو!"

جہاں پناہ کام ہو چکا ہے۔ سر کٹی ہوئی وہیل کے جسم پر سے ساری چربی اتاری گئی ہے۔ اس کا سفید ڈھانچہ سنگ مرمر کے مقبرے کی طرح چمک رہا ہے۔ اس کا رنگ تو ضرور بدل گیا ہے لیکن جسامت ابھی تک کم نہیں ہوئی۔ ابھی تک یہ زبردست ہے۔ سمندر میں تیرتا ہوا جہاز سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف بے شمار شارک مچھلیاں چپ چپ پانی اڑا رہی ہیں۔ اڑنے والے پرندے چیخ چیخ کر چکر لگا کر پریشان کر رہے ہیں۔ ان کی چونچیں خنجروں کی طرح وہیل پر پڑ رہی ہیں اور یوں اس لاش کی مٹی خراب ہو رہی ہے۔ یہ سر کٹا سفید بھوت جہاز سے دور ہوتا جاتا ہے اور جتنا آگے چلتا ہے مچھلیوں اور پرندوں کا قاتلانہ شور و غل اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ جہاز اپنی جگہ کھڑا ہے اور یہ خوفناک تماشہ گھنٹوں دکھائی دیتا رہتا ہے۔ صاف شفاف نیلے آسمان کے نیچے خوشگوار سمندر کی حسین سطح پر خوش و خرم ہواؤں کے سہارے یہ لاش تیرتی چلی جاتی ہے اور آخر لامتناہی پہنائیوں میں غائب ہو جاتی ہے۔

یہ تجہیز و تکفین بھی کس قدر المناک اور تمسخر آمیز ہے۔ سمندر کے گدھ بھی اس میں نہایت پارسائی سے حصہ لیتے ہیں۔ ہوائی شارک مچھلیوں نے پرتکلف کالے یا چتری دار کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اگر اپنی زندگی میں وہیل کو اتفاق سے ان کی ضرورت پڑتی تو ان میں سے کوئی اس کی مدد کو نہ آتا لیکن اس کی تجہیز و تکفین کی دعوت پر وہ سب بڑی سعادت مندی کے ساتھ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کرۂ زمین پر گدھوں کی ذہنیت کس بری طرح کام کر رہی ہے اور شاید سب سے بڑی وہیل بھی اس سے آزاد نہیں۔

لیکن یہی خاتمہ بالخیر نہیں جو لاش کی آتی ہے بلکہ اس کے بعد ایک بھوت دوسروں کو ڈرا کر اپنا انتقام لینے کے لیے اس کے اوپر منڈلاتا رہتا ہے۔ جب کبھی یہ دور سے کسی ڈرپوک جنگی جہاز یا بھولی بھٹکی کشتی کو نظر آ جاتی ہے۔ فاصلے کی وجہ سے پرندوں کے جھنڈ تو دکھائی نہیں دیتے لیکن یہ سفید تودا سورج کی روشنی میں تیرتا ہوا اور سفید جھاگ اس کے اوپر چڑھتے ہوئے نظر آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہیل کی اس بے ضرر لاش کے متعلق جہاز کے روزنامچے میں کانپتی انگلیوں سے فوراً لکھ دیا جاتا ہے ———— "یہاں اتھلا پانی، چٹانیں اور تیز لہریں ہیں خبردار!" پھر کئی سال تک جہاز اس جگہ سے بچ کے نکلتے ہیں اور یوں کتی کاٹ کے جاتے ہیں جیسے کسی گڑھے کے اندر سے۔ بکریوں کی سردار کو ڈرا جائے تو اس کی پیروی میں ساری بکریاں وہاں سے ڈر کر ہی گزرتی ہیں۔ یہ ہے جناب آپ کا قانون، اولاً اصول سے روایات کا اعادہ بیہودہ اعتقاد کے زندہ ہونے کی اصلی زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ہے راسخ الاعتقادی۔

ممکن ہے کہ اس زبردست وہیل کا جسم اس کے دوران زندگی میں دشمنوں کے لیے خطرہ بنا ہو لیکن مرنے کے بعد اس کا بھوت بیکار اور بے اثر ہونے کے باوجود ایک دنیا کو ڈرانے لگتا ہے۔

کیا حضرت! کیا آپ بھوتوں کو مانتے ہیں؟ جن بھوتوں کے متعلق قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بھوت ہوتے ہیں اور بڑے بڑے عقلمند لوگ ان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

جیروبوام کی کہانی

جہاز اور ہوا دونوں ساتھ ساتھ گزر رہے تھے۔ لیکن ہوا جہاز سے تیز چل رہی تھی چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں پیکوڈ لہروں پر جھولنے لگا۔
ہم نے دوربین سے دیکھا کہ اس جہاز میں کشتیاں لٹکی ہوئی ہیں اور مستولوں پر پہرہ چڑھا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ یہ بھی شکاری جہاز ہے۔
لیکن ایک تو وہ جہاز ہوا کے رخ پر تھا، دوسرے ہم سے کافی دور شاید کسی اور شکار گاہ کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس لیے پیکوڈ جھپٹ کے اس کے
قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے اشارہ دیا کہ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔

یہاں ایک بات بتا دوں۔ جنگی جہازوں کی طرح امریکہ کے ہر شکاری جہاز کا بھی ایک مخصوص اشارہ ہوتا ہے۔ ہر کپتان کے پاس ایک کتاب
ہوتی ہے جس میں یہ سارے اشارے اور ساتھ ہی ہر جہاز کا نام لکھا رہتا ہے۔ اس طرح شکاری جہازوں کے کپتان سمندر میں ایک دوسرے کو کافی دور
سے بھی نہایت آسانی کے ساتھ پہچان لیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے اشارے کے جواب میں اس جہاز نے بھی اپنا مخصوص اشارہ کیا۔ اس سے پتا چلا کہ یہ نین ٹکٹ کا جہاز جیروبوام ہے۔ وہ
جہاز اپنے بادبان لپیٹ کر ہماری طرف بڑھا اور پیکوڈ کے قریب آ گیا۔ اس دوران اس نے سمندر میں کشتی اتاری۔ کشتی جلدی جلدی پیکوڈ کے قریب آ گئی۔ [illegible]
کے حکم سے آنے والے کپتان کی آسانی کے لیے دیوار پر سیڑھی لٹکائی جا رہی تھی کہ اتنے میں اس اجنبی نے اپنی کشتی میں سے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا کہ یہ سب
غیر ضروری ہے۔ بات یہ تھی کہ جیروبوام میں کوئی متعدی وبا پھیلی ہوئی تھی اور اس کا کپتان مے ہیو اس بات سے ڈرتا تھا کہ پیکوڈ والوں کو بھی یہ
بیماری نہ لگ جائے۔ حالانکہ وہ خود اور اس کی کشتی کے ملاح ابھی تک اس مصیبت سے بچے ہوئے تھے۔ پھر جہاز اور جہاز کے بیچ میں سمندر
کی لہریں اور ہوا حائل تھی۔ لیکن اس کپتان نے فرض شناسی اور احتیاط سے کام لیا اور جنگلی لوگوں کی طرح قرنطینے کا اصول نبھاتا رہا۔ اس نے جہاز پر
آنے سے انکار کر دیا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپس میں بات چیت بھی نہ ہو سکے۔ اب ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ جہاز ادھر سمندر میں جھپٹا جا رہا تھا اور
بادبان ہوا سے پھول گیا تھا لیکن کشتی والوں نے [illegible] چپوؤں کا استعمال کر کے اسے پیکوڈ کے ساتھ ہی رکھا۔ [illegible] بغیر کشتی
آگے بڑھ جاتی لیکن [illegible] نہایت چابک دستی کے ساتھ [illegible]۔ اس گڑبڑ کے باوجود دونوں جہازوں میں گفتگو برابر جاری رہی۔ لیکن بیچ بیچ میں
ایک دوسری قسم کی خلل اندازی بھی ہوتی رہی۔

وہاں کے ملاحوں کی زندگی میں بھی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی ہر چیز ہی ندرت رکھتی ہے۔ جیروبوام کی کشتی میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کا
حلیہ عجیب و غریب تھا۔ ٹھگنا قد، سارے منہ پر چھائیاں، بال زرد، [illegible] پہنے ہوئے ایک لمبے دامن والے اونی کوٹ [illegible] کے بازو [illegible]
میں جس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آستینیں کلائیوں پر سے الٹی ہوئی [illegible]۔ آنکھوں میں ایک مستقل جنون اور ہذیان کی سی کیفیت۔

اس شخص کو دیکھتے ہی اسٹب چیخ پڑا تھا ——— وہی ہے وہی ہے! ——— ٹاؤن ہو والوں نے جس شخص کے [illegible]

سے جیری کی بات ختم ہوگئی تو اہاب نے پھر اسی قسم کے سوالات کئے کہ ابھی کپتان یہ پوچھ بھی نہ سکا کہ اگر وہ بچ جاتا کیا تم بھی جزیرے پر ہی وہیل کا شکار کرتے

اہاب نے جواب دیا ۔۔۔۔ "ہاں" یہ سنتے ہی جبریل پھر اٹھ کھڑا ہوا اور خشم آلود نظروں سے بڈھے کی طرف دیکھتے ہوئے انگلی سے نیچے کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔۔۔۔ "اس بے ادب کا انجام یاد رکھو ۔۔۔۔ مرگیا وہاں ڈوب گیا! ۔۔۔۔ اس بے ادب کے انجام سے آگاہ رہو!"

اہاب کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولا "اسے ہاں مجھے ڈاک کے تھیلے کا خیال آیا۔ شاید تمہارے جہاز کے کسی افسر کے نام خط ہے۔ اسٹاربک ذرا تھیلے میں دیکھ تو سہی!"

ہر سرکاری جہاز مختلف جہازوں کے لیے بہت سے خطوط لے کے چلتا ہے۔ جن کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ سمندروں میں اتفاق سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر خطوط اپنی منزل پر پہنچتے ہی نہیں۔ اور وقت سے دو تین سال پرانے ہو جانے کے بعد ملتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسٹاربک ہاتھوں میں ایک خط لیے ہوئے آیا۔ لفافہ بری طرح مڑ تڑ گیا تھا اور میلا ہو چکا تھا پھر اس پر الماری میں پڑے رہنے سے اس میں ہری ہری پھپھوندی لگ گئی تھی۔ یہ خط تو موت جیسے ڈاکیے کے ہاتھوں ہی آ سکتا تھا۔

"پڑھا نہیں جاتا؟" اہاب نے کہا۔ "لاؤ مجھے دو۔ ہاں ہاں بالکل گھسیٹ میں لکھا ہے اور حروف تک مٹ چکے ہیں ۔۔۔۔ یہ کیا لکھا ہے؟" وہ خط پڑھنے میں لگ گیا اور اسٹاربک نے ایک لمبی سی بلی لے کر چاقو سے اس کے ایک سرے میں شگاف کیا تاکہ اس میں خط رکھ دے اور کشتی والوں کو پکڑا دے۔

اہاب خط پڑھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا "مسٹر ہیری ۔۔۔۔ ہاں مسٹر ہیری ۔۔۔۔ کسی عورت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جیسے کیڑے کوڑے رینگ رہے ہوں ۔۔۔۔ ضرور اسی شخص کی بیوی ہوگی ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ مسٹر ہیری میسی جیرو بوآم جہاز ۔۔۔۔ ارے یہ تو میسی ہے جو مر بھی چکا!"

"بے چارا وہ بد نصیب، اور خط بھی اس کی بیوی کا ہے" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا "خیر یہ خط مجھے دے دو۔"

"نہیں اسے اپنے پاس رہنے دو" جبریل نے اہاب سے کہا "تم بھی جلد ادھر ہی جانے والے ہو"

"لعنت ہو تیرے اوپر کمبخت!" اہاب چیخا "کپتان سے کہو، خط پکڑو"

اسٹاربک کے ہاتھ سے وہ خوفناک خط لے کر اس نے بلی کے شگاف میں پھنسایا اور کشتی کی طرف بڑھایا پتوار چلانے والوں نے اپنا کام روک دیا تھا اگر کپتان کا خیال کر کے کشتی تھوڑی سی جہاز کے پچھلے حصے کی طرف کھسک آئی چنانچہ خط ایک دم سے جبریل کے مشتاق ہاتھوں کے پاس پہنچ گیا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس نے فوراً ایک بیلدار کشتی کا چاقو نکالا خط اس پر رکھ کر اسے زور سے جہاز میں پھینک دیا۔ وہ اہاب کے قدموں پر گرا۔ پھر جبریل نے پکار کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ اور اس طرح یہ منحوس کشتی پیکوڈ سے جلدی جلدی دور ہوتی چلی گئی۔

اس واقعے کے بعد جہازی پھر وہیل کی ادھیڑنے کے کام میں لگ گئے اور اشاروں ہی اشاروں میں اس خوفناک واقعے کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں کی گئیں۔

باب - ۷۲

بندر والی رسی

ویل کو کاٹنے کے کام میں ایسا ہنگامہ خیز ہے کہ جہازیوں کو ادھر سے ادھر دوڑتے رہنا پڑتا ہے کبھی کہیں یہاں بلایا جاتا ہے کبھی وہاں ایک جگہ ٹھہرنا نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ایک وقت ہر جگہ کام ہو رہا ہوتا ہے۔ یہی بات اس آدمی پر بھی صادق آتی ہے جو اس منظر کو نقش کرنا چاہتا ہے۔ اب ہمیں پھر پیچھے جانا ہوگا۔ بتایا جا چکا ہے کہ اسٹاربک اور اسٹب نے ویل کی کمر میں سوراخ کر کے آنکڑا لگایا تھا لیکن اتنی وزنی اور بے ڈھنگی چیز سوراخ میں کیسے [illegible] گئے۔ یہ کام میرے دوست کوئی کوئگ نے کیا۔ ہر بچھا کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ ویل کی کمر پر اتر کر آنکڑا لگائے لیکن اکثر حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جب تک چربی اتارنے کا کام ختم نہ ہو جائے ہر بچھا ویل کے اوپر ہی رہے۔ ویل تقریباً ساری کی ساری پانی کے اندر رہتی ہے اور صرف اتنا حصہ باہر رہتا ہے جہاں کام جاری ہو۔ بیچارہ ہر بچھا عرشے سے کوئی دس فٹ نیچے آدھا ویل پر اور آدھا پانی میں لڑکھڑاتا پھرتا ہے۔ اور اس کے پیروں کے نیچے ویل اس طرح ناچتی ہے جیسے چکی چل رہی ہو۔ کوئی کوئگ اس موقع پر اسکاٹ لینڈ والوں کا سا لباس پہنے ہوا تھا اور ٹانگیں بالکل کھلی ہیں کم سے کم مجھے وہ اس حالت میں بڑا چھانگا جیسا آپ ابھی دیکھیں گے کسی اور کو اس کا ایسا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

میں اس بیچارے کی کشتی میں کھینے والا تھا اس لیے میرا فرض تھا کہ جب وہ مردہ ویل کی کمر پر لڑکھڑانے کے جائے تو میں اس کی مدد کروں۔ آپ نے اٹلی کے چھوٹے لڑکوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ ایک لمبی سی رسی سے بندر نچا رہے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میں نے جہاز کی ڈھلوان دیوار پر سے کوئی کوئگ کو سمندر میں تھام رکھا تھا۔ اس کی کمر میں کینوس کی ایک پیٹی بندھی ہوئی تھی جس میں وہ رسی بندھی تھی جسے ہم بندر والی رسی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا سرا میری پیٹی میں بندھا رکھا تھا۔

یہ چیز ہم دونوں کے لیے نہایت خطرناک تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ رسی کے دونوں سرے بندھے ہوتے تھے۔ ایک طرف کوئی کوئگ کی کمر والی پیٹی سے اور دوسری طرف میری چوڑی چمڑے والی پیٹی سے۔ اب اس کا انجام چاہے کچھ ہو [illegible] گٹھ بندھن ہو گیا تھا۔ اگر بیچارہ کوئی کوئگ سمندر میں ڈوب جائے تو رواج اور عزت کا تقاضا یہی تھا کہ رسی کو کاٹنے کے بجائے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا جاؤں۔ غرض ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے دو جڑواں بچے ایک ہی نال میں بندھے ہوں۔ کوئی کوئگ میرا جڑواں بھائی تھا اور ہم ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور ہم میں سے کوئی اپنی جان بچا سکتا تھا جو اس رسی کے رشتے نے ہم پر عائد کی تھی۔

میں اس حالت پر فلسفیانہ انداز سے غور کرنے لگا۔ کوئی کوئگ کی حرکات و سکنات کا سنجیدگی سے مشاہدہ کرتے کرتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میری انفرادیت ختم ہو کر دو آدمیوں کے مشترکہ سرمائے کی تجارتی کمپنی میں جذب ہو گئی ہے۔ میری آزاد مرضی کو گہرا صدمہ پہنچا ہے اور دوسرے آدمی کی غلطی یا بد قسمتی سے میں بے گناہ موت کے منہ میں جا سکتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے نظام کائنات تھوڑی دیر کے لیے معطل ہو گیا ہے کیونکہ اس کی انصاف پسندی اتنی سخت بے انصافی کبھی گوارا نہ کرتی۔ پھر بھی میں [illegible] تھا کہ کوئی کوئگ کہیں ویل اور جہاز کے درمیان دب کے نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں بار بار رسی کو جھٹکا دے کے اسے سنبھال لیتا تھا۔ اب میں نے آگے غور کیا تو مجھ پر کھلا کہ اس وقت میری جو حالت ہے وہ ہر شخص کی

کے مارے داروغہ کی طرف چلا اور کہنے لگا: "ادرک کی شراب؟ ادرک کی شراب؟ جناب داروغہ صاحب ذرا یہ تو فرمائیے کہ اس شراب سے کیا مادہ ہوا؟ ادرک؟ اس کا پتہ چلتے ہی گی گڑگی کو بچانے کے لیے تم رنگ دیتے ہو؟ ادرک! ______ یہ کم بخت ادرک ہے کیا چیز؟ ______ کوکا سچو؟ ______ جلانے کی لکڑی ہے؟ ______ دیا سلائی ہے؟ ______ بارود ہے؟ ______ چقماق ہے؟ ______ آخر یہ ادرک ہے کیا چیز جو تم نے اس بچارے کی کرنگیت کو لگا دی ہے؟"

اسٹائنبک کی اپنی طرف آنکھ جھوک کر اس نے داروغہ سے کہا، معلوم ہوتا ہے ہمارے جادوئی شراب کے خلاف کوئی تحریک چل پڑی ہے۔ جناب یہ یاد آپ ملاحظہ فرمائیے۔ اسے سونگھ کر دیکھیے۔ پھر ٹیٹ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا، مسٹر اسٹائنبک۔ اس داروغہ کی زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ کوئی کرنگیت بھی دل کے اوپر سے اترا ہے اور داروغہ اسے بے حقیقت رہے رہا ہے۔ یہ داروغہ کی تعظیم ہے؟ کیا یہ ڈوبے ہوئے آدمی ہی کی جان نکالتا ہے؟

"ہاں، یہ تو واقعی بالکل بے کار چیز ہے۔" اسٹائنبک نے کہا۔

اسٹیب چیخ کے بولا، ہاں ہاں داروغہ صاحب، ہم مطمئن تو جب ہی ہوں گے کہ پچھے بازو ں کو کیا دوا پلائی جا رہی ہے۔ ہماری ملازمی یہاں نہیں چلے گی۔ کیا تم ہمیں زہر دینا چاہتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہمیں قتل کر کے ہمارے پیسے کا اور سامان بھی جیب میں ڈالو؟

داروغہ نے کہا، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ یہ ادرک کا شیرہ تو خاص چیز تھی لائی گئی تھی۔ اور مجھ سے کہا تھا کہ پچھے بازو کو شراب بھی نہ دینا، بلکہ ادرک کا شیرہ پلانا۔"

"ادرک کا شیرہ؟ ادرک کے بچے! اسے لے کے یہاں سے بھاگ، جلدی الماری میں سے کوئی اچھی سی چیز نکال کے لا۔ مسٹر اسٹائنبک، آپ کو اعتراض نہیں ہوگا؟ یہ ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ پچھے بازو دل کے اوپر ہوں تو انھیں برانڈی پلائی جائے۔"

"بس بہت ہو گیا۔" اسٹائنبک نے جواب دیا۔ "اب جائیے اور دے دیجیے۔"

"میرے مارنے سے چوٹ نہیں لگتی۔ البتہ کسی دل وغیرہ کو مارو تو اور بات ہے۔ لیکن یہ شخص تو ادرک والا ہے۔ ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ اس کے ساتھ تشریف لے جائیے اور جو چیز چاہتے ہیں نکال لیجیے۔"

اسٹیب واپس آیا تو ایک ہاتھ میں سیاہ بوتل تھی اور دوسرے میں ایک چائے دانی کی قسم کی چیز۔ بوتل میں تیز شراب تھی جو کوئی گنگو کو دے دی گئی۔ چائے دانی خالص چیز تھی ، جو تحفہ تھی ، اسے لہروں کی نذر کر دیا گیا۔

اسٹب اور فلاسک وہیل کی دُم میں رسّیاں باندھ کر اسے کھینچ کر لانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

"خدا جانے بیڈھا اس گندی چربی کا کیا کرے گا؟" اسٹب نے کہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس ذلیل قسم کی وہیل سے دوچار ہونا پڑا۔

فلاسک تمباکو چباتے ہوئے بولا "کیا کرے گا؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ جس جہاز کے ایک طرف رائٹ وہیل کا سر لٹکا ہو اور دوسری طرف اسپرم وہیل کا تو پھر وہ جہاز کبھی نہیں ڈوبتا؟"

"کیوں نہیں ڈوبتا؟"

"مجھے تو پتا نہیں، وہ چھتنا فیض اللہ کہہ رہا تھا۔ اسے جہازوں کے سارے ٹونے ٹوٹکے معلوم ہیں۔ لیکن بعض دفعہ میں سوچتا ہوں کہ اس کے ٹونے ٹوٹکوں کی بدولت جہاز کا حشر کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ اسٹب، مجھے یہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ اس کا باہر کو نکلا ہوا دانت بالکل ایسا لگتا ہے جیسے سانپ کے سر میں نقش کر دیا گیا ہو؟"

"ابے جہنم میں جائے! میں تو اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ لیکن اگر اتفاق سے اندھیری رات میں وہ کشتیوں کے قریب کھڑا ہوا ہو اور کوئی اس پاس نہ ہو ——— فلاسک، ذرا پانی کی طرف دیکھو" ——— اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک عجیب طرح سمندر کی طرف اشارہ کیا ——— "اس وقت فیض اللہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیطان بھیس بدل کے آگیا ہے۔ یہ بات تو پکی ہے کہ فیض اللہ کو کسی کنارے سے جہاز میں چوری چھپے لایا گیا تھا۔ بھلا تمہیں اس بات پر یقین آتا ہے کہ یہ واقعی شیطان ہے؟ تمہیں اس کی دُم اس وجہ سے نظر نہیں آتی کہ وہ اسے لپیٹ کے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ لعنت ہو اس کم بخت پر! اب مجھے خیال آیا کہ وہ ہر وقت اپنے جوتوں کو بھرنے کے لیے روئی مانگتا رہتا ہے۔"

"وہ جوتے پہنے پہنے سوتا ہے، اس کے پاس بستر بھی نہیں۔ لیکن میں نے اسے رات کو رسیوں کے ڈھیر پر سوتے دیکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے اپنی منحوس دُم کی وجہ سے سوتا ہوگا۔ وہ اس ڈھیر کے سوراخ میں اپنی دُم ڈال دیتا ہے۔"

"بیڈھے نے اس سے اتنا یارانہ کیوں گانٹھ رکھا ہے؟"

"اس سے کوئی سودا کر لیا ہوگا۔"

"سودا! ——— کس چیز کے بارے میں؟"

"تم جانتے ہی ہو کہ بیڈھے کے سر پر سفید وہیل کو مارنے کی دھن سوار ہے اور شیطان اس سے سودا پٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیڈھے سے چاندی کی گھڑی یا اس کی روح یا کوئی اور چیز لے گا اور بدلے میں بوڑی ڈک دے دے گا۔"

"ہونہہ، اسٹب، تمہیں تو دل لگی سوجھی ہے۔ یہ بات فیض اللہ کیسے کر سکتا ہے؟"

"فلاسک، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن شیطان بڑا عجیب شخص ہے اور بڑا ہی بدمعاش۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ وہ اکڑتا ہوا اور اس طرح دُم ہلاتا جیسے کوئی کتا ہلاتا ہو ایک پرانے جہاز میں جا پہنچا اور پوچھا کہ ایڈمرل صاحب ہیں؟ ایڈمرل صاحب موجود تھے۔ انھوں نے شیطان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ شیطان نے اپنے کھر زور سے فرش پر مارے اور کہا مجھے جان چاہیے! ایڈمرل نے کہا کس لیے؟ شیطان چڑ کے بولا: اس سے تمہیں کیا غرض؟ مجھے اس سے کچھ کام لینا ہے۔ ایڈمرل نے کہا لے جاؤ۔ فلاسک، خدا کی قسم، اگر جان کو شیطان سے پیچھا چھڑانے سے پہلے ہیضہ نہ ہوا تو میں ایک نوالے میں یہ ساری وہیل کھا جاؤں گا۔ ارے ذرا ادھر دیکھو ——— تیار ہو! اچھا تو رسّی کھینچو۔ لاؤ وہیل کشتی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

"جب دونوں کشتیاں اپنے بوجھ سمیت جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں تو فلاسک بولا "مجھے بھی ایک ایسی ہی کہانی یاد ہے جیسی تم نے
سنائی لیکن یہ خیال نہیں رہا کہ کہاں سنی تھی۔"

"تین بھیس والوں کی کہانی: تین خونخوار سپاہیوں کے کارنامے؟ اسی کتاب میں پڑھی تھی نا؟ ضرور وہیں پڑھی ہوگی؟"

"نہیں، میں نے کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی۔ البتہ اس کا نام سنا ہے۔ خیر، اسٹب، اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے جس شیطان کی کہانی
سنائی کیا یہ وہی ہے جو تم کہتے ہو کہ آج کل ہمارے جہاز میں موجود ہے؟"

"میں وہی آدمی ہوں یا نہیں جس نے اسی وہیل کو مارا تھا؟ شیطان ہمیشہ زندہ رہتا ہے کہ نہیں؟ کبھی کسی نے اس کے گرجے
کی خبر سنی ہے؟ کبھی تم نے کسی پادری کو شیطان کا ماتم کرتے دیکھا ہے؟ اگر شیطان کے پاس ایک ایسی کنجی ہے جس کی مدد سے
امیر البحر کے کمرے میں داخل ہوجائے تو کیا وہ سوراخ میں سے رینگ کر جہاز میں نہیں آسکتا؟ بولو فلاسک۔"

"اسٹب، تمہارے خیال میں فیض اللہ کی عمر کیا ہوگی؟"

اسٹب نے جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں وہ بڑا مستول دکھائی دے رہا ہے؟ اچھا تو اسے ایک کا عدد سمجھو۔
پھر جہاز کی کوٹھری میں جتنے گھیرے ہیں ان سب کو رسے کے مستول کے پاس ایک قطار میں رکھ دو یہ صفر ہوئے لیکن اس طرح
بھی فیض اللہ کی عمر کے عدد نہیں بنیں گے۔ دنیا کے سارے کھیرے مل کر بھی اتنے گھیرے نہیں بنا سکتے کہ جس صفر کافی تعداد میں بن
جائیں۔"

"لیکن، اسٹب، ایک بات بتاؤ تم ابھی شیخی مار رہے تھے کہ اگر موقع ملے تو فیض اللہ کو سمندر میں ڈبو دو۔ اگر اس کی عمر اتنی
ہی ہے جتنی تم نے بتائی، اور اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے گا تو پھر اسے سمندر میں دھکیلنے سے کیا فائدہ؟ بولو؟"

"بہرحال میں اسے غوطہ ضرور دوں گا۔"

"لیکن وہ پھر اوپر آجائے گا۔"

"میں اسے پھر غوطہ دے دوں گا، اور غوطے ہی دیتا رہوں گا۔"

"فرض کرو اسے کچھ ایسی سوجھی کہ تمہیں غوطہ دے کے ڈبو دے ——— تو پھر؟"

"وہ مجھے غوطہ دے کے تو دیکھے! میں کھوپڑی گنجی کردوں گا۔ پھر شرم کے مارے نہ تو امیر البحر کے کمرے میں اپنا منہ دکھائے
گا نہ جس دلدل میں پڑا رہتا ہے، وہاں، اور نہ جہاں جہاں رسے ہیں جہاں وہ چھپا پھرتا ہے۔ اس کی لعنت! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں شیطان سے
ڈرتا ہوں؟ اس سے تو بس خدا ہی ڈرتا ہے جس کی اتنی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ اسے پکڑ کے شکنجے میں کس دے بلکہ خدا نے تو
اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ لوگوں کو اڑا کے لے جائے اور یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ شیطان جتنے آدمیوں کو اڑا کے لے جائے گا
خدا انھیں آگ میں جلائے گا۔ اچھا حصہ لیا ہے؟"

"کیا تمہارے خیال میں فیض اللہ کپتان اہاب کو اڑا کے لے جانا چاہتا ہے؟"

"میرا خیال ہے؛ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ تمہیں جلدی ہی پتا چل جائے گا لیکن اب میں اس پر نظر رکھوں گا۔ اگر میں نے

کوئی شبہ کی بات دیکھی تو توڑ اس کی گردن دبا لوں گا اور کہوں گا ـــــ دیکھو شیطان یہ حرکت ٹھیک نہیں۔ اگر اس نے کچھ جھگڑا کیا تو خدا کی قسم میں اس کی جیب میں سے اس کی دُم نکال لوں گا اور چرخی پہ رکھ کے ایسا مروڑوں گا کہ دم اکھڑ آئے گی۔ مجھے، جب وہ دیکھے گا کہ میں اس بُری طرح چمٹ گیا ہوں تو چپ چاپ کھسک لے گا، اور اسے اتنا اطمینان بھی حاصل نہ ہو گا کہ دبی ٹانگوں کے بیچ میں دُم تو ہے۔"

"اور دُم کیا کرو گے، اسٹب؟"

"کیا کروں گا، گھر جا کے اسے چابک بنا کر بیچ دوں گا، اور کیا کروں گا؟"

"کیا تم یہ ساری باتیں سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟"

"خیر کسی طرح کہہ رہا ہوں، اب تو ہم جہاز کے پاس آ گئے۔"

جہاز پر سے لوگوں نے پکار کے کہا کہ وہیل کو بائیں طرف لے آؤ، وہاں وہیل کو باندھنے کے لیے زنجیریں وغیرہ سب تیار ہیں۔

فلاسک بولا "دیکھو میں نے کہا تھا نا؟ اب تم خود دیکھ لو گے کہ رائٹ وہیل کا سر روغنی وہیل کے سر کے مقابلے میں لٹکایا جائے گا۔"

تھوڑی دیر میں فلاسک کی بات بالکل سچ ثابت ہوئی۔ پہلے تو روغنی وہیل کے سر کی وجہ سے جہاز ایک طرف کو جھک گیا تھا لیکن اب دوسرے کی وجہ سے توازن ٹھیک ہو گیا، حالانکہ زور بہت پڑنے لگا۔ اسی طرح جب آپ ایک طرف فلسفی لوک کا سر لٹکائیں گے تو آپ اسی طرف کو ڈھلک جائیں گے لیکن دوسری طرف کانٹ کا سر لٹکانے سے آپ کا توازن پھر ٹھیک ہو جائے گا لیکن آپ کی حالت غیر ہوگی۔ اسی طرح بعض لوگوں کے دماغ متوازن اپنا توازن ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ ارے بے وقوفو! یہ سارا وبال اٹھا کے سمندر میں پھینکو پھر تمہارا جہاز بہت ہلکا ہو جائے گا اور ٹھیک طرح چلے گا۔

جب رائٹ وہیل کی لاش جہاز کے پاس آ جاتی ہے تو عام طور سے ابتدا میں وہی کارروائی ہوتی ہے جو روغنی وہیل کے ساتھ۔ البتہ روغنی وہیل کا سر پورا ایک ساتھ کاٹا جاتا ہے لیکن رائٹ وہیل کے ہونٹ اور زبان الگ نکال کے عرشے پر کھینچ لی جاتی ہے اور ساتھ میں وہ کالی ہڈی بھی جو کھوپڑی میں لگی ہوتی ہے لیکن اس بار یہ باتیں نہیں ہوئیں۔ دونوں وہیلوں کے ڈھانچے جہاز کے پچھلی طرف لٹکے ہوئے تھے اور جہاز بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خچر دونوں طرف سے بھری ہوئی جھولی لے کر بوجھ لادے چلا جا رہا ہو۔

اس دوران میں فیض اللہ اطمینان سے کھڑا رائٹ وہیل کے سر کو دیکھ رہا تھا کبھی اس کی نگاہ سر کی گہری جھریوں کی طرف جاتی اور کبھی اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرف۔ اہاب کچھ اس طرح کھڑا تھا کہ اس کا سایہ فیض اللہ پر پڑ رہا تھا۔ اگر فیض اللہ کا سایہ تھا بھی تو وہ اہاب کے سائے میں گھل مل گیا تھا، اور اس طرح اہاب کا سایہ اور بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ جہازی اپنے کام پر جٹے ہوئے تھے اور ان سارے واقعات کے متعلق ان میں چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔

باب - ۷۴

رغنی ویل کا سر ــــــ تقابلی مطالعہ (۱)

لیجیے یہ دو بڑی بڑی وہیلیں اپنے سروں کو پاس رکھے کچھ سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ آئیے ہم بھی ان میں شامل ہوں اور کچھ گپ لڑائیں۔ بڑی جسامت والی وہیلوں میں روغنی ویل اور رائٹ ویل سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ بس یہی دو وہیلیں ہیں جن کا لوگ عام طور سے شکار کھیلتے ہیں۔ ویل کی جتنی بھی قسمیں ہمیں معلوم ہیں نین ٹکٹ والوں کے نزدیک ان کے ایک سرے پر روغنی ویل ہے اور دوسرے سرے پر رائٹ ویل۔ خارجی طور سے ان دونوں میں جو فرق ہے وہ خصوصاً سر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت ان دونوں کے سر جہاز میں لٹکے ہوئے ہیں اور ہم عرشہ پار کرکے آزادی کے ساتھ ادھر سے اُدھر جا سکتے ہیں لہٰذا وہیلیات کا عملی طور پر مطالعہ کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کونسا ہوگا؟

آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان دونوں سروں میں عمومی طور سے بھی بڑا فرق ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ دونوں کے دونوں بڑے بھاری ہیں لیکن روغنی ویل کے سر میں ایک نہایت باریک تناسب ہوتا ہے جس سے رائٹ ویل کا سر خالی ہے۔ روغنی ویل کے سر میں انفرادیت زیادہ ہے۔ اس میں کچھ ایسا وقار ہے کہ اسے دیکھتے ہی آپ بے اختیار اس کی افضلیت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جو روغنی ویل موجود ہے، اس کا سر اوپر سے کالی مرچوں اور نمک کے رنگ کا ہے جس سے وقار میں اضافہ ہو گیا ہے اور اس کی پختگی اور تجربہ کاری کا پتا چلتا ہے یعنی یہ وہ مچھلی ہے جسے ماہی گیروں کی اصطلاح میں سفید سر والی ویل کہا جاتا ہے۔

اچھا اب یہ دیکھئے کہ ان سروں میں کیا چیز سب سے کم مختلف ہے ــــــ یہ دو سب سے اہم اعضا ہیں یعنی آنکھ اور کان۔ دونوں ویلوں کے سر کے ایک پہلو میں بہت پیچھے نیچے کی طرف اگر آپ جبڑے کے قریب غور سے تلاش کریں تو آخر آپ کو ایک آنکھ پلکوں کے بغیر دکھائی دے گی جسے آپ بچھیرے کی آنکھ سمجھیں گے۔ سر کی جسامت سے اس آنکھ کو ذرا بھی مناسبت نہیں۔

ویل کی آنکھیں پہلو میں ایک عجیب جگہ واقع ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح وہ بالکل پیچھے کی چیز نہیں دیکھ سکتی اسی طرح بالکل آگے کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتی۔ مختصر یہ کہ ویل کی آنکھیں وہاں ہوتی ہیں جہاں آدمی کے کان۔ اب آپ ذرا سوچیے کہ اگر آپ چیزوں کو دائیں بائیں اپنے کانوں سے دیکھتے ہوں تو آپ پر کیا گزرے گی۔ ایسی صورت میں آپ کو پتا چلے گا کہ آپ اپنی آنکھوں کی سیدھ میں کوئی تیس ڈگری آگے کی طرف اور کوئی تیس ڈگری پیچھے کی طرف دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کا جانی دشمن دن دہاڑے ہاتھ میں خنجر لیے سیدھا آپ کی طرف آ رہا ہو تو آپ اسے نہیں دیکھ سکیں گے جیسے پیچھے سے چھپ کر آنے والا نظر نہیں آنے کا۔ قصہ مختصر آپ کی گویا دو طرف ہوں گی لیکن ساتھ ہی ساتھ سامنے کا رخ بھی دو طرف ہوگا، کیونکہ سامنے کا رخ اور کیا ہوتا ہے سوا آدمی کی آنکھیں۔

اس کے علاوہ میں جتنے بھی جانوروں کو جانتا ہوں ان کی آنکھیں اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ ان کی بصارت ایک ہو جاتی ہے چنانچہ ان کے ذہن میں دو نہیں بلکہ ایک تصویر پیدا ہوتی ہے لیکن ویل کی آنکھیں عجیب ہی جگہ واقع ہیں۔ دونوں آنکھوں کے بیچ میں کئی فٹ چوڑا سر آ جاتا ہے جیسے دو جھیلوں کے درمیان ایک اونچا سا پہاڑ کھڑا ہو۔ لہٰذا دونوں آنکھیں الگ الگ دیکھتی ہیں اور ان سے جو تصویریں مرتب ہوتی

ہیں وہ بھی جدا رہتی ہیں چنانچہ وہیل کو اس طرف سے ایک تصویر نظر آتی ہوگی اور اس طرف سے دوسری تصویر اور ان دونوں کے درمیان خلا
اور تاریکی رہتی ہوگی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان دنیا کو ایک ایسی کھڑکی میں سے دیکھتا ہے جس کے دونوں حصے جڑے ہوئے ہیں لیکن وہیل کے اندر
یہ دونوں حصے الگ الگ لگائے گئے ہیں اور اس طرح دو علیحدہ علیحدہ کھڑکیاں بن گئی ہیں لیکن اس سے منظر بالکل مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہیل کی
آنکھوں کی یہ خصوصیت ایسی ہے جس کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ اور آگے چل کے جو مسائل پیش کیے جائیں گے ان کے سلسلے میں جا بجا پیش آیا
کریں۔

وہیل کی بصارت کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب اور پیچیدہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے لیکن میں اس طرف بس ایک اشارہ کروں گا۔ جب
تک کسی کی آنکھیں روشنی میں کھلی رہیں دیکھنے کا عمل غیر اختیاری ہوتا ہے یعنی جو چیزیں اس کے سامنے ہیں وہ خود بخود اسے نظر آتی رہتی
ہیں۔ بہرحال آپ خود اپنے تجربے پر غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ چاہے آدمی ادھر ادھر کی پوری چیزوں کا سلسلہ ایک نظر میں دیکھ لے لیکن اس کے
لیے دو چھوٹی یا بڑی چیزوں کو بیک وقت پوری طرح اور غور سے دیکھنا ممکن نہیں، خواہ وہ چیزیں ایک دوسرے کے کتنی ہی کیوں نہ قریب ہوں
لیکن اگر آپ ان دونوں چیزوں کو الگ الگ رکھ دیں اور دونوں کے گرد تاریکی کا ایک حلقہ کھینچ دیں، پھر ان میں سے ایک چیز کو پورے
انہماک کے ساتھ غور سے دیکھیں تو دوسری چیز فی الحال آپ کے شعور سے خارج ہو جائے گی۔ لیکن اس معاملے میں وہیل کا کیا حال ہے۔ یہ
تو ٹھیک ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں اپنی اپنی جگہ بیک وقت عمل کرتی ہیں لیکن کیا اس کا دماغ انسان کے دماغ سے زیادہ وسیع
جامع اور محیط ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف مناظر جن میں سے ایک تو ایک سمت میں ہے اور دوسرا بالکل مختلف سمت میں بیک وقت پورے
غور کے ساتھ دیکھ سکے؟ اگر وہیل یہ کام کر سکتی ہے تو یہ ایسی ہی حیرت انگیز چیز ہے جیسے کوئی شخص اقلیدس کے دو مختلف مسئلے ایک ساتھ
حل کرتا ہو۔ مگر آپ اس تشبیہ پر اچھی طرح غور کریں تو یہ ناموزوں نہیں نکلے گی۔

ممکن ہے یہ میری خیال آرائی ہو لیکن مجھے ہمیشہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ تین چار کشتیاں جب حملہ کرتی ہیں تو ایسے وقت وہیل کا تذبذب،
اس کی جھجکاہٹ اور عجیب طرح سہم کے رہ جانا ان ساری چیزوں کی وجہ قوت ارادی کی وہی بے بسی اور پیچیدگی ہے جس میں وہیل اپنی منتشر اور متضاد
بصارت کے باعث گرفتار رہتی ہے۔

لیکن وہیل کا کان بھی ایسی ہی انوکھی چیز ہے جیسی آنکھ۔ اگر آپ اس نسل سے واقف نہیں ہیں تو چاہے آپ ان دونوں سروں پر گھنٹوں
تلاش میں لگے رہیں مگر کان نہیں ملیں گے۔ وہیل کے باہر کی طرف کوئی کان نہیں ہوتا اور سوراخ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں قلم تک نہیں
جا سکتا۔ یہ سوراخ آنکھ سے ذرا پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ پھر کان کے معاملے میں ان دونوں وہیلوں کے درمیان بھی ایک اہم فرق ہے۔ روغنی وہیل
کا کان باہر کی طرف سے کھلا ہوتا ہے، رائٹ وہیل کا کان ایک جھلی کے پیچھے چھپا رہتا ہے اور باہر سے نظر نہیں آتا۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہیل جیسا زبردست جانور دنیا کو اتنی چھوٹی سی آنکھ سے دیکھے، اور بادلوں کی گرج ایک ایسے کان سے سنے
جو خرگوش کے کان سے بھی چھوٹا ہے۔ لیکن اگر اس کی آنکھیں ہرشل کی عظیم دوربین کے شیشے کے برابر ہوتیں اور کان گرجا کی ڈیوڑھی کی
طرح وسیع ہوتے تو کیا اس کی سماعت اور بصارت کچھ اور تیز ہوتی؟ ہرگز نہیں ——— تو پھر آپ اپنے ذہن کو وسعت دینے کی کوشش
کیوں کرتے ہیں؟ اسے باریک بین بنائیے۔

آپ جب جوشین میں داخل ہوں تو اس کی مدد سے روشنی وہیل کا سر اٹھا دیں تاکہ نیچے کا حصہ اوپر آجائے پھر سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ کر منہ کے اندر جا سکیں۔ اب جسم تو سر سے علیحدہ ہو چکا ہے، ورنہ ہم لالٹین لے کے اس کے غار جیسے پیٹ میں اتر جاتے لیکن خیر آئیے، دانت کے کے چاروں طرف دیکھیں کہ ہم کہاں ہیں کیسا عجیب منہ ہے اس پر تو گویا پر تنا ہوا رہتا ہے۔ چھت سے لے کر فرش تک ایک جھلملاتی ہوئی سفید جھلی منڈھی ہے جو اتنی چمکدار ہے جیسے دلہن کے ریشمی کپڑے۔

لیکن اب باہر آجائیے، اور نیچے کے زبردست جبڑے کو دیکھیے جو ایسا لگتا ہے جیسے کسی زبردست تلوار کی ڈبیا کا لمبا اور پتلا ڈھکنا، مگر اس میں قبضہ پہلو کے بجائے ایک سرے پر لگا ہے اگر آپ اسے کھول دیں اور دانتوں کی قطار باہر نکل آئے تو یہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی قلعے کا سلاخوں والا دروازہ۔ اور افسوس بعض بدنصیب ماہی گیروں کے لیے یہ بالکل قتل گاہ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جب اس کی سلاخیں گرتی ہیں تو بدن میں آر پار نکل جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب سے زیادہ خوفناک اس وقت معلوم ہوتا ہے جب آپ سمندر میں کسی سوگز نیچے کسی کینہ ور خاطر وہیل کو ایک جگہ ٹھہرے ہوئے دیکھیں، اور اس کا پندرہ فٹ لمبا جبڑا نا دیدہ قائمہ بناتا ہوا نیچے لٹک رہا ہو۔ یہ وہیل مردہ نہیں ہوتی بلکہ کہ معلوم ہے کہ بے کیف یا افسردہ خاطر ہو جاتی ہے ——— اس طرح ڈھ جاتی ہے کہ اس کے جبڑوں کے قبضے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور وہ نہایت بدنما نظر آنے لگتی ہے ایسی حالت میں اس کے قبیلے والوں کو اس پر شرم آتی ہوگی اور وہ اس پر لعنت بھیجتے ہوں گے۔

اگر آدمی کو تجربہ ہو تو یہ قبضہ نہایت آسانی سے اکھڑ آتا ہے۔ عموماً اس جبڑے کو الگ کر کے عرشے پر کھینچ دیا جاتا ہے، اور وہاں دانت نکال لیے جاتے ہیں، ان سفید سفید دانتوں سے جہازی طرح طرح کی انوکھی چیزیں بناتے ہیں، مثلاً چھڑی کے دستے، چھتریوں کی ڈنڈیاں اور چابک کی موٹھیں۔

جبڑے کو جہاز پر لانے میں اتنی محنت پڑتی ہے جیسے یہ لنگر ہو، باقی کام ختم ہو جانے کے کئی دن بعد مناسب وقت پر کوئی کوئیگ، ڈیگو اور ٹاشٹیگو جو دندان سازی کے ماہر ہیں دانت اکھاڑنا شروع کر دیتے ہیں کوئی کوئیگ ایک تیز کسلا لے کر مسوڑھے کو کاٹ دیتا ہے اور جبڑے کو پیچ تک صاف کر دیتا ہے، پھر اوپر سے ایک لنگر اتارا جاتا ہے اور دانتوں کو اس طرح کھینچ کھینچ کر نکالا جاتا ہے جیسے مشی گن کے بیل جنگلوں میں سے شاہ بلوط کے درختوں کے ٹھنٹ کھینچ کے لاتے ہیں عموماً کل بیالیس دانت ہوتے ہیں، بڈھی وہیلوں کے دانت گھس تو ضرور جاتے ہیں لیکن خراب نہیں ہوتے اور نہ ان میں ہمارے جیسے مصنوعی طریقے سے اپنے دانت بھرواتی ہیں بعد میں جبڑے کو کاٹ کر ٹکڑے کر لیتے ہیں، اور انھیں ایک طرف ڈھیر کر دیتے ہیں جیسے مکان بنانے کے لیے کڑیاں۔

باب - ۷۵

رائٹ ویل کا سر — تقابلی مطالعہ (۲)

آئیے اب جہاز کی دوسری طرف چلیں اور رائٹ ویل کے سر کو غور سے دیکھیں۔
بحیثیت مجموعی رائٹ ویل کے سر کو رومی کی جگہ رکھتے ہوئے تشبیہ دی جا سکتی ہے خصوصاً سامنے کی طرف سے جہاں یہ بہت چوڑا اور گول ہوتا ہے۔ دوسری طرح بالکل رائٹ ویل کا سر کشتی کی شکل کے ایک بہت بڑے جوتے سے ایک بھدی سی مشابہت رکھتا ہے۔ دو سو سال ہوئے انگلینڈ کے ایک بڈھے سیاح نے اسے موچی کے کالبوت سے تشبیہ دی تھی۔ بچوں کی اس مشہور کہانی میں جس بڑھیا کا ذکر آتا ہے وہ اپنے بچوں کی پلٹن سمیت اس جوتے یا کالبوت میں نہایت آسانی سے رہ سکتی ہے۔

لیکن اگر آپ اس زبردست سر کے قریب آ جائیں تو جس جگہ آپ کھڑے ہوں اس کے لحاظ سے یہ مختلف شکلیں اختیار کرنے لگتا ہے۔ اگر آپ اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کے فوارے کے سوراخوں کو دیکھیں تو آپ کو یہ سر ایک بہت بڑا طنبورہ معلوم ہوگا اور یہ فوارے اس کے سوراخ۔ سر کے اوپر ایک سخت کلغی سی ہوتی ہے اس سبز رنگ کے جھینگے کو گرین لینڈ والے "تاج" اور امریکی لوگ "رائٹ ویل کی ٹوپی" کہتے ہیں۔ مگر آپ اپنی نظریں صرف اسی چیز پر گاڑ دیں تو یہ سر آپ کو شاہ بلوط کے بہت بڑے درخت کا تنا لگے گا جس کے شگاف میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا ہو۔ اس ٹوپی کے اوپر جو زندہ کیکڑے کلبلاتے رہتے ہیں اگر آپ انہیں غور سے دیکھیں تو آپ کے ذہن میں یہ تصور ضرور پیدا ہوگا لیکن اگر آپ اس اصطلاح یعنی "تاج" کے اسیر ہو کے رہ گئے ہیں تو آپ نہایت دلچسپی کے ساتھ یہ سوچیں گے کہ یہ زبردست عفریت واقعی سمندر کا تاج پوش بادشاہ ہے۔ اور اس کے سر پر یہ سبز تاج بڑی شان سے رکھا ہے۔ لیکن اگر یہ ویل بادشاہ ہے تو اس لحاظ سے اس کی سنجیدگی اور کاہلی اسے زیب نہیں دیتی۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ اس کا نچلا ہونٹ کیسے لٹکا ہوا ہے۔ اس سے کتنی بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ ٹپکتی ہے! بڑھئیوں کی ناپ کے مطابق یہ لٹکا ہوا ہونٹ کوئی بیس فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے۔ اور اس میں سے پانچ سو گیلن تیل نکل سکتا ہے۔

یہ واقعی افسوس کی بات ہے کہ اس بدنصیب ویل کا ہونٹ بیچ میں سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ شگاف کوئی ایک فٹ چوڑا ہے۔ شاید اس ویل کی ماں پیرو کے ساحل پر تیز رو بچی کو زلزلہ آ گیا اور اس طرح یہ شگاف پیدا ہوا۔ اس ہونٹ پر دہلیز کی طرح پیر رکھ کے ہم منہ کے اندر جا سکتے ہیں۔ خدا کی قسم یہاں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ریڈ انڈین لوگوں کے خیمے کے اندر کھڑا ہوں۔ یا اللہ کیا حضرت یونسؑ اسی راستے سے گئے تھے؟ چھت کوئی بارہ فٹ اونچی ہے اور ترچھی ہوتی چلی گئی ہے۔ پہلو کی تراش نما اور یہاں دار دیواریں نوک دار کی شکل کی ہڈیاں فراہم کرتی ہیں۔ یہ ہڈیاں سر کے اوپر والی ہڈی میں جڑی ہوتی ہیں اور ان سے ایک کھڑکی سی بن جاتی ہے جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ دونوں طرف تین تین سو ہڈیاں ہوتی ہیں ان کے کناروں پر جھوتروں کا ایک جھالر سا لگا ہوتا ہے جب رائٹ ویل چلتے سے بھرے ہوئے سمندر میں منہ کھول کے تیرتی ہے تو پانی انہی جھوتروں کے ذریعے چھن جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں انہیں میں الجھ کے رہ جاتی ہیں۔ بیچ والی ہڈیوں پر عجیب و غریب گڑھے، قوس اور نشانات ہوتے ہیں جن کی مدد سے شکاری ویل کی عمر کا اندازہ لگاتے ہیں بالکل جس طرح شاہ بلوط کی عمر کا

اندازہ دو طرزوں سے لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس معیار کو درست ثابت کرنا مشکل ہے لیکن اس قیمتی کی بنا پر اس کے صحیح ہونے کا امکان ضرور ہے جو اصل اگر ہم یہ معیار اختیار کر لیں تو ہمیں یہ بھی قبول کرنا پڑے گا کہ رائٹ وہیل کی جتنی عمر نظر آتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

پرانے زمانے میں ان کنگھیوں کے متعلق کچھ عجیب و غریب خیال آرائیاں ہوتی ہیں۔ ایک ملاح کہتا ہے کہ وہیل کے منہ کے اندر "برگھنیں" ہوتی ہیں ایک دوسرا ملاح انھیں سور کے بال بتاتا ہے۔ تیسرے صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے منہ میں کوئی ڈھائی سو پرگھے ہوتے ہیں اور زبان کے اوپر لٹکتے رہتے ہیں۔

ان چیزوں کا خواہ آپ کوئی بھی نام رکھیں مگر ان سے عورتوں کے پنکھے، اور دوسری سنگھار کی چیزیں تیار ہوتی ہیں لیکن اس سلسلے میں اب اس ہڈی کی مانگ کچھ کم ہوگئی ہے۔ اس سے تو ملکہ این کے زمانے میں رواج کر لیا کیونکہ ان دنوں بڑے بڑے گھیر والے سایوں کا دور تھا جن کے نیچے وہیل کی ہڈیاں لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس زمانے کی بیگمات گویا وہیل کے جبڑوں میں رہتی تھیں۔ اسی طرح ہم لوگ بھی کبھی انھیں جبڑوں کی پناہ ڈھونڈتے ہیں کیونکہ چھتری میں تیلیاں اسی ہڈی کی ہوتی ہیں۔

لیکن اب کنگھیوں اور وہیل کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیے اور رائٹ وہیل کے منہ میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھیے۔ ہڈیوں کے ان باقاعدہ ترتیب سے کھڑے ہوئے ستونوں کو دیکھ کر آپ کو بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے ہارلم کے زبردست ارگن باجے کے اندر کھڑے ہوں اور اس کی ہزاروں نلکیوں کو دیکھ رہے ہوں جس طرح ارگن باجے کے نیچے قالین بچھا ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی نہایت نرم ایرانی قالین بچھا ہوا ہے —— یعنی زبان جو منہ کے فرش سے چپکی رہتی ہے۔ یہ بڑی موٹی اور نازک ہوتی ہے جب اسے عرشے پر کھینچا جاتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ اس زبان میں سے چھ پیپے تیل نکلتا ہے۔

میں نے شروع میں جو بات کہی تھی، اب تک آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ بالکل صحیح تھی —— یعنی روغنی وہیل اور رائٹ وہیل کا سر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اچھا اب ساری بحث کا خلاصہ سنیے۔ رائٹ وہیل کے سر میں روغن نہیں ہوتا، سفید سفید دانت نہیں ہوتے، لمبا اور پتلا سا نچلا جبڑا نہیں ہوتا جیسے روغنی وہیل کے ہوتا ہے۔ روغنی وہیل کے سر میں ہڈیاں نہیں ہوتیں، لمبا چوڑا نچلا ہونٹ نہیں ہوتا اور نہ زبان ہوتی ہے پھر رائٹ وہیل کے سر میں باہر کی طرف فوارے کے دو سوراخ ہوتے ہیں، روغنی وہیل کے سر میں ایک۔

یہ دونوں قابل احترام سر اس وقت پاس پاس پڑے ہیں۔ انھیں آخری بار اچھی طرح دیکھ لیجیے کیونکہ ایک تو جلدی ہی سمندر میں ڈوب جائے گا اور دوسرا بھی کچھ دن بعد اس کے پیچھے چل دے گا۔

روغنی وہیل کے چہرے پر جو تاثر چھایا ہوا ہے اسے آپ دیکھ رہے ہیں!

یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا مرتے وقت تھا البتہ پیشانی کی لمبی لمبی جھریاں غائب سی ہو گئی ہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی چوڑی پیشانی سے گھاس کے میدانوں کا سا اطمینان جھلکتا ہو یہ سکون موت سے فلسفیانہ بے پروائی کے باعث پیدا ہوا ہے۔ اب دوسرا سر دیکھیے نچلا ہونٹ اتفاقاً جہاز کی دیوار میں جا لگا ہے چنانچہ سارے کا سارا جبڑا بند ہو گیا ہے۔ کیا اس سر سے یہ بات نہیں جھلکتی کہ وہیل نے موت سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ رائٹ وہیل رواقی فلسفی تھی۔ اور روغنی وہیل افلاطون کے پیروؤں میں سے، آگے چل کے اسپنوزا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

باب - ۷۶

قلعہ شکن

اس موضوع کو چھوڑ کر آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے بیچ و طالب علموں کی حیثیت سے سپرم وہیل کے سر کے اگلے حصے کو غور سے دیکھیں کہ یہ کتنا ٹھوس اور گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ پوری تحقیق سے کام لے کر کسی مبالغے کے بغیر سوچ سمجھ کر اندازہ لگائیے کہ اگر وہیل ٹکر مارے تو دیوار ٹوٹ جائے گی یا نہیں۔ یہ مرحلہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر آپ نے اس معاملے کے متعلق پہلے اپنی کوئی ذاتی رائے قائم نہ کی تو آپ کو اس ہولناک واقعے کا بھی یقین نہ آئے گا جو بالکل سچا ہے اور جس کی نظیریں تاریخ میں بہت کم ملیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ تیرنے کی حالت میں سپرم وہیل کے سر کا اگلا حصہ پانی کے اندر عمودی شکل میں کھڑا رہتا ہے۔ پیشانی کا نچلا حصہ پیچھے کی طرف کو ڈھلوان ہو کر چلا جاتا ہے اور اس گڑھے سے جا ملتا ہے جس میں نچلا جبڑا پیوست رہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ منہ بالکل سر کے نیچے ہوتا ہے ایسے ہی جیسے آپ کا منہ آپ کی ٹھوڑی کے نیچے ہو۔ پھر وہیل کے باہر کی طرف کوئی ناک نہیں ہوتی اگر آپ چاہیں تو فوارے کے سوراخ کو ناک کہہ لیجئے لیکن وہ بھی سر کے اوپر ہوتا ہے۔ پھر آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس کی آنکھیں اور کان سر کے پہلوؤں میں ہوتے ہیں اور منہ کے سرے سے کوئی اتنے فاصلے پر ہوتے ہیں جو جسم کا ایک تہائی ہے۔ چنانچہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سپرم وہیل کا ماتھا ایک اندھی دیوار کی طرح ہوتا ہے جس میں کوئی عضو باہر کو نکلا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ سر کے انتہائی نچلے کے ڈھلوان حصے کے آخر میں ہی کچھ ہڈی کا نشان ملتا ہے اور پیشانی سے بیس فٹ آگے نکل کر کھوپڑی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس پورے حصے میں ایک بھی ہڈی نہیں ہوتی۔ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو گا کہ اس حصے میں جو چیزیں بھری ہوتی ہیں ان میں نہایت لطیف قسم کا تیل بھی ہوتا ہے ظاہر میں تو یہ چیز بہت نرم کی جا سکتی ہیں لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ مادہ کتنا سخت اور ناقابلِ تسخیر ہے۔ پہلے کہیں میں بتا چکا ہوں کہ وہیل کے جسم پر چربی اس طرح چڑھی رہتی ہے جیسے نارنگی پر چھلکا۔ یہی حال سر کا ہے مگر ایک فرق ہے۔ سر کے اوپر یہ غلاف اتنا موٹا تو نہیں ہوتا لیکن ہڈی کے بغیر بھی اس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص نے اسے چھو کے دیکھا ہو اسے کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مضبوط سے مضبوط بازو کا آدمی نوکیلے سے نوکیلا برچھا یا تیز سے تیز بھالا پھینکے تو سر پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور برچھا سر پر پڑتے ہی اچٹ جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سپرم وہیل کے ماتھے پر گھوڑے کے سم لگے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کا احساس نہیں ہوتا۔

اچھا اب ایک اور بات پر غور کیجئے۔ جب گھاٹ پر دو بڑے بڑے اور لدے ہوئے جہاز ہجوم کی وجہ سے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگیں اور ان کے ٹکرا جانے کا خطرہ ہو تو جہازی کیا کرتے ہیں؟ وہ ان کے درمیان لوہے یا لکڑی کی طرح کی کوئی سخت چیز نہیں لٹکاتے بلکہ اس کے بجائے وہ دو جہازوں کے درمیان کاگ اور سوت کی ایک بڑی سی گدی رکھ دیتے ہیں جو بیل کی موٹی اور سخت کھال میں لپٹی ہوتی ہے۔ چنانچہ ٹکر کا سارا زور اسی گدی پر پڑتا ہے اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا حالانکہ جہازوں کے ڈنڈے اور لوہے کے شہتیر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے جو بات کہی ہے اس کی یہ ایک مثال کافی ہے لیکن اس کے علاوہ میں نے ایک اور مفروضہ قیاس دوڑایا ہے۔ معمولی قسم کی مچھلیوں کے اندر ایک تھیلا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ تیرتی ہیں اور ضرورت کے مطابق پھیل بھی جاتا ہے اور سکڑ بھی جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے سپرم وہیل کے اندر اس قسم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ پھر ایک عجیب و غریب بات یہ کہ وہ جب چاہتی ہے اپنا سر پانی کی سطح کے نیچے کر لیتی ہے اور تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کے چلنے لگتی ہے۔ اس کے سر کا غلاف نہایت لچکدار ہوتا ہے اور اسے ہلنے جلنے میں کوئی دقت

پیش نہیں آتی۔ اس کے علاوہ سر کے اندر کا حصہ بھی کھوکھلا ہوتا ہے۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ اس پُراسرار پھٹنے کا تعلق باہر کی ہوا سے ہوگا۔ چاہے ابھی تک ہم اس کا پتہ نہ چلا سکیں۔ بہرحال اس تعلق کی وجہ سے فضا کے پھیلاؤ اور سکون کا اثر اس پھٹنے پر ضرور ہوتا ہوگا۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس خوفناک اور اٹل قوت کا اندازہ کیجئے جس میں وہ سب سے زیادہ بے خبری اور تباہ کن عنصر یعنی ہوا بھی اضافہ کرتی رہتی ہے۔

اچھا اب سنیئے۔ وہیل اپنے ساتھ بہرکرہ، ذلیل اور ناقابل تسخیر دیوار اور اندر بے تیر ہتھیار لیے پھرتی ہے اور پیچھے پیچھے طوفانِ زندگی کا ایک ڈھیر کا ڈھیر چلتا ہے جسے بس رسی کے ذریعے ہی ناپا جا سکتا ہے جیسے لکڑی کے ٹیلے کو پھر یہ سارا جسم ایک ہی قوت ارادی کا تابع ہوتا ہے جیسے کسی چھوٹے سے کیڑے کا جسم۔ لہٰذا اب میں آگے چل کے آپ کو بتاؤں گا کہ اس وسیع و عریض عفریت میں جو لچکتی قوت چھپی پڑی ہے اور اس کے کیا خواص ہیں جب میں آپ کو بتاؤں گا کہ وہیل کی "تاخت و تاراج" کا کیا عالم ہے تو امید ہے کہ آپ جاہلانہ بے یقینی سے کنارہ کش ہو چکے ہوں گے اور یہ شرط قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے کہ چاہے روغنی وہیل کسی پہاڑ کو توڑ کے بیچ میں سے گزر جائے۔ چاہے بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملا دے۔ پھر بھی آپ کے ابرو پر بل نہیں پڑے گا کیونکہ جب تک آپ وہیل کی عظمت کا اعتراف نہ کریں، آپ حقیقت شناسی کے معاملے میں تنگ نظر اور جذباتی رہیں گے۔ حقیقت سے آنکھیں چار کرنا تو دیوقامت انسانوں کا کام ہے جو آگ میں سے بھی گزر جائیں۔ یہاں تنگ نظری کا کیا کام؟ آپ کو یاد ہوگا کہ جس کمزور دل نوجوان نے لاٹیس کی ہولناک دیوی کا نقاب اٹھایا تھا اس کا کیا حشر ہوا۔

باب - ۷۷

مٹھور

اب وہیل کے اندر سے روغن نکالنے کا کام آتا ہے لیکن اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے آپ کو اس چیز کی اندرونی ساخت کا علم ہونا چاہیے جس پر یہ عمل ہو رہا ہے۔

وہیل کا سر قوس اور مستطیل شکل کا ہوتا ہے اور آپ اسے کسی جھکے ہوئے تختے پر رکھ کے دو آڑے آڑے ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں سے نیچے والا حصہ ڈھانچہ ہڈی اور جبڑوں پر مشتمل ہوگا، اوپر والا حصہ ایک چکنا چکنا لوتھڑا ہوگا جس میں ہڈیاں نہیں ہوں گی۔ اس کے آگے والے چوڑے سرے کو وہیل کی عمودی پیشانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اوپر والے ٹکڑے کو پیشانی کے بیچ میں سے آڑا کاٹئے تو برابر کے حصے ہو جائیں گے جن کے بیچ میں پہلے ایک ریشہ دار دیوار تھی۔

ان دو حصوں میں سے نیچے والا ایک بہت بڑا چھتا ہوتا ہے اور اس میں تیل بھرا رہتا ہے اس چھتے میں کوئی دس ہزار خانے ہوتے ہیں جن کی دیواریں لچکدار، سخت اور سفید ریشوں کی ہوتی ہیں۔ اوپر والے حصے کو صندوق کہتے ہیں۔ اسے روغنی وہیل کا مٹھور سمجھئے۔ جس طرح مشہور مٹھور کے اوپر پراسرار قسم کے نقش و نگار ہوتے ہیں، اسی طرح وہیل کے ماتھے کی جھریاں اس مٹھور کی آرائش کے لیے عجیب و غریب قسم کے نقش بناتی ہیں۔ پھر جس طرح مٹھور میں شراب بھری رہتی ہے اسی وہیل کے صندوق میں دنیا کا سب سے قیمتی تیل یعنی وہیل کا روغن اپنی خالص، شفاف اور سیال شکل میں موجود ہوتا ہے۔ وہیل کے جسم کے دوسرے حصوں میں یہ روغن اس طرح حرارت کے بغیر نہیں ملتا۔ وہیل زندہ ہو تو یہ بالکل سیال رہتا ہے لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اسے ہوا لگتی ہے تو یہ جمنے لگتا ہے اور اس میں بلور کی سی خوبصورت شاخیں نکل آتی ہیں، جیسے پانی میں برف جمنا شروع ہو تو باریک پتیاں سی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بڑی وہیل کے صندوق میں سے عام طور پر کوئی پانچ سو گیلن روغن نکلتا ہے، حالانکہ بہت سا گر جاتا ہے یا ٹپک جاتا ہے یا روغن جمع کرنے کے دشوار عمل میں ضائع ہوتا ہے۔

پتا نہیں شراب کے مٹکے کے اندر کس قسم کا نفیس اور بیش قیمت روغن چڑھایا جاتا ہے لیکن روغنی وہیل کے صندوق میں اندر کی طرف موتیوں کے سے رنگ کی ریشمی جھلی چڑھی رہتی ہے اس کی نرمی اور خوبصورتی کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی۔

آپ دیکھ ہی گئے ہوں گے کہ روغنی وہیل کا صندوق سر کے اوپر کی پوری لمبائی گھیرے رہتا ہے۔ پھر جیسا بتایا جا چکا ہے کہ سر کی لمبائی پورے جسم کی ایک تہائی ہوتی ہے، اگر وہیل کی لمبائی اسی فٹ ہو تو مٹھور جب جہاز کے پہلو میں لٹکایا جاتا ہے، اس کی گہرائی چھبیس فٹ سے بھی زیادہ نکلے گی۔

وہیل کا سر کاٹتے وقت جراح کا اوزار اسی جگہ کے قریب رہتا ہے جہاں بعد میں سوراخ کر کے روغن نکالا جائے۔ چنانچہ اسے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ کسی بے احتیاطی سے اس مقدس مقام پر بھی ہاتھ پڑ جائے اور یہ گراں قیمت روغن بہہ نکلے گا۔ سر کے اس حصے کو کاٹ کر پانی سے باہر نکال لیتے ہیں اور چرخیوں میں لٹکا دیتے ہیں چنانچہ اس طرف رسیوں کا پورا جنگل نظر آتا ہے۔

یہ تفصیلات تو میں نے آپ کو سنا دیں، اب مہربانی فرما کر مٹھور میں سے روغن نکلنے کا عمل ملاحظہ فرمائیے۔ جو ہمیشہ نہایت دلچسپ

اور عجیب و غریب ہوتا ہے اور اس پر قدرت کو حیرت ہوا

کے اندر رکھ دیا تاکہ کشتی زنجیر پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط رہے۔ اور اس سے پہلے کہ ناش ٹیگو سمندر کی تہ تک پہنچے رسی کھینچنے والا شخص ڈیگو اوپر کھینچا دیا ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا لوگوں نے دیوار پر سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو سر کے بل چھین پڑا تھا یہ سمندر کی سطح کے نیچے ادھر ادھر چل رہا تھا جیسے کوئی زبردست خیال اس پر غالب آگیا ہو۔ دراصل یہ بیچارہ جنگلی تھا جو غیر شعوری طور پر اپنی جد و جہد کے ذریعے یہی بتا رہا تھا کہ وہ کس خطرناک گہرائی تک پہنچ رہا ہو۔

یہ دیکھ کر معلوم کس طرح دوسری چیزوں میں جا پھنسی تھی اور ڈیگو سر کے اوپر کھڑا اسے نکال رہا تھا اتنے میں چٹخنے کی سی تند و تیز آواز آئی اور سب لوگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ جن دو آنکڑوں میں سر لٹکا ہوا تھا ان میں سے ایک ٹوٹ گیا ہے اور بے انتہا دیو ایک خوفناک حرکت کے ساتھ آزاد کانپ رہا ہے جہاز پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور وہ اس طرح کانپنے لگا جیسے برف کے پہاڑ سے ٹکرا گیا ہو۔ اب ایک آنکڑا رہ گیا تھا اور سارا بوجھ اسی کے اوپر تھا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ بھی ٹوٹ جائے گا سر کے تیزی کی وجہ سے یہ امکان اور بھی بڑھ گیا تھا۔

"نیچے آجاؤ، نیچے آجاؤ!" جہازیوں نے ڈیگو کو پکارا لیکن اس نے ایک ہاتھ سے بھاری چربی … کو پکڑ لیا تاکہ اگر سر گرے تو یہ لٹکا رہے۔ پھر زنجیروں کو ڈھیلا کرنے کے بعد حبشی نے بالٹی کو جھولتے ہوئے کنویں میں ڈال دیا تاکہ دونوں ہر پہنچا دے کر کنگ …

اسٹب نے پکار کر کہا۔ "ارے چھپے! کیا تو اس ٹب میں گرز ڈال رہا ہے۔ ہٹ جا ہٹ! اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ تو نے تو وہیل کی ابالی اس کے سر پر رکھ دی ہے۔ اب تو وہ بھی سر کے ساتھ گرے گا ہٹ وہاں سے!"

"چرخی کے راستے سے ہٹ جاؤ!" اتنے زور کی آواز آئی جیسے کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

ساتھ ہی ساتھ کھچ کی سی کڑک سنائی دی اور وہ زبردست تودا سمندر میں گر پڑا جیسے کوئی چٹان نیاگرا کے پانی میں گری ہے جہاز کو جھٹکا اس وجہ سے آزاد ہو کر دور ہٹ گیا اور اس کا تاتا بندھے لگا لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا سانس نیچے۔ جھاگ کی گہری گہری دھند میں سے دکھائی دے رہا تھا کہ ڈیگو چرخی پکڑے جھول رہا ہے کبھی جہازیوں کے سروں کی طرف آتا ہے کبھی پانی کی طرف جاتا ہے۔ ادھر بیچارہ ڈوبتا ہوا ناش ٹیگو سمندر کی تہ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ دھند کا پردہ دور ہوا سامنے سے جہاں ہی تھا کہ ایک ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے معلوم ہوا کہ کشتی کے اوپر منڈلاتا نظر آیا اس کے بعد ایک زور کا چھپاکا ہوا جس سے پتا چلا کہ میرا دلیر کوئیک ڈوبنے والے کی مدد کرنے کے لیے سمندر میں کود پڑا ہے۔ سارا ہجوم جہاز کی دیوار کی طرف بڑھا اور ایک ایک لمحہ گننے لگا لوگ یہ گن رہے تھے مگر نہ تو ڈوبنے والے کا کوئی نشان تھا نہ غوطہ لگانے والے کا کچھ لوگ جلدی سے ایک کشتی میں کود پڑے اور اسے جہاز سے تھوڑی دور ہٹانے لگے۔

"آ! آ!" ڈیگو ایک دم سے چلایا۔ وہ ہمارے سروں کے اوپر نہایت اطمینان سے جھول رہا تھا ہم نے دور آگے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ نیلی لہروں میں سے ایک بازو نکلا ہوا ہے۔ یہ نظارہ ویسا ہی عجیب و غریب تھا جیسے قبر کے اوپر گھاس میں سے ہاتھ باہر نکل آیا ہو۔

"دونوں! دونوں! — دونوں ہیں!" ڈیگو خوشی کے مارے چلا اٹھا تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ کوئیک ایک ہاتھ سے تیراکی کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے حبشی کے لمبے لمبے بال پکڑے ہوئے ہے اتنے میں کشتی میں کھینچ لیا گیا اور وہ جلدی ہی عرشے پر آگئے لیکن ناش ٹیگو

بڑی مشکل سے ہوش میں آیا اور کرنل کوئنگ بھی کچھ ایسا چاق چوبند نہ لگ رہا تھا۔

ابھا ناش نیکو کی نجات کس طرح ہوئی؟ سنیے۔ وہیل کا سر آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا۔ کرنل کوئنگ غوطہ مار کر اس کے پاس پہنچا اور اس کے جبڑے کے قریب اپنی تیز تلوار کے ہاتھ لگا کر ایک بڑا سا سوراخ کر لیا پھر تلوار پھینک دی اور اپنا بازو اندر ڈال کے ناش نیکو کو سے پکڑ کے نکال لیا اس نے بتایا کہ ہیل دھڑ دھڑا کر نگل گیا تھا۔ کوئی بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ عجیب طریقہ نہیں اور مکمل ہے اس سے گزر ہو چکا ہے اس نے ٹانگ پھر اندر کر لی اور ریت چابک دستی سے جستی کو اپنا کے تلا بازی کھائی۔ ٹانگ کی کوشش میں وہ اسی قدیم طریقے سے باہر نکل آیا۔۔۔ بیٹی سرپیٹے اور ٹانگیں ہیں ہوا دوسرا ٹھوڑا رو جیلی حیرت سے تھا۔

قدرتی انتہائی مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود کرنل کوئنگ کی بہادری اور دلیری کے فن میں کمال کی بدولت ناش نیکو کو نجات بھی دولت حاصل ہوئی اس واقعے سے ایک دیا سبق ملتا ہے جسے کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تیز رفتار گھوڑے کی سواری اور کشتی رانی کے ساتھ ساتھ دلیری کا فن بھی سیکھنا ضروری ہے۔

میں جانتا ہوں کہ بعض حضرات اس واقعے پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ ان لوگوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر ایک ایسا نظریہ قائم کر لیا ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ حضرات اکثر پیش آتا رہتا ہے، اور اس کی کوئی ایسی معقول وجہ بھی نہیں ہوتی جیسی ناش نیکو والے معاملے کی تھی کیونکہ ان کی ٹھوڑی کی تشریح تو بے انتہا مشکل ہوتی ہے۔

لیکن شاید آپ نہایت دانش مندی کے ساتھ اعتراض کریں گے کہ یہ سب ہوا کیسے؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ وہیل کا سر بہت ہی نفیس اور خانے ہی خانے ہوتے ہیں اس کے جسم کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے اور پانی پر کاگ کی طرح تیر سکتا ہے لیکن ڈوبتے ہوئے وہ پانی میں ڈوب گیا جس کا تعلق اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے جس نے تمہیں پکڑ لیا۔ ذرا بھی نہیں بلکہ میں نے آپ کو پکڑ لیا بیچارہ ناش نیکو اس کے اندر گیا ہے تو صندوقوں میں سے سارے کی ساری چیزیں الگ کی جا چکی تھیں اور کمرے کی ماں ٹوٹی ہوئی اور بتی رہ گئی تھیں جو موٹی اور بھاری ہوتی ہیں یہ مادہ سمندر کے پانی سے زیادہ بھاری ہوتا ہے اور اس کا ایک ٹکڑا اسی طرح ڈوب جاتا ہے جیسے کوئی پتھر یہ مادہ ڈوبنے میں آہستہ آہستہ نیچے گرتا ہے۔ مگر اس موقع پر چند دوسرے حصے سر میں لگے رہ گئے تھے جو اسے بھاری بنا رہے تھے چنانچہ سر پانی میں آہستہ آہستہ اتر رہا تھا اور کرنل کوئنگ کو یہ موقع مل گیا تھا کہ بھاگتے بھاگتے اپنے دلیری کے فرائض انجام دے لے۔ ہاں یہ موقع مل جاتے جاتے مل گیا تھا۔

اگر ناش نیکو سر کے اندر ہی فنا ہو جاتا تو یہ موت بڑی بیش قیمت ہوتی۔ وہ نہایت سفید خوشبودار لطیف روغن میں گھٹ کے مرتا اس کی آرزو ایک اندر سب سے خطرناک ہیں اور سب سے مقدس مقام پر پڑتی جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اس سے پہلے ہم نے ایک ہی آدمی کو دیکھا ہے۔ اوہیو میں ایک شہد نکالنے والے نے بڑے مزے کی موت پائی۔ وہ ایک کھوکھلے درخت کے شگاف میں شہد ڈھونڈ رہا تھا۔ وہاں اسے شہد کا اتنا بڑا ذخیرہ ملا کہ وہ بہت اندر کو جھک گیا۔ اور شگاف میں ہی پڑا پڑا اچھی موت سے خوشگوار موت مرا۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ افلاطون کے شہد آگیں سر میں کتنے لوگ گر جاتے ہیں اور اس شیرینی کے ساتھ فنا ہوتے ہیں!

پہاڑ کے قریب زمین کی ایک تھالی سی بنی شکسپیر کی سی پیشانیاں تو بہت کم ہیں جو ایک طرف تو اتنی اونچی اٹھی ہیں اور دوسری طرف
نتھنے پھنگ تک اترتی ہیں کہ آنکھیں صاف و شفاف روشنی سے اور روشن جھیلیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور جس طرح پہاڑوں کے شکاری
برف میں ہرنوں کے نشان ڈھونڈتے پھرتے ہیں اسی طرح آنکھوں کے اوپر پیشانی کی شکنوں میں آپ کو ذہانت کے پیچھے اتر کر پالی
پیچھے کے نشانات ملتے ہیں۔ پیشانی میں بذات خود دیوتاؤں کا سا وقار اور جلال ہوتا ہے وہ روشن دلی میں گر پڑ کر گنا ذرہ ہو جاتا ہے۔
اس کو سامنے کی طرف سے دیکھنے سے اپنے دل پر شکوہ اور ذری بے پناہ قوتوں کا ایسا رعب چھا جاتا ہے کہ فطرت کی دنیا میں کبھی اور
پھر کو دیکھنے سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں کہیں بھی خاص مقام کو نہیں دیکھتے یہاں خود جلال واضح طور سے نمایاں نہیں ہوتے
ناک سے، آنکھیں، رخسار، ہونٹ۔ یہ چہرہ کے صحیح حصے ہیں روشن دلی کے پاس یہ چیزیں ہیں ہی نہیں۔ اس کی پیشانی تو ایک وسیع و عریض
آسمان ہے جس کی ہر شکن میں ایک گہرا دھندلا ہوتا ہے اور جس کے کونے تیرہ دلوں کی خاموشی میں گھنگھور جہازوں اور انسانوں
کی تباہی کی پیشین گوئیاں۔ اگر آپ اسے ایک پہلو سے دیکھیں تو بھی اس پیشانی کے جلال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ دل پر دیباچہ جب
نہیں بیٹھا ہوتے دیکھیں تو آپ کو پیشانی کے بیچوں بیچ وہ آدھا دائرہ نیم قوس کی شکل کا گڑھا نظر آئے گا جو لاواٹر کے نزدیک انسان میں
ذہانت کی نشانی ہے۔

مگر کیسے، روشن دلی میں ذہانت؟ روشن دلی نے کبھی کوئی کتاب لکھی ہے کبھی کوئی بات کی ہے؟ نہیں۔ اس کی ذہانت اسی چیز
سے ظاہر ہے کہ اس نے یہ بات ثابت کر دکھانے کے لیے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ ذہانت دلی کو دیکھ کر خاموشی سے
بھی ظاہر ہوتی ہے اس سے مجھے خیال آیا کہ اگر ابتدائی زمانے میں مشرقی دنیا روشن دلی سے واقف ہوتی تو ان لوگوں کا بھی ویسا
ساحرانہ تخیل اسے بھی دیوتا بنا کے چھوڑتا۔ انھوں نے دیدنی دیل کے گونگے پن کو تو دیوتا بنا ہی دیا تھا کیونکہ گونگوں کے زبان نہیں ہوتی
روشن دلی کے بھی زبان نہیں ہوتی۔ یہ کام سے کرتی بھی جھوٹی ہوتی ہے کہ یہ نہیں بول سکتی۔ اگر آئندہ کبھی مذہب یا شاعرانہ مزاج قوم نے پرانے
کے زندہ دل دیوتاؤں کو ان کا پیدائشی حق واپس دے دیا اور انھیں پھر ان آسمان پر لا بٹھایا جواب خود پرستی کے زمرے میں گرفتار
ہے اس پہاڑی پر تخت نشین کر دیا جہاں آج کل کسی پری انگ کا سایہ نہیں پڑتا تو یقین رکھیے کہ عظیم روشن دلی ہی دیوتاؤں کی
سرتاج ہوگی اور زیوس کی جگہ سنبھالے گی۔

مصر کے قریب وہ جہتوں کی پیچیدہ تحریریں، شمپولیون نے پڑھ لی تھیں لیکن ہر انسان کے چہرے پر جو پراسرار اور مخفی تحریر
درج ہے اسے پڑھنے والا ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ انسانی علم کی طرح قیافہ شناسی بھی ایک مختصر کہانی ہے جو بس دیوار ہی دکھا
دیتی ہے۔ سر ولیم جونز تیس زبانوں کے عالم ہونے کے باوجود یہ سادے کسان کے چہرے کے عمیق اور لطیف معانی نہیں پڑھ
سکتے تو مجھ جیسا بیچارہ وہیل شناس روشن دلی کی پیشانی پر لکھی ہوئی پراسرار تحریر کیسے پڑھ سکتا ہے۔ میں تو پیشانی آپ کے
سامنے رکھے دیتا ہوں آپ سے پڑھا جائے تو پڑھ لیجیے۔

ویل کے شکار کی شان و عزت

بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کو کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ بڑی احتیاط سے بے قاعدگی برتی جائے۔

میں ویل کے شکار کے متعلق جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اور اس کی تحقیق کا دائرہ جتنا وسیع کرتا جاتا ہوں، اس کی قدامت اور شرافت سے اتنا ہی متاثر ہوتا ہوں۔ خصوصاً جب میں دیکھتا ہوں کہ کئی عظیم دیوتاؤں، بہادروں اور ولیوں نے اسے امتیاز بخشا ہے تو میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو جاتا ہوں کہ میری کوئی اہم حیثیت ہے۔ میں بھی اس عظیم الشان برادری کا ایک فرد ہوں۔

جو پیٹر کا ایک بیٹا یعنی بہادر پرسیوس ویل کا سب سے پہلا شکاری تھا۔ ہمارے پیشے کی دائمی عزت کی خاطر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری برادری نے ویل پر سب سے پہلے جو حملہ کیا تھا اس میں نیت فاسد نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہم لوگ جنگ کیا کرتے تھے، اور لوگوں کے چراغ کی کپیاں بھرنے کے لیے نہیں، بلکہ مصیبت زدوں کی امداد کے لیے ہتھیار اٹھاتے تھے۔ آپ کو پرسیوس اور اینڈرومیڈا کی کہانی تو معلوم ہی ہوگی۔ یعنی ایک بادشاہ کی بیٹی تھی، اور سمندر کے ساحل پر ایک چٹان سے بندھی ہوئی تھی۔ ویل اسے اٹھا کر لے ہی جانے والی تھی کہ شکاریوں کا شہزادہ پرسیوس بے جگری کے ساتھ آگے بڑھا، ویل کو اپنے برچھے سے چھید ڈالا، حسینہ کو رہائی دلائی اور اس سے شادی کر لی۔ یہ ایسا بے نظیر اور قابلِ تحسین کارنامہ تھا کہ آج کل کے ہنرمند برچھے بازوں نے بھی ایسا کمال کم ہی کیا ہوگا ——— جس میں ویل پہلے ہی وار میں قتل ہو گئی۔ آپ کو اس کہانی پر شک نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ شام کے ساحل پر جو ایک قدیم شہر یافا آباد ہے، وہاں ایک مندر میں صدیوں تک ایک ویل کا ڈھانچہ نمائش کے لیے رکھا رہا، جس کے بارے میں روایت تھی کہ یہ اسی ویل کی ہڈیاں ہیں جو پرسیوس کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی۔ جب رومن لوگوں نے یافا کو فتح کیا تو اس ڈھانچے کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھا کر اٹلی لے گئے۔ اس کہانی میں جو بات سب سے اہم، عجیب اور دلچسپ ہے وہ یہ کہ حضرت یونس یافا ہی سے جہاز میں سوار ہوئے تھے۔

پرسیوس اور اینڈرومیڈا کی داستان سے ملتی جلتی ایک اور کہانی ہے جس کے متعلق بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ اسی داستان سے نکلی ہے۔ میرا مطلب سینٹ جارج اور اژدہے کی مشہور و معروف کہانی سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اژدہا اصل میں ویل ہی تھا، کیونکہ بہت سی پرانی کہانیوں میں ویل اور اژدہے کو عجیب طرح گڈمڈ کر دیا گیا ہے، اور اکثر ایک دوسرے کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ حزقی ایل نے کہا ہے، "تو ایسا ہے جیسے پانی کا شیر، جیسے سمندر کا اژدہا"۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں ان کی مراد ویل سے تھی، بلکہ بائبل کے بعض نسخوں میں تو یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، اگر سینٹ جارج کا مقابلہ سمندر کے عظیم عفریت کے بجائے زمین کے ایک رینگنے والے کیڑے سے ہوا ہوتا تو ان کے کارنامے کی شان ادھوری رہ جاتی۔ سانپ کو تو کوئی بھی مار سکتا ہے۔ لیکن ویل کے مقابلے پر کھڑے ہونے کی ہمت صرف کسی پرسیوس یا سینٹ جارج یا کوفن ہی میں ہوتی ہے۔

آجکل اس منظر کی جو تصویریں بنائی جاتی ہیں ان سے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، حالانکہ ایسی تصویروں میں اس مخلوق

پدماوتی، سینٹ جوزف، جوالا مکھی، حضرت بل شریف، درگاہ مقدس، یہ سب جہاں مندروں کی فہرست، یہاں کے شکاریوں کے
ساحل کنارے کی کشتیوں میں ہے جسے یہ امتیاز حاصل ہو۔

سکے مارے بچتے۔

سانڈوں کا کورم ہونے لگتے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تو وہی حالت ہے جو کالج میں پڑھنے والے لڑکوں کی ہے — وہ لاکھ شریر ہوں تو بھی حال تو یہ ہے یہ سانڈ دنیا بھر میں ایسی ہی جوانی کی سی بے پروائی سے پھرتے رہتے ہیں مگر کوئی دوراندیش بیٹ ان کی زندگی کا بیمہ تو کر نہیں سکتا۔ بہر حال ان کی جگہ گیری جب ختم ہو جاتی ہے جب یہ سانڈ پندرہ برس کے ہو جاتے ہیں تو ان کی ٹولی بکھر جاتی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر کسی نہ کسی نئے حرم کی تلاش میں چل کھڑے ہوتے ہیں۔

نروں اور مادائوں کی ٹولیوں میں ایک اور فرق ہے جس سے دونوں جنسوں کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر آپ کسی سانڈ پر حملہ کریں تو اس کے ساتھی اس بیچارے کو چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں لیکن اگر آپ حرم والی کسی مادہ پر وار کریں تو اس کی سہیلیاں ہمدردی کی ہر علامت کے ساتھ اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ تو اس کے نزدیک اتنی دیر تک ٹھہری رہتی ہیں کہ خود بھی شکار ہو جاتی ہیں۔

یں استف اعظم کے روسے سر کے کو ٹکڑے سے چھین کر لاکھوں روپے ہتھیاتے ہیں یہ اگر چمٹی ہوئی مچھلی نہیں تو اور کیا ہے ۔ اس خوفناک بھالے باز
یعنی انگلستان کے لیے بیچارہ آئرلینڈ چمٹی ہوئی مچھلی نہیں تو اور کیا ہے ، اور ان حضرت والا کے لیے اپنے سامنے چمٹی ہوئی مچھلیاں
نہیں تو اور کیا ہیں ، اور کیا ان سب لوگوں کے مسئلے میں قبضہ ہی پورا قانون نہیں ؟

لیکن اگر چمٹی ہوئی مچھلی کا اصول ان ساری چیزوں پر عاید ہو سکتا ہے تو کھلی ہوئی مچھلی کا اصول اور بھی زیادہ چیزوں پر عائد
ہوتا ہے ۔ اس کی تو بین الاقوامی اور عالمگیر حیثیت ہے ۔

۱۴۹۲ء میں امریکہ کھلی ہوئی مچھلی نہیں تو اور کیا تھا کولمبس نے اس کے اندر اسپین کا جھنڈا گاڑ کے اپنے بادشاہ اور ملکہ
کی طرف سے اس پر قبضہ کر لیا ۔ زار روس کے لیے پولینڈ کیا تھا ؟ ترکوں کے لیے یونان ، انگلستان کے لیے ہندوستان ؟ آخر کار امریکہ
کے لیے میکسیکو کیا چیز ہو گا ؟ یہ سب کھلی ہوئی مچھلیاں ہیں ۔

انسانی حقوق اور دنیا کی آزادیاں اگر کھلی ہوئی مچھلیاں نہیں تو اور کیا ہیں ؟ انسانوں کے ذہن اور ان کی رائیں کھلی ہوئی
مچھلیاں نہیں تو اور کیا ہیں ؟ ان کے اندر مذہبی عقیدے کا اصول کھلی ہوئی مچھلی نہیں تو اور کیا ہے ؟ نمائش پسند اور چوری رکھنے والوں کے لیے
مفکروں کے خیالات کھلی ہوئی مچھلیاں نہیں تو اور کیا ہیں ؟ خود یہ کرۂ زمین کھلی ہوئی مچھلی نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور معزز ناظرین آپ
بیک وقت کھلی ہوئی مچھلیاں اور چمٹی ہوئی مچھلیاں نہیں تو اور کیا ہیں ؟

اتنے میں ایک شکاری بیٹھک سے باہر نکل آیا۔ وہ چست قد اور گورے رنگ کا آدمی تھا لیکن بڑی کپتان کے لباس سے پکا رومن کیتھولک لگتا تھا۔ جو بال اس کی ٹوپی کے نیچے سے نکل رہے تھے، اور وہاں مخمل کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا، گھڑی کی زنجیریں جس پر لٹکی ہوئی تھیں۔ گرین ہل والے نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے اسٹبٹ کا تعارف کرایا اور خود نوجوان ہی بیٹھا۔

وہ بولا: "میں اس سے پہلے کیا کہوں؟"

اسٹبٹ نے مخمل کی واسکٹ، گھڑی اور زنجیروں کو دیکھتے ہوئے کہا: "میں کسی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا قائل نہیں لیکن جو تم پہلے ہی کہہ رہے ہو کہ وہ کیا مجھے تو یہ شخص بھی سا لگتا ہے۔"

گرین ہل والے نے اپنے کپتان سے فرانسیسی میں کہا: "یہ کہتے ہیں کہ ابھی کل ہی یہاں ایک جہاز ملا تھا جو ایک مری ہوئی وہیل کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اس جہاز کا کپتان، چیف میٹ اور چھ جہازی بخار میں مبتلا ہو کے مر گئے۔"

یہ بات سن کے کپتان چونک پڑا اور اسے اشتیاق ہوا کہ اور باتیں معلوم ہوں۔

"اب کیا کہوں؟" گرین ہل والا اسٹبٹ سے بولا:

"یہ تو ساری باتیں بڑی چاؤ سے سن رہا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ وہ اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ چاہے بندر میں کپتان بننے کی اہلیت ہو، مگر اس میں نہیں ہے۔ اس سے میری طرف سے کہہ دو کہ یہ تو لنگور لگتا ہے۔"

"جی، یہ تو قسم کھا کے کہتے ہیں کہ وہ دوسری وہیل جو خشک ہو گئی ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ان کا مشورہ تو یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی جان پیاری ہے تو ان مچھلیوں کو جہاز سے الگ کر دیا جائے۔"

کپتان فوراً بھاگ کے جہاز کے اگلے حصے میں گیا اور جہازیوں کو حکم دیا کہ رسیاں تراش ڈالیں بلکہ جن زنجیروں میں وہیلیں بندھی ہوئی تھیں انہیں کھول دیں۔

کپتان ان لوگوں کے پاس واپس آیا تو گرین ہل والا بولا: "اب کیا کہوں؟"

"اچھا، ٹھہرو، سوچتا ہوں۔ ہاں، اس سے کہہ دو کہ ــــــ کہ ــــــ کہ وہ کہ تم لنگور ہو، اور دوسرا بھی ایک اور لنگور ہے۔"

"جناب، یہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی جو خدمت کی ہے اس کی مجھے بہت خوشی ہے۔"

یہ سن کر کپتان نے کہا کہ نہیں، احسان مند تو ہم ہیں۔ اس کے بعد اس نے اسٹبٹ کو اپنے کمرے میں آکر شراب پینے کی دعوت دی۔

نوجوان بولا: "یہ چاہتا ہے کہ تم اس کے ساتھ جاکے شراب پیو۔"

"میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کرو اور کہہ دو کہ میں نے جس آدمی کو لنگور بنایا ہو اس کے ساتھ شراب پینا میرے اصول کے خلاف ہے، بلکہ کہہ دو اب میں چلتا ہوں۔"

"جناب، یہ کہتے ہیں کہ شراب پینا میرے اصول کے خلاف ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اگر آپ شراب پینے کے لیے ایک دن

اور نہ وہ رہنا چاہتے ہیں تو چاروں کشتیوں کو اتاریں اور جہاز کو وہلوں کے پاس سے ہٹا لے جائیں کیونکہ جہاں ہمیں خاموشی ہے کہ یہ خود ہی بہیں گے۔

اسٹب جہاز کی دیوار پر چڑھ چکا تھا اور اپنی کشتی میں اتر رہا تھا۔ اس نے چلا کے کہا کہ وہ اپنے ساتھ میری کشتی میں ایک جست بھی ڈال دو ہے۔ ہم بھی ہماری مدد کرو گے اور وہل کو جہاز کے پاس سے کھینچ لو گا۔ فرانسیسی کشتیاں تو جہاز کو ایک جانب دھکیلنے لگیں، اور اسٹب بانس کا مظاہرہ کرتے ہوئے دور کی سمت میں دھیں کے وہل کو دوسری طرف کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ہوا تیز ہو گئی۔ اسٹب نے کچھ ایسا ظاہر کیا جیسے وہل سے الگ ہو گیا ہو۔ فرانسیسی جہاز نے اپنی کشتیاں اٹھا لیں اور آگے نکل گیا۔ اس دوران میں پیکوڈ فرانسیسی جہاز اور اسٹب کی وہل کے درمیان آ گیا۔ اسٹب جلدی سے تیرتی ہوئی لاش کے پاس پہنچا اور چاقو کے ٹکڑے وہلوں کو بتایا کہ میری نیت کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فوراً اپنے بیان اور چاقو کی مدد سے کام اٹھانے میں مشغول ہو گیا۔ پھر تیز کسا اٹھا کے اس نے وہل کے پیٹ کے پاس ایک گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سمندر میں خندق کھود رہا ہو۔ اور آخر کار جب اس کا کسا تعفن بھری پسلیوں سے ٹکرایا تو ایسا لگا جیسے انگلستان میں زرخیز مٹی کے نیچے سے رومن کے زمانے کے برتن نکالے جا رہے ہوں۔ اس کی کشتی کے ملاح بھی جوش میں آ گئے تھے اور جی جان سے اس کی مدد کر رہے تھے اور انہیں ایسا اشتیاق ہو رہا تھا جیسے سونا ڈھونڈنے والوں کو ہوتا ہے۔

وہلوں کے چاروں طرف بے شمار پرندے غوطے لگا رہے تھے۔ چونچیں مار رہے تھے شور مچا رہے تھے اور آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسٹب مایوس ہو چلا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ بو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اتنے میں اس بدبو کے اندر سے اچانک خوشبو کی ایک ہلکی سی لہر آئی جو بدبو کے طوفانوں میں سے گزر رہی تو ضرور لیکن اس میں جذب نہ ہوئی —— جیسے کوئی دریا کسی اور دریا میں گر کے پھر الگ ہو جائے لیکن اس میں ملنے نہ پائے۔

"مل گئی، مل گئی!" اسٹب خوشی کے مارے چلا اٹھا کیونکہ وہل کے اندر اس کا کسا کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ "عنبر! عنبر!"

اپنا کسا پھینک کے اس نے دونوں ہاتھ اندر ڈال دیئے اور مٹھی بھر بھر کے کوئی چیز باہر نکالنے لگا جو پنیر جیسی تھی یا پرانے پنیر کی طرح لگتی تھی، اور بہت چکنی اور خوشبودار تھی۔ اس میں آپ انگوٹھے سے بآسانی سوراخ کر سکتے ہیں، اور اس کا رنگ بادامی مائل زرد ہوتا ہے۔ یہ وہ عنبر ہے، جو عطار کے یہاں ایک اشرفی فی اونس کے حساب سے بکتی ہے۔ اس وہل میں سے چھ مٹھی عنبر نکلا لیکن اس سے بھی زیادہ سمندر میں ضائع ہو گیا ہوگا۔ بلکہ شاید اور بھی زیادہ مل جاتا لیکن بے چین اہاب نے اسٹب کو پکار کے کہا کہ اب یہ جھگڑا ختم کرو اور جہاز پر آ جاؤ، ورنہ ہم تمہیں چھوڑ کے چل دیں گے۔

بدبو آتی ہے۔ اس گھناؤنے جسم کی بنا کیسے ہوئی!

میری دانست ہے کہ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب دو صدی پیشتر گرین لینڈ کے شکاری جہاز چل کر لندن آتے تھے۔ یہ لوگ جنوب کے شکاریوں کی طرح تیل کو سمندر میں نہیں پگھلاتے، بلکہ چربی کو کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا لیتے ہیں اور پیپوں میں ڈال کر گھر لے آتے ہیں۔ برفیلے سمندروں میں شکار کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے اور بہت طوفان آنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب گودی کھول کر پیپوں کو قبرستان سے باہر نکالا جاتا ہے تو ایسی بدبو اٹھتی ہے جیسے شہر کا پرانا قبرستان کھود کر زچاؤں کے ہسپتال کی بنیاد رکھتے وقت۔

پھر ایک اور قیاس ہے کہ وہیل پر یہ نامعقول الزام اس وجہ سے لگا کہ پرانے زمانے میں گرین لینڈ کے ساحل پر ولندیزیوں کا ایک گاؤں آباد تھا جس کا نام اسمیرن برگ تھا۔ مشہور عالم فوگو فان سلنگ نے خوشبوؤں کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں گاؤں کا یہی نام بتایا ہے۔ ڈچ زبان میں اسمیر کے معنی ہیں چربی اور برگ کے معنی ہیں [illegible]، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ گاؤں اس لیے بسایا گیا تھا کہ ولندیزی جہاز چربی یہاں لاکر پگھلائیں، اور اسے گھر نہ لے جانا پڑے۔ یہ گاؤں کیا تھا اچھا خاصا بھٹیوں اور پیپوں کا جنگل تھا۔ جس وقت یہ کاروبار زوروں پر تھا وہاں سے کام کرنے والوں کو کوئی اچھی خوشبو نہیں آتی تھی۔ لیکن جنوب کے شکاری جہازوں کا معاملہ مختلف ہے۔ چار سال کے سفر میں یہ جہاز کوئی بیاسی دن تیل پگھلانے میں صرف کرتے ہیں، اور سارا تیل کوٹھری میں بھر لیتے ہیں۔ جس حالت میں وہ تیل پیپوں میں بھرا جاتا ہے اس وقت تیل میں کسی قسم کی بو نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہیل چاہے زندہ ہو یا مر گیا ہو، اگر اس کے ساتھ خراب سلوک کیا جائے تو وہ کسی طرح بھی بدبودار نہیں ہوتی۔ سناہے وہیل کے شکاریوں کو سونگھ کر پہچان سکتے ہیں جیسے ازمنہ وسطیٰ میں لوگوں کو یقین تھا کہ یہودیوں کو بو سے پہچان سکتے ہیں۔ پھر وہیل کی صحت تو نہایت اچھی ہوتی ہے۔ وہ خوب ورزش کرتی ہے اور ہمیشہ گھر سے باہر رہتی ہے۔ اس کے بدن سے بدبو کیسے آ سکتی ہوگی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، جب وہیل پانی کے اوپر آتی ہے تو اس میں سے ایسی خوشبو اٹھتی ہے جیسے گرم کمرے میں کسی عطر بیز خاتون کے لباس کی سرسراہٹ سے۔ تو پھر اس کی جسامت کا خیال رکھتے ہوئے میں وہیل کو خوشبو کے اعتبار سے کس چیز سے تشبیہ دوں؟ میرے خیال میں تو مشہور و معروف ہاتھی مناسب رہے گا جو خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا، دانتوں میں زیور پہنے سکندر اعظم کے اعزاز میں ایک ہندوستانی شہر کے باہر لایا گیا تھا۔

اس ہنگامے جھگڑے میں کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اسٹب کی کشتی کے ایک پتوار چلانے والے کی کلائی میں موچ آگئی، اور وہ فی الحال بالکل بےکار ہوگیا۔ چنانچہ وقتی طور پر پپ کو اس کی جگہ بٹھا دیا گیا۔

جب وہ وہیل باکشتی میں اترا تو پپ کو بڑا ڈر لگا لیکن خوش قسمتی سے وہ اس دفعہ وہیل کے قریب پہنچنے سے بچ گیا چنانچہ وہ کچھ ایسا برا نہیں رہا لیکن اسٹب اسے دیکھتا رہا تھا جس میں اس نے احتیاطاً پپ کو تنبیہ کی کہ اپنی ہمت مضبوط رکھو، خدا جانے کب ضرورت پیش آجائے۔

جب کشتی دوسری دفعہ اتری تو وہ وہیل کی طرف چل چل کے بڑھا چلا گیا، اور اس نے حسب معمول دُم کی زد میں بچا دی۔ اتفاق سے بچارے پپ کی نشست کے نیچے پڑی، وہ ایک دم سے اتنا پریشان ہوا کہ پتوار ہاتھ میں لیے کشتی میں سے کود پڑا اور کچھ اس طرح کہ ڈھیلی ڈور اس کے سامنے آئی تو اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کے لے گیا، اور جب پانی میں گرا تو اس میں الجھ چکا تھا۔ اتنے میں زخمی وہیل دیوانہ وار دوڑ پڑی اور ڈور کھنچ بھی گئی۔ پپ کے سینے اور گردن میں ڈور کے کئی چکر لپٹ چکے تھے، وہ بچارا ابھرتی ہوئی لہروں میں ڈور کے ساتھ ساتھ کشتی کی طرف کھنچا چلا آیا۔

تاشتگو کمانے میں کھڑا تھا اس وقت وہ شکار کے جوش میں تھا ویسے بھی اسے پپ سے نفرت تھی اور اسے بالکل ہیرو سمجھتا تھا۔ اس نے غلاف میں سے چاقو نکال لیا، اور اس کی تیز دھار ڈور کے اوپر رکھ کے اسٹب سے پوچھنے لگا ——— "کاٹ دوں؟" اُدھر پپ کا دم گھٹ رہا تھا اور اس کا نیلا چہرہ صاف یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ خدا کے لیے جلدی کاٹو۔ یہ ساری باتیں آنکھ جھپکنے میں ہوگئیں اور حادثے میں بھی دو منٹ لگا ہوگا۔

"لعنت اس پر، کاٹ دو۔" اسٹب نے چیخ کے کہا۔ چنانچہ وہیل ہاتھ سے نکل گئی اور پپ کی جان بچ گئی۔

بچارا حبشی ہوش میں آیا ہی تھا کہ اس پر ہر طرف کے ملاحوں کی پھٹکار پڑنے لگی۔ اسٹب چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ یہ ہجوم ذرا ختم ہو تو اس نے بڑے کاروباری لہجے میں، لیکن اپنے نیم ظریفانہ انداز کے ساتھ، چلتے چلتے سرکاری طور پر پپ کو گالیاں دیں۔ اس کے بعد غیر سرکاری طور پر نہایت مفید مشورے دیے۔ اس ہدایت کا خلاصہ یہ تھا کہ پپ کشتی میں سے کبھی نہ کودو، سوائے اس وقت کے ——— لیکن باقی نصیحت بالکل مبہم رہی جیسے کہ معقول نصیحت ہمیشہ ہوا کرتی ہے۔ وہیل کے شکار میں عام طور سے اصول یہ ہے کہ کشتی ہی میں رہو، لیکن بعض حالات میں کشتی سے کود پڑنے کا اصول اور بھی اچھا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں شاید اسٹب نے محسوس کیا کہ اگر میں نے پپ کو ایمانداری کے ساتھ سچا اور بے میل مشورہ دیا تو آئندہ اس کے کود پڑنے کا امکان بہت باقی رہے گا۔ لہٰذا اس نے دفعتاً نصیحت کو الگ رکھا اور بڑا تاکیدی حکم نافذ کر دیا ——— "پپ بس اب کشتی ہی میں رہنا۔ اگر اب کے کودے تو خدا کی قسم میں تمہیں نہیں نکالوں گا۔ یاد رکھنا، تم جیسے لوگوں کے لیے ہم وہیلیں ضائع نہیں کر سکتے۔ وہیل تم سے تیس گنی زیادہ قیمت رکھتی ہے، پپ یہ بات یاد رہے۔ آئندہ کشتی میں سے کبھی نہ کودنا۔" یہاں شاید اسٹب اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ انسان اپنے ساتھیوں سے محبت تو کرتا ہے لیکن انسان پیسے بنانے والا جانور ہے، اس لیے یہ میلان اس کی رحم دلی کے راستے میں اکثر حائل ہوتا رہتا ہے۔

لیکن ہم سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ پپ کشتی میں سے ایک بار پھر کود پڑا۔ اس دفعہ بھی وہی حالات رونما ہوئے

تھے جو چل رہے تھے لیکن اس بار وہ دور دور کو ساتھ لے کے نہیں گیا چنانچہ جب وہیل نے جاگنا شروع کیا تو پپ وہیں سمندر میں پیچھے رہ گیا جیسے کوئی مسافر جلدی میں اپنا صندوق چھوڑ جائے۔ افسوس! اسٹب نے جو کہا تھا اس پر حرف بحرف عمل کیا۔ یہ دن بڑا خوبصورت اور نیلا تھا اور پپ اپنا سمندر چاروں طرف نہایت نیلاہٹ سے بکھرا ہوا تھا۔ سمندر میں سکون اور ٹھنڈا تھا اور اس پر ستارے سے تاج رہے تھے۔ پانی بالکل ہموار افق تک اس طرح پھیلا ہوا لگتا تھا جیسے کسی سنار نے سونے کے پترے کی کھال یہاں سے وہاں تک پھیلا دی ہو۔ سمندر میں پپ کا سیاہ سر لونگ جیسا دکھائی دیتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے سمندر میں لونگیں لگی ہوں۔ جب وہ پانی میں گرا تو اب کے اس کی مدد کے لیے کوئی چاقو نہیں اٹھا۔ اسٹب نے بڑی بے رحمی سے منہ پھیر لیا اور وہیل کا پیچھا کرنے لگا۔ تین منٹ کے اندر اندر پپ اور اسٹب کے درمیان پورے ایک میل کا فاصلہ ہو گیا۔ سمندر کے بیچ میں بیچارے پپ نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا سیاہ سر پانی میں سے نکال کے سورج کی طرف اٹھا رکھا تھا جو سب سے بلند اور سب سے چمکدار سہی لیکن تنہا ہے اور اسے بھی کشتی میں سے اٹھا کے پھینک دیا گیا ہے۔

موسم پرسکون ہو تو تجربہ کار تیراک کے لیے کھلے سمندر میں تیرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا خشکی پر گاڑی میں چلنا۔ لیکن سمندر کی خوفناک تنہائی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ان بے رحم چاروں کے درمیان آدمی خود اپنے اندر مرکوز ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہ اذیت بیان سے باہر ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب جہازی پرسکون سمندر میں نہاتے ہیں تو اپنے جہاز کے نزدیک رہتے ہیں اور اس کے چاروں طرف تیرتے ہیں۔

لیکن کیا اسٹب نے بیچارے حبشی کو واقعی قسمت کے حوالے کر دیا تھا؟ نہیں کم سے کم اس کی نیت یہ تو نہیں تھی۔ پپ کے پیچھے پیچھے دو کشتیاں چلی آ رہی تھیں اور اسٹب کا خیال تھا کہ وہ جلدی ہی پپ کے پاس پہنچ کے اسے اٹھا لیں گی۔ اگرچہ کوئی تیر چلانے والا خود اپنی بزدلی کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا ہو تو عام طور پر اس قسم کے حالات میں شکاری لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس پیشے میں جس آدمی کو بزدل سمجھا جائے اسے بالکل ویسی ہی بے رحمانہ حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جیسے فوج میں۔

لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کشتیوں نے پپ کو دیکھا ہی نہیں بلکہ اچانک وہیلیں نظر آئیں تو کشتیاں رخ بدل کے ان کے پیچھے چل دیں۔ اسٹب کی کشتی اب بہت دور نکل چکی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی اپنی وہیل کے پھیر میں پڑے ہوئے تھے چنانچہ پپ کا افق وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ آخر کار خود جہاز نے اس کی جان بچالی لیکن اس دن سے یہ حبشی ہوش سے پاگل ہو کے چپکے لگا کم سے کم لوگ تو یہی کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ سمندر نے اس کے ساتھ عجب مذاق کیا تھا یعنی اس کے محدود جسم کو تو ابھار کے رکھا لیکن اس کی لامحدود روح کو ڈبو دیا مگر پوری طرح ڈبو یا بھی نہیں بلکہ اسے جیتے جاگتے ان حیرت انگیز گہرائیوں میں لے گیا جہاں اس کی بے حرکت آنکھوں کے سامنے دنیا کے قدیم ترین اور غیر مسخ شدہ زمانے کی عجیب و غریب شکلیں ادھر سے ادھر تیرنے لگیں۔ اس کی گہرائیوں میں پری نما دانشمندی نے اس کے لیے اپنے خزانے دکھائے اور ان بے رنگ، ہنگل اور [illegible] کے درمیان پپ نے خدا کی طرح ہر جگہ موجود رہنے والے مونگے کے کیڑے دیکھے جو پانیوں کے آسمانوں میں بڑے بڑے ستارے اٹھانے کے لیے چلے جا رہے تھے۔ اس نے تقدیر کو تانا بانا بنتے دیکھا اور اس سے ملاقات بھی کی چنانچہ اس کے ساتھی اسے دیوانہ کہنے لگے۔ غرض وہ جس چیز کو انسان دیوانگی سمجھتے ہیں وہ آسمانوں کی سوجھ بوجھ ہے۔ فانی عقلمندی سے چل کے انسان آخر کار ایک ایسے آسمانی خیال تک آ پہنچتا ہے جو عقل کو مہمل اور مجنونانہ معلوم ہوتا ہے لیکن خوشی ہو یا رنج وہ شخص اپنے آپ کو ہر بات سے بے تعلق اور اپنے خدا کی طرح بے نیاز محسوس کرتا ہے۔

بہرحال اسٹب کو زیادہ الزام نہ دیجئے۔ وہیل کے شکار میں یہ بات عام ہے۔ اس کہانی کے خاتمے پر آپ دیکھیں گے کہ اسی قسم کا واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔

باب - ۹۴
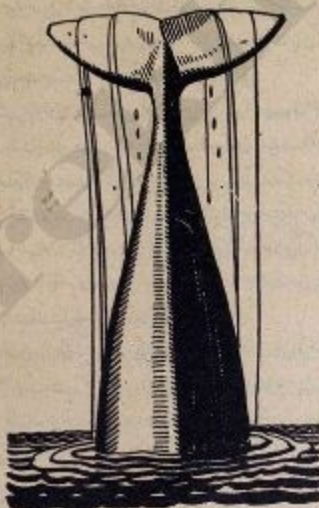
مصافحہ

اسٹب کی وہیل جو اتنی مہنگی پڑی تھی، جہاز کے پاس لائی گئی، اور اسے اوپر کھینچنے اور کاٹنے کی وہ ساری کارروائیاں انجام دی گئیں جن کا بیان ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ ہیڈل برگ ٹن کو بھی خالی کر دیا گیا۔

کچھ لوگ تو اس کام میں مصروف تھے، اور باقی لوگ یہ خدمت انجام دے رہے تھے کہ روغن کی ناندیں جیسے ہی بھرتی اُنھیں کھینچ لے جائیں۔ جب وقت آیا تو اس روغن کو پگھلانے کے لیے بڑی احتیاط سے تیار کیا گیا۔ پگھلانے کا بیان بھی آگے چل کے ہوگا۔

روغن ٹھنڈا ہو کے اس بری طرح جم گیا تھا کہ جب میں دوسرے لوگوں کے ساتھ روغن کے ایک بہت بڑے حوض کے سامنے بیٹھا تو دیکھا کہ کچھ حصہ تو ابھی سیال ہے، لیکن باقی ٹکڑوں کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے جو ادھر ادھر تیر رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ تھا کہ ان ٹکڑوں کو نچوڑ کے پھر سیال میں تبدیل کر دیں۔ بڑا ہی شیریں اور مزے کا کام ہے! کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پرانے زمانے میں یہ روغن خوشبو کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ہاتھ ڈوب جاتے تو کتنی صفائی، شیرینی، خوشبو، ملائمت اور نرمی پیدا ہوتی ہے! میرے ہاتھ روغن میں بس دو چار منٹ ہی دبے ہوں گے کہ میری انگلیاں ایسی لگنے لگیں جیسے بام مچھلیاں، اور انھوں نے گویا سانپ کی طرح لہرانا شروع کر دیا۔

آسمان نیلا اور پرسکون تھا اور جہاز بادبان پھیلائے مزے مزے میں چلا جا رہا تھا۔ میں جو غوطے لگاتے لگاتے تھک چکا تھا اور اب عرشے پر آرام سے پالتی مارے بیٹھا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں روغن کے تمام ملائم گولے ان پگھلے تھے۔ میں انھیں انگلیوں میں سے گزارتا تو ان ملائم ہوتے گولوں میں سے پھوار سی چھوٹتی جیسے پکے انگوروں میں سے شراب نکل رہی ہو، یہ بے میل خوشبو بالکل ایسی تھی جیسے بہار کے موسم میں بنفشے کے پھولوں کی مہک۔ میں سچ کہتا ہوں، اس وقت تو مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مشک بار سبزہ زار میں بیٹھا ہوں۔ ہم لوگوں نے جو خوفناک قسم کھائی تھی میں اسے بالکل بھول گیا۔ اس بے مثال روغن میں اسے اپنے ہاتھوں اور اپنے دل پر سے دھو ڈالا۔ مجھے تو اس پرانے توہم پرستانہ عقیدے پر یقین سا آ چلا کہ روغن میں غصے کی گرمی کو کم کرنے کی خاصیت ہے۔ اس روغن میں نہاتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں ہر طرح کے بغض، عناد اور عداوت سے پاک ہو گیا ہوں۔

——— نچوڑو! نچوڑو! نچوڑو! صبح کا سارا وقت اسی میں گیا۔ میں روغن نچوڑتا رہا، یہاں تک کہ قریب قریب خود بھی اسی میں گھل گیا۔ میں روغن نچوڑتا رہا یہاں تک کہ میرے اوپر ایک عجیب قسم کی دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں بے اختیاری کے عالم میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ہاتھوں کو نرم نرم گولے سمجھ کر انھیں دبا رہا ہوں۔ یہ کام کرتے کرتے میرے اندر پیار، محبت اور دوستی کا ایسا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ آخر میں تو ان کے ہاتھ دبانے لگا اور ایک جذباتی انداز سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہوں۔

آہ! میرے عزیزو! ہم جنسو! ایک دوسرے کے خلاف دل میں کینہ یا حسد یا کدورت کیوں رہے؟ آؤ، ہم سب ایک

دوسرے کے ہاتھوں دبائیں بلکہ آؤ ایک دوسرے کے اندر گھل مل جائیں۔ آؤ ہم سب مل کے انسانیت اور ہمدردی کے روغن میں تحلیل
ہو جائیں۔

کاش کہ میں ہمیشہ ہمیشہ روغن ہی نچوڑتا رہتا! طول طویل اور متواتر تجربات کے بعد جا کر یہ حقیقت میری سمجھ میں آئی ہے کہ انسان کو اونچی
کے اونچے اونچے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ پانسے جو پھینکتے ہیں اور پھر وہی چنے کی کھاتے ہیں۔ خوشی نہ تو دماغ کے فیصلے سے ملتی ہے
نہ تخیل کے ذریعے، بلکہ بال بچوں میں ہے، گھر بار میں، دل میں، بستر پہ، دستر خوان پہ، گھوڑے کی پیٹھ پر یا دیہات میں۔ اب یہ ساری
باتیں میری سمجھ میں آگئی ہیں تو میں ہمیشہ ہمیشہ روغن نچوڑتے رہنے کو تیار ہوں۔ رات کو خواب میں بھی مجھے جنت میں فرشتوں کی لمبی لمبی
قطاریں وہیل روغن کے مرتبان میں ہاتھ ڈالے نظر آتی ہیں۔

اچھا اب روغن کا ذکر چلا ہے تو دو ایک اور چیزوں کا بھی بیان ہو جانا چاہیے جن کا تعلق روغنی وہیل کو پگھلانے کے لیے تیار کرنے
کے کام سے ہے۔

سب سے پہلے وہ چیز آتی ہے جسے سفید گھوڑا کہتے ہیں۔ یہ وہیل کے لمبوترے حصے اور دم کی موٹی تہوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس
ٹکڑے کی رگیں جم کے سخت ہو جاتی ہیں اور ایک تھکا سا بن جاتا ہے۔ پھر بھی اس میں سے تھوڑا بہت تیل ضرور نکلتا ہے۔ اس ٹکڑے
کو وہیل میں سے الگ کرنے کے بعد اسے مستطیل ٹکڑوں میں کاٹ لیتے ہیں تاکہ قیمہ کرنے کی مشین کے پاس لے جانے میں آسانی ہے۔
یہ ٹکڑے سنگ مرمر کے تختوں کی طرح لگتے ہیں۔

وہیل کے گوشت کے کچھ حصے چربی کے کمبل میں ادھر ادھر چپکے رہتے ہیں اور بعض دفعہ تیکھے بھی ہوتے ہیں۔ انہیں اصطلاح میں
پلم پڈنگ کہا جاتا ہے۔ یہ چیز دیکھنے میں بڑی تر و تازہ، خوشگوار اور حسین ہوتی ہے۔ اس کی سطح کچھ ایسی لگتی ہے جیسے سترنگی دھاریوں والا
منقش کپڑا —— سفید اور سنہری زمین، اوپر سے قرمزی اور سرخ چھینٹیاں اور دھاریاں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نارنگی
رنگ کی تصویر میں لعل و یاقوت کے گل بنے ہوں۔ آپ کی عقل کتنا ہی منع کرے لیکن جی چاہتا ہے کہ اسے کھائیں۔ سچ ہی کیوں نہ
کہ دوں، ایک دفعہ میں نے مستول کے پیچھے چھپ کر اسے چکھا تھا۔ اس کا مزا کچھ ایسا تھا جیسے فرانس کے بادشاہ موٹے لوئی کی ران
میں سے گوشت کاٹ کر شاہی کباب بنایا گیا ہو —— لیکن ہرن کے شکار اور انگور کی شراب کے موسم میں۔

اس کام کے دوران میں ایک اور بہت عجیب و غریب قسم کی چیز ہاتھ آتی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا اسے بیان کس طرح کروں۔
اسے سلوب گولین کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام وہیل کے شکاریوں نے رکھا ہے اور یہ چیز ہے بھی اتنی ہی انوکھی۔ یہ ایک بھورے رنگ دار چپچپاتی
ہوئی سی چیز ہوتی ہے اور جب بہت دیر سے روغن کو نچوڑ نچوڑ کے پیپوں میں بھرتے ہوں تو ٹب کے اندر سے ملتی ہے۔ میرا خیال
ہے کہ یہ عنبر کی پتلی پتلی ٹوٹی ہوئی رگیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے جڑ جاتی ہیں۔ ایک اور چیز ہے جسے گری کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح
دراصل رائٹ وہیل کے شکاریوں کی ہے لیکن اتفاق سے روغنی وہیل کے شکاری بھی کبھی کبھی استعمال کر لیتے ہیں۔ اس سے مراد وہ سیاہ

چپ دار مادہ ہے جو اٹھ ویل کی کمر پہ سے کھرچا جاتا ہے، اور ان گشتی جہازوں کے عرشے پر پڑا رہتا ہے جو اس گھناؤنی مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں ——

چھوٹا: در اصل یہ لفظ ویل کی اصطلاحات سے کوئی فوری علاقہ نہیں رکھتا لیکن چونکہ شکاری لوگ استعمال کرتے ہیں، لہٰذا ان میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ریشہ دار ٹکڑا ہوتا ہے جو ویل کی دُم کے پچھلے حصے میں سے کاٹا جاتا ہے اوسطاً اس کی موٹائی کوئی ایک انچ بھر ہوتی ہے، اور لمبائی چوڑائی کھرپے کے برابر۔ اسے جہاز نے پھسلانے کا کچھ ایسا ڈھنگ آتا ہے کہ اگر اسے چکنے عرشے پر چپٹے کی جھاڑو کی طرح چلایا جائے تو ساری گندگی کو اپنے ساتھ کھینچ لیے چلا جاتا ہے جیسے جادو کے زور سے۔

لیکن ان سب دقیق اور پیچیدہ معاملات سے واقف ہونے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ چربی کی کوٹھری میں اتر جائیں اور وہاں کے رہنے والوں سے لمبی چوڑی گفتگو کریں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب کمبل کے ٹکڑوں کو کاٹ کر ویل سے الگ کر لیا جاتا ہے تو انھیں یہاں رکھتے ہیں۔ جب ان ٹکڑوں کو کاٹنے کا وقت آتا ہے تو یہیں کا منظر ناتجربہ کار لوگوں کے لیے بڑا ہولناک ہو جاتا ہے، خصوصاً رات کے وقت۔ کوٹھری کے ایک حصے میں کام کرنے والوں کے لیے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے اور یہاں ایک گندی سی لالٹین جلتی رہتی ہے۔ کام کرنے والے عموماً دو دو کی جوڑی بناتے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں پھاوڑا ہوتا ہے، دوسرے کے ہاتھ میں سلاخ اور کُدال۔ یہ شخص چربی کے تختے میں کُدال گاڑ کے اسے وہیں بھینچے رکھتا ہے تاکہ جہاز ہچکولے کھائے تو چربی کا ٹکڑا پھسلنے نہ پائے۔ ادھر دوسرا آدمی تختے کے اوپر کھڑے ہو کے پھاوڑے سے اس کے قتلے کرنے لگتا ہے۔ یہ پھاوڑا بڑا تیز ہوتا ہے، پھر یہ آدمی ننگے پاؤں رہتا ہے، اور جس چیز پر کھڑا ہوتا ہے وہ بعض دفعہ نیچے سے اس طرح پھسل جاتی ہے جیسے برف کی گاڑی۔ لہٰذا اگر وہ اپنی یا اپنے ساتھی کے پیر کی انگلیاں کاٹ لے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ پرانے چربی کاٹنے والوں کے پیر کی انگلیاں اکثر غائب ہوتی ہیں۔

باب ۔ ۹۵

عبا

جس وقت وہیل کی چیر پھاڑی ہو رہی تھی، اگر آپ پیکوڈ کے عرشے پر ٹہلتے ہوئے چرخی کی طرف نکل جاتے تو آپ کو پچھلے پرنالے کے قریب ایک عجیب و غریب اور پراسرار چیز پڑی ہوئی نظر آتی۔ وہیل کے زبردست سر میں وہ حیرت انگیز حوض، نیچے کا کھلا ہوا ہیبت ناک جبڑا، دُم کے تناسب کا معجزہ ـــــ ان سب چیزوں کو دیکھ کر تو آپ کو تعجب ہوتا ہی ہے لیکن اس ناقابلِ فہم اور مخروطی شکل کے تودے کو ایک چیز نہیں پہنچتی ـــــ جیسے لمبے آدمی سے بھی زیادہ اونچی، نیچے سے ایک فٹ کا قطر، کوئی کوئیگ کے آبنوسی بت کی طرح سیاہ اور واقعی یہ بھی بت ہی تھا یا یوں کہیے کہ پرانے زمانے میں اس کی شبیہ کا بت ہوتا تھا۔ اسی قسم کا ایک بت یہودا کی ملکہ معکہ کے خفیہ باغ میں ملا تھا جس کی پرستش کی وجہ سے اس کے بیٹے آسا نے ملکہ کو تخت سے اتار دیا اور اس بت کو ایک گندی چیز سمجھ کر قدرون کے چشمے کے کنارے جلوا دیا۔ یہ سارا قصہ کتاب سلاطین کے پندرھویں باب میں لکھا ہے۔

اب ایک آدمی آتا ہے جسے قیمہ کوٹنے والا کہتے ہیں، اس کے ساتھ دو مددگار اور ہیں۔ وہ اس بت کو اٹھا کے کندھوں پہ رکھ لیتا ہے اور اس طرح لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے جیسے میدانِ جنگ میں کوئی سپاہی اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کے جا رہا ہو۔ اسے عرشے پہ رکھ کے وہ اس کی کھال گول گول اتارنے لگتا ہے جیسے افریقہ میں شکاری اژدہے کی کھال اتارتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اسے پتلون کے پائنچے کی طرح الٹ دیتا ہے اور خوب کھینچتا ہے تاکہ اس کا قطر دگنا ہو جائے۔ پھر اسے سوکھنے کے لیے رسیوں پہ ٹانگ دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اتار کے نوک والی طرف سے کوئی تین فٹ کا حصہ الگ کر دیتا ہے اور دوسری طرف بازوؤں کے لیے دو سوراخ بنا کے اس کھال کو پہن لیتا ہے۔ اب قیمہ کوٹنے والا اپنے پیشے کی عبا پہنے آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ یہ رواج نہ معلوم کب سے چلا آ رہا ہے۔ جب یہ شخص اپنے کام میں مصروف ہوگا تو یہ لباس اس کی حفاظت کرے گا۔

اس کا کام چربی کے تنوں کو قیمہ کر کے پگھلانے کے لیے تیار کرنا ہے۔ یہ کارروائی لکڑی کے ایک عجیب و غریب گھوڑے پر انجام دی جاتی ہے جو پٹے سے لگا رکھا رہتا ہے اور نیچے ایک بہت بڑی ناند ہوتی ہے جس میں کٹے ہوئے ٹکڑے اتنی تیزی سے گرتے جاتے ہیں جیسے کوئی خطیب اپنی تقریر میں کھو جائے تو اس کے ہاتھ سے کاغذ کے ورق۔ اگر گوشت کے ٹکڑے پتلے پتلے کاٹے جائیں تو پگھلانے میں آسانی رہتی ہے اور تیل بھی اچھا نکلتا ہے چنانچہ اس کے ساتھی قیمہ کوٹنے والے سے کہتے جاتے ہیں کہ اتنے پتلے ٹکڑے کاٹو جیسے انجیل کے ورق۔ غرض یہ شخص سیاہ رنگ کی عبا میں ملبوس ہے۔ اس کے پاس ایک منبر بھی ہے اور اسے انجیل کے ورقوں کا بھی خیال ہے۔ اسقف یا پوپ بنانے کے لیے اس سے اچھا آدمی اور کون ملے گا!

ـــــــــــ

باب ۔ ۹۶

بھٹی

کشتیاں تو سارے ہی شکاری جہازوں کے چلوں میں لگی ہوتی ہیں، لیکن امریکی جہاز کی شناخت یہ ہے کہ اس میں بھٹی بھی ہوتی ہے۔ اس جہاز کی ایک اصل بے جوڑ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو جہاز شاہ بلوط کے تختوں اور سن کی رسیوں سے بنا ہے، دوسری طرف اینٹ کی چنائی بھی موجود ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اینٹوں کا بھٹہ میدان میں سے اٹھا کے یہاں لا رکھا ہو۔

یہ بھٹی اگلے مستول اور بیچ والے مستول کے درمیان واقع ہوتی ہے جو عرشے کا سب سے کشادہ حصہ ہے۔ اس کے نیچے والے تختے نہایت مضبوط رکھے جاتے ہیں تاکہ چونے اور گارے کی اس ٹھوس چنائی کا بوجھ سنبھال سکیں جو دس فٹ لمبی، آٹھ فٹ چوڑی اور پانچ فٹ اونچی ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد عرشے کے تختوں میں گڑی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ لوہے کے زبردست آنکڑوں سے چاروں طرف جکڑی رہتی ہے اور پیچوں کے ذریعے تختوں میں کس دی جاتی ہے۔ دونوں پہلوؤں پر لکڑی کا غلاف سا چڑھا ہوتا ہے اور اوپر ایک لمبا چوڑا ڈھلواں اور دیواروں سے چپکا ہوا ڈھکنا۔ ڈھکنا اٹھا کے دیکھیں تو دو بڑے بڑے دیگ رکھے ہوں گے جن میں روغن کے کئی پیپے آ سکتے ہیں۔ یہ دیگ جس وقت استعمال میں نہ آ رہے ہوں، نہایت صاف رکھے جاتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں ریت اور ریشے سے مانجتے ہیں اور یہ اندر سے چاندی کے پیالوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ رات کو پہرے کے وقت بعض بڈھے کام چور جہازی ان کے اندر منڈ گری مار کے سو جاتے ہیں۔ جب ان دیگوں میں اتر کے دو جہازی انہیں مانجتے ہیں تو لوہے کے کناروں کے اوپر سے آپس میں بڑی راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ علم ریاضی کے بڑے بڑے سخت مسئلے حل کرنے کے لیے بھی یہ جگہ نہایت موزوں ہے۔ ایک دن میں پیکوڈ کے بائیں ہاتھ والے دیگ کو مانج رہا تھا اور بیٹھے کا پانی میرے چاروں طرف لہریے لے رہا تھا، اس دن اقلیدس کا یہ نکتہ پہلی دفعہ مجھ پر منکشف ہوا کہ جو چیزیں دائرے پر پھسل رہی ہوں وہ کسی ایک نقطے سے بالکل ایک ہی وقت میں نیچے اتریں گی۔

بھٹی کے سامنے والے حصے کا تختہ ہٹائیں تو اینٹوں کی دیوار نظر آتی ہے جس میں ٹھیک دیگوں کے نیچے بھٹیوں کے دو منہ رہتے ہیں۔ منہ کے اوپر لوہے کے بھاری بھاری کواڑ ہوتے ہیں۔ آگ کی تیز حرارت کو عرشے تک پہنچنے سے روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ بھٹی کی پوری بنیاد کے نیچے ایک اتھلا سا حوض بنا دیا جاتا ہے۔ پانی بھاپ بن بن کر اڑتا ہے، لیکن پیچھے کی طرف ایک نالی لگی ہوتی ہے جس میں سے ہر وقت تازہ پانی آتا رہتا ہے۔ اوپر کی طرف چمنیاں نہیں ہوتیں، بلکہ پچھلی دیوار میں سے کھلتی ہیں۔

اچھا، اب تھوڑی دیر کے لیے ذرا پیچھے کی طرف چلیے۔

رات کے نو بجے کا عمل ہوگا اس سفر میں پیکوڈ کی بھٹیاں پہلی دفعہ جلنی شروع ہوئیں۔ اس کام کی نگرانی اسٹب کے سپرد ہوئی۔ "سب لوگ تیار ہیں؟ ڈھکنا اٹھاؤ اور بھٹی جلاؤ۔ باورچی، آگ جلاؤ۔" یہ بالکل آسان کام تھا کیونکہ بڑھئی پورے سفر میں اپنی چھیلن بھٹی میں ڈالتا چلا آ رہا تھا۔ یہاں اتنی بات بتا دوں کہ وہیل کے شکار میں جب بھٹی ایک دفعہ گرم کی جائے تو بس تھوڑی

دیر لکڑی جلانی پڑتی ہے۔ اس کے بعد لکڑی استعمال نہیں ہوتی البتہ آگ بھڑکانی ہو تو اور بات ہے۔ چربی کو پگھلا کر تیل نکال لیا جائے تو پھر بھی اس کے چھیچھڑے اور سخت ہوئے ٹکڑوں میں خاصی چکنائی باقی رہ جاتی ہے۔ بھٹی میں انھیں کو جلایا جاتا ہے۔ ایک دفعہ چنگاری ڈال دی جائے تو ربڑ کی ہوئے تارے جلتے ہوئے شہید یا ولی ہی دل میں کڑھنے والے آدم بیزار شخص کی طرح اپنی چتا خود ہی بن جاتی ہے اور خود اپنے بدن کی آگ میں جلتی ہے۔ کاش کہ یہ اپنا دھواں بھی خود ہی ہڑپ کر لیا کرتی کیونکہ اس کے دھوئیں میں سانس لینا بڑا مشکل کام ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ خاصی دیر اس میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ جلتی ہوئی ویل میں بڑا سخت تعفن ہوتا ہے جیسے ہندوؤں کے شمشان میں۔ اس میں سانس لینے سے جہنم کا مزا آ جاتا ہے اور آدمی قیامت کے دن پر ایمان لانے لگتا ہے۔

آدھی رات کے وقت تک بھٹیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ ہم نے ڈھانچے کو پانی میں پھینک کے بادبان پھیلا دیئے تھے۔ ہوا موافق ہو تو جاری تھی۔ سمندر کو وحشی اندھیرا نہایت شدید تھا لیکن اس اندھیرے میں بار بار غضبناک شعلے لپک اٹھتے اور ان کی زبانیں دھوئیں سے اٹی ہوئی چمنیوں میں سے نکل کے بادبانوں کی ایک ایک رسی کو منور کر دیتیں۔ جلتا ہوا جہاز اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے کسی سے انتقام لینے کی خدمت پر مامور کیا گیا ہو۔ اسی طرح وادا ورکناراس کے تارکول اور گندھک سے لدے ہوئے جہاز آدھی رات کے وقت بادبانوں کے بجائے شعلوں کی چادریں اڑاتے بندرگاہ سے چلے تھے اور ترکی جہازوں کو یہاں سے وہاں تک شعلوں میں لپیٹ دیا تھا۔

بھٹیوں کے اوپر سے ڈھکنا اٹھا لیا گیا تو ایک ایسی چوڑی سی جگہ نکل آئی جیسی آتش دان کے گرد ہوتی ہے۔ جنگی بیڑے پار وہاں جا کھڑے ہوئے شکاری جہازوں کو دھکیلنے والوں کا کام انھی سے لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ لمبے لمبے دوشاخے بانس لے کے چربی کے سناتے ہوئے بڑے بڑے ٹکڑوں کو گھونٹتے ہوئے دیگوں میں دھکیلتے اور آگ بھڑکانے لگے۔ یہاں تک کہ دروازوں میں سے شعلے سانپ کی طرح بل کھاتے نکلے اور ان کے پیروں کی طرف لپکے۔ دھوئیں کی ڈھیریاں کی ڈھیریاں اوپر اٹھنے لگیں۔ جب جہاز ہلتا تو ابلتا ہوا تیل بھی ساتھ ساتھ ہلتا جیسے کود کر ان کے چہروں پر پڑنا چاہتا ہو۔ بھٹیوں کے منہ کے مقابل آہنچ تھا اس نے سمندری ہونے کا کام دیا۔ پہرہ داروں کو کام نہ ہوتا تو آگے اس پر لوٹ لگنے لگتے اور دھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھتے رہتے یہاں تک کہ انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے آنکھیں جھلس کے رہ گئی ہیں۔ ان کے دھوئیں اور پسینے میں اٹے ہوئے سیاہ چہرے، الجھی ہوئی داڑھیاں، اور اس کے مقابلے میں دانتوں کی وحشیانہ چمک ——— ان سب چیزوں کو شعلوں کی لپک نے عجب طرح بھیانک بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے ہولناک تجربے سنا رہے تھے لیکن اس طرح جیسے لطیفے ہوں۔ ان کے ناشائستہ قہقہے ہوا میں ایسے لپک رہے تھے جیسے بھٹی کے شعلے۔ ادھر پیچھے جہاز اپنے لمبے لمبے پرچھے سنبھالے اچک اچک چاندر ہے تھے۔ ہوا بجلیوں کی طرح غرانے لگی تھی۔ سمندر اچھلا لگیں لگا رہا تھا۔ جہاز چرچرانے لگتا اور بار بار ہچکولے کھاتا لیکن بڑی استقامت کے ساتھ رات اور سمندر کے اندھیرے میں اپنا یہ سرخ جہنم لیے اڑا چلا جا رہا تھا ——— بڑی حقارت کے۔

ساتھ یہ سفید پڑی چھپا ہوا اور چاروں طرف تھوکتا ہوا غرض جنگلوں کا بوجھ لادے، اپنے سینے پر آگ اٹھائے، ایک لاش جلاتا اور سیاہ دیا کی ہی موت لگاتار یہ تیز رفتار چینگو، بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنے پاگل کپتان کی روح کا خارجی نمونہ ہو۔

کم سے کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوا میں سکان سنبھالے کھڑا تھا اور اس آگ کے جہاز کو سمندر میں چپ چاپ راستہ دکھا رہا تھا اس وقت میں تو اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، اس لیے دوسروں کی لال لال بھیانک شکلیں اور ان کا پاگل پن مجھے اور بھی طرح نظر آ رہا تھا میں آدھی رات کے وقت سکان پر کھڑا ہوتا تو نہ معلوم کیوں ہمیشہ اونگھنے لگتا۔ اس حالت میں ان بھوت جیسی شکلوں کو دھوئیں اور شعلوں میں ناچتا دیکھ کر میری روح میں بھی ایسے ہی نقشے ابھرنے لگے۔

لیکن اس رات میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ کھڑے کھڑے ذرا دیر کو میری آنکھ جھپک گئی تھی۔ ایک دم سے چونکا تو ہولناک احساس ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں سکان کے ہڈی والے ڈنڈے سے لگا کھڑا تھا۔ وہ میرے پہلو میں بری طرح گڑ رہا تھا۔ کانوں میں بادبانوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ آ رہی تھی جو ہوا میں ابھی ابھی بجنے شروع ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میری آنکھیں کھلی ہیں۔ اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے پپوٹوں پر انگلیاں رکھ کر آنکھوں کو زبردستی کھول رہا ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے قطب نما دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ مجھے یاد تھا ابھی ایک منٹ پہلے میں اس کے اندر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں تکتے کا مطالعہ کر رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سامنے گھپ اندھیرے کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بیچ بیچ میں شعلوں کی سرخ سرخ چمک اور بھی خوفناک بنا رہی ہے۔ اس وقت میرے اوپر یہ تاثر سب سے زیادہ غالب تھا کہ میں جس دوڑتی ہوئی چیز پر کھڑا ہوں وہ آگے کسی بندرگاہ کی طرف نہیں جا رہی بلکہ ساری بندرگاہوں کو پیچھے چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔ میرے اوپر ایک موت کی سی وحشت چھا گئی۔ میرے ہاتھ اچھل پڑے اور میں نے سکان پکڑ لیا لیکن دل میں یہ عجیب پاگل پن کا خیال پیدا ہوا کہ سکان نہ معلوم کس جادو کے زور سے الٹا ہو گیا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ مجھے کیا ہو گیا ہے! اف وہ! قصہ یہ تھا کہ میں نے اس مختصری نیند کے دوران میں اپنا رخ بدل لیا تھا۔ اب میرا منہ جہاز کے پچھلے حصے کی طرف تھا اور کمر جہاز کی چونچ اور قطب نما کی طرف۔ یہ دیکھتے ہی میں فوراً مڑا اور جہاز کو ہوا کے رخ پر جانے اور ڈوبنے سے بچا لیا۔ یہ کیسا ہولناک خواب تھا۔ جہاز تباہ ہونے سے بال بال بچا تھا۔ رات کے اندھیرے نے مجھے جو فریب دیا تھا اس سے رہائی پا کے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

اے انسان، آگ کی طرف زیادہ نہ دیکھ! سکان سنبھالنے کے بعد خوابوں میں نہ پڑ، قطب نما کی طرف کمر کر کے کھڑا نہ ہو۔ سکان کے ذرا سے اشارے پر چوکنا ہو جا۔ جب مصنوعی آگ کی سرخی ساری چیزوں کو بھیانک بنا دے تو اس کی بات کا یقین نہ کر۔ کل صبح کو جب فطری سورج نکلے گا تو آسمان روشن ہو جائے گا۔ جو لوگ شعلوں کی لپک ہی میں بھتنے لگتے ہیں تھے صبح کا نور انہیں ایک اور خوشگوار شکل میں پیش کرے گا۔ اصل چراغ تو یہ شاندار سنہرا اور خطرناک سورج ہے ——— باقی سب چراغ جھوٹے ہیں!

اس کے باوجود سورج نہ تو کسی تاریک دلدل کو چھپاتا ہے، نہ کسی ویرانہ و بیابان کو، نہ کسی سیکڑوں میل لمبے ریگستان کو، نہ دنیا کی بے شمار مصیبتوں اور دکھوں کو۔ سورج تو سمندر کو بھی نہیں چھپاتا جو کرۂ زمین کا تاریک رخ ہے اور دو تہائی حصے

پرچھایا ہوا ہے۔ چنانچہ جس فانی انسان کے اندر خوشی زیادہ ہو اور رنج کم وہ سچا آدمی نہیں ہو سکتا —— یا تو سچا نہیں ہوگا یا
اس کی نشوونما نہ ہوئی ہوگی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ دنیا میں ایک بڑے سچے آدمی حضرت عیسیٰؑ تھے جنھوں نے سب سے زیادہ
دکھ اٹھائے۔ سب سے سچی کتاب حضرت سلیمانؑ کی ہے۔ اور عہد نامہ قدیم میں واعظ کی کتاب تو بالکل ایسی ہے جیسے رنج و غم
کو پیٹ پیٹ کر پختہ فولاد بنا دیا گیا ہو۔ "سب کچھ باطل ہے" سب کچھ۔ یہ دنیا ایسی ہٹ دھرم ہے کہ چونکہ حضرت سلیمانؑ عیسائی نہ
تھے، اس لیے ان کی دانشمندی سے مستفیض نہ ہو سکی۔ لیکن جو شخص ہسپتالوں اور جیل خانوں سے کترا کے نکلتا ہے، قبرستانوں کے
پاس سے جلدی جلدی گزر جاتا ہے، جہنم کے بجائے اوپیرا کی باتیں کرتا ہے، کوپر، ینگ، پاسکال اور روسو کو مریض اور ذہنی طور
سے بیمار سمجھتا ہے، بے فکرے پن کی زندگی بسر کرتا ہے، رابلے کو عقلمند اور زندہ دل سمجھ کے اس کا کلمہ پڑھتا ہے ——
ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اس عجیب و غریب اور گہرے مفکر یعنی سلیمانؑ کے ساتھ قبروں کے اوپر بیٹھے، اور ہری ہری کائی ہٹا
کے ان کے اندر جھانکے۔

لیکن حضرت سلیمانؑ نے کہا ہے —— "جو شخص عقل و فہم کے راستے سے بھٹکے گا اس کا شمار مردوں میں ہوگا" (یعنی زندہ
رہتے ہوئے بھی)۔ لہٰذا، اے انسان، تو اپنے آپ کو آگ کے سپرد نہ کر، ورنہ یہ تجھے الٹ کے رکھ دے گی، تجھے بے جان بنا
دے گی، جیسا میرا حال ہوا تھا۔ ایک دانشمندی تو وہ ہے جو دکھ کے برابر ہے، لیکن ایک دکھ ایسا بھی ہوتا ہے جو پاگل پن کے
برابر ہے۔ بعض لوگوں کی روح میں ایک عقاب ہوتا ہے جو اندھیری سے اندھیری گھاٹیوں میں بھی غوطہ لگا سکتا ہے اور پھر
اوپر اٹھ کے منور خلاؤں میں بھی غائب ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ ہمیشہ گھاٹی کے اندر ہی اڑتا رہے لیکن گھاٹی پہاڑوں میں ہوتی
ہے۔ یوں تو میدان کے پرندے بھی ہوا میں اڑ لیتے ہیں مگر پہاڑی عقاب نیچے سے نیچے اتر کے بھی ان سے اونچا ہی رہتا ہے۔

باب ۔ ۹۷

چراغ

اگر آپ بھٹیوں کے پاس سے ہٹ کے جہاز کے اگلے حصے میں گئے ہوتے جہاں کچھ جہازی پہرے سے فارغ ہو کر سو رہے تھے، تو آپ تھوڑی دیر کے لیے یہ سمجھتے کہ بادشاہوں اور ولیوں کے منور مقبرے میں کھڑے ہیں۔ یہ لوگ شاہ بلوط کے تختوں کے بنے ہوئے تکونے تابوتوں میں لیٹے تھے اور ہر جہازی کی بند آنکھوں پر بیسیوں چراغوں کی روشنی پڑ رہی تھی، چنانچہ وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سنگ مرمر کا خاموش مجسمہ۔

تجارتی جہازوں میں جہازیوں کے لیے تیل اتنا ہی نادر و نایاب ہوتا ہے جتنا ملکہ کا دودھ۔ ان کے لیے یہی مقدر ہو چکا ہے کہ اندھیرے میں کپڑے پہنیں، اندھیرے میں کھانا کھائیں اور اندھیرے ہی میں بستر پہ جا پڑیں، لیکن وہیل کا شکاری روشنی کی غذا ڈھونڈنے نکلتا ہے، اس لیے وہ روشنی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹتا ہے تو اپنے بستر کو اچھا خاصا الہ دین کا چراغ بنا لیتا ہے، چنانچہ اندھیری سے اندھیری رات میں بھی جہاز کی سیاہ کوٹھری میں دن نکلا رہتا ہے۔

یوں تو وہیل کے شکاری کا چراغ پرانی بوتلوں سے بنتا ہے لیکن وہ پانچ چھ چراغ ایک ساتھ لے جا کر نہایت آزادی کے ساتھ بھٹیوں کے پاس والے حوض میں سے تیل بھر لیتا ہے جیسے کوئی شراب کے پیپے میں سے اپنا گلاس بھرتا ہو۔ پھر وہ خالص ترین یعنی بے میل اور صاف و شفاف تیل جلاتا ہے جس سے خشکی پر رہنے والوں کے جھاڑ فانوس تک واقف نہیں ہیں۔ یہ تیل ایسا میٹھا ہوتا ہے جیسے موسم بہار کا مکھن۔ جس طرح گھاس کے میدانوں میں سفر کرنے والا خود شکار مار کے کھاتا ہے، اسی طرح وہیل کا شکاری اپنا تیل خود جا کے ڈھونڈتا ہے۔

باب ۔ ۹۸

صفائی

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ اس عفریت کو چٹان کے اوپر بہت دور سے دیکھ کے سمندر کے میدانوں میں اس کا تعاقب کیا جاتا ہے پانی کی وادیوں میں اسے قتل کیا جاتا ہے، پھر اسے جہاز کے ساتھ باندھ کے لے چلتے ہیں اور اس کا سر کاٹ لیتے ہیں اس کے بعد جس طرح پرانے زمانے میں مقتول کے کپڑے مارنے والے کو مل جاتے تھے، اسی اصول کے مطابق ویل کا موٹا گوشت اس کے قاتل کی ملکیت بن جاتا ہے پھر وقت آنے پر اس کو دیگوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس کا روغن، تیل اور ہڈیاں آگ میں سے گزرنے کے بعد بھی صحیح سلامت رہتی ہیں، جیسے پرانی داستانوں میں ہوا کرتا تھا، یہ ساری باتیں تو بیان ہو چکیں لیکن ابھی اس قصے کا آخری باب باقی ہے۔ اب میں ایک رومانی کارروائی کا حال سناؤں گا، بلکہ گویا ہوا گیت کی شکل میں سناؤں گا اب میں بتاؤں گا کہ تیل کو پیپوں میں بھر کے کوٹھری میں کس طرح رکھا جاتا ہے جہاں ویل ایک بار پھر گہرائیوں میں اور پانی کی سطح سے نیچے جا پہنچتی ہے ـــــ لیکن افسوس! اس کے بعد وہ کبھی اوپر آتی ہے نہ دوبارہ پھڑکتی ہے۔

تیل ابھی گرم ہی ہوتا ہے کہ شراب کی طرح پیپوں میں بھر دیا جاتا ہے، جہاز آدھی رات کے سمندر میں ہچکولے کھاتا رہتا ہے، ادھر ان زبردست پیپوں کو کھسکا کے ایک قطار میں رکھنے کا کام شروع ہوتا ہے بعض دفعہ پیپے پھسلتے پھسلتے فرش پر بڑے خوفناک طریقے سے پھسل جاتے ہیں جیسے زمین ایک دم سے اندر کو بیٹھ جائے لیکن جہازی انہیں پکڑ کے پھر اپنی جگہ لگاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر طرف ٹھک ٹھک ہتھوڑے سے چلنے لگتے ہیں کیونکہ اس وقت ہر جہازی ٹھیکیدار بن جاتا ہے۔

آخر کار جب سارا تیل پیپوں میں پہنچ جاتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو گودام کے ڈھکنے کھول دیئے جاتے ہیں، جہاز کا پیٹ کھل جاتا ہے اور پیپے سمندر کے اندر اپنی آخری آرام گاہ میں جانے لگتے ہیں، اس کے بعد ڈھکنے مضبوطی سے بند کر دیئے جاتے ہیں جیسے کوٹھری کے دروازے کو اینٹوں سے چن دیا جائے۔

ویل کے شکار میں شاید یہ واقعات سب سے زیادہ قابل غور ہوتے ہیں، آپ دیکھیں تو ایک دن تختوں پر خون اور تیل کی ندیاں بہہ رہی ہیں، مقدس چھوٹے عرشے پر ویل کے سر کے بڑے بڑے ٹکڑے بدتمیزی سے بکھرے پڑے ہیں، بھٹیوں کے دھوئیں نے دیواروں کو کالا کر کے رکھ دیا ہے، جہازی چکنائی میں نہائے پھر رہے ہیں، سارا جہاز تو ایک ویل ہی لگتا ہے ہر طرف اتنا شور و غل ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

لیکن اسی جہاز میں دو ایک دن بعد چاروں طرف دیکھئے اور کان لگا کے سنیئے، اور اگر راز فاش کرنے والی کشتیاں اور بھٹیاں موجود نہ ہوں تو آپ قسم کھا کے کہیں گے کہ ہم کسی پرسکون تجارتی جہاز میں کھڑے ہیں جس کا کپتان بڑا محتاط اور صاف ستھرا ہے، بغیر بتائے ہوا ویل کا روغن چیزوں کو صاف کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ عرشے اتنے سفید بھی

نہیں دکھائی دیتے جتنے اس تمام جھگڑے کے بعد علاوہ ازیں جی ہوئی ویل کی راکھ سے ایک تیزاب بنایا جاتا ہے۔ اگر جہاز کی دیوار پر ویل کی کچری چکنائی لگی رہ جائے تو اس سے فوراً صاف ہو جاتی ہے۔ کام ختم ہوتے ہی لوگ پانی کی بالٹیاں اور چیتھڑے لے کے پشتوں کی رگڑائی شروع کر دیتے ہیں اور ساری دیواریں اتنی ہی صاف ستھری ہو جاتی ہیں جتنی پہلے تھیں۔ ریتیوں پر سے جوش کی کاونس چھڑائی جاتی ہے اور جتنے اوزار استعمال ہوئے ہیں انہیں احتیاط سے صاف کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ ڈھکنے کو بھی ہانچ کے بھٹی پر رکھ دیتے ہیں جس سے دیگ چھپ جاتے ہیں۔ ہر چیز نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتا ہے۔ چربیوں کو کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کے صاف کیا جاتا ہے۔ جب سارے جہازیوں کی مشترک اور باقاعدہ محنت سے یہ کام ختم ہو جاتا ہے تو پھر خود ان لوگوں کا غسل شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے بدن کو سر سے پیر تک رگڑ رگڑ کے دھوتے ہیں اور آخر صاف ستھرے عاشے پہ ایسے تر و تازہ اور خوش و خرم بن کے نکلتے ہیں جیسے برات کا دولہا۔

اب وہ دو تین تین کی ٹولیاں بنا کے عرشے پر گشت کرتے پھرتے ہیں اور یونہی دل لگی میں دیوان خانوں، قالینوں، پردوں اور صوفوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اس کی صلاح ہوتی ہے کہ عرشے پر غالیچے بچھائیں، مستول پر پردے لٹکائیں اور جہاز کے پچھلے حصے کے شہ نشین پر چاندنی بچھا دیں۔ ایسے معطر جہازیوں کے سامنے تیل، ہڈی اور چربی کا نام لینا بڑی جسارت کا کام ہے۔ آپ نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا وہ اس سے قطعاً واقف نہیں ہیں، جانتے، ہمارے لیے رومال لے کے آئیے!

لیکن ذرا ادھر دیکھئے، تینوں بجلاؤں پر تین آدمی کھڑے ویلوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ویل ہاتھ لگی تو شاید یہ سارا ساز و سامان پھر گندا ہو جائے گا اور کہیں نہ کہیں چکنائی کا داغ ضرور لگے گا۔ ہاں یہ قصہ تو روز پیش آتا ہے کہ مسلسل چھیانوے گھنٹے کی سخت محنت کے بعد جس میں نہ دن کا پتا چلے نہ رات کا، خط استوا کے قریب پتوار چلاتے چلاتے جہازیوں کی کلائیاں سوج گئی ہیں، وہ ابھی کشتی میں سے اتر کے گئے ہیں، لیکن عرشے پر پہنچتے ہی بھاری بھاری زنجیریں اٹھانی پڑی ہیں، جرخ چلانا پڑا ہے، ویل کو کاٹنا پیٹنا پڑا ہے اور وہ پسینے میں شرابور جھیلوں اور خط استوا کے سورج کی مشترک آگ میں ایک دفعہ پھر جلنے لگے ہیں۔ اس کے بعد بھی انہیں چین نہیں ملا بلکہ انہوں نے پورے جہاز کو صاف کیا اور اسے آئینہ بنا کے رکھ دیا۔ ہاں یہ قصہ تو روز پیش آتا ہے کہ بچارے جہازی بمشکل نہا دھو کر قمیص کے بٹن لگا رہے ہیں کہ اتنے میں نعرہ بلند ہوا ——— "فوارہ چھوڑ رہی ہے!" اور وہ سب پھر جہاز کے ویل سے لڑنے چل پڑے اور یہ ساری کلفت پھر اٹھانی پڑی۔ آہ! میرے دوستو، کتنا جانگسل کام ہے، لیکن یہی زندگی ہے۔ فانی انسانوں کا یہی حال ہے کہ سخت مشقت کے بعد انہوں نے دنیا کے زبردست جسم میں سے تھوڑا بہت قیمتی روغن نکالا ہے، پھر نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اپنے آپ کو اس کی نجاستوں سے پاک کیا ہے اور روح کے صاف ستھرے مندر میں رہنا سیکھا ہے۔ ابھی یہ کام پوری طرح ختم بھی نہیں ہوا کہ نعرہ بلند ہوتا ہے ——— "فوارہ چھوڑ رہی ہے!" ——— وہ بھوت پھر دکھائی دے جاتا ہے اور ہم کسی دوسری دنیا سے لڑنے چل کھڑے ہوتے ہیں اور نئی زندگی کے پرانے معمول کو پھر سے ادا کرتے ہیں۔

او ہو! تناسخ!! او ہو! وہ فیثا غورث جو دو ہزار سال ہوئے حسین و جمیل یونان میں مرا تھا اور انتہائی نیک،

عقلمند اور نرم دل آدمی تھا۔ پچھلی دفعہ پیرو کے ساحل پر میں نے اسی کے ساتھ سفر کیا تھا ـــــ میں ہزار بیوقوف اور اناڑی سہی لیکن، اے نیشا فورث، میں نے تجھے رسیوں میں گرہ لگانا سکھایا تھا۔

باب - ۹۹

اشرفی

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اہاب چھوٹے عرشے پر چہل قدمی کرنے کا عادی تھا۔ ایک طرف تو اس کی حد قطب نما تھی اور دوسری طرف بڑا ستون لیکن اس دوران میں بیسیوں دوسری چیزوں کا بیان لازمی ہوگیا اس لیے یہ بات نہیں بتائی جا سکی کہ ٹہلتے ہوئے بعض دفعہ جب اس پر اپنی وہی جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تو وہ باری باری سے ان دونوں مقامات پر رکتا اور وہاں جو چیز سامنے ہوتی اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگتا جب وہ قطب نما کے پاس آکے ٹھہرتا تو اس کی نگاہ نوکیلی سوئی پر گڑ جاتی اور اس کے ارادے کی نوکیلی شدت کی وجہ سے یہ نگاہ بھالے کی طرح نوکیلی معلوم ہوتی۔ اس کے بعد وہ پھر چل پڑتا اور بڑے ستون کے سامنے آکے رکتا۔ اب کے اس کی نظر اس اشرفی پر جمتی جو ستون پر ٹنکی ہوئی تھی اور اس کے انداز میں وہی تھکی ہوئی چنگی ہوتی لیکن اگر مایوسی نہیں تو ایک وحشیانہ آرزو مندی کی آمیزش کے ساتھ۔

لیکن ایک دن صبح کو اشرفی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے عجیب و غریب نقوش میں اسے ایک نئی کشش نظر آئی گویا ان میں جو کچھ بھی معنی پوشیدہ تھے انھیں وہ اپنے جنونی انداز میں پہلی مرتبہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سبھی چیزوں میں کوئی نہ کوئی معنویت ہوتی ہے، ورنہ ساری چیزیں بے کار ہیں، بلکہ یہ گول دنیا بھی ایک خالی صفر ہے جس کا بس اتنا مصرف ہو سکتا ہے کہ بوسٹن کی چٹانوں کی طرح اسے بھی گاڑیوں میں لاد لاد کر کہکشاں کی کوئی دلدل پاٹنے کے لیے بیچ دیا جائے۔

یہ اشرفی خالص ترین اور اچھوتے سونے کی تھی اور اسے ان شاندار پہاڑیوں میں سے کھود کے نکالا گیا تھا جہاں سے بیسیوں دریا شروع ہوتے ہیں اور سنہرے ریت پر سے بہتے ہوئے مشرق و مغرب کی طرف نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ اب یہ لوہے کے زنگ آلود پیچوں اور تانبے کی سبز پڑی ہوئی سلاخوں کے درمیان لگی تھی، مگر ایسی پاکیزہ وضع کی اس پر کسی گندگی کا اثر ہوتا ہی نہ تھا اور اس کی چمک دمک اب تک باقی تھی، حالانکہ اس کے چاروں طرف بے درد جہازی بستے تھے اور بے درد ہاتھ ہر وقت اس کے پاس سے گزرتے تھے پھر اس پہ ساری رات گہرا اندھیرا چھایا رہتا تھا کہ اگر کوئی اسے چرانا چاہے تو وہ کسی کو نظر بھی نہ آئے اس کے باوجود یہ اشرفی سورج نکلنے کے وقت وہیں ہوتی جہاں سورج ڈوبنے کے وقت تھی کیونکہ اسے ایک منحوس اور ہیبت ناک کام کے لیے وقف کر دیا گیا تھا اور اسی لیے اسے تقدس حاصل ہوگیا تھا۔ جہازی یوں چاہے کتنے ہی بڑے لگے بندھے ہوں لیکن اس کا سب احترام کرتے تھے اور اسے سفید وہیل کا تعویذ سمجھتے تھے۔ بعض اوقات جب وہ رات کو پہرا دیتے دیتے اکتا جاتے تو اس کے متعلق باتیں کرنے لگتے اور یہ سوچتے کہ آخر کار یہ کس کو ملے گی اور وہ اسے خرچ کرنے کے لیے زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔

جنوبی امریکہ کی یہ حسین اشرفیاں تو گویا سورج کے تمغے اور گرم ملکوں کا پورا نگار خانہ ہوتی ہیں۔ ان پر کھجور کے درخت

آتش فشاں پہاڑ، لاما کا بھیڑیں، سورج، تارے، گنایا ہوا چاند، قسمت کی دیوی کا سینگ اور خوبصورت جھنڈے۔ خوش قسمتی طرح طرح کی چیزیں کثرت سے نقش ہوتی ہیں چنانچہ ان تجلی افروز تمغوں میں سے گزر کر بیش قیمت سونا اور بھی گراں قدر اور شاندار ہو جاتا ہے۔ ان اشرفیوں میں واقعی ایپیئن والوں کا شاعرانہ مزاج جھلکتا ہے۔

اتفاق سے چیکوڈی کی اشرفی ان سب چیزوں کی ایک انتہائی درخشاں مثال تھی۔ اس کے گول حاشیے پر یہ الفاظ کندہ تھے ——— "جمہوریۂ ایکواڈر، کیٹو" یعنی یہ چمکدار اشرفی ایک ایسے ملک سے آئی تھی جو دنیا کے بیچوں بیچ اور خطِ استوا کے نیچے واقع ہے اور جس کا نام خطِ استوا کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔ یہ اینڈیز کے سلسلۂ کوہ کے وسط میں واقع ایک ایسی ٹکسال میں تیار کی گئی تھی جہاں کبھی خزاں آتی ہی نہیں۔ الفاظ والے حاشیے کے نیچے اینڈیز کی تین چوٹیوں کی تصویر دکھائی دیتی تھی ——— ایک چوٹی میں سے شعلے نکل رہے تھے، دوسری پر مینار تھا، تیسری پر اذان دیتا ہوا مرغا۔ ان سب کے اوپر محراب کی طرح الگ الگ دائروں میں راس منڈل کا ایک حصہ بنا ہوا تھا اور ہر برج کے ساتھ اس کا نشان بھی تھا۔ محراب کے بیچوں بیچ سورج کو برج میزان میں نقطۂ معتدل النہار پر پہنچتے دکھایا گیا تھا۔

استواقی تمغوں کی اس اشرفی کے سامنے اہاب رک کے کھڑا ہو گیا تھا، حالانکہ لوگ اُسے دیکھ رہے تھے۔

"پہاڑ کی چوٹیوں، میناروں اور عظیم الشان اور بلند چیزوں میں کچھ خود پرستی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی ——— تین چوٹیاں اس تکبر کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی ہیں جیسے ابلیس۔ مضبوط اور بلند مینار، یہ اہاب ہے۔ آتش فشاں پہاڑ، یہ اہاب ہے۔ بے خوف، دلاور، اور فتح مند مرغا، یہ بھی اہاب ہے۔ سب اہاب ہیں۔ یہ گول اشرفی بس گول زمین کی تصویر ہے جو کسی جادوگر کے آئینے کی طرح باری باری سے ہر شخص کو خود اسی کی پر اسرار شخصیت کا عکس دکھاتی ہے۔ جو لوگ دنیا سے کہتے ہیں کہ ہماری گتھی سلجھا دو، ان کے لیے تکلیف تو بہت ہے اور فائدہ کم۔ یہ خود اپنی گتھی تو سلجھا نہیں سکتی۔ اشرفی کے اوپر جو سورج بنا ہے اس کا چہرہ تو خوب سرخ معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا دیکھو تو! ہاں، یہ معتدل النہار یعنی طوفانوں کی راس میں داخل ہو رہا ہے! لیکن ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو یہ برج حمل میں ایک اور معتدل النہار سے گزرا تھا۔ طوفان سے طوفان تک! اچھا یہی سہی۔ انسان درد زہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے بالکل مناسب ہے کہ وہ دکھوں میں جیے اور کرب میں مرے! اچھا یہی سہی! یہاں رنج و غم کے لیے نہایت اچھا سامان مہیا ہے۔ اچھا تو یوں ہی سہی!"

"اس اشرفی کو پریوں کی انگلیوں نے تو نہیں چھوا ہوگا لیکن کل سے شیطان کے پنجے اس پر اپنا نشان ضرور چھوڑ گئے ہیں،" اسٹاربک بڑ بڑایا جو پشتوں کے سہارے کھڑا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ "معلوم ہوتا ہے اشرفی پر بڈھے کو وہ تحریر دکھائی دے رہی ہے جو بیلشضر کو دیوار پر نظر آئی تھی۔ میں نے اس اشرفی کو کبھی غور سے معائنہ نہیں کیا۔ لو، بڈھا نیچے چل دیا۔ میں اسے پڑھ کے تو دیکھوں۔ تین زبردست اور فلک بوس چوٹیوں کے درمیان ایک تاریک وادی ہے۔ چوٹیاں تو گویا تثلیث کی دھندلی سی ارضی علامت ہیں۔ اس موت کی وادی میں بھی خدا ہمیں اپنا حفاظت میں لیے رہتا ہے۔ ہمارے

غم اور مایوسی میں بھی راست بازی کا سورج اپنی شعاعوں سے ہمیں اُمید دلاتا رہتا ہے۔ اگر ہم نیچے کی طرف دیکھیں تو اندھیری وادی کی گندی مٹی نظر آتی ہے لیکن اگر نگاہیں اوپر اٹھائیں تو مسکراتا ہوا سورج ان کا استقبال کرتا ہے اور ہمیں دُعا دیتا ہے لیکن یہ عظیم سورج بھی ایک جگہ قائم نہیں رہتا۔ اگر آدھی رات کو ہم اس کی طرف دیکھ کر تسلی حاصل کرنا چاہیں تو ہماری نظروں کو مایوس لوٹنا پڑے گا۔ اس اشرفی کی باتیں بڑی ملائم، عقلمندانہ اور سچی ہیں، مگر مجھے ان سے ہول بھی آتا ہے۔ میں یہاں سے ہٹا جاتا ہوں، کہیں صداقت میرے اندر کوئی ہیجان پیدا نہ کر دے۔"

"ہمارا مغل اعظم چل دیا۔" اسٹب جنتری کے پاس کھڑا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ "اشرفی کا مطلب سمجھنے کی فکر میں تھا اور اسٹار بک بھی وہاں سے ہٹ آیا ہے۔ دونوں کے چہرے میل میل بھر لمبے ہو رہے تھے اور بس یہ اشرفی دیکھنے سے۔ اگر اپنے شہر میں یہ اشرفی میرے پاس ہوتی تو خرچ کرتے ہوئے میں اسے الٹ پلٹ کے بھی نہ دیکھتا۔ ہونہہ! میری ناچیز رائے میں تو یہ اشرفی بڑی انوکھی ہے۔ میں نے اپنے سفروں میں بیسیوں ہی اشرفیاں دیکھی ہوں گی ——— پرانے اسپین کی اشرفیاں، پیرو کی اشرفیاں، چلی کی اشرفیاں، بولیویا کی اشرفیاں، پوپایان کی اشرفیاں، پھر سونے کی گنیاں، مُہریں، روپے، اٹھنیاں، چونیاں، پھر اس جھاستو کی اشرفی میں ایسی کیا عجیب بات ہے کہ یہ دونوں گھبرا گئے۔ بگل کتنے کی قسم، لاؤ ذرا اسے پڑھ کے تو دیکھوں۔ ارہو! اس پر تو بڑے عجیب غریب نشان بنے ہوئے ہیں! اچھا، یہ تو وہ چیز ہے جسے بوڈچ نے اپنی کتاب میں راس منڈل کہا ہے اور میری جنتری جو نیچے پڑی ہے وہ بھی اس پر اکتفا کرتی ہے۔ میں جنتری لا کے دیکھتا ہوں۔ سنتا ہے منتر پڑھنے سے شیطان سامنے آجاتا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ میساچوسٹس میں چھپی ہوئی جنتری کی مدد سے ان عجیب نشانوں کا مطلب سامنے آتا ہے یا نہیں۔ لو کتاب بھی لے آیا۔ اب ذرا دیکھیں کیسے انوکھے نشان ہیں۔ ان میں سورج ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہوں! ہوں! ہوں! لو یہ ہے ——— سب کے سب جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ برج حمل یا مینڈھا، برج ثور یا بیل، اور اب یہ جوزا آگیا ——— جڑواں بچے اچھا، سورج ان کے درمیان چکر لگا رہا ہے۔ یہ ایک حلقے میں بارہ کمرے بنے ہوئے ہیں اور دو کمروں کے بیچ میں سورج دہلیز پار کر رہا ہے۔ چل ری کتاب، تو ادھر چل۔ اری کتابو تمہیں اپنی جگہ پہچاننی چاہیے۔ تم سیدھے سادے الفاظ اور حقائق تو فراہم کر دیتی ہو۔ مگر ان میں خیالات ڈالنا ہمارا کام ہے۔ میں نے تو بس تین کتابیں پڑھی ہیں، میساچوسٹس کی جنتری، بوڈچ کی "فن جہازرانی" اور ڈیبل کی "علم ریاضی"۔ میرا یہ معمولی سا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ نشانات اور عجائبات، اگر نشانات حسین اور تعجب خیز نہ ہوں اور عجائبات معنی خیز نہ ہوں تو بڑے افسوس کی بات ہے اگر کوئی نہ کوئی سراغ تو ملے گا ہی۔ ذرا ٹھہرو ——— آ! ایسا ہے، مل گیا! اری اشرفی، دیکھ تو سہی تیرے راس منڈل میں تو انسان کی ساری زندگی ایک باب میں بیان کر دی گئی ہے۔ اب میں اسے کتاب میں دیکھ دیکھ کے پڑھتا ہوں۔ آ جنتری، ادھر آ! اچھا شروع! برج حمل یا مینڈھا ——— بدکار کتا یہ ہمیں پیدا کرتا ہے۔ پھر برج ثور یا بیل ——— یہ چھوٹتے ہی ہمارے ٹکر مارتا ہے پھر جوزا یا جڑواں بچے ——— یعنی بدی اور نیکی۔ ہم نیکی کی طرف بڑھتے ہیں کہ اتنے میں سرطان یا کیکڑا آکے ہمیں پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ نیکی کے پاس سے چلے

تو راستے میں اسد یا دہاڑتا ہوا شیر بیٹھا ہے ——— وہ چار چھ پنجے مارتا ہے اور دانتوں سے جھنجھوڑتا ہے۔ اس سے جان بچا کے چلے تو سنبلہ یا دوشیزہ سامنے آئی۔ یہ ہماری پہلی محبت ہے۔ ہم شادی کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ کی خوشی حاصل ہو گئی۔ اتنے میں کھٹ سے میزان یا ترازو آ پڑتی ہے ——— ہم اپنی خوشی کو تول کے دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہم اس رنج میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ پیچھے سے عقرب یا بچھو ڈنک مارتا ہے اور ہم ایک دم سے اچھل پڑتے ہیں۔ ہم اپنے زخم کے علاج میں لگتے ہیں کہ چاروں طرف تیروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ برج قوس یا تیر انداز دل لگی کر رہا ہے۔ اب ہم اپنے بدن سے تیر نکال رہے ہیں، ہٹ جائیے، وہ جو بچال کا پہنچا یعنی جدی یا بکرا۔ وہ سینگ تانے سیدھا اڑا چلا آتا ہے اور ہمیں ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ ادھر دلو یا سقہ اپنی موسلا دھار بارش سے ہمیں ڈبو دیتا ہے۔ اور بالآخر ہم برج حوت یا مچھلیوں کے ساتھ سو جاتے ہیں۔ آسمان کے اوپر تو ایک پورا وعظ لکھا ہوا ہے۔ سورج ہر سال اسے پورے کا پورا سنتا ہے، لیکن پھر بھی جیتا جاگتا اور ہنستا کھیلتا باہر نکل آتا ہے۔ وہ آسمان پر ساری مصیبتیں ہنسی خوشی جھیلتا ہے اور نیچے زمین پر بھولا اسٹب بھی یہی کرتا ہے۔ ہاں، اصل چیز تو ہنسی خوشی ہے۔ اچھا، اشرفی، خدا حافظ۔ ارے، ذرا ٹھہرو، فلاسک آ رہا ہے۔ ذرا چرخی کے پیچھے چھپ کے سنیں تو سہی کہ یہ کیا کہتا ہے۔ وہ وہ چرخی کے سامنے پہنچ گیا۔ بس اب بولنے ہی والا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، شروع ہو گیا۔"

"بھلا اس میں کیا دھرا ہے، سونے کا ایک گول ٹکڑا ہے۔ جو شخص سب سے پہلے ایک خاص وہیل کو دیکھے گا، یہ اشرفی اسی کو ملے گی۔ تو پھر یہ لوگ کھڑے اسے کیوں گھور رہے تھے؟ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی قیمت سولہ ڈالر ہے۔ دو سینٹ فی سگار کے حساب سے نو سو ساٹھ سگار ہوتے ہیں۔ اسٹب کی طرح گندے پائپ نہیں پیتا۔ مجھے تو سگار پسند ہیں، اور یہاں نو سو ساٹھ سگار مل رہے ہیں۔ فلاسک تو چلا یہ چلا، وہاں جا کے سگاروں کا بندوبست کرے گا۔"

"میں اسے عقلمندی کی بات سمجھوں یا بیوقوفی کی؟ اگر عقلمندی کی بات ہے تو بھی کچھ احمقانہ لگتی ہے لیکن اگر احمقانہ بات ہے تو کچھ عقلمندانہ لگتی ہے۔ لیکن ٹھہرو تو سہی۔ یہ مینکس والا آیا۔ جہازی بننے سے پہلے یہ کوچوان ہو گا۔ یہ تو اشرفی کو سر اٹھا کے دیکھنے لگا۔ آگا، مستول کے دوسری طرف جا رہا ہے۔ ہاں، ادھر گھوڑے کا نعل لگا ہوا ہے نا۔ وہ تو پھر واپس آ گیا۔ اس کے کیا معنی؟ اد ہو، منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہا ہے ——— اس کی آواز تو ایسی ہے جیسے کوئی گھسی ہوئی چرخی چل رہی ہو۔ ذرا کان لگا کے سنو تو سہی!

"اگر سفید وہیل نظر آئی تو آج سے مہینے بھر بعد دکھائی دے گی، جب سورج انہی میں سے کسی ایک برج میں ہو گا۔ میں نے ان نشانوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے نشانوں سے بھی واقف ہوں، کوئی چالیس سال ہوئے کوپن ہیگن میں اس بڈھی جادوگرنی نے مجھے یہ ساری چیزیں سکھائی تھیں۔ اچھا، اس وقت سورج کس نشان میں ہو گا! گھوڑے کے نعل والے نشان میں، کیونکہ اشرفی کے دوسری طرف ہی لگا ہوا ہے۔ جب تیرے انجام پر نظر جاتی ہے تو بڑا ڈھارس رہنے لگتا ہے۔"

"عبارت وہی ہے لیکن یہ تفصیل بالکل نئی ہے۔ ایک ہی دنیا میں طرح طرح کے آدمی ہیں۔ پھر چپ چاپ جاؤ۔ لکڑی کو ٹیک آرہا ہے —— سر سے پیر تک گدا ہوا —— یہ تو خود راس منڈل معلوم ہوتا ہے یہ جنگلی کیا کر رہا ہے! او ہو، یہ تو اپنا اور راس منڈل کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اپنی ران کی ہڈی کو دیکھتا ہے۔ شاید سوچ رہا ہے کہ سورج ران میں ہے یا چنڈل میں یا استریوں میں —— یعنی جس طرح ہمارے گاؤں کی بڑھیاں علم نجوم کی باتیں کیا کرتی ہیں۔ خدا کی قسم اسے اپنی ران کے آس پاس کوئی چیز مل گئی —— شاید برج قوس یا تیر انداز ہے۔ نہیں۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ یہ اشرفی کیا بلا ہے۔ وہ تو اسے کسی بادشاہ کے پتلون کا پرانا بٹن سمجھ رہا ہے۔ ارے، پھر پیچھے ہٹ جاؤ! وہ بھتنا فیض اللہ آرہا ہے۔ اس نے حسب معمول دم چھپا رکھی ہے اور جوتوں میں بھس ٹھونس رکھا ہے۔ اس کی نظریں کیا کہہ رہی ہیں؟ او ہو یہ تو راس منڈل کے سامنے جھک کے سلام کر رہا ہے۔ اشرفی کے اوپر سورج بنا ہوا ہے نا —— یہ ضرور آگ پوجنے والا ہے لو جو ابھی تو اور لوگ آرہے ہیں پپ اِدھر آیا۔ بیچارہ بچہ! کاش کہ وہ مر گیا ہوتا یا میں اسے دیکھ کے مجھے تو ہول آتا ہے۔ وہ ان سارے مقبروں کو دیکھ رہا ہے —— خود مجھے بھی —— اب وہ اپنا احمقوں کا سا چہرہ لیے اس عبارت کو پڑھنے آیا ہے ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور اس کی بات بھی سنو۔ آ گیا!"

"میں دیکھتا ہوں، تو دیکھتا ہے، وہ دیکھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں، تم دیکھتے ہو، وہ دیکھتے ہیں۔"

"خدا کی قسم، یہ گردان وہ قواعد پڑھتا رہا ہے۔ بیچارہ اپنے ذہن کی تربیت کر رہا ہوگا! لیکن اس نے یہ اب کیا کہنا شروع کیا —— سنو تو!"

"میں دیکھتا ہوں، تو دیکھتا ہے، وہ دیکھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں، تم دیکھتے ہو، وہ دیکھتے ہیں۔"

"ابے یہ تو رٹ رہا ہے —— پھر بولا!"

"میں دیکھتا ہوں، تو دیکھتا ہے، وہ دیکھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں، تم دیکھتے ہو، وہ دیکھتے ہیں۔"

"ارے، یہ تو عجب مذاق ہے!"

"میں، تو، وہ، ہم، تم، وہ، سب کے سب چمگادڑیں ہیں۔ اور میں کوا ہوں، خاص طور سے اس لیے کہ میں صنوبر کے درخت کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ کائیں، کائیں، کائیں، کائیں، کائیں، کائیں، کائیں! کیا میں کوا نہیں ہوں؟ اور کوؤں کو ڈرانے والا کہاں ہے؟ وہ کھڑا ہے۔ وہ ہڈیاں پرانے پتلون کے پائنچوں میں گھسی ہوئی، اور وہ پرانے کوٹ کی آستینوں میں!"

"کہیں اس کا اشارہ میری طرف تو نہیں؟ —— اچھی تعریف کی! —— بیچارہ بچہ! —— جی چاہتا ہے جا کے اپنے پھانسی لگاؤں۔ خیر اب میں پپ کے پاس سے کھسکتا ہوں۔ دوسروں کو تو میں برداشت کر سکتا ہوں کیونکہ ان کی عقل سیدھی سادی ہے لیکن پپ ایک تو پگلا ہے دوسرے کوا۔ میری ہوشمندی یہ باتیں نہیں سہار سکتی۔ میں تو اسے بڑبڑ کرتے چھوڑ کے چلا۔"

"یہ اشرفی جہاز کا ناف ہے اور سب لوگ اسے اتارنے کو بے تاب ہیں۔ لیکن اگر آدمی اپنی ناف اتار بھی لے تو کیا نتیجہ

نکلتے ہی ملیں گی۔ اشرفی ہمیں ملے گی، یہی تو ہمیں بڑی معلوم ہوگی کیونکہ جب کوئی چیز مستول کے اوپر ٹھونک دی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے حالات خراب ہو چکے۔ ہا! ہا! بڈھا آہاب! تیرے تو سفید وہیل کیل ٹھونکے گی، یہ صنوبر کا درخت ہے، ایک مرتبہ گاؤں میں میرے باپ نے ایک صنوبر کا درخت کاٹا تھا، اس میں سے ایک چاندی کی انگوٹھی ملی، یہ کسی بڈھے حبشی کے بیاہ کی انگوٹھی ہوگی۔ مگر وہاں کیسے پہنچی؟ قیامت کے دن جب وہ لوگ اس پرانے مستول کو ڈھونڈنے نکلیں گے تو چھال کے جاتے اس پر سیپیاں چپکی ہوں گی، اور اندر یہی اشرفی ہے گی۔ اس وقت وہ لوگ یہی سوال پوچھیں گے۔ ادھر سونا کتنا قیمتی ہوتا ہے! ——— وہ ہر کنجوس اسے بھی جلد ہی اپنے خزانے میں جمع کرے گا! شش، شش! خدا ساری دنیاؤں میں ادھر ادھر جاتا پھرتا ہے، بادل گرج اور بادل! ہمیں کہ پکا لال! جیتی! اسے، اسے، اسے، اسے، اسے جیتی رہیں! دیکھو تو! ایک گچھا رہ جائے!

لیکن ابھی کپتان نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ معاملہ کیا ہے اور پکار کے کہا "اچھا یہ بات ہے! —— اسی جگہ ٹھہرو
چونچ چلاؤ:"

خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی کہ ابھی وہ ایک دن پہلے ایک جہاز کے جلو میں ایک وہیل ہنڈولی ہوئی تھی جس پر چڑیاں ابھی تک اور بھی اور چربی نکالنے کا زبردست آنکڑا اور ڈھلا دھلایا اور صاف شفاف ابھی زنجیر میں لگا ہوا تھا۔ اس آنکڑے کو اہاب کے پاس اتار دیا گیا۔ اس نے ساری بات فوراً سمجھ لی اور اپنی واحد ران آنکڑے کے خم میں رکھ کے بیٹھ گیا۔ لگ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے لنگر کے بیچ میں یا سیب کے درخت کے گدے پر بیٹھا ہو۔ پھر وہ جہاز والوں کو آواز دے کے آنکڑے سے چپک گیا اور ساتھ ساتھ چلتی ہوئی زنجیر کو کھینچ کھینچ کے اپنا بوجھا اوپر کھینچنے میں مدد دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جھولتا ہوا چھتوں کے پاس پہنچ گیا اور اطمینان سے چرخ کے اوپر جا اترا۔ دوسرا کپتان اپنا مصنوعی بازو بے جھجک آگے بڑھائے استقبال کے لیے لپکا۔ اہاب نے اپنی ہڈی والی ٹانگ بڑھا کے اس کے بازو سے ملا دی جیسے دو کتا مچھلیوں کے جبڑے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں۔ پھر وہ اپنے مخصوص کڑک دار لہجے میں بولا —— "ہاں ہاں بھیا، ٹھیک ہے! لوگ تو ہاتھ ملاتے ہیں، مگر ہم ہڈیاں ملاتے ہیں —— ایک بازو اور ایک ٹانگ! —— بازو جو مڑ نہیں سکتا اور ٹانگ چل نہیں سکتی۔ سفید وہیل کہاں دکھائی دی تھی؟ —— کتنے دن ہوئے؟"

"سفید وہیل۔" انگریز نے اپنا مصنوعی بازو مشرق کی طرف اٹھا کر ایک حسرت کے ساتھ گویا نشست باندھتے ہوئے کہا جیسے یہ دوربین ہو۔ "میں نے اسے پچھلے موسم میں خط استوا کے پاس ادھر دیکھا تھا۔"

"اور وہ تمہارا بازو اڑا لے گئی؟" اہاب نے چرخ پر سے پھسل کر انگریز کے کندھوں پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کم سے کم وہ اس کا سبب تو ضرور بنی۔ کیا تمہاری ٹانگ بھی اسی کی نذر ہوئی؟"

اہاب نے کہا "پورا قصہ تو سناؤ، یہ ہوا کیسے؟"

"میری زندگی میں پہلی دفعہ خط استوا پر سفر کر رہا تھا" انگریز نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اس زمانے میں سفید وہیل کا نام تک نہ سنا تھا۔ اچھا، ایک دن ہم نے چار پانچ وہیلوں کی ایک ٹولی دیکھی اور کشتیوں میں بیٹھ کے ان کے پیچھے چل پڑے۔ میری کشتی نے ایک وہیل پھانس لی۔ یہ وہیل اچھا خاصا سرکس کا گھوڑا تھی۔ یہ کشتی کے چاروں طرف اس بری طرح چکر لگا رہی تھی کہ ملاحوں کو توازن برابر رکھنے کے لیے باہر کی دیوار پر بیٹھنا پڑا۔ اتنے میں کشتی کے نیچے سے ایک زبردست وہیل کود کے اچھلی، جس کا سر اور کوہان دودھ کی طرح سفید تھا اور وہاں سے وہاں تک جھریاں ہی جھریاں نظر آ رہی تھیں۔"

"وہی تھی، وہی تھی!" اہاب ایک دم سے چھنکار مار کے چلایا۔

"اس کے دائیں طرف والے پر کے پاس برچھے گھسے ہوئے تھے۔"

"ہاں، ہاں —— وہ برچھے میرے تھے!" اہاب خوش ہو کے چلایا —— "خیر آگے سناؤ!"

"اچھا، مجھے بولنے تو دو،" انگریز نے خوش طبعی کے ساتھ کہا۔ "ہاں، تو یہ وہیلوں کی بڑی بی نانی جھاگ اڑاتی دوسری وہیل

کی طرف گئی اور میری ڈور کو پاگلوں کی طرح چبانے لگی۔"

"ہاں میں سمجھ گیا ——— اسے توڑنا چاہتی ہوگی تاکہ بندھی ہوئی مچھلی آزاد ہو جائے ——— یہ اس کا پرانا ہتھکنڈہ ہے ——— میں تو اس کی ہر تکنیک سے واقف ہوں۔"

"پتا نہیں۔ یہ سب ہوا کیسے۔ بہر حال جب وہ ڈور چبا رہی تھی تو کسی طرح اس کے دانتوں میں پھنس گئی تھی۔ مجھے اس وقت یہیں کچھ معلوم نہ ہوا بعد میں جب ہم نے ڈوری کھینچی تو کشتی اس کے پیچھے جا نکلی اور دوسری وہیل کو دم بلائی ہوا کے رخ پر چلی گئی۔ اب کچھ میں ایک معاملہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ وہیل تو بہت بڑی اور نہایت شاندار ہے ——— بلکہ میں نے تو اپنی عمر میں اس سے بڑی اور شاندار وہیل کبھی نہیں ——— چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے ضرور پکڑوں گا حالانکہ وہ اس وقت غصہ کے مارے کھول رہی تھی میں نے سوچا کہ الجھی ہوئی ڈور کہیں ڈھیلی نہ پڑ جائے یا اس دانت میں ڈور الجھی ہوئی ہے وہ باہر نہ نکل آئے اس لیے میری کشتی کے ملاح ڈور کو پاگلوں کی طرح کھینچنے میں مصروف تھے میں اچھل کر اپنے چیف میٹ کی کشتی میں کود گیا ——— مسٹر ماونٹ ٹوپ یہاں موجود ہیں (ارے ہاں، آپ کپتان صاحب ہیں، آپ مسٹر ماونٹ ٹوپ ہیں) ——— ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں ماونٹ ٹوپ کی کشتی میں کود گیا جو میری کشتی سے لگی کھڑی تھی اور برچھا ہاتھ میں اٹھا کے وہیل کی پیٹھ پانی کے اندر اتار دیا (یعنی خدایا!) ——— بہت بڑی وہیل تھی ——— اب جو دیکھتا ہوں تو مجھے نظر ہی نہیں آتا ——— دونوں آنکھیں بند ——— کالے کالے جھاگ سے دونوں کی دونوں اندھی ——— اور وہیل کی دم پانی میں سنگ مرمر کے مینار کی طرح سیدھی کھڑی ہے۔ اب کشتی پیچھے ہٹانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ سورج کی روشنی سے آنکھوں میں چکا چوند ہو رہی تھی میں ٹھیک دوپہر کے وقت اندھوں کی طرح ادھر ادھر ٹٹول رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ ہاں، تو میں دوسرا برچھا تلاش کر رہا تھا کہ اسے بھی کھینچ ماروں ——— اتنے میں وہیل کی دم آ کے مینار کی طرح گری اور کشتی کے دو ٹکڑے کر دیئے بلکہ ان ٹکڑوں کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ وہیل دم آگے کی طرف کر کے اور کوبہ اوپر کو اٹھا کے اس اگلے ٹکڑے میں سے یوں چل آئی جیسے کشتی کے تختے اس لکڑی کی کھپچیاں ہوں۔ ہم لوگ نیچے وہیل سے دور بھاگنے لگے۔ اس کی دم موسل کی طرح چل رہی تھی۔ اس سے بچنے کے لیے میں نے دو برچھا پکڑ لیا جو اس کے اندر گڑا ہوا تھا اور دم بھر کے لیے اس سے چپک گیا لیکن موجوں نے دھکا دے کے مجھے دور پھینک دیا اور ساتھ ہی ساتھ مچھلی آگے کی طرف لپک کر نیچے بیٹھ گئی۔ دوسرا برچھا میرے قریب ہتا پھر رہا تھا۔ وہ میرے یہاں لگا۔ اس نے اپنے کندھے کے نیچے ہاتھ رکھ کے بتایا۔ ہاں، برچھا اس جگہ پڑا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے جسم میں جل رہا ہوں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ برچھا میرا سارا بازو پھاڑتا ہوا چلا گیا اور کلائی کے قریب پہنچ کے گر پڑا اب میں بھی ڈوب کر ابھر آیا ——— باقی کہانی وہ صاحب سنائیں گے (کپتان صاحب، یہ ڈاکٹر بنگر ہیں۔ اس جہاز کے ڈاکٹر) اور بنگر، یہ کپتان صاحب ہیں) ہاں، پیارے بنگر، باقی کہانی تم سناؤ۔"

کپتان نے بے تکلفی سے جس ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا وہ شروع ہی سے ان لوگوں کے پاس کھڑا تھا لیکن اس میں ذرا بھی تو ایسی بات نہ تھی جس سے پتا چلے کہ یہ اس جہاز کا افسر ہے۔ اس کا چہرہ بہت ہی گول مگر متین قسم کا تھا اور اس نے ایک

جی اور قمیص اور جوتوں والا چکوں پہن رکھا تھا اس کے ایک ہاتھ میں سلوچ تھی اور دوسرے میں گولیوں کا صندوقچہ۔ اب تک اس کی توجہ انھیں دو چیزوں کے درمیان بٹی رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک تنقیدی نظر ان دونوں کپتانوں کے عضو پر بھی ڈالتا ہوا دیکھ لیتا تھا لیکن اس کے افسر نے اہاب سے تعارف کرایا تو اس نے بڑی شائستگی سے جھک کر سلام کیا اور اپنے کپتان کے حکم کی تعمیل شروع کر دی۔

"بڑا ہی برا زخم تھا کپتان بومر نے میرے مشورے پر عمل کیا اور ہمارے مسیحی کو ——؟"

"میرے جہاز کا نام سیموئل اینڈربی ہے" مجھے کپتان نے بات کاٹتے ہوئے اہاب سے کہا "ہاں یار، آگے چلو۔"

"کپتان نے بھی کا رخ شمال کی طرف پھیر دیا کہ تھا استوائی سرزمین کی گرمی سے بچا سکے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا —— میں نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھی۔ ساری رات ان کے سرہانے بیٹھا جاگتا رہا اور پرہیز کے معاملے میں بڑی سختی سے کام لیا ——؟"

"واقعی بڑی سختی سے کام لیا تھا" خود مریض نے لقمہ دیا پھر اچانک آواز بدل کے بولا "یہ حضرت روز رات کو میرے ساتھ شراب پیتے رہے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ دکھائی بھی نہیں دیتا تھا ٹھیک طرح پٹیاں بھی باندھیں۔ مجھے کئی رات کے تین بجے سونے کا موقع ملتا تھا۔ ہاں، خدا کی قسم، یہ میرے ساتھ جاگا کرتے تھے اور پرہیز کے معاملے میں بڑی سختی سے کام لیتے تھے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب مریضوں کی بہت اچھی نگرانی کرتے ہیں اور بڑا سخت پرہیز کراتے ہیں۔ اے یار بنگر، خیر، ہنسنا کیوں نہیں، تو جانتا ہے کہ تو بڑا اچھا ہوا بدمعاش ہے لیکن پھر دوست مجھے تیرے ہاتھ سے مرنا قبول ہے دوسرے کے ہاتھ سے زندہ رہنا قبول نہیں۔"

بنگر شکل سے نہایت دیندار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گیا اور اس نے اہاب کے سامنے تعظیم بجا لاتے ہوئے کہا —— "جناب آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ ہمارے کپتان صاحب بعض وقت دل لگی میں آ جاتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کے بڑے بڑے لطیفے سناتے ہیں لیکن میں آپ کو بتائے چلا جاتا ہوں کہ میں پادری رہ چکا ہوں اور شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ میں واقعی نہیں پیتا۔"

"پانی!" کپتان نے کہا "ہاں یہ پانی کبھی نہیں پیتے۔ اس سے دورہ پڑ جاتا ہے۔ تازہ پانی ان میں تو پانی سے ڈرنے لگتے ہیں۔ مگر تم بازو کی کہانی سناؤ۔"

ڈاکٹر نے کسی قسم کی جھلاہٹ کے بغیر کہا "ہاں، اب سناتا ہوں۔ کپتان بومر نے لطیفے بازی شروع کر دی ورنہ میں بتا رہا تھا کہ میری انتھک کوششوں کے باوجود زخم کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ سچی بات ہے جناب، کہ ایسا خوفناک زخم آج تک کسی ڈاکٹر نے نہ دیکھا ہو گا۔ دو فٹ سے بھی لمبا تھا۔ میں نے ناپ کے دیکھا ہے۔ قصہ مختصر زخم سیاہ ہو چلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے، اور وہی ہوا لیکن یہ مصنوعی بازو لگوانے میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ یہ چیز تو اصول کے خلاف ہے۔"

—— اس نے سلوچ سے بازو کی طرف اشارہ کیا —— "یہ تو کپتان صاحب کی حرکت ہے میری نہیں۔ یہ خود ہی

نے بڑی نفاست سے جوڑا ہے اور اس کے سرے پر تھوڑا سا حصہ اس نے لگا دیا ہے تاکہ ضرورت پڑے تو آدمی کو بھی نکال کے رکھ
دیں۔ ایک دفعہ میرے اوپر بھی چھت پڑے تھے بعض دفعہ یہ خطرے میں بالکل بھوت بن جاتے ہیں۔ آپ نے یہ گڑھا دیکھا جب؟
——— اس نے ٹوپی اتاری اور بال ہٹا کے کھوپڑی میں ایک پیالہ کی طرح کا گڑھا دکھایا جس میں نہ تو کوئی ہڈی تھی نہ کوئی اور
نشان جس سے پتا چلے کہ یہاں کبھی زخم تھا ——— کپتان صاحب بتائیں گے کہ یہ گڑھا کیسے پیدا ہوا؟ انہیں معلوم ہے۔"

"نہیں، مجھے معلوم نہیں،" کپتان نے کہا۔ "عمران کی والدہ کو معلوم تھا یہ گڑھا پیدائشی ہے۔ اسے بنگلہ تو بڑا خطرناک
کا بنا ہوا ہے۔ اسے اسی صندوق میں جس میں یہ معاش کوئی نہ ہوگا اور سے گئے۔ جب تو مرے تو وصیت کر کے مرنا کہ تیری لاش
آئندہ کے لیے محفوظ کر کے رکھ لی جائے۔"

"اچھا، سفید وہیل کیسی ہوتی ہے؟" اہاب نے کہا۔ وہ ان دو انگریزوں کی یہ چھیڑ خانی بس سن کے دل ہی دل میں گھٹ
رہا تھا۔

"اوہو! بھلا کپتان چلایا۔" اور ہو، ہاں، اچھا تو وہیل پانی میں بیٹھ گئی اور اس کے بعد کچھ دن تک ہمیں نظر نہ آئی۔
جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کونسی وہیل ہے جس نے مجھے چرکا دیا۔ کچھ دن بعد جب ہم خط استوا کی
طرف واپس آئے تو موبی ڈک کا ذکر سنا۔ اس وقت پتا چلا کہ یہ وہی وہیل تھی۔"

"پھر کبھی اس سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی؟"

"دو بار۔"

"اس کے اندر برچھا نہیں اتارا؟"

"ہمت ہی نہیں پڑی۔ کیا ایک بازو کافی نہیں؟ اس دوسرے بازو کے بغیر میں تو بالکل اپاہج ہو جاؤں گا، اور مجھے
یہ بھی خیال ہے کہ موبی ڈک اتنا کاٹتی نہیں جتنا نگلتی ہے۔"

بنجر بات کاٹ کے بولا۔ "اچھا تو اگر آپ اپنا دایاں بازو واپس لینا چاہتے ہیں تو بائیں بازو کو چارے کے طور پر
استعمال کیجیے جناب۔ آپ کو معلوم ہے ——— وہ بڑی باری سے دونوں کپتانوں کے سامنے بڑی نفاست کے ساتھ ادب
بجا لایا ——— "آپ جانتے ہیں کہ خدا نے وہیل کا معدہ کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ آدمی کے بازو تک کو پوری طرح
ہضم نہیں کر سکتی اور وہ خود بھی یہ بات جانتی ہے چنانچہ جس چیز کو آپ سفید وہیل کی کینہ پروری سمجھتے ہیں وہ دراصل اس
کی گھبراہٹ ہے۔ وہ کسی عضو کو نگلنا نہیں چاہتی۔ وہ تو بس کرنا کے ڈرانا چاہتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ اس کا حال اس مریض
بازی گر کا سا ہوتا ہے جس کو میں نے لنکا میں علاج کیا تھا۔ یہ شخص چھوٹے موٹے چاقو نگلا کرتا تھا لیکن ایک دفعہ پورا چاقو نگل
گیا۔ چاقو کوئی سال بھر اس کے پیٹ میں رہا۔ اور جب میں نے اسے جلاب دیا تو کئی ٹکڑے ہو کے نکلا۔ مجھے اپنے ہیں وہ بھی
وہ اس چاقو کو ہضم کر کے اپنے جسمانی نظام میں جذب نہیں کر سکا۔ ہاں، کپتان بومر، اگر آپ اپنے ایک بازو کو باقاعدہ
دفن کرنا چاہتے ہیں اور اس کی خاطر دوسرا بازو گروی رکھنے کو تیار ہیں تو جلد ہی ایسا ہوگا کہ آپ کو اپنا بازو مل جائے گا۔ لیکن

کو ایک چھیٹ کا اور موقع دے دیکھئے:

"نہیں جنگو، بہت بہت شکریہ" انگریز کپتان نے کہا۔ "وہ جہاز واقعی کو مبارک رہے کیونکہ اب میرے ہاتھ سے تو نکل ہی چکا اور اس وقت میں اس ویل سے واقف ہو تھا لیکن میں اسے دوسرے جہاز کے قریب نہ آنے دوں گا۔ میں تو سفید ویلوں سے بارہ چھٹکارا ہی ہوں گا۔ میں تو ایک دفعہ ہی اس کا پیچھا کر کے بھر پایا۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے مارنا بڑے فخر کی بات ہوگی اور اس کے اندر منوں روغن بھرا پڑا ہے لیکن صاحب یہی بہتر ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کیوں کپتان صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟" ——— اور اس نے مصنوعی ٹانگ کی طرف دیکھا۔

"ہاں، صاحب تو ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک نہ ایک دن شکار ضرور ہوگی۔ جس چیز سے دور رہنا ہی اچھا ہو وہی بھاتی ہے۔ سفید ویل تو پوری مقناطیس ہے۔ اسے آخری دفعہ کب دیکھا تھا؟ کس طرف جا رہی تھی؟"

"خدا خیر کرے۔ اس چڑیل پر لعنت" جنگو نے اہاب کے چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے اور سونگھتے ہوئے کہا۔ "ذرا ٹھہر لو ذرا ——— ان کانوں کو کھول رہا ہے! ——— جیسے ایسی دھڑ دھڑ چل رہی ہے کہ سننے کرنے لگے! ——— جناب! ———" وہ جیب سے نشتر نکال کے اہاب کے بازو کی طرف بڑھا۔

"شکاریہاں سے" اہاب چنگھاڑا اور اسے پشتوں پر دھکیل دیا ——— "جواں چکی کشتی میں! وہ کس رخ جا رہی تھی؟"

"آہ!" انگریز کپتان بولا۔ اس سے یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ "انہیں کیا ہو گیا؟ شاید مشرق کی طرف جا رہی تھی ——— تمہارے کپتان پاگل تو نہیں ہوگئے؟" فیض اللہ کے کان میں کہا۔

لیکن فیض اللہ نے ہونٹوں کے اوپر انگلی رکھی اور پشتوں کے اوپر سے پھسل کے اپنی چپو سنبھال لی۔ اہاب نے چرخی کی طرف گھمایا اور جہاز کے ملاحوں کو حکم دیا کہ مجھے نیچے اتار دو۔

دم بھر ہی میں وہ اپنی کشتی کے پچھلے حصے میں جا کھڑا ہوا اور میلتا کے لوگ پتواروں پہ ٹوٹ گئے۔ انگریز کپتان نے ان کو بہت پکارا لیکن بے سود۔ اہاب اجنبی جہاز کی طرف پشت کیے اور غمگین چہرہ سامنے سیدھا کھڑا رہا۔ اور آخر اپنے جہاز کے پاس پہنچ گیا۔

باب - ۱۰۱

پیپا

اس انگریزی جہاز کے نظروں سے غائب ہونے سے پہلے یہ پتا چلا کہ وہ لندن سے روانہ ہوا تھا اور اس کا نام وہاں کے نامور مرحوم سیموئل اینڈربی کے نام پر رکھا گیا تھا جو وہیل روغن کی مشہور تجارتی کوٹھی اینڈربی اینڈ سنز کا بانی تھا۔ میری ناچیز رائے میں تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے اس کوٹھی کی وقعت ٹیوڈرز اور بوربان دونوں شاہی خاندانوں سے بھی زیادہ ہے۔ مچھلیوں کے متعلق میری دستاویزات سے کچھ پتا نہیں چل سکا کہ یہ کوٹھی ۱۷۷۵ء سے کتنے سال پہلے وجود میں آئی۔ لیکن ۱۷۷۵ء میں ان لوگوں نے انگلستان میں سب سے پہلے وہ جہاز تیار کیے جنھوں نے باقاعدہ روغنی وہیل کا شکار کھیلا۔ حالانکہ ہمارے ہاں نینٹکٹ والے اور جزائر نینٹکٹ کے وارث چالیس برس پہلے سے کراس وہیل کا شکار کھیل رہے تھے ــــــــ لیکن صرف شمالی اور جنوبی بحر اوقیانوس میں، اور کسی جگہ نہیں۔ یہ بات مستند ہے کہ مہذب ملکوں میں سب سے پہلے نینٹکٹ والوں نے برچھے سے روغنی وہیل کا شکار کھیلا اور کوئی پچاس سال تک ساری دنیا میں بس یہی لوگ تھے جو روغنی وہیل پر برچھے بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔

۱۷۷۸ء میں اس بلند حوصلہ اینڈربی خاندان نے خاص طور سے اسی مقصد کے لیے اپنے خرچ پر ایک جہاز ایمیلیا نامی تیار کیا جو نہایت جانبازی کے ساتھ راس ہارن کا چکر لگا گیا۔ دنیا کی ساری قوموں میں یہ پہلا جہاز تھا جو جنوبی سمندر میں پہلی دفعہ شکار کی کشتی اتاری۔ یہ سفر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوا۔ جب یہ جہاز اپنی بندرگاہ واپس آیا تو بیش قیمت وہیل روغن سے لدا ہوا تھا۔ اب دوسرے انگریز اور امریکی جہازوں نے بھی اس کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا اور بحر الکاہل میں روغنی وہیل کی زبردست شکارگاہیں کھل گئیں۔ لیکن یہ خاندان تھکنا تو جانتا ہی نہ تھا، اس کارنامے پر قناعت نہ کر کے دوبارہ پھر سرگرم عمل ہو گیا۔ چنانچہ سیموئل کے بیٹے کتنے تھے یہ تو بس ان کی ماں کو ہی معلوم ہوگا بہرحال سیموئل اور اس کے سارے بیٹوں کی زیر نگرانی، اور شاید ایک حد تک انھی کے خرچ پر برطانوی حکومت نے ریٹلر نامی جنگی جہاز بھیجا تاکہ جنوبی سمندر میں نئی شکارگاہیں دریافت کرے۔ اس جہاز کا کپتان ایک سابق بحری افسر تھا۔ یہ سفر بڑے زور کا رہا اور جہاز نے کچھ خدمت بھی انجام دی۔ ـــ لیکن یہ پتا نہیں چل سکا کتنی۔ ابھی اور سنیے جناب ۱۸۱۹ء میں اسی کوٹھی نے خود اپنا جہاز نئی شکارگاہوں کی دریافت کے لیے بھیجا جو اس آزمائشی سفر میں جاپان کے دور دراز سمندر کی طرف گیا۔ یہ سائرن نامی جہاز اس بحری آزمائشی سفر میں بڑا کامیاب رہا۔ اور جاپان کی شکارگاہ کو سب سے پہلے اسی نے دریافت کیا۔ اس مشہور سفر میں سائرن کا کپتان نینٹکٹ کا ایک باشندہ کوفن تھا۔

غرض اینڈربی کے خاندان پر خدا کی رحمت ہو۔ میری کی دولت سے بھی دوسری دنیا کے جنوبی سمندر میں جا پہنچا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی کوٹھی آج تک موجود ہے۔

جس جہاز کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا وہ اسی عزت افزائی کا مستحق تھا کیونکہ بڑے غضب کا جہاز تھا اور نہایت تیز چلتا تھا چینائی گریناگے کے ساحل کے قریب میں ایک مرتبہ آدھی رات کو اس جہاز میں گیا ہوں اور جہازیوں کے ساتھ شراب پی ہے یہ طوفان جنت زندوں کی رہی اور یہ سب بڑے مزے کے لوگ تھے۔ خدا کرے وہ اس تھوڑے دن جیتیں اور پھلتے پھولتے مریں۔ یہ بڈھے اباپ کے مرنے کے بہت دن بعد کا واقعہ ہے۔ مجھے ان انگریزوں کی مہمان نوازی آج تک یاد ہے۔ انگریز بھی تو خدا کی رحمت سے محروم رہیں! شراب؟ میں نے کہا تھا کہ ہم نے شراب پی! پان اور چھلوں کے شوربے چڑھا گئے۔ اس علاقے میں طوفان بہت آتے ہیں چنانچہ جب طوفان آیا اور ملاحوں نے مع سارے جہازیوں کے بادبان اتارنے کے لیے بلایا گیا تو اس وقت تک ہم اتنے اوجھل ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کو کتے سے پہچانتے رسیوں پر چڑھنا پڑا۔ بلکہ ہم سے ایسی حماقتیں سرزد ہوئیں کہ ہمارے دامن بادبانوں میں الجھ گئے اور ہم اس جھگڑتے ہوئے طوفان میں بدمست جہازیوں کے لیے عبرت کا نمونہ بن کے اوپر لٹک گئے۔ بہرحال مستول سے نیچے نہیں گرے، اور ہم آہستہ آہستہ نیچے اترے۔ لیکن اب ہمیں اتنا ہوش آ چکا تھا کہ ایک دفعہ پھر شراب کا دور چلا۔ مگر سمندر کے نمکین جھاگ نے ہمارے شراب کا ذائقہ خراب کر دیا تھا۔

گوشت بھی نہایت نفیس تھا سخت تو ضرور تھا لیکن خوب چبا دار (بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اور بعض لوگوں کی رائے تھی اونٹ کا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اصل قصہ کیا تھا ساتھ میں کیک بھی تھے ——— چھوٹے چھوٹے لیکن خوش رنگ گول اور مدور اور بے حد سخت کہ ہضم بھی نہ ہو سکیں۔ مجھے تو کھانے کے بعد ایسا لگا جیسے پیٹ میں بوجھ سا رہے ہوں۔ اگر آگے کو جھکیں تو ڈر لگتا تھا کہ گیندوں کی طرح منہ سے نکل پڑیں گے۔ ڈبل روٹی کا حال کیا بتاؤں! ان بیچاروں کے پاس اس کا علاج ہی کیا تھا علاوہ ازیں یہ روٹی خارش اور فساد خون کے لیے نہایت مفید تھی۔ کھانے کے سامان میں بس یہی ایک چیز تازہ تھی لیکن جہاز کا اگلا حصہ کچھ ایسا ہلکا نہ تھا اور روٹی کھاتے ہوئے کسی اندھیرے کونے میں چلے جانا ہی احسان تھا لیکن باورچی کی دیگوں اور خود اس کی کھال والی چیچڑی پر غور کریں اور چوبچے سے لے کر دم تک سارے جہاز کو نظر میں رکھیں تو سیول اینڈ بی تھا بڑے مزے کا جہاز، کھانا اچھا اور بافراط، شراب تیز اور نفیس، جہازی سارے کے سارے جی دار اور سر سے پیر تک شریف

آپ سوچیں گے کہ سب ... یعنی سیول اینڈ بی اور کئی دوسرے انگریزی جہاز اتنے مہمان نواز کیوں تھے؟ وہاں ہی اتنی وافر شراب کے دور اور لطیفے بازیاں کیوں ہوتی تھیں؟ وہ لوگ کھانے پینے اور جینے سے تھکتے کیوں نہ تھے؟ میں بتاتا ہوں۔ انگریزی جہازوں کی یہ زندہ دلی اور خیال نہیں تو اس لائق ہیں کہ ان پر تاریخی نقطہ نظر سے تحقیقات کی جائے اور جہاں کہیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے میں نے تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

نئی لیفڈ، ہالینڈ اور ڈنمارک کے لوگ اس پیشے میں انگریزوں سے پہلے آگے تھے۔ انگریزوں نے بہت سی اصطلاحات انھی سے لی ہیں اور کھانے پینے کے سامان کی بہتات کا رواج بھی وہیں سے آیا ہے۔ عام طور سے انگلستان کے تجارتی جہاز اپنے ملاحوں کو بھوکا مارتے ہیں۔ لیکن انگلستان کے شکاری جہازوں کا یہ حال نہیں۔ لہٰذا یہ خوش خوراکی فطری اور عام چیز نہیں بلکہ اتفاقی اور خصوصی ہے چنانچہ اس کی ابتدا بھی خاص طریقے سے ہوئی ہوگی۔ اس امر کا بیان کچھ تو ہو چکا

...اور کچھ تشریح اب ہوتی ہے۔

ویل کی تاریخ کے سلسلے میں تحقیقی کام کرتے ہوئے اتفاق سے ڈچ زبان کی ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ یہ کتاب بہت پرانی چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے شکاری جہازوں کی سی بو آ رہی تھی چنانچہ میں تاڑ گیا کہ اس میں شکاری جہازوں کا ذکر ہوگا۔ اس کتاب کا نام تھا "ڈان کوپ مان"۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ایمسٹرڈم کے کسی ٹھٹھیرے کی خود نوشت سوانح عمری ہوگی جس نے کسی شکاری جہاز میں نوکری کی ہوگی کیونکہ ہر شکاری جہاز میں ایک ٹھٹھیرے کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے یہ کتاب ترجمے کے لیے اپنے دوست ڈاکٹر اسنوڈ ہیڈ کو دی جو بڑے زبردست عالم اور ڈچ زبان کے پروفیسر ہیں۔ اور اس محنت کے صلے میں دو شمعوں کا ایک ڈبہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے کتاب دیکھتے ہی مجھے یقین دلایا کہ "ڈان کوپ مان" کے معنی ٹھٹھیرا نہیں ہیں بلکہ تاجر۔ مختصر یہ کہ اس قدیم اور عالمانہ کتاب میں ہالینڈ کی تجارت کا حال لکھا تھا اور منجملہ دوسرے موضوعات کے ویل مچھلی کے کاروبار کا بھی بڑا دلچسپ بیان تھا۔ ایک باب کا عنوان تھا "چربی کا بیان"۔ مجھے ایک طویل اور مفصل فہرست ملی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہالینڈ کے ایک سو اسی شکاری جہازوں کی کوٹھریوں میں کھانے پینے کا کیا سامان بھرا گیا تھا۔ ڈاکٹر اسنوڈ ہیڈ کے ترجمے کے مطابق میں اس فہرست کو بجنسہ نقل کرتا ہوں:

گائے کا گوشت	۴۰۰,۰۰۰ پونڈ
سور کا گوشت	۶۰,۰۰۰ پونڈ
مچھلی	۱۵۰,۰۰۰ پونڈ
بسکٹ	۵۵۰,۰۰۰ پونڈ
ڈبل روٹی	۷۲,۰۰۰ پونڈ
گھی	۲,۸۰۰ پیپے
عمدہ پنیر	۲۰,۰۰۰ پونڈ
معمولی قسم کا پنیر	۱۴۴,۰۰۰ پونڈ
جنیوا کی شراب	۵۵۰ پیپے
بیئر	۱۰,۸۰۰ پیپے

عام طور سے شماریاتی گوشوارے پڑھنے میں بے انتہا خشک لگتے ہیں لیکن یہ فہرست ایسی نہیں ہے کیونکہ یہاں تو شراب کے پورے پورے پیپے اور غذا کی ساری قسمیں موجود ہیں۔

میں نے اس زمانے میں اس سارے گوشت روٹی اور شراب کو ہضم کرنے میں تین دن لگائے۔ اس دوران میں بہت سے گہرے خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے جن میں فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے خود بھی کئی فہرستیں ترتیب دیں جن میں دکھایا گیا تھا کہ ہالینڈ کا ہر برچھے باز کتنی مچھلی روزانہ کھاتا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ

وحشیوں کے جزیرے میں ایک گنج

دریائی وہیل کا نقشہ دیکھتے ہوئے میں نے ابھی تک فی الحال اس کی خارجی شکل کے عجائبات کا ذکر کیا ہے اور اندرونی ساخت کی بھی دو چار تفصیلات الگ الگ بیان کر دی ہیں لیکن آپ وہیل کو سر سے دم تک اور پوری طرح نہیں سمجھیں گے جب تک میں سارے بٹن نہ کھول دوں، اور گھنڈیاں کھول کے اس کے کپڑے نہ اتار ڈالوں، اس کی اندرونی ہڈیوں کے جوڑ جوڑ الگ نہ کر دوں اور آپ کے سامنے اس کی بنیادی شکل یعنی ڈھانچے کی صورت میں پیش نہ کر دوں۔

ارے اسمٰعیل! یہ کیا؟ اس پیشے میں تمہاری حیثیت تو بس پتوار چلانے والے کی ہے، تم وہیل کے اندرونی حصوں کے متعلق کچھ جاننے کا دعویٰ کیسے کرتے ہو؟ اسٹب تو اپنے علم کا ماہر تھا کیا وہ چرخ کے اوپر چڑھ کے وہیل کے جسم کے متعلق تقریر بھی کیا کرتا تھا؟ کیا وہ آپ کے لیے کی مدد سے وہیل کی پسلیوں کا نمونہ پیش کیا کرتا تھا؟ اسمٰعیل، بتاؤ تو سہی یہ قصہ کیا ہے۔ کیا تم ایک پوری وہیل کو معائنے کے لیے عرشے پر لا سکتے ہو، جیسے باورچی خانے میں بھنا ہوا گوشت لا رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسمٰعیل، اب تک تو تم بڑے سچے گواہ ثابت ہوتے ہو لیکن ذرا یونس کے حق میں یہ امتیاز تو بس حضرت یونس کو حاصل تھا کہ وہ وہیل کے ڈھانچے کی کڑیوں، شہتیروں، تختوں اور کھونٹیوں کے متعلق تقریر کر سکتے تھے، بلکہ اس کے پیٹ میں چربی کے مٹکے اور دودھ نکالنے کی بھٹی اور پنیر بنانے کا سامان وغیرہ سب اس کے متعلق ہی۔

مجھے تسلیم ہے کہ حضرت یونس کے بعد سے بہت ہی کم شکاریوں کو پوری وہیل کے پیٹ میں جانے کا موقع ملا ہے، پھر بھی تھا اتفاق سے کہ مجھے چھوٹی وہیل کا تجزیہ کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ ایک مرتبہ میں ایک جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی دودھ پیتی وہیل عرشے پر لائی گئی تاکہ اس کی کھال اتار کے برچھیوں کے غلاف بنائے جائیں۔ بھلا میں ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ میں کلہاڑی اور چاقو لے کے جٹ گیا اور دو گھنٹے میں اس خدا کی ساری تحریر پڑھ ڈالی۔

جہاں تک وہیل کی زبردست اور پوری طرح نشوونما پائی ہوئی ہڈیوں سے واقفیت کا تعلق ہے تو وہ مجھے اپنے مرحوم دوست ٹرانکو کے ذریعے حاصل ہوئی جو جزیرہ ٹرانک کا باشندہ تھا۔ ان دنوں میں الجزائر کے ایک تجارتی جہاز کے متعلق تھا اور اس علاقے میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ بادشاہ نے مجھے دعوت دی کہ میں پوپیلا میں آ کے اس کے ساتھ کچھ دن ناریل کے جھنڈ کے محل میں رہوں۔ یہ جگہ سمندر کے کنارے ایک گھاٹی میں واقع ہے اور اس کے دارالخلافہ سے زیادہ دور نہیں جسے جہازی بانسوں کا شہر کہتے ہیں۔

میرے شاہی دوست میں یوں تو اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں لیکن خاص طور سے وحشیوں کے فنی کارناموں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی چنانچہ اس کے ہنرمند مردم قوم جتنی انوکھی چیزیں بھی ایجاد کر سکتے تھے وہ سب اس نے پوپیلا میں

تازہ لباس پہنتا ہے لیکن خود وہی ڈھانچے کا ڈھانچا ہے۔ زندگی موت سے ہم آغوش تھی موت زندگی کو گلے لگا رہی تھی اس ہولناک ویرانے نے نوجوان زندگی کو پیار کر کے گھنگھر بڑے بالوں والے خوبصورت بچے پیدا کیے تھے۔

پھر جب میں ڑنگو کے ساتھ اس عجیب وغریب وہیل کے پاس پہنچا تو دیکھا اس کی کھوپڑی تقریباً گڑی ہوئی ہے اور جہاں سے پہلے فوارہ نکلا کرتا تھا وہاں سے عشق پیچاں کی بیلیں نکل رہی ہیں مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ بادشاہ صاحب ڑنگو اس ایک کاریگری کا نمونہ سمجھتا ہے۔ یہ سن کر وہ ہنسنے لگا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب مجھے اس بات پر ہوا کہ یہ وسیع دھوپ میں کے فوارے کو ہی اور حقیقی نمائشے تھے میں اس ڈھانچے کے سامنے بھونچکا کھڑا رہ گیا پھر بیلیں ہٹائیں اور پسلیوں میں گھس کر اندر جا پہنچا ہاتھ میں تاگے کا گولا لے کر میں اس کے سایہ دار تیلیوں اور کنگوں میں گھومتا پھرا لیکن میرا تاگہ تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو گیا۔ اس کی مدد سے میں پھر اسی راستے سے واپس نکل آیا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ ڈھانچے کے اندر مجھے کوئی جاندار چیز نظر نہیں آئی۔ وہاں ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

میں نے ایک ہری بھری شاخ کاٹ کے ناپنے کا گز بنایا اور ایک مرتبہ پھر ڈھانچے کے اندر داخل ہو گیا۔ کھوپڑی میں جو دراز تھی اس میں سے پروہتوں نے مجھے لکڑی کی ایک پیمائش لیتے دیکھا تو چیخ پڑے ——— ارے یہ کیا؟ تجھے ہمارے پیرونا کنا پنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ یہ تو ہمارا کام ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں باپ تمھارے خیال میں اس کی لمبائی کتنی ہے؟ آپ وہیل کی لمبائی کے متعلق ان لوگوں کے درمیان ایک جھگڑا برپا ہو گیا اور وہ ایک ایک انچ پر لڑنے لگے۔ انھوں نے اپنے گز سے ایک دوسرے کی کھوپڑی توڑنی شروع کر دی اور وہیل کی کھوپڑی اس شور سے گونج اٹھی۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اپنی پیمائش مکمل کر لی۔

یہ پیمائش میں اب آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں لیکن ایک بات کو خطرہ ہے مجھے یہ آزادی حاصل نہیں کہ جو ناپ چاہوں بتا دوں۔ کیونکہ ڈھانچے کے ماہر موجود ہیں اور میری صداقت کا امتحان لینے کے لیے آپ ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔ سنا ہے کہ انگلستان میں شکاری جہازوں کے ایک بندرگاہ ہل میں وہیلوں کا ایک عجائب خانہ ہے جہاں پر دار مگوال وہیل اور کئی دوسری وہیلوں کے ڈھانچے محفوظ ہیں … میں … کے عجائب خانے کے اندر ایک ڈھانچا رکھا ہے جس کے متعلق مالکوں کا دعویٰ ہے کہ امریکا میں گرین لینڈ وہیل کا اس سے اچھا نمونہ اور کوئی نہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان میں برٹن کانسٹیبل کے مقام پر ایک شخص سر کلفرڈ کانسٹیبل کے پاس ایک درمیانے درجے کی روغنی وہیل کا ڈھانچا ہے۔ مگر وہ اتنا زبردست نہیں جتنا میرے دوست بادشاہ ڑنگو کے پاس تھا۔

یہ ڈھانچے جن وہیلوں کے تھے ان کے مالکوں نے انھیں ایک ہی جیسی وجہ کی بنیاد پر اپنے قبضے میں لیا تھا۔ بادشاہ ڑنگو نے وہیل پر قبضہ جمایا کیونکہ اسے ضرورت تھی اور سر کلفرڈ نے اس لیے کہ وہ اس علاقے کا رئیس تھا۔ سر کلفرڈ کی وہیل کے جبڑے کو الگ کر دیا گیا ہے چنانچہ آپ اس ڈھانچے کے ہر حصے کو صندوق کی طرح کھول اور بند کر سکتے ہیں ——— اس کی پسلیوں کو ایک زبردست پنکھے کی طرح پھیلا سکتے ہیں ——— اور اس کے نیچے جبڑے میں دن بھر جھولا جھول سکتے ہیں۔ اب تک

کے دروازوں میں تالے بھی لگنے جانے والے ہیں اور آئندہ نواب صاحب کا خادم چاہے یوں کا گھانے کر تماشائیوں کو خوش دکھایا کرے گا۔ سر گنگوڑ کا ارادہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی والی ہیں جانگنے کے دو جس لیے جا ہیں، کھوپڑی کے نیچے کی گول بھی تنے گے تین جس اور راستے میں چڑھنے کے باہر ویلیکے کے چوبیس۔

ڈھانچے کی ناپ میں اپنے دائیں بازو پر سے حرف بحرف نقل کر دوں گا جہاں میں نے بہت گودوالیا تھا کیونکہ میں اس زمانے میں آوارہ گھومتا پھرتا تھا اور ایسے بیش قیمت اعداد و شمار کو محفوظ رکھنے کا اور کوئی طریقہ اتنا اچھا نہ تھا لیکن بازو پر جگہ کم تھی پھر بھی ان دنوں ایک نظم بھی گودا رہا تھا اور جسم کے باقی حصوں کو اس کے لیے خالی رکھنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے انچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ ویسے بھی ویل کی پیمائش میں انچوں کو خیال رکھنا کچھ ناموزوں سا ہے۔

وہیل کے ڈھانچے کی ناپ

ہم جس عفریت کا ڈھانچہ آپ کو دکھانے والے ہیں پہلے تو ہم اس کی زندہ جسامت کے متعلق ایک سیدھی سادھی بات آپ کے سامنے پیش کروں گا ممکن ہے یہ بیان یہاں کارآمد ثابت ہو۔

اسکورزبی کا اندازہ ہے کہ بڑی سے بڑی اور ساٹھ فٹ لمبی گرین لینڈ وہیل کا وزن ستر ٹن ہوتا ہے۔ اس قیاس کی بنیاد پر میں نے بڑی احتیاط سے حساب لگایا ہے کہ بڑی سے بڑی روغنی وہیل جس کی لمبائی پچاسی اور نوے فٹ کے درمیان اور گھیر چالیس فٹ سے کم ہی ہو وزن میں کم سے کم نوے ٹن بیٹھے گی چنانچہ تیرہ آدمی فی ٹن کے حساب سے وہیل کا وزن ایک ہزار ایک سو کی آبادی والے پورے گاؤں سے بھی زیادہ ہو گا۔

کسی خشکی والے کا تخیل وہیل کو بس اسی طرح چلا سکتا ہے کہ اس عفریت میں ذہن بیلوں کی طرح جوتے جائیں یہی بات ہے نا؟ ——۔

وہیل کی کھوپڑی، فوارے کا سوراخ، جبڑا، دم، ماتھا، پر اور جسم کے مختلف حصے تو میں آپ کے سامنے پیش کر ہی چکا ہوں، اب صرف ان چیزوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس کے چھپے ڈھانچے میں سب سے زیادہ دلچسپ ہیں لیکن چونکہ وہیل کی زبردست کھوپڑی ڈھانچے کا بہت بڑا حصہ گھیرے رکھتی ہے، اور سب سے زیادہ پیچیدہ حصہ بھی یہی ہے پھر اس باب میں کھوپڑی کے بارے میں کوئی بات دہرائی نہیں جائے گی۔ اس لیے جب ہم آگے چلیں تو آپ اس کھوپڑی کو یاد ذہن میں رکھیے یا بغل میں دبا لیجیے، ورنہ آپ ڈھانچے کی عمومی ساخت کے متعلق کوئی واضح تصور قائم نہیں کر سکیں گے۔

ترانکو والی روغنی وہیل کا ڈھانچہ لمبائی میں بہتر فٹ تھا چنانچہ جب اس پر گوشت چڑھا ہوا ہو گا۔ تو زندہ وہیل نوے فٹ کی ہو گی کیونکہ زندہ وہیل کے مقابلے میں ڈھانچہ کافی بڑے حصے کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ اس بہتر فٹ میں سے بیس فٹ کھوپڑی اور جبڑے کے نکل گئے، باقی پچاس فٹ ریڑھ کی ہڈی کے بچے۔ اس ہڈی کے ایک تہائی حصے میں پسلیوں کی لمبی چوڑی اور گول ٹوکری لگی ہوئی تھی جس کے اندر ایک زمانے میں اس کی انتڑیاں بند تھیں۔

اس سفید سفید پسلیوں والے صندوق اور اس کے ساتھ لگی ہوئی لمبی ریڑھ کی ہڈی کو دیکھ کر جو ایک لکیر کی طرح سیدھی چلی گئی تھی، مجھے اس زبردست جہاز کا ڈھانچہ یاد آ گیا جسے ابھی کارخانے میں لا کر رکھا گیا ہو، اور کلے کی دس بیس پسلیاں لگائی گئی ہوں لیکن فی الحال چند ایک لیا ساختہ ہوا در لگائے گئے۔

دونوں طرف دس دس پسلیاں تھیں، پہلی پسلی گردن کے پاس والی پسلی کوئی چھ فٹ لمبی تھی۔ دوسری، تیسری اور چوتھی پسلیاں بتدریج لمبی ہوتی چلی گئی تھیں یہاں تک کہ سب سے لمبی پانچویں پسلی آ گئی تھی جو آٹھ فٹ اور کچھ انچ کی تھی۔ وہاں

سے پسلیاں پھر چھوٹی ہونی شروع ہو جاتی تھیں، یہاں تک کہ دسویں اور آخری پسلی محض پانچ فٹ اور کچھ انچ کی تھی۔ ان کی موٹائی بھی لمبائی کے تناسب سے تھی بیچ کی پسلیاں سب سے زیادہ گول تھیں بحر الکاہل کے جزیروں میں انھیں شہتیروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح چھوٹے چھوٹے چشموں پر پل بنائے جاتے ہیں۔

ان پسلیوں پر غور کرتے ہوئے مجھے پھر اسی بات پر تعجب ہوا جس کا ذکر مختلف طریقوں سے اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے۔ وہ یہ کہ وہیل کا ڈھانچا زندہ وہیل کی شکل کا صحیح اندازہ پیش نہیں کرتا۔ اس وہیل کی سب سے بڑی پسلی جسم کے اس حصے میں واقع تھی جس کی موٹائی زندہ وہیل میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس وہیل کے جسم کا سب سے موٹا حصہ کم سے کم سولہ فٹ کا ہو گا لیکن اس کے اندر کی پسلی آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھی چنانچہ یہ پسلی اس حصے کی زندہ جسامت کا صرف آدھا تصور پیش کر رہی تھی۔ علاوہ ازیں جہاں میں اس وقت ننگی ریڑھ کی ہڈی موجود تھی اس کے گرد پہلے کبھی گوشت، عضلات، خون اور انتڑیاں تھیں پر ان کے بجائے اس وقت مجھے چند بے ترتیب جوڑ نظر آ رہے تھے اور دم کے دونوں دونلی اور شاندار پنکھے بے ہڈی والے حصوں کی جگہ بالکل خالی تھی۔

میں نے دل میں کہا کہ اس پرسکون جنگل میں مردہ ڈھانچے کو دیکھ کر اس عجیب و غریب وہیل کا صحیح تصور قائم کرنے کی کوشش کتنی لغو اور فضول ہے۔ یہ کام ان جہازوں کے بس کا نہیں جنھوں نے کبھی سفر کیا ہی نہ ہو۔ نہیں، زندہ وہیل کیا چیز ہے، اس کا پتا تو بس گہرے سمندر کی پہنائیوں میں، زبردست خطروں کے درمیان اور اس کی غضبناک دم کے گرداب میں گر کر ہی چل سکتا ہے۔

لیکن ریڑھ کی ہڈی! اس کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کرین کی مدد سے اس کی ساری ہڈیاں ایک دوسرے کے اوپر کھڑی کر دی جائیں۔ یہ کام خاصا وقت طلب ہے لیکن اگر آپ اسے کر گزریں تو یہ ڈھیر ایسا معلوم ہو گا جیسے قطب مینار۔ کل ملا کر چالیس مہرے ہوتے ہیں جو ڈھانچے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں ہوتے عموماً وہ اس طرح لگے رہتے ہیں جیسے کسی پرانے قلعے کے اکیلے پتھروں کی موٹی چنائی۔ سب سے بڑا یعنی بیچ والا مہرہ چوڑائی میں تین فٹ سے کم اور موٹائی میں چار فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹے مہرے کی جگہ وہ ہے جہاں ریڑھ کی ہڈی پتلی ہو کر دم سے جا ملتی ہے۔ یہ چوڑائی میں بس دو انچ کا ہوتا ہے اور سفید گیند کی طرح لگتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ابھی چند اور بھی چھوٹے مہرے تھے لیکن پروہت کے شریر بچے انھیں گولیاں کھیلنے کے لیے چرا لے گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے جانور کی ریڑھ کی ہڈی بھی پتلی ہوتے ہوتے آخر کار بچوں کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

متحجر ویل

ویل اپنی عظیم جسامت کی وجہ سے ایک ایسا موضوع فراہم کرتی ہے جس کے متعلق جتنا چاہیے لکھے چلے جائیے۔ اگر آپ چاہیں بھی تو اسے مختصر نہیں کر سکتے۔ ویل کا تو بجا طور پر حق یہ ہے کہ اس کا بیان صرف بڑی تقطیع کی شاہی کتابوں میں لکھا جائے۔ اس کی لمبائی، جسم اور گردن کی چوڑائی کی بات تو چھوڑیئے، ان کا ذکر تو ہو ہی چکا۔ اب ذرا اس کی زبردست انتڑیوں کے گنجلک پیچ و خم کا تصور کیجیے جو پیٹ میں اس طرح پڑی رہتی ہیں جیسے جنگی جہاز کی کوٹھڑی میں موٹے موٹے رسوں کے لچھے۔

چونکہ میں نے اس عفریت کا معائنہ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے، اس لیے لازم آتا ہے کہ میں اپنے علم کو جامع و مانع اور ہر چیز پر حاوی ثابت کر دکھاؤں، اس کے خون کے منوی جراثیم تک کو نظر انداز نہ کروں اور ایک ایک انتڑی کھول کے آپ کے سامنے پھیلا دوں۔ اس کے جسم اور جائے رہائش کی بیشتر خصوصیات میں وہ تو میں بتا ہی چکا ہوں، اب یہ کام باقی رہ جاتا ہے کہ علم آثار قدیمہ، علم حجریات اور زمانہ قبل از تاریخ کے نقطۂ نظر سے تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ ویل کے سوا کسی اور جانور، مثلاً چوہے یا پسو کے سلسلے میں یہ موٹے موٹے الفاظ غیر ضروری حد تک طویل اور ناموزوں معلوم ہوں گے، لیکن جب موضوع ویل ہو تو بات مختلف ہو جاتی ہے۔ میں لغت کے بھاری سے بھاری الفاظ کو اس مہم پر روانہ کروں گا اور یہ بات بھی بتا دوں کہ ان مقامات میں جب کبھی مجھے لغت دیکھنے کی ضرورت پیش آئی ہے تو میں نے جینسن (ڈاکٹر جانسن) کی عظیم لغت استعمال کی ہے جو میں نے خاص طور سے اسی کام کے لیے خریدی تھی کیونکہ مشہور لغت نگار اپنی غیر معمولی جسامت کی وجہ سے ایک ایسی لغت تیار کرنے کی زیادہ اہلیت رکھتا تھا جو ویل کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کے استعمال میں آسکے۔

اکثر سننے میں آیا ہے کہ موضوع چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، لیکن جب یہ پھیلنا شروع ہوتا ہے تو بعض مصنفوں میں اس کے ساتھ ساتھ بلندی اور وسعت آتی چلی جاتی ہے۔ میں تو ویل کے متعلق لکھ رہا ہوں تو پھر میرا معاملہ کیا رہے گا؟ یہ کتاب لکھتے ہوئے میرے حروف اپنے آپ سے اپنے آپ بڑے بڑے اور شاندار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے تو رُخ کے پر کا قلم اور آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کی دوات چاہیے! دوستو، میرے بازوؤں کو سہارا دو، کیونکہ اس عفریت کے متعلق اپنے خیالات لکھتے ہوئے میری تو بری حالت ہو گئی ہے اور چکر آنے لگا ہے — ان خیالات کی ہمہ گیری اور ان کے پھیلاؤ کا دائرہ اتنا زبردست ہے کہ سارے علوم، ماضی، حال اور مستقبل کے سارے انسانی ادوار اور ماسٹوڈن کی نسلیں کی نسلیں، زمین پر سلطنتوں کے عروج و زوال کے سارے تماشے، بلکہ ساری کائنات اور اس کے مضافات بھی اس میں آ گئے ہیں۔ اگر موضوع بڑا ہو تو وہ ہر چیز کو بڑا کر کے دکھا دیتا ہے۔ ہم بھی پھیل کر اتنے ہی بڑے بن جاتے ہیں جتنا ہمارا موضوع۔ عظیم کتاب لکھنے کے لیے موضوع بھی عظیم ہی چننا چاہیے۔ پسو کے متعلق کوئی عظیم اور دیرپا کتاب نہیں لکھی جا سکتی، چاہے بہت سے لوگوں نے اس کی کوشش کی ہو۔

عجوبوں کا بیان شروع کرنے سے پہلے میں ایک ماہر حیاتیات ارض کی حیثیت سے اپنی اسناد پیش کر دوں میں حقیر و ناچیز
ہی سمجھا جاتا ہوں اور ختم نہیں، بنتی، بگڑتی، ٹوٹتی اور جڑتی ہوئی کے بعد ہی کھلتے ہیں پھر تمہید کے طور پر میں ایک بات یہ
بتانا چاہتا ہوں کہ چٹانوں کی قدیم ترین تہوں میں وہ خوفناک جانور دبے ہوئے ملتے ہیں جو اب بالکل ناپید ہیں جن چٹانوں کو تیسری
تہہ کہا جاتا ہے ان کے اندر جو حجریات ملے ہیں وہ لاکھوں سال پہلے کے جانوروں اور ان جانوروں کی درمیانی کڑی ہیں جن کے بچے
بچ رہے حضرت نوح کی کشتی میں داخل ہوئے تھے ایک جتنی مچھلیاں دریافت ہوتی ہیں وہ سب کی سب تیسرے دور کی ہیں
جو سب سے اوپر والی تہوں کے بننے سے ذرا پہلے آتا ہے۔ آجکل ویل کی جتنی قسمیں موجود ہیں یہ مچھلیاں ان سب سے بغیر
ہیں لیکن مچھلی اور پرندے سے ملتی جلتی ہیں۔ للہذا ہم انھیں ویلوں میں شامل کرنے میں حق بجانب ہیں۔

پچھلے تیس سال کے عرصے میں انسان کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی ویلوں کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے، ہڈیاں اور کھوپڑیاں،
لومبارڈی، فرانس، انگلستان، سکاٹ لینڈ، امریکہ اور دوسرے علاقوں میں وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب و غریب
ایک کھوپڑی کا ٹکڑا ہے جو ۱۷۷۹ء میں پیرس کی ایک سڑک میں سے کھود کے نکالا گیا تھا جو سیدھی بادشاہ کے محل کی طرف جاتی
تھی۔ اس کے علاوہ وہ چھوٹی ہڈیاں ہیں جو نپولین کے زمانے میں انٹورپ کی بندرگاہ کھودتے وقت نکلی تھیں۔ کوویئے کی رائے میں
یہ ٹکڑے کچھ ایسی قسم کی ویل کے ہیں جس سے آجکل لوگ واقف نہیں۔

مگر ان حجریات میں سب سے نادر چیز کسی ناپید ویل کا ایک مکمل اور زبردست ڈھانچا ہے جو ۱۸۴۲ء میں الاباما کے ایک زمیندار
کے کھیت میں ملا تھا۔ اس کھیت میں جو ضعیف الاعتقاد غلام موجود تھے ان پر اس ہیبت طاری ہوئی کہ سمجھے کسی راندۂ درگاہ
فرشتے کی ہڈیاں ہیں۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ یہ ایک بہت بڑا سانپ ہے لیکن جب نمونے کی ہڈیاں حجریات کے ماہر اوون کے
پاس انگلستان بھیجی گئیں تو پتا چلا کہ یہ سانپ نہیں بلکہ ویل ہے۔ مگر اس کا خاندان اب نیست و نابود ہو چکا ہے یہ اس حقیقت کی
ایک اہم مثال ہے جو اس کتاب میں بار بار دہرائی گئی ہے یعنی ڈھانچا دیکھ کر زندہ ویل کی شکل کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ اوون نے
لندن کی ایک علمی مجلس کے سامنے ایک مقالہ پڑھا اور بتایا کہ یہ ان انتہائی عجیب و غریب جانوروں میں سے ہے جنھیں کرۂ زمین کی
تبدیلیوں نے مٹا ڈالا ہے۔

جب میں ان عظیم الشان کھوپڑیوں، دانتوں، جبڑوں، پسلیوں اور ریڑھ کے مہروں کے درمیان کھڑا ہوتا ہوں
جو ایک طرف تو کچھ نہ کچھ موجودہ ویلوں سے مشابہ ہیں اور دوسری طرف حضرت آدم کے وقت سے بھی پہلے کے جانوروں
سے علاقہ رکھتے ہیں تو میں ایک سیلاب کی لہروں پر بہتا بہتا اس حیرت ناک زمانے میں جا پہنچتا ہوں کہ جب وقت کا بھی آغاز
نہ ہوا تھا کیونکہ وقت تو انسان کے ساتھ شروع ہوا ہے۔ اس وقت میرے چاروں طرف روزِ ازل کی دھند کا سیلاب ٹھاٹھیں
مارنے لگتا ہے اور میری کانپتی ہوئی نظروں کو وہ ابدیت دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگتی ہے کہ جب آجکل والے گرم ملکوں
میں برف کے پہاڑ تیرتے پھرتے تھے اور زمین کے پچیس ہزار میل لمبے محیط پر بالشت بھر جگہ ایسی نہ تھی جہاں کوئی رہ سکے اس
زمانے میں ساری دنیا ویل کی تھی۔ ہر جگہ اسی کی بادشاہت تھی اور وہ اس جگہ جھاگ اڑاتی پھرتی تھی جہاں آجکل اینڈیز اور ہمالیہ کے

سکتے ہیں۔ ایسا شجرۂ نسب کس کا ہوگا جیسا وہیل کا ہے! اب تک کے ہر بچے نے وہ خون گرایا ہے جو زمین کے خون سے بھی قدیم ہے۔ یہ
آخر شیخ سکول کا بچہ معصوم ہوتا ہے۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگتا ہوں کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا سام نظر آئے تو اس سے ہاتھ ملاؤں۔ میں
سوچ کر ہی تو حیرت کے مارے گم سم رہ جاتا ہوں کہ اس ہولناک جانور کی ابتدا کا پتا نہیں چلتا —— یہ وقت کے پیدا
ہونے سے پہلے بھی موجود تھی اور انسانی دور کے ختم ہونے کے بعد بھی موجود رہے گی۔

وہیل نے حضرت آدمؑ کے وقت سے بھی پہلے فطرت کی تصویروں میں اپنا نشان چھوڑا ہے۔ اور تصویروں میں اپنے نقشے بنائے ہیں
صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مصری تحقیقوں میں بھی اس کی قدامت انہیں ایک عجیب چیز کی کیفیت عطا کر دیتی ہے۔ وہیل کے پر کا نقشہ تھا
جو کوئی چار ہزار سال ہوئے مصر کے ایک عظیم مندر میں پتھر کی چھت پر ایک منقش گولا دریافت ہوا تھا جس کے اوپر عجیب و غریب
اور خیالی جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان جانوروں کے درمیان وہیل بھی تیر رہی ہے —— اس گولے پر حضرت [illegible]
کی پیدائش کے صدیوں پہلے سے تیر رہی ہے۔

طوفانِ نوحؑ کے بعد سے وہیل جس شکل میں موجود رہی ہے اس کی قدامت کی تصدیق ایک اور طرح بھی ہوتی ہے۔ اس
سلسلے میں حافظ بریک کے مشہور سیاح جون لیز کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

"سمندر کے قریب ہی ایک مندر ہے جس کے شہتیر وہیل کی ہڈیوں کے ہیں کیونکہ یہاں ساحل پر وہ قامت وہیلیں اکثر
مردہ پڑی ملتی ہیں۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے اس مندر کو یہ عجیب و پراسرار طاقت بخشی ہے کہ جو وہیل سامنے سے گزرے
گی وہ فوراً مر جائے گی لیکن اصل بات یہ ہے کہ مندر کے دونوں طرف پتھر اسی چٹانیں ہیں جو دو دو میل تک سمندر میں چلی گئی
ہیں اور وہیلیں ان سے ٹکرا کے زخمی ہو جاتی ہیں۔ مندر میں وہیل کی ایک پسلی محراب کے طور پر لگی ہے۔ یہ زمین پر اس طرح گڑی
ہے کہ مندر کا حصہ اوپر کی طرف ہے۔ یہ چیز ایک خواب سی بن گئی ہے اگر آدمی اونٹ کے اوپر بیٹھا ہو تو بھی اس کی چوٹی تک
نہیں پہنچ سکتا۔ کہتے ہیں کہ یہ پسلی کوئی سو سال سے یہاں پڑی ہے۔ اس ملک کے مورخوں کی رائے ہے کہ وہیل نے حضرت یونسؑ
کو اسی مندر کے پاس لاکے اگلا تھا۔"

میرے قاری! میں تمہیں وہیل کے اس افریقی مندر میں چھوڑ کے چلتا ہوں۔ اگر تم زین گنگ کے رہنے والے اور وہیل
کے شکاری ہو تو چپ چاپ اس مندر میں پوجا کرنے لگو گے۔

کیا وہیل کی جسامت کم ہو رہی ہے؟

• کیا وہیل فنا ہو جائے گی؟

وہیل ماہیت کے اعتبار سے جتنی بھاری ہو سکتی ہے ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہیل کی نسل انحطاط کی طرف تو مائل نہیں رہی۔ اور اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں اس کی جسامت تو کم نہیں ہو گئی۔

بلکہ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ تیسرے دور کی چٹانوں میں جو انسان کی پیدائش سے بہت پہلے کی ہیں، جو مجحر وہیلیں ملتی ہیں ان کے مقابلے میں آجکل کی وہیلیں کہیں زیادہ بڑی ہیں۔ بلکہ تیسرے دور میں بھی بعد کے زمانے کی وہیلیں شروع کے زمانے کی وہیلوں سے بڑی ہیں۔

حضرت آدمؑ کے زمانے سے پہلے کی جتنی وہیلیں ملی ہیں ان میں سب سے بڑی زیوگلوڈون تھی جس کا ذکر پچھلے باب میں ہوا۔ اور وہ ڈھانچے کی شکل میں ستر فٹ سے کم تھی۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری پیمائش کے حساب سے آجکل کی بڑی وہیل کا ڈھانچا بہتر فٹ نکلا ہے۔ میں نے وہیل کے شکاریوں کو کہتے سنا ہے کہ بعض روغنی وہیلیں ایسی بھی ہاتھ آئی ہیں جو سو فٹ کے قریب لمبی ہیں۔

آجکل کی وہیلیں زمانہ قبل از تاریخ کی وہیلوں سے بڑی سہی لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے ان میں انحطاط آ چلا ہو؟

اگر ہم پلینی جیسے لوگوں اور قدیم ماہرین حیوانات کے بیانوں پر اعتبار کریں تو یہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ کیونکہ پلینی ایسی وہیل کا ذکر کرتا ہے جس کی جسامت کئی کئی ایکڑ تھی اور ایلڈرو وانڈس نے بعض دوسری وہیلوں کا حال لکھا ہے جن کی لمبائی آٹھ سو فٹ تھی جیسے وہیلیں کیا پوری سڑکیں کی سڑکیں تھیں۔ بلکہ ابھی کچھ دن کی بات ہے کہ ڈنمارک کی عجائب گھر کے ایک رکن نے آئس لینڈ کی بعض وہیلوں کو ایک سو بیس گز یعنی تین سو ساٹھ فٹ کا بتایا ہے۔ فرانسیسی ماہر حیوانات لاسے پیڈ نے وہیلوں کی مفصل تاریخ کے صفحہ تین پر راست وہیل کی لمبائی تین سو اٹھائیس فٹ بیان کی ہے اور یہ کتاب ابھی ۱۸۲۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

لیکن کوئی شکاری ان قصے کہانیوں پر یقین کرے گا؟ نہیں۔ آجکل کی وہیل اتنی ہی بڑی ہے جتنی پلینی کے زمانے میں اس کے آبا و اجداد تھے۔ اگر میں کبھی وہاں گیا جہاں آجکل پلینی ہے تو میں وہیل کے شکاری کی حیثیت سے یہ بات اس کے منہ پر صاف کہہ دوں گا کیونکہ ایک جیسی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مصر کی حنوط شدہ لاشیں جو پلینی کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے دفن ہوئی تھیں لمبائی میں اتنی ہی ہیں جتنا آجکل امریکہ کا کوئی آدمی۔ مصر اور نینوا کی قدیم ترین تختیوں پر بنے ہوئے گائے بیل اور دوسرے جانوروں کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آجکل کے تنومند اور تندرست گائے بیل فرعون کی موٹی سے موٹی گائے سے بھی زیادہ چوڑے چکلے ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے میں کس طرح مان لوں کہ سارے جانوروں میں صرف

ہی کا انتظار ہوتا ہے۔ لیکن ابھی ایک سوال اور باقی رہتا ہے جسے عام طور سے جن لگت کے ذوق پسند لوگ اٹھاتے ہیں۔ آج یہ حال ہو چکا ہے کہ آدمی نے ہر رنگ کی دنیا کے ہر کونے کھدرے میں شکاری جہاز پہنچ چکے ہیں اور ان کی چاہ پر ہر دیو رہنے والے وہیل کی ایک رحجان سے واقف ہیں۔ بحر منجمد کے ساحلوں پر روزانہ سینکڑوں برچھے اور جال پھینکے جاتے ہیں۔ غرض وہیل کا اس بری طرح شکار ہو رہا ہے بلکہ ابھی گزرے دنوں اور انتظار کیا گیا ہے چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہیل کی نسل جلد ہی ختم ہو جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آخر کار وہیل بالکل ہی ختم ہو جائے۔ آخری انسان کی طرح آخری وہیل بھی اپنا آخری پائپ پی کر آخری کش کے ساتھ خود بھی دھواں بن کے اڑ جائے۔

ابھی چالیس سال کی بات ہے کہ الی نوائس اور مسوری کی چراگاہوں میں ہزاروں گوجر دار بھینسے پھرا کرتے تھے جس جگہ پہلے ان کی قطاریں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اور ان کی خوفناک چنگھاڑیاں گونجتی تھیں وہاں آجکل بڑے بڑے شہر آباد ہیں اور مذہب وہاں ایک ایکڑ فی ڈالر کے حساب سے زمین بکتی ہیں۔ اگر آپ ان بھینسوں کا مقابلہ وہیلوں سے کریں تو یہی نتیجہ مرتب ہوگا کہ شکاریوں کے ہاتھوں وہیل بھی جلدی ہی موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔

لیکن آپ کو اس معاملہ پر ہر نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تک الی نوائس میں بھینسوں کی آبادی شہروں میں انسانوں کی آبادی سے بھی زیادہ تھی لیکن آج اس علاقے میں ان کا ایک سینگ یا کھر تک باقی نہیں ہے اور اس ساری تباہی کی ذمہ داری انسان کے نیزے پر ہے لیکن وہیل کے شکار کی نوعیت مختلف ہے۔ اس لیے وہیل کا انجام ایسا عبرتناک نہیں ہو سکتا۔ اگر چالیس آدمی کسی جہاز میں اڑتالیس مہینے تک روغنی وہیل کا شکار کھیلتے رہیں اور چالیس مچھلیوں کو قتل کر ڈالیں تو وہ سمجھیں گے کہ ہم بہت کامیاب رہے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کریں گے۔ اس کے برخلاف کینیڈا کے پرانے شکاریوں کے دور میں کہ جب امریکہ کے مغرب کا سارا علاقہ ایک ویرانہ تھا اگر اتنے ہی آدمی اتنے ہی دن کشتیوں کے بجائے گھوڑوں پر سوار ہو کے شکار کھیلتے تو چالیس نہیں بلکہ چالیس ہزار بھینسے مارتے۔ اگر ضرورت پڑے تو یہ بات اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کی جا سکتی ہے۔

اگر آپ ٹھیک طرح غور کریں تو یہ بات بھی روغنی وہیل کی بتدریج تباہی کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اب سے پہلے پچھلی صدی کے آخری حصے میں وہیلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آجکل کی بہ نسبت زیادہ نظر آتی تھیں اور اسی لیے ان دنوں سفر اتنے طویل نہیں ہوتے تھے اور منافع بھی کہیں زیادہ ہوتا تھا جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے وہیلیں حفاظت کے خیال سے اب بڑے بڑے قافلے بنا کر چلتی ہیں چنانچہ پرانے زمانے کی ٹولیاں، ٹکڑیاں اور بکھری بکھرائی آوارہ گرد وہیلیں اب یکجا ہو کر زبردست فوجوں کی شکل اختیار کر گئی ہیں جو بہت بہت دن جدا اور ایک دوسرے سے دور نظر آتی ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اسی طرح یہ خیال بھی باطل معلوم ہوتا ہے کہ جن شکارگاہوں میں پہلے وہیلیں بڑی کثرت سے پائی جاتی تھیں اب وہاں بالکل نہیں جاتیں۔ لہٰذا یہ نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی گئی ہیں۔ اگر ایک ساحل پر ان کے فوارے دکھائی نہیں دیتے تو یقین رکھیے کہ اب کچھ دن سے یہ تماشہ کسی اور دور دراز ساحل پر ہو رہا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک ان وہیلوں کا تعلق ہے جن سے وہیل کی ہڈی ملتی ہے تو ان کے پاس دو ایسے محفوظ قلعے ہیں جو
کبھی فتح نہیں ہو سکتے۔ جس طرح سوئٹزرلینڈ کی وادیوں پر حملہ کیا جائے تو وہ لوگ پہاڑوں پر جا پہنچتے ہیں اسی طرح جب ان وہیلوں
کو خط استوا کے سمندروں کی وادی سے بھگا دیا جائے تو وہ آخر کار اپنے قطب شمالی والے قلعے میں جا پہنچیں گی اور شیشے جیسی
دیواروں کے نیچے فولاد جیسے برف کے دریاؤں اور گھٹنوں میں جا چھپیں گی۔ ان کا یہ حصار عافیت جہاں ہمیشہ دسمبر کا زمانہ
رہتا ہے، انسان کی دسترس سے باہر ہے۔

لیکن چونکہ ایک روغنی وہیل کے مقابلے میں پچاس پٹی دار وہیلیں شکار ہوتی ہیں، اس لیے بعض فلسفی قسم کے جہازیوں
کا خیال ہے کہ اس قتل عام نے ان کی تعداد بہت گھٹا دی ہے۔ لیکن حالانکہ صرف امریکہ کے شکاری ہی ہر سال کم سے کم اس
قسم کی تیرہ ہزار وہیلیں مارتے ہیں، مگر یہ بات بھی کوئی یقینی ثبوت نہیں، کیونکہ اس کے خلاف بھی کئی دلائل موجود ہیں۔

ہمیں اس بات کا یقین ذرا مشکل ہی سے آتا ہے کہ دنیا میں عظیم الجثہ جانوروں کی آبادی اتنی زیادہ ہو گی۔ بہرحال گوگے
مورخ ہارتو نے لکھا ہے کہ سیام کے بادشاہ نے ایک شکار میں چار ہزار ہاتھی مارے اور اس علاقے میں ہاتھی اتنے ہی
زیادہ ہوتے ہیں جتنے گرم ملکوں میں مویشی۔ ان ہاتھیوں کا شکار ہزاروں سال سے کھیلا جا رہا ہے یعنی سکندر، پورس،
ہنی بال اور مشرق کے سارے بادشاہوں نے ہاتھیوں کا شکار کھیلا ہے۔ مگر اس کے بعد بھی ہاتھی اتنی بڑی تعداد میں موجود
ہیں تو وہیل کے فنا ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ اس کے پاس ٹہلنے کے لیے تو بڑی چراگاہ موجود ہے جو ایشیا،
شمالی و جنوبی امریکہ، یورپ، افریقہ اور ہند کے سارے جزیروں کو ملا کر بھی ان سب سے دگنی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات بھی غور کے لائق ہے۔ کہتے ہیں کہ وہیل کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے اور وہ سو سال سے بھی زیادہ
کی ہو کے مرتی ہے۔ لہٰذا ایک وقت میں کئی بالغ نسلیں ایک دوسرے کی ہم عصر ہوتی ہوں گی۔ اگر آپ یہ فرض کر لیں کہ دنیا
بھر کے سارے قبرستانوں میں سے وہ سب مرد، عورتیں اور بچے جی اٹھیں جو پچھتر سال پہلے زندہ تھے اور
اس بے شمار ہجوم کو زمین کی موجودہ آبادی کے ساتھ شامل کر دیں تب جا کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس بات کے کیا معنی ہیں۔

چنانچہ ان سب باتوں کی بنا پر ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہیل انفرادی طور سے فانی سہی مگر نسل کے اعتبار سے
غیر فانی ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی لہروں پر تیرتی تھی کہ جب خشکی پانی سے الگ نہ ہوئی تھی۔ وہ اس جگہ تیر چکی ہے جہاں
آجکل ونڈسر کاسل اور کریملن آباد ہیں۔ طوفان نوح میں اسے حضرت نوح کی کشتی کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ اگر چوہے مارنے
کے لیے خدا نے ہالینڈ کی طرح دنیا میں بھی ایک دفعہ پھر طوفان بھیجا تو لافانی وہیل اس سے بھی بچ نکلے گی اور سیلاب کی
سب سے اونچی لہر پر بیٹھی اپنا فوارہ چھوڑ کر آسمانوں کا مذاق اڑاتی رہے گی۔

بڑھئی

زحل کے چاندوں کے درمیان سلطان کی طرح بیٹھ کے انسان کو تجریدی طور سے دیکھیے تو وہ ایک عجوبہ نظر آئے گا —— شان و شوکت اور درد و غم کا مجموعہ معلوم ہوگا۔ لیکن اسی جگہ سے انسانوں کو مجموعی طور پر دیکھیے تو وہ بس بار بار دہرائی گئی غیر ضروری نقلیں دکھائی دیں گے۔ پیکوڈ کا بڑھئی بہت ہی معمولی قسم کا آدمی تھا، اسے انسان کے مثالی تصور کا نمونہ تو کسی طرح بھی نہیں سمجھا جا سکتا لیکن وہ کسی دوسرے آدمی کی نقل نہ تھا۔ اسی لیے وہ اب بنفس نفیس آپ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔

جہازوں کے، خصوصاً شکاری جہازوں کے سارے بڑھئیوں کی طرح یہ بھی عملی طور پر ایک حد تک اپنے پیشے سے متعلق بہت سے کاموں میں ماہر تھا، کیونکہ بڑھئی کا پیشہ تو ایک قدیم درخت کا تنا ہے جس میں سے ان تمام صنعتوں کی شاخیں نکلی ہیں جہاں لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ خیر یہ بات تو سارے ہی بڑھئیوں پر صادق آتی ہے، لیکن پیکوڈ کا بڑھئی ان ہزاروں بے نام ضرورتوں میں بھی کار آمد ثابت ہوتا تھا۔ جو غیر مہذب اور دور دراز سمندروں میں تین چار سال کے سفر پر نکلنے والے جہاز کو درپیش آتی ہیں۔ وہ اپنے عام فرائض تو خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہی تھا —— مثلاً شکستہ کشتیوں کی مرمت، ٹوٹی ہوئی پتواروں کی درستی، بگڑی ہوئی شکل کے ڈنڈوں کی اصلاح، عرشے کے تختوں میں سوراخ کرنا یا کیلیں لگانا اور اپنے پیشے کے متفرق کام، لیکن ساتھ ساتھ وہ جہاز کے بیسیوں کام کرنے سے بھی نہ گھبراتا تھا جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہ ہو۔

اس کی یہ تمام سرگرمیاں ایک بہت بڑی لمبی سی بھدی میز کے اوپر انجام پاتی تھیں جس میں لکڑی اور لوہے کے چھوٹے بڑے کئی شکنجے لگے ہوئے تھے۔ جہاز کے ساتھ وہیل بندھی ہوئی ہو تو اور بات ہے، ورنہ یہ میز روغن پگھلانے کی بھٹیوں کے پیچھے رسیوں سے بندھی رہتی تھی۔

کھونٹا بہت بڑا ہے اور سوراخ میں نہیں آتا۔ بڑھئی اسے فوراً شکنجے میں کس کے ریتی سے چھوٹا کر دیتا ہے۔ کوئی عجیب و غریب پروں والا ساحلی پرندہ راستہ بھول کے جہاز میں آ جاتا ہے اور پکڑ لیا جاتا ہے۔ رائٹ وہیل کی چکنی ہڈیاں اور اسپرم وہیل کی ہڈی کی سلائیوں سے بڑھئی اس کے لیے مندر کی شکل کا پنجرہ تیار کر دیتا ہے۔ ایک پتوار چلانے والے کی کلائی میں موچ آ گئی ہے —— بڑھئی مرہم گھوٹ کے دے دیتا ہے۔ اسٹب چاہتا ہے کہ اس کی ہر پتوار پر شنگرفی رنگ کے ستارے بنے ہوئے ہوں۔ بڑھئی ہر پتوار کو لکڑی کے شکنجے میں جکڑ کے ترتیب وار ستارے بنا دیتا ہے۔ ایک ملاح کو اچانک شوق ہوتا ہے کہ شارک کی ہڈی کے بندے پہنوں —— بڑھئی اس کے کان چھید دیتا ہے۔ ایک اور آدمی کے دانت میں درد ہو رہا ہے —— بڑھئی زنبور نکال لاتا ہے اور ایک ہاتھ میز پر رکھ کے اس آدمی سے کہتا ہے کہ بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہ عمل جراحی ختم بھی نہیں ہوا کہ وہ بیچارہ بے اختیار کسمسانے لگتا ہے۔ بڑھئی لکڑی کا شکنجہ گھماتے ہوئے اشارے سے کہتا ہے کہ اگر اپنا دانت نکلوانا چاہتے ہو تو جبڑا شکنجے میں رکھ دو۔

غرض یہ بڑھئی ہر کام کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کے دل میں کسی چیز کا احترام نہ تھا اور وہ کُلّی بے نیازی برتتا تھا۔ اس کی نظر میں دھات، ہڈی کے ٹکڑے تھے، ہر لکڑی کے کندے اور انسانوں کو وہ ایک طرح سمجھتا تھا، چونکہ وہ اپنے مختلف کاموں کو بہتر تھا اور اسے ہر چیز میں کمال حاصل تھا، لہٰذا آپ سمجھیں گے کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا بھی مالک ہو گا لیکن یہ بات نہیں۔ اگر اس میں کوئی چیز عجیب و غریب تھی تو اس کا غیر شخصی قسم کا احساس تھا، جس نے اس چیز کو غیر شخصی بنا دیا تھا کیونکہ یہ آس پاس کی لامحدود فضا میں اس طرح جذب ہو جاتی تھی جیسے ساری کائنات کی عام بے حسی میں گھل مل گئی ہو ——— اس بے حسی میں جو جزوی طریقے سے جھلک دیتی ہے لیکن اپنا اسکرین کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اور چاہے آپ گرجا کی بنیاد رکھ رہے ہوں لیکن آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ بجز بڑھئی کی اس بے تو فنک بے حسی میں ایک شوخ و شنگ بے دردی شامل تھی لیکن کبھی کبھی ایک بدھی ٹھنڈی گھٹیا سی مزاری اور کاٹ کھانے والی مسخری بھی شامل تھی جس میں وقتاً فوقتاً ایک بے تکی ظرافت کا رنگ بھی ہوتا۔ یہ کچھ اس قسم کی ظرافت تھی جو حضرت نوح کی کشتی میں آدھی رات کو پہرے کا وقت گزارنے کے لیے استعمال ہوتی ہو گی، لیکن یہ بات تو صحیح تھی کہ اس بڈھے بڑھئی کی طرز زندگی میں گزری ہو اور اس وقت زندگی میں کچھ جمع ہو گیا ہو، رگڑ کھا کر جو کچھ اس نے بھی ملیامیٹ ہو گیا ہو، وہ ایک برہنہ تجرید تھا جس کا سارا گوشت پوست اتار دیا گیا ہو۔ وہ ایک ایسا عدد صحیح تھا جس کی کسور رد ہو چکا ہو۔ وہ ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ملاقی سے پاک تھا۔ اس کا اس دنیا یا اس دنیا سے کوئی پہلے سے سوچا سمجھا ہوا رشتہ نہ تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملاقی سے یہ بے نیازی ذہانت کی بے خبری کے سبب ہے کیونکہ اپنے مختلف کام وہ نہ تو عقل کی مدد سے کرتا تھا نہ جبلّت کی مدد سے، نہ اس لیے کہ اس نے یہ کام سیکھا تھا، نہ ان سب چیزوں کی مساوی یا غیر مساوی آمیزش کے ذریعے۔ وہ تو اپنا کام اس طرح کرتا تھا جیسے کوئی گونگا اور بہرا عمل خودبخود جاری ہو۔ وہ تو بس کام کرنے کی مشین تھا۔ اگر اس کے پاس ذہن تھا بھی تو وہ شروع میں ہی اس کی انگلیوں کے عضلات میں گھل گیا ہو گا۔ وہ تو خفیف کی سی ہوتی اس بے عقل مگر اشتہاء کارآمد چیز کی طرح تھا جو باہر سے تو ایک موٹے سے ... معلوم ہوتی ہے، لیکن جس کے اندر نہ صرف چھوٹے بڑے چاقو بلکہ پیچ کش، ریلنے، زنگ چوٹیاں ساری رہتی ہیں، برما اور کارک نکالنے کا پیچ، غرض دنیا کی ہر چیز بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اس کے افسر بڑھئی کو پیچ کش کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تو بس وہ منہ کھول دیتے اور پیچ کس جاتا۔ اگر کسی چوٹی کی ضرورت پڑتی تو اسے ٹانگیں پکڑ کے اٹھا لیا جاتا اور کسی چوٹی موجود۔

بہرحال جیسے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے یہ ... کا کھلنے اور بند ہونے والا بڑھئی محض ایک خود بخود چلنے والا مشین نہ تھا۔ اس کے اندر عام انسانوں جیسی روح نہ سہی لیکن کوئی پُراسرار چیز ضرور تھی جو معلوم کس طرح اپنے کے فرائض انجام دیتی تھی، خدا جانے یہ چیز پارے کا جوہر تھی یا ہرن کے سینگ کا سفوف۔ بہرحال کچھ نہ کچھ چیز تھی ضرور، جو ساٹھ سال سے تھی۔ یہ نامعلوم چیز اس کی زندگی کا لطیف جوہر تھی، اسی چیز کی بدولت وہ زیادہ وقت اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا ——— لیکن اس طرح جیسے کوئی بے عقل پہیا چلتے ہوئے گھوں گھوں کرتے ہوئے بلا رہتا ہو یا یوں سمجھیے کہ اس کا جسم پہرے داری کی کوٹھری تھا اور یہ بولنے والا پہرے دار جو اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لیے بولتا رہتا تھا۔

اہاب اور بڑھئی

عرشہ ——— رات کا پہلا پہر۔

بڑھئی اپنی میز کے سامنے کھڑا ہے اور دو لالٹینوں کی روشنی میں ٹانگ بنانے کے لیے ہاتھی دانت کی ہڈی کو ریت رہا ہے جو شکنجے میں کسی ہوئی ہے۔ ہڈی کے ٹکڑے، چمڑے کے تسمے، گدیاں، پیچ اور مختلف قسم کے اوزار میز کے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ آگے کی طرف بھٹی کے شعلے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاں لوہار کام کر رہا ہے۔

اس ریتی کی ایسی کی تیسی! اس ہڈی کی ایسی کی تیسی! جو چیز نرم ہونی چاہیے وہ سخت ہے اور جو چیز سخت ہونی چاہیے وہ نرم ہے۔ پرانے جبڑوں اور پنڈلی کی ہڈیوں کو ریتنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ لاؤ کوئی اور ریتی اٹھا کے دیکھیں۔ ہاں یہ ذرا ٹھیک چل رہی ہے (چھینکتا ہے) ادھر یہ ہڈی کا برادہ (چھینکتا ہے) ——— ارے یہ تو (چھینکتا ہے) ——— ہاں یہ تو (چھینکتا ہے) مجھے تو بولنے بھی نہیں دیتا! مردہ لکڑی کو چیرنے کا یہی انعام ملتا ہے۔ جیتے جاگتے درخت کو چیرو تو ایسا برادہ نہیں اڑتا۔ زندہ ہڈی کاٹو تو ایسا برادہ نہیں اڑتا (چھینکتا ہے) ارے اسے۔ ذرا اے لوہار جلدی کرو، کام میں جلدی ہاتھ لگا لو۔ ذرا وہ ڈنڈا اور پیچ اٹھا کے دے۔ ابھی ان کی ضرورت پڑے گی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے (چھینکتا ہے) کہ گھٹنے کا جوڑ نہیں بنانا پڑ رہا۔ اس میں تو الجھن ہوتی ہے۔ بس پنڈلی کی ہڈی ——— اسے بنانا تو اتنا ہی آسان جتنا کھمبے گاڑنا۔ البتہ خوب چمکانا پڑے گا۔ وقت، وقت، اگر وقت ہوتا تو میں اس کے لیے ایسی صاف ستھری ٹانگ بنا کے دیتا کہ ایسی ٹانگ تو (چھینکتا ہے) دیوان خانوں میں کسی بیگم کے سامنے نظر آتی ہو گی۔ میں نے دکانوں کی کھڑکیوں میں ہرن کی کھال کی ٹانگیں اور پنڈلیاں دیکھی ہیں۔ وہ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ان میں تو پانی جذب ہوتا ہے۔ پھر انہیں گٹھیا بھی ہو جاتی ہے اور زندہ ٹانگوں کی طرح (چھینکتا ہے) ان کا بھی دوا کے پانی سے علاج کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک، اسے چیرنے سے پہلے بادشاہ سلامت کو بلا کے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ لمبائی درست ہے یا نہیں۔ کچھ چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ آہا، ان کی ایڑی کی چاپ آ رہی ہے۔ آج صبح ہم کسی اچھے آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ وہ خود آ گئے۔ یا کوئی اور ہو گا۔ آواز تو ضرور کسی کی تھی۔

اہاب [آگے بڑھتے ہوئے]

[مندرجہ ذیل منظر میں بڑھئی وقتاً فوقتاً چھینکتا رہتا ہے]

کیوں بھئی انسان بنانے والے!

حضور، آپ بڑے وقت سے آئے۔ اگر کپتان صاحب اجازت دیں تو میں لمبائی دیکھ لوں۔ حضور، ناپ لے لوں؟

ٹانگ بنانے کے لیے اب لکڑی جا رہی ہے۔ بہت خوب۔ پیر اس سے پہلے ہی تیار ہو چکا ہے۔ ٹھیک ہی ہے۔ ہاں، ذرا اپنی انگلی وہیں رکھو، ارے بھئی بڑھئی تمہارا تجزیہ تو بہت کام کا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی اس کی کیا شکل ہے۔ ٹھیک ٹھیک، یہ تو پتلی کا تسمہ ہے۔

جی حضور۔ یہ تو پوری کاٹ دیتا ہے ——— ذرا ہوشیار رہیے گا!

ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اچھی گرفت پسند ہے۔ اس دنیا میں بڑی کشمکش ہے۔ ہیں تو اسی چیز کو چاہتا ہوں جس کی پکڑ مضبوط ہو۔ وہ پرومی تھیوس کیا کر رہا ہے ——— میرا مطلب ہے وہاں ——— وہ کیا کر رہا ہے؟

جی بکسوے کا پیچ تیار کر رہا ہو گا۔

ٹھیک۔ یہ بھی سانچے کا کام ہے۔ رفتہ رفتہ کام ہو سکتا ہے۔ اس کی بھٹی میں سے بڑے لال لال شعلے نکل رہے ہیں۔

جی حضور! اس کا کام بہت باریک ہے اس لیے بڑی تیز آگ چاہیے۔

ہوں! ہوں۔ واقعی تیز آگ چاہیے۔ کہتے ہیں کہ انسانوں کو پرومی تھیوس نے بنایا ہے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ وہ چور تھا اور اس نے انسانوں میں آگ کے ذریعے جان ڈالی تھی کیونکہ جو چیز آگ کے اندر بنائی جاتی ہے دراصل وہ آگ کی ہی چیز ہے۔ لہٰذا جمز کا نظریہ درست ہے کہ یہی کالونس ٹھیک ہی ہے۔ پرومی تھیوس نے افریقہ کے لوگوں کو بھی بھٹ سے بنایا ہوگا۔ بڑھئی جب یہ بکسوا تیار کرے تو اس سے کہنا کہ وہ جھٹکے والا ہنر بنا دے۔ ایک پھیری والا ایسا ہے جس کی کمر بوجھ کے مارے ٹوٹی جا رہی ہے۔

حضور ——— ؟

ٹھہرو۔ اب پرومی تھیوس نے کام شروع کیا ہے تو میں ایک پورا آدمی بنواؤں گا اور ایک بہت لطیف نقشے کے مطابق، یعنی ——— پچاس فٹ کا قد، سینہ جہاز بانس کی طرح، ٹانگوں میں جڑیں تاکہ ایک جگہ قائم رہیں۔ پاؤں تین فٹ چوڑے، دل غائب، پیتل کا تھا اور پیشانی اکڑ کا دماغ۔ اچھا ذرا دیکھوں تو سہی ——— باہر دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی بنواؤں! انہیں سر کے اوپر ایک روشندان بنا دو تاکہ اندر اجالا رہے۔ چلو میرا حکم ہے۔ بنانا شروع کر دو۔

اسے دوسری طرف کر کے، ارے یہ کیا باتیں کر رہا ہے اور کس سے باتیں کر رہا ہے؟ میں یہاں کھڑا ہوں کہ جاؤں؟ ایک اندھا گنبد بنانے میں کیا رکھا ہے۔ ایک یہاں بھی ہو تو ہے۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ مجھے لالٹین چاہیے۔

ارے اور ٹھیک ہے حضور۔ یہاں وہ لالٹین ہیں، میرا ایک سے کام چل جائے گا۔

ارے، تو یہ چور پکڑنے کا آلہ میرے منہ میں کیوں ٹھونسے دے رہا ہے۔ بگھی کے اوپر روشنی ٹھونسنے سے تو بہتر ہے کہ دکھاوا اچھا ——— حضور، میں سمجھا آپ بڑھئی سے کہہ رہے ہیں۔

بڑھئی، بیٹھی کو ——— ٹھیک نہیں ——— بڑھئی، تم تو بڑا صاف ستھرا اور شریفانہ کام کرتے ہو ——— کیا تم بھی کام شروع کرنا چاہتے ہو؟

حضور! —— جی! جی حضور! یعنی کچی مٹی کا کام تو ہم نے کمہاروں کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔

یہ شخص بڑی مزیدار باتیں کرتا ہے! تو ٹھیک کیوں رہا ہے؟

حضور! مٹی میں سے خاک اڑتی ہے۔

اسی بات سے سبق حاصل کر، جب تو مرے تو جیتے جاگتے آدمیوں کے سامنے دفن مت ہونا۔

حضور! —— ادھر آ! —— جی، ٹھیک ہے —— ہاں —— ادھر!

ارے بڑھئی، ادھر دیکھو تو اپنے آپ کو بڑا اچھا کاریگر سمجھتا ہے! تیری کاریگری تو اس وقت ثابت ہوگی کہ جب میں تیری بنائی ہوئی ٹانگ لگاؤں تو اسی جگہ ساتھ ساتھ دوسری ٹانگ بھی لگی ہوئی محسوس ہو —— یعنی میری ضائع شدہ ٹانگ —— گوشت پوست کی ٹانگ۔ کیا تو اس بھوت کو بھگا نہیں سکتا؟

جی حضور! اب میں کچھ کچھ سمجھا۔ ہاں، میں نے اس سلسلے میں ایک بڑی عجیب بات سنی ہے یعنی جس آدمی کی ٹانگ ضائع ہو جائے اس کے دل سے پرانی ٹانگ کا احساس کبھی نہیں جاتا بلکہ اسے برابر ستاتا رہتا ہے۔ گستاخی معاف حضور! کیا یہی بات ہے؟

ہاں، یہی بات ہے۔ اچھا دیکھو، اپنی زندہ ٹانگ وہاں رکھ دے جہاں ایک زمانے میں میری ٹانگ تھی۔ اب آنکھوں کو تو بس ایک ٹانگ نظر آ رہی ہے، لیکن روح دو ٹانگیں دیکھ رہی ہے۔ جس جگہ تو زندگی کی دھڑکن محسوس کر رہا ہے بالکل وہیں میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ کیا یہ کوئی معمہ ہے؟

حضور، مجھے تو پہیلی معلوم ہوتی ہے۔

اچھا تو سن۔ تجھے کیا معلوم کہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہیں کوئی جیتی جاگتی اور سوچنے والی چیز بھی کھڑی ہو لیکن نہ تو نظر آتی ہو اور نہ تیرے وجود میں جذب ہوتی ہو!

ہاں، تیرے بارے میں وہیں کھڑی ہو؛ جس وقت تو اکیلا ہوتا ہے، کیا تجھے ڈر نہیں لگتا کہ دیوار کے پیچھے کہیں کوئی آدمی نہ ہو؟ حضور! ابھی بول مت۔ حالانکہ میری ٹانگ کو ضائع ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، لیکن میں اس کا دکھ آج تک محسوس کرتا ہوں۔ تو پھر بڑھئی، تو جسم کی مدد کے بغیر جہنم کے عذاب کیوں نہیں محسوس کر سکتا؟ بول!

توبہ! جی ہاں، حضور، اگر یہی بات ہے تو مجھے ایک بار پھر حساب لگانا پڑے گا۔ حضور، میرا خیال ہے کہ میں ایسا بدھو نہیں ہوں۔

ادھر دیکھو! بعض لوگوں کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے انھیں بحث میں نہیں پڑنا چاہیے —— یہ ٹانگ کتنی دیر میں تیار ہوگی؟

کوئی گھنٹہ بھر میں، حضور۔

اچھا، تو اپنی کٹ کٹ کر اور ٹانگ بنا کے میرے پاس لے آ۔ (چلنے کے لیے مڑتا ہے) ہائے، زندگی! میں

یونانی دیوتاؤں کی طرح مغرور ہوں ابھی کھڑے ہونے کے لیے ایک ہڈی کی خاطر اس احمق کا احسان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ لعنت
ہو انسانوں کی اس بدبو دار احسان مندی پر جو ہیں کھاتوں کو ختم نہیں ہونے دیتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہوا کی طرح آزاد ہوں
لیکن میرا نام دنیا بھر کے ہی کھاتوں میں لکھا ہوا ہے۔ میں انتظار میں ہوں کہ کبھی وقت روم کی سلطنت یعنی دنیا بھر کا مالک ہوا
تھا۔ میں اب ایک اور آدمی کے مقابلے میں بول بول سکتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ میں جس زبان سے شیخیاں بگھار
رہا ہوں اس کے لیے کسی اور کا احسان مند ہوں۔ خدایا! میں تو ایک کھائی سے اس کے اندر کود جاؤں گا اور گل گل
کے اس ایک چھوٹا سا اور بے گھر ہو جاؤں گا۔ بس یہی ٹھیک ہے۔

بڑھئی (دوبارہ کام شروع کرتے ہوئے)

خوب، خوب، خوب! اے اسٹب سب سے اچھی طرح جانتا ہے۔ اور اسٹب ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ بڑا عجیب
آدمی ہے۔ اس کی نظر سے لفظ کے سوا اور کچھ کہتا ہی نہیں۔ اسٹب کہتا ہے کہ یہ بڑا عجیب آدمی ہے —— عجیب آدمی ہے۔
—— عجیب، عجیب۔ وہ مسٹر اسٹاربک کے سامنے ہر وقت یہی شور مچاتا رہتا ہے —— بڑا عجیب آدمی ہے عجیب
عجیب، عجیب، بڑا عجیب اور یہ اس کی ٹانگ ہے! ہاں، اب مجھے خیال آیا، یہ تو اس کے ساتھ سوتی ہے
بیل کے جبڑے کی ہڈی اس کی بیوی ہے! اور یہ اس کی ٹانگ ہے وہ اس کے سہارے کھڑا ہو گا۔ وہ اس سے کیا بات کہتی
تھی کہ ایک ٹانگ تین جگہ کھڑی ہے اور تینوں جگہیں ایک جہنم میں کھڑی ہیں —— وہ کیا بات تھی؟ اوہو! اس نے
مجھے بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا ہو گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ میں بڑی عجیب سی باتیں سوچنے لگتا ہوں مگر میں تو کچھ
گزرا سا جاتا ہوں۔ پھر مجھ جیسے ٹھگنے اور بڈھے آدمی کو لیے تڑنگے اور مضبوط کپتانوں کے ساتھ گہرے پانیوں میں نہیں
اترنا چاہیے۔ پانی پلک جھپکتے میں ٹھوڑی کے نیچے پہنچتا ہے اور پھر بڑی توبہ کرنے کے ہوتی ہے۔ او یہ ٹانگ ہی لگی!
بگلے کی ٹانگ کی طرح لمبی اور پتلی۔ عام طور سے لوگوں کے لیے عمر بھر کو دو ٹانگیں کافی ہوتی ہیں، اور یہ اس وجہ سے کہ وہ
انھیں ایسی نرم دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے کوئی بڈھی بیگم اپنے پرانے گھوڑوں کو چلایا کرتی ہے —— یہ بڑا بے ڈھب
کو جوان ہے، اس نے ایک ٹانگ کو تو چلا چلا کے مار ڈالا اور دوسری میں عمر بھر کے لیے چوٹ لگا کر لنگڑا کر دیا۔ اور اب
لیتوں میں گھی ہوئی ہڈی کی ٹانگیں پہنے پھرتا ہے۔ ارے اسٹب ادھر گیا! بیچ لگنے میں تو تو ذرا دیر کر۔ لا اسے جلدی
سے پورا کر۔ ورنہ قیامت والا بچا ہوتا ہے اصل اور نقل سب طرح کی ٹانگیں جمع کرنے آ جائے گا جیسے پھیری والے شراب
کے پرانے پیپے اکٹھے کرتے پھرتے ہیں تاکہ انھیں پھر سے بھر دیا جائے۔ کیسی عجیب ٹانگ بنی ہے! بالکل جیتی جاگتی اور
اصل ٹانگ لگتی ہے جیسے اس میں گودا ہی گودا بھرا ہو۔ کل وہ اس ٹانگ پر کھڑا ہو گا اور اس کے اوپر اپنا حساب لگا
رہا ہو گا۔ اوہو! میں وہ چکنی تختی تو بنانا بھول ہی گیا جس پر وہ طول البلد کا حساب لگاتا ہے۔ ٹھیک ہے، چلو
چھینی، ریتی اور ریگ مال لاؤ!

باب-۱۰۹

اہاب اور اسٹاربک

کپتان کے کمرے میں!

اگلے دن صبح کو دستور کے مطابق جہاز میں سے پانی نکالا جا رہا تھا کہ تہہ میں دیکھا پانی میں تیل کی کافی مقدار ملی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نیچے رکھے ہوئے پیپوں میں سوراخ ہو گیا۔ اب تو لوگوں کو فکر پڑ گئی۔ اور اسٹاربک اس حادثے کی اطلاع دینے کپتان کے کمرے میں گیا۔

اب پیکوڈ جنوب اور مغرب کی طرف سے چل کے فارموسا اور باشی جزیروں کے قریب آ رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک راستہ ہے جو چین کے سمندر سے بحر الکاہل کو جاتا ہے۔ چنانچہ اسٹاربک نے دیکھا کہ اہاب کے سامنے مشرق کے جزیروں کا ایک نقشہ پھیلا ہوا ہے۔ اور ایک دوسرے نقشے میں جاپانی جزائر کا طویل مشرقی ساحل نظر آ رہا ہے۔ اہاب نے اپنی سفید ہڈی کی ٹانگ میز کی ٹانگ سے جوڑ رکھی تھی اور ایک لمبے کی شکل کا چاقو ہاتھ میں لیے اور دروازے کی طرف سے منہ پھیرے یہ بیٹھا ہوا بڈھا تھا بھنویں بل ڈال کر اپنے سفر کا راستہ مقرر کر رہا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے پیروں کی چاپ سن کر کہا۔ "ابھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ بھاگ جاؤ!"

"کپتان اہاب! آپ سمجھے نہیں۔ یہ تو میں ہوں جناب۔ کوٹھری میں رکھا ہوا تیل لیک رہا ہے۔ ہمیں کسی بندرگاہ پر ٹھہر کے پیپوں کی مرمت کرا لینی چاہیے۔"

"کسی بندرگاہ پر ٹھہر کے مرمت کرا لینی چاہیے؟ یعنی جاپان کے قریب پہنچ کر بھی ایک ہفتہ ٹھہریں اور ان پرانے کنستروں پر وقت ضائع کریں؟"

"اگر آپ مرمت نہیں کرائیں گے تو ایک دن میں اتنا تیل ضائع ہو جائے گا جس کی کمی ہم سال بھر میں بھی پوری نہ کر سکیں گے۔ جس چیز کو لینے ہم بیس ہزار میل چل کر آئے ہیں اس کی تو حفاظت کرنی چاہیے، جناب۔"

"ہاں، واقعی حفاظت کرنی چاہیے، اگر شکار مل جائے۔"

"جی، میں تو کوٹھری کے تیل کا ذکر کر رہا تھا جناب۔"

"لیکن میں تیل کے بارے میں تو بات کر رہا ہوں نہ سوچ رہا ہوں۔ بھاگ جاؤ! ٹپکنے دو! میں خود ٹپک رہا ہوں۔ ہاں! ٹپکنے میں ٹپکا ہے! ایک تو ٹپکنے والے پیپے اور وہ بھی ٹپکنے والے جہاز میں رکھے ہوئے۔ پیکوڈ کی حالت ایسی خراب کہاں ہے؟ لیکن اس کے باوجود میں مرمت کرانے کے لیے نہیں ٹھہروں گا کیونکہ ایسے لدے پھندے جہاز کے چندے میں سوراخ کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہے اور اگر مل بھی جائے تو زندگی کے اس طوفان میں مرمت کہاں ہو سکتی ہے! اسٹاربک! میں کسی بندرگاہ پر نہیں ٹھہروں گا۔"

"جناب، جہاز کے مالک کیا کہیں گے؟"

"مالکوں کو نین ٹکٹ کے ساحل پر کھڑے چیخنے چلانے دو۔ ایہاب کو اس کی کیا پروا ہے؟ مالک، مالک۔ اسٹاربک تم نے ان کو بس مالکوں ہی کی رٹ لگا رکھی ہے جیسے وہ لوگ میرا ضمیر ہوں۔ لیکن ادھر دیکھو —— ہر چیز کا اصل مالک بس اس کا کمانڈر ہے۔ میرا ضمیر اس جہاز کے پیندے میں ہے —— بھاگ جاؤ!"

"کپتان ایہاب!" میٹ نے آگے بڑھتے ہوئے سرخ ہو کر کہا۔ اس کی جسارت بھی اتنی محتاط اور مودب بھی کہ نہ تو اپنا خوف اظہار ہونے دے رہی تھی اور نہ آگے اپنے اوپر اعتماد معلوم ہوتا تھا۔ "ہم لوگ آپ کی بہت سی باتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو اگر کسی نوجوان اور درشت کلام شخص سے سرزد ہوں تو بہت بری لگیں۔"

"منحوس، کیا تجھے یہ ہمت ہوئی کہ میرے اوپر نکتہ چینی کرے —— بھاگ یہاں سے!"

"نہیں، جناب نہیں، ابھی نہیں۔ مہربانی فرما کر ایک بات سن لیجیے۔ میں اتنی جسارت تو ضرور رکھتا ہوں کہ —— آپ کے ساتھ تحمل سے کام لوں، کپتان صاحب۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اور میں ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں؟"

ایہاب نے کھونٹی پر سے بندوق اتاری اور اسٹاربک کی طرف اٹھا کے چلایا —— "ساری زمین کا آقا بس ایک خدا ہے، اور پیکوڈ کا آقا بس ایک کپتان ہے —— بھاگ جاؤ!"

میٹ کی شعلہ بار آنکھوں اور آتشیں رخساروں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے گولی لگ چکی ہو لیکن اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ باہر جاتے ہوئے وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور کہنے لگا —— "جناب، آپ نے میری ہتک نہیں کی بلکہ مجھے پیروں سے روندا ہے لیکن میں اس کے بدلے میں یہ نہیں کہتا کہ اسٹاربک سے ہوشیار رہیے گا۔ یہ بات سن کے تو آپ ہنس پڑیں گے لیکن ایہاب کو ایہاب سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ بڈھے اپنے آپ سے ہوشیار رہو۔"

اسٹاربک چلا گیا تو ایہاب منہ ہی منہ میں بولا "بڑا بہادر بنتا ہے لیکن ساتھ ساتھ حکم بھی مانتا ہے۔ اس کی بہادری بھی عقلمندی سے خارج نہیں۔ ہاں، وہ اس نے کیا کہا تھا؟ —— ایہاب کو ایہاب سے ہوشیار رہنا چاہیے —— یہ تو واقعی ایک بات ہے!" پھر وہ بے خبری کے عالم میں تیوریاں چڑھائے اور بندوق کو عصا بنائے کیبن میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں چہرے کی تیوری اتر گئی اور وہ بندوق ٹانگ کے باہر عرشے پر چلا گیا۔

"اسٹاربک، تو بڑا ہی نیک دل آدمی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا پھر آواز بلند کر کے جہازیوں سے کہنے لگا —— "ہمیں پیپوں کی مرمت کرانی ہے۔ سارے بادبان کھول دو اور جہاز کو تیز چلاؤ۔"

یہ قیاس آرائی فضول ہے کہ اسٹاربک کے سلسلے میں ایہاب نے یہ حرکت کیوں کی۔ ممکن ہے تھوڑی دیر کے لیے اس کی دیانتداری نے اپنا زور دکھایا ہو یا شاید یہ مصلحت اندیشی ہو کیونکہ ان حالات میں یہ بات مناسب نہ تھی کہ اس کے جہاز کا ایک بڑا افسر کھلم کھلا اپنی ناراضی کا اظہار کرے۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو، اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور سارے بادبان پھیلا دیے گئے۔

تھیں۔ ان میں ایک عجیب نرمی اور چمک آ گئی تھی۔ کوئی کو ینگ اپنی بیماری کے باوجود لوگوں کی طرف بڑی ملائم اور گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ آنکھیں اس کی ذہنی اور دلی صحت مندی کی علامت تھیں۔ چونکہ آنکھیں سرخ تھیں اور وہ کم ہو چکی تھی جس طرح پانی کے اوپر دائرے ہلکے پڑنے لگتے ہیں تو پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس کی آنکھیں بھی ابدیت کے حلقوں کی مانند گول ہوتی جا رہی تھیں۔
آپ اس گھٹتے ہوئے جنگل کے پاس پہنچیں تو ایک بے نام رعب دل پر طاری ہو جاتا تھا اور اس کے چہرے میں ایسی ہی پُراسرار چیزیں منعکس آتی تھیں جیسی زرتشت کی موت کے وقت اس کے مریدوں کو نظر آئی ہوں گی کیونکہ انسان کے اندر جو دلی حیرت انگیز اور ہیبت ناک خواص ہیں وہ آج تک الفاظ یا کتابوں میں بیان نہیں ہوئے۔ جب موت قریب آتی ہے تو سب الگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور سب کے اوپر یہی ایک راز منکشف ہوتا ہے جس کا حال کوئی مردوں کی دنیا کا مصنف ہی بتائے تو بتائے۔ چنانچہ کبھی مرتے ہوئے کو دانی یا یونانی کے ذہن میں ایسے بلند اور پاک خیالات پیدا نہیں ہوئے ہوں گے جیسے خیالات کی پرچھائیں کوئی کو ینگ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹا تھا اور جیسے اسے جھلا جھلا کر ابدی نیند سلا رہی تھیں اور سمندر کا جوار بھاٹا اُسے اوپر اٹھا اٹھا کر اس کی آخری منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔

ہم لوگ اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ کوئی کو ینگ اپنے متعلق کیا سوچ رہا تھا، اس کا پتا اس کی اس خواہش فرمائش سے چلے گا۔ ایک دن وہ پوچھ رہی تھی کہ اس نے ایک بڑھئی والے کو بلایا اور اس کا ماپ کر کے بتایا کہ اس نے نیچی تنگ میں سیاہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں دیکھی تھیں جیسی جو دائی کے جزیرے میں بھی ہوتی ہیں۔ یا پیچھے پتا چلا کہ نیچی تنگ میں جتنے شکاری مرتے ہیں ان کو انھی سیاہ کشتیوں میں دفن کیا جاتا ہے۔ اس طرح دفن ہونے کا خیال اسے بڑا پسند آیا تھا کیونکہ اس کی قوم میں بھی یہی رواج ہے کہ آدمی کی حنوط شدہ لاش کو خود اسی کی کشتی میں رکھ کے لہروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ وہ اُسے ستاروں کے مجلا الجزائر میں بہا لے جائیں۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ستاروں کے جزیرے ہیں، بلکہ افق کے پار خوروں کا پرسکون اور غیر آباد سمندر ہے جو نیلے آسمانوں میں جا بہتا ہے اور کہکشاں کی سفید سفید لہریں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی کو ینگ نے جیکار اُسے بچھوے میں ہمیشہ کے لیے بند کیے جانے کے خیال سے جھرجھری آتی ہے کیونکہ یہ تو ایسا ہے جیسے کسی گندی چیز کو اٹھا کے شارک مچھلیوں کے سامنے پھینک دیا جائے۔ نہیں اسے تو نیچی تنگ کی سی کشتی پسند تھی۔ اسی وجہ سے اور بھی کہ وہ دل کا شکاری تھا اور شکاری کی کشتی کی طرح اس تابوت والی کشتی میں بھی الگ سے چپو نہیں لگا ہوا تھا، گو اس میں یہ خرابی ضرور ہے کہ رُخ کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اور ممکن ہے کہ آدمی صدیوں اسی طرح بہتا پھرے۔

جب لوگوں کو اس عجیب و غریب فرمائش کی خبر ہوئی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ مگر کوئی کو ینگ کی خواہش پوری کی جانے چاہیے تھی۔ کچھ تابوت کے سے رنگ کی سیاہ اور پرانی لکڑی پڑی تھی جو ایک پچھلے سفر میں جزائر کے گھنے گھنے جنگلوں سے کاٹ لی گئی تھی۔ تابوت کے لیے جو کشتی بنی تھی بڑھئی کو حکم ملا تو وہ حسب معمول اپنی بے نیازی اور چستی کے ساتھ گرنے کے بعد کوئی کو ینگ کے پاس پہنچا اور اس کی ناپ لینے لگا۔ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے وہ کوئی کو ینگ کے بدن پر گز ناپ کے نشان لگاتا جا رہا تھا۔

"ہائے بیچارہ، اب تو اسے مرنا ہی پڑے گا" لونگ آئیلینڈ کا جاہل بولا:

بڑھئی اپنی میز کے پاس پہنچا اور اپنی احتیاط اور استحکام کے لیے اس نے جبڑے کے اوپر پنسل لگا لیا، تابوت کا تختہ لیا اور پھر ان دونوں نشانوں کو چاقو سے کھود کر چوڑا بنا دیا، اس کے بعد اُس نے تختے اور اوزار اٹھائے اور کام میں لگ گیا۔

جب آخری کیل بھی ٹھونک دی گئی اور ڈھکنے کے اوپر رندہ بھی ہو چکا تو وہ تابوت کو کندھے پر رکھ کے لے چلا اور پوچھنے لگا کہ ادھر معاملہ تیار ہے یا نہیں۔

یہ سن کر لوگوں کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ وہ چیخ چیخ کر اُسے بھگانے لگے۔ کوئی کوئیگ نے یہ شور سن لیا اور کہا کہ تابوت ذرا میرے پاس لاؤ۔ اس بات پر لوگ بھونچکے رہ گئے لیکن اس کے ساتھ ایک پیچ بھی ہے۔ بعض آدمی مرتے وقت بڑے جابر بن جاتے ہیں، لیکن یہ سوچ کر ان کے نخرے سہنے پڑتے ہیں کہ اب یہ ہمیں کبھی تنگ نہیں کریں گے۔

کوئی کوئیگ آگے کو جھک کر تابوت کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا، پھر اس نے اپنا برچھا منگوایا، اور اس کا لکڑی والا دستہ نکال کے پھل تابوت کے اندر پتوار کے پاس رکھوا دیا۔ اس کی درخواست کے مطابق کشتی میں دونوں طرف بسکٹ بھی چن دیے گئے۔ سرہانے کی طرف تازہ پانی کی بوتل رکھی گئی اور پائینتی کی طرف اس مٹی کی تھیلی جو کوٹھری میں سے کھرچی گئی تھی۔
کوئی کوئیگ نے بادبان کے ٹکڑے کا تکیہ بنوایا اور کہا کہ مجھے اس آخری آرام گاہ میں اتار دو۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ یہ آرام دہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ تھوڑی دیر تو چپ چاپ لیٹا رہا، پھر ایک نے سے بولا کہ جا کے میرے تھیلے میں سے میرا یوجو نکال لاؤ۔ اب اس نے یوجو کو اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا اور کہا کہ تابوت کا ڈھکنا (ابھی ڈھکنا) بند کر دو۔ ڈھکنے کے اوپر والے حصے میں چمڑے کے فیتے لگے ہوئے تھے، چنانچہ سر کھلا رہ گیا اور باقی جسم ڈھک گیا۔ بہرحال کوئی کوئیگ تابوت میں بڑے اطمینان سے لیٹا رہا۔ آخر کار بولا ——— "راراہی" (یعنی بس کرو، خاصا آرام دہ ہے) اور اس نے اشارہ کیا کہ اب مجھے بستر پر لٹا دو۔

اس دوران میں پپ چوری چھپے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ کوئی کوئیگ کے تابوت میں سے نکلنے سے پہلے وہ اس کے قریب آیا، اور سسکیاں لیتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— دوسرے ہاتھ میں اس کا ڈھول تھا۔

"بیچارا آوارہ گرد! کیا پھر تیری آوارہ گردی کبھی ختم نہ ہوگی؟ اب تو کدھر جا رہا ہے؟ اگر لہریں تجھے بہا کے ایسے پیارے جزیروں میں لے جائیں جہاں ساحل پر بس تیرنے کے پھول کھلتے ہیں، تو کیا تو میرا ایک چھوٹا سا کام کر دے گا؟ ایک لڑکا پپ مدت سے غائب ہے۔ ذرا اُسے تلاش کرنا۔ میرا خیال ہے کہ وہ انہیں جزیروں میں ہے۔ اگر وہ مل جائے تو اُسے تسلی دینا۔ کیونکہ وہ بڑا افسردہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اس کی ڈھولک یہیں رہ گئی ہے ——— اتفاق سے مجھے مل گئی۔ ڈھپ، ڈھپ ڈھپ! اچھا، کوئی کوئیگ، اب تو مر جا۔ میں تیرے کوچ کا باجا بجاتا ہوں۔"

اسٹاربک نے روشن دان میں سے جھانکتے ہوئے کہا ——— "سُنا ہے کہ بعض دفعہ زور کے بخار میں جاہل آدمی بھی پرانی زبانوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ تحقیق کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے بچپن کے واقعات بھول چکے ہیں، لیکن اُس نے

ہیں ان کے سامنے کسی عالم نے وہ قدیم زبان بولی تھی، اسی طرح محو احمق کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ پپ اپنے اس معصوم پاگل پن میں ہماری آسمانی گھری کی آسمانی خبریں سُناتا ہے۔ یہ باتیں اس نے وہاں کے خدا اور کہاں سیکھی ہوں گی ——— تو اس نے پھر اپنا شروع کیا لیکن اب کے ذرا جوش میں ہے:

"دو دو کی صف بناؤ! آؤ! اسے سپہ سالار بنا دیں! ارے، اس کا برچھا کہاں گیا؟ ادھر ——— دیکھو ——— ڈھپ، ڈھپ، ڈھپ! اوہ! اگر کوئی ڈرنے والا مرغا ہوتا تو اسے اس کے سر پر بٹھا دیتے، وہ گڑ گڑ کرتا۔ کوئی کوئیگ — بہادروں کی موت مر رہا ہے! ——— یاد رکھنا کوئی کوئیگ بہادروں کی موت مر رہا ہے! اسی طرح ہم لوگ کوئی کوئیگ بہادروں کی موت مر رہا ہے! ہاں، بہادروں کی موت بہادروں کی موت، بہادروں کی موت! لیکن پپ کتنا کمینہ تھا۔ وہ بزدلوں کی موت مرا۔ کانپتا ہوا مرا ——— پپ کے اوپر لعنت ہو! سنو، اگر پپ مل جائے تو سب لوگوں کو بتانا کہ پپ بھگوڑا ہے، بزدل ہے، بزدل، بزدل، بزدل! ان لوگوں کو بتا دینا کہ وہ شکاری کشتی میں سے کود پڑا تھا۔ اگر کمینہ پپ اس وقت یہاں مر رہا ہوتا تو میں اس کے لیے اپنی ڈھپلی بھی نہ بجاتا اور نہ اسے سپہ سالار بناتا، نہیں، نہیں! سارے بزدلوں پر لعنت ——— بزدلوں پر لعنت! انھیں پپ کی طرح ڈوب مرنے دو جو شکاری کشتی میں سے کود پڑا تھا۔ لعنت، لعنت!"

اس دوران میں کوئی کوئیگ آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ لوگ پپ کو پکڑ لے گئے اور بیمار کو بستر پر لٹا دیا گیا۔

لیکن جب وہ مرنے کی ساری تیاریاں کر چکا اور اس کا تابوت بھی ٹھیک بیٹھ گیا تو کوئی کوئیگ ایک دم سے اچھا ہونے لگا اور تھوڑے دن بعد اس بڑھئی کے صندوق کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس پر لوگوں کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ کوئی کوئیگ نے بتایا کہ اس کے تندرست ہو جانے کی وجہ یہ تھی ——— ایک دم مرتے مرتے اسے یاد آیا کہ ساحل پر ایک چھوٹا سا کام باقی ہے جسے انجام دینا ہے۔ چنانچہ مرنے کے سلسلے میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کیونکہ یہ کام کیے بغیر وہ مر نہیں سکتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ جینا یا مرنا کیا تمھاری مرضی اور ارادے پر منحصر ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں، بالکل۔ مختصر کوئی کوئیگ کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص زندہ رہنے کا ارادہ کر لے تو محض بیماری اسے نہیں مار سکتی ——— وہیل، یا طوفان، یا کوئی دوسری خوفناک، ہلاکت خیز اور ذہن سے عاری قوت مار ڈالے تو اور بات ہے۔

اچھا، مہذب آدمی اور جنگلی میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ مہذب آدمی بیمار پڑے تو اسے اچھے ہونے میں چھ چھ مہینے لگتے ہیں۔ جنگلی بیمار ہو تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کوئی کوئیگ کی طاقت بڑی جلدی بحال ہو گئی۔ وہ چار دن تو وہ چرخی پر بیٹھا آرام کرتا رہا، بھی کھانا خوب پیٹ بھر کے کھایا، پھر ایک دن اچانک کود کے اٹھ کھڑا ہوا، بازو اور ٹانگیں پھیلا دیں، ایک جمائی اور لمبی سی انگڑائی لی، پھر اپنی کشتی میں کود گیا اور برچھا تان کے بولا کہ وہ میں لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

اب اس نے عجب سنکی پن سے کام لیا یعنی تابوت کو صندوق کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ اپنا تھیلا اس میں الٹ کے کپڑے اندر رکھ دیے۔ خالی وقت میں وہ بیٹھا گھنٹوں اس کے ڈھکنے پر طرح طرح کی تصویریں بنایا کرتا

ہوتا تھا کہ وہ ایک ان گھڑ طریقے سے اپنے بدن پر گُدے ہوئے نشانات کی نقل اتار رہا ہے اور یہ نشانات اُس کے جسم پر کے ایک مرحوم عارف اور ولی نے بنائے تھے، اور ان پُر اسرار حروف میں اُس کے بدن پر زمین و آسمان کا ایک مکمل نظریہ اور حقیقت تک پہنچنے کا بیان اور طریقہ لکھ دیا تھا، چنانچہ کوئی کوئیگ بذاتِ خود ایک پہیلی تھی ——— ایک جلد کی حیرت انگیز کتاب تھا، حالانکہ اس کا دل بھی کتاب کے نیچے دھڑکتا رہتا تھا لیکن اس کے اسرار و رموز وہ خود بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ ان اسرار و رموز کا انجام یہ ہونے والا تھا کہ جس زندہ موم جامے پر لکھے ہوئے ہیں اُس کے ساتھ خود بھی فنا ہو جائیں اور انہیں آخری دم تک کوئی نہ سمجھ سکے۔ غالباً اہاب کے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہوا ہوگا کیونکہ ایک دن کوئی کوئیگ کو بڑی دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد جب وہ چلنے لگا تو بڑے وحشیانہ جوش کے ساتھ بولا ——— "دیوتا بھی کتنے منحوس ہیں! بس یہیں تو ستاتے ہی رہتے ہیں!"

جاذ گرج اٹھا ــــــ "سب لوگ پیچھے کی طرف چلیں، سینہ وری کے فوارے ہی سے گولا ٹھا خون نکل رہا ہے!

لوہار

ایک تو اس علاقے میں گرمی کا موسم بہت اچھا ہوتا ہے، دوسرے یہ دو چار دن بعد اس کے ذمے وقت سا کام پڑنے والا
تھا چنانچہ کارخانے میں پہنچتے ہوئے اور جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے بڈھے لوہار پر تو نے ایا بت کی ٹانگ کا کام ختم کرنے کے بعد اپنی
اٹھا دی بھی پیچھے کوٹھری میں نہیں چھپائی بلکہ اُسے حوصلے بری رہنے دیا اور بڑے ستون کے حلقے میں رسیوں سے باندھ دیا۔
آج کل بیٹے اور پوتے یا اور جواری ہر وقت اس سے کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرانے آتے رہتے تھے کبھی وہ ان کے ہتھیاروں ہل کشتی
کے ساز و سامان کی مرمت کرتا، کبھی انھیں پھر سے چلاتا اور کبھی کوئی ترمیم کرتا۔ اکثر اس کے گرد جواریوں کا ایک حلقہ رہتا اور وہ
بے چینی سے انتظار میں بیٹھے رہتے کہ ہماری باری کب آئے۔ اپنی چوپایوں، سواریوں، برچھے اور قلم ہاتھ میں لیے اس کی ایک
ایک حرکت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے۔ بہرحال اس بڈھے میں ایک خوبی تھی کہ وہ کبھی شکایت نہ کرتا۔ نہ بے صبری دکھاتا،
نہ گھبراتا۔ وہ گمبھیر اور چپ چاپ آہستہ آہستہ کام کرتا رہتا بلکہ اس کی وقت کے بوجھ سے دبی ہوئی کمر اور بھی جھک جاتی اور
وہ اس طرح محنت میں لگ جاتا جیسے محنت و مشقت ہی زندگی ہو اور ہتھوڑے کی بھاری چوٹیں اس کے دل کی دھڑکنیں ہوں، واقعی
بات بھی یہی تھی ——— کیا مصیبت تھی بیچارے کے لیے۔

یہ بڈھا ایک عجب طرح چلتا تھا۔ اس کی چال میں ایک ہلکا سا لیکن تکلیف دہ خم تھا۔ سفر کے آغاز میں ہی جواریوں
کو اس چیز کے متعلق تجسس پیدا ہوا۔ جب انھوں نے بار بار ضد کی تو آخر اُسے وجہ بتانی ہی پڑی۔ چنانچہ اس کی بدنصیبی
کی شرمناک کہانی ہر ایک کو معلوم ہو چکی تھی۔

ایک مرتبہ جاڑوں میں آدھی رات کے وقت اُسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور اس دیر کی وجہ بھی کچھ ایسی ٹھیک نہ
تھی چنانچہ وہ ایک دیہاتی سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اپنی بے وقوفی میں اُسے اپنا جسم سُن ہوتا محسوس ہوا لہٰذا وہ پناہ
لینے کے لیے ایک ٹوٹے پھوٹے برج کے کوٹھے میں گھس گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے دونوں پیروں کی انگلیاں ضائع ہو گئیں۔
اُس نے یہ کہانی تھوڑی تھوڑی کر کے سنائی۔ اس کی زندگی کے المناک ڈرامے کے پانچ منظر تھے۔ چار منظر خوشی اور مسرت
کے تھے اور پانچواں طویل منظر ہی انجام کو نہ پہنچا تھا۔

یہ ایک بڈھا آدمی تھا جسے بڑی دیر میں اب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کے اس چیز سے سابقہ پڑا تھا جسے المیہ کی اصطلاح
میں بد بختی کہتے ہیں۔ وہ بڑا مشہور کاریگر رہ چکا تھا اور اُس کے پاس کام بھی بہت آیا کرتا تھا۔ گھر بار تھا، ایک باغیچہ تھا،
غرض خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ ایک نوجوان اور محبت کرنے والی بیوی تھی جو بالکل اس کی بیٹی لگتی تھی۔ زمین پہ پاسے پاسے
جن کو بیچتے تھے ہر آدمی کو سب دل کے ایک خوبصورت سے گرجا میں جایا کرتے تھے جو درختوں کے کنج میں واقع تھا لیکن ایک

وہ مشرق اور مغرب، صبح اور شام ہر جگہ اور ہر وقت یہی آوازیں سنتا رہا۔ آخر اس کی روح نے بھی لبیک کہا اور بولا ——— ہاں میں آتی ہوں، اچھا چلو پر تھوڑی دیر کے لئے رک کر کھڑا ہوا۔

لوہار کی بھٹی

الجھی ہوئی داڑھی لیے اور شارک کی کھال کا ایپرن پہنے پرتھ دوپہر کے وقت اپنی بھٹی اور اہرن کے درمیان کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے سلاخ کو کوئلوں میں رکھے اور دوسرا ہاتھ دھونکنی پر دھرے۔ اتنے میں کپتان اہاب چمڑے کا ایک زنگ آلود سا تھیلا ہاتھ میں لیے ادھر آیا۔ وہ بھٹی سے کچھ دور کے فاصلے پر ہی رک گیا، یہاں تک کہ آخرکار پرتھ نے اپنا اوزار آگ میں سے نکالا اور اسے اہرن پر رکھ کے پیٹنے لگا۔ سرخ سرخ لوہے میں سے اتنی زیادہ چنگاریاں اڑیں کہ بعض تو اہاب کے پاس تک پہنچیں۔

"پرتھ، کیا یہ چنگاریاں تیرے مُرغی کے بچے ہیں؟ یہ ہر وقت تیرے پیچھے اڑتی رہتی ہیں۔ یہ پرندے ہیں تو نیک شگون، لیکن سب کے لیے نہیں ---- اچھا ادھر تو دیکھ، ان سے آدمی جل جاتا ہے۔ لیکن تو ---- تو ان کے درمیان رہتا ہے اور تیرا بال بیکا نہیں ہوتا۔"

"کیونکہ میں تو پہلے ہی سارا جل چکا ہوں، کپتان اہاب۔" پرتھ نے اپنے ہتھوڑے پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے جواب دیا۔ "اب آگے اور کیا جلوں گا۔ کھرنڈ آسانی سے نہیں جلتا۔"

"بس بس، آگے مت بول۔ تیری دبی ہوئی آواز میں رنج تو ہے لیکن سکون اور سمجھداری زیادہ ہے۔ یوں تو میں بھی جنت میں نہیں ہوں لیکن دوسرے کے اندر مجھے وہ رنج ذرا اچھا نہیں لگتا جو پاگل نہ ہو جائے۔ اے لوہار، تجھے پاگل ہو جانا چاہیے۔ بتا تو پاگل کیوں نہیں ہو جاتا؟ پاگل ہوئے بغیر تو زندہ کیسے ہے؟ کیا آسمانوں کو ابھی تک تجھ سے نفرت ہے جو تو پاگل نہیں ہو سکتا؟ ---- تو کیا بنا رہا تھا؟"

"جی، میں ایک پرانی سلاخ میں ٹانکا لگا رہا تھا۔ کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔"

"اچھا، لوہار، جب سلاخ کی ایسی بری گت بن گئی ہو تو کیا تو اس وقت بھی اسے ویسی ہی چکنا اور ہموار بنا سکتا ہے؟"

"جی، میرا تو یہی خیال ہے۔"

"کیوں، لوہار، چاہے دھات کتنی ہی سخت ہو تو سارے گڑھے اور شگاف دور کر سکتا ہے؟"

"جی ہاں، جناب، کر سکتا ہوں۔ ایک کے سوا سارے۔"

"اچھا تو ادھر دیکھ۔" اہاب جوش میں آکے آگے بڑھتے ہوئے بولا اور دونوں ہاتھ پرتھ کے کندھوں پر رکھ دیے۔ "ادھر دیکھ ---- ادھر، لوہار، کیا تو ایسا گڑھا مٹا سکتا ہے؟" اس نے اپنی شکن آلود پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "اگر تو یہ کام کر سکے تو لوہار، میں بڑی خوشی سے اپنا سر تیری اہرن پر رکھ دوں گا اور تیرے بھاری سے بھاری ہتھوڑے کی چوٹ سہہ لوں گا۔ جواب دے،

کیا تو یہ گڈا مٹا سکتا ہے؟

"ادھر ہی تو ہے وہ، جناب! میں نے کہا تھا کہ ایک کے سوا سارے گڈے مٹا سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، وہ وہی ہے۔ ہاں، اسے کوئی نہیں نبا سکتا، حالانکہ مجھے یہ گڈا میری کھال کے اوپر نظر آرہا ہے لیکن یہ میری کھوپڑی کی ہڈی میں اتر چکا ہے ——— تھوڑی ہی بس گڈے ہی گڈے ہیں۔ اچھا اب یہ چکر کی سی باتیں ختم کرو۔ آج یہ چیلنج ہے میں سمجھ رہا جناب ادھر دیکھو! اس کے چہرے کا تعویذ شکستہ ہے جسے لگا پایا ہیں استخوان ابھری ہیں۔ میں بھی ایک برچھا بنوا رہا ہوں پرتھ۔ ایسا برچھا بناؤ جسے ہزار مچھلی بھی چاہیں تو ول کے نہ توڑ سکیں ——— جیسا برچھا جو ویل کے اندر خود اسی کی ہڈی کی طرح لگ گیا۔ وہ ہتھے سے دھات یہ ہے"۔ اس نے تھیلی اہرن کے اوپر پھینک دی۔ "ذرا دیکھو تو وہ، یہ گھوڑوں کے گھوڑسوں کے وہ ہی نعلوں کے پیچے ہوئے ٹکڑے ہیں۔"

"نعلوں کے ٹکڑے، او ہو، کپتان اہاب۔ اس سے اچھی اور مضبوط دھات تو کوئی بھی نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے بھی پتا ہے۔ یہ ٹکڑے آپس میں اس طرح جڑ جائیں گے جیسے قاتلوں کی پگھلی ہوئی ہڈیوں کو گوند جڑی کر برچھا ڈال۔ لیکن اس سے پہلے مجھے کے لیے بارہ سلاخیں بنا۔ پھر ان بارہ کی بارہ کو اس طرح کوٹ پیٹ کے ایک کر کے جیسے ڈور کے تاگے۔ جلدی کر میں دھونکنی چلاتا ہوں۔"

آخر کار جب یہ بارہ سلاخیں تیار ہو گئیں تو اہاب نے انھیں آزمانے کے لیے خود اپنے ہاتھ سے ایک ایک سلاخ کو لوہے کے کھونٹے پر رگڑ کے مروڑا۔ "ذرا سی خرابی رہ گئی"۔ اس نے آخری سلاخ پھینکتے ہوئے کہا "پرتھ، اسے دوبارہ بنا۔"

جب یہ کام بھی ختم ہو گیا تو پرتھ ان بارہ سلاخوں کو پیٹ کر ایک بنانے لگا لیکن اہاب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ میں اپنا ہتھیار خود بناؤں گا۔ پرتھ ہاں لگا، جیسی سلاخوں کو ایک ایک کر کے ٹکڑانے لگا۔ بھٹی میں سے ایک تیز اور سیدھا شعلہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اہاب نے ہاتھ جھکڑ کر تھوڑا جلا دیا تھا۔ اتنے میں آتش پرست فیدالہ چپ چاپ ادھر آیا اور آگ کے سامنے سر جھکا کر اس ہوم کو دعا یا بددعا دینے لگا لیکن جب اہاب نے نظر اٹھائی تو وہ کھسک لیا۔

"یہ شیطانوں کی ٹولی وہاں کیوں پھیری پھر رہی ہے؟" اسٹب نے جہاز کے اگلے حصے میں سے ادھر دیکھ کر منہ ہی منہ میں کہا "یہ پارسی تو آگ کو دور سے سونگھ لیتا ہے۔ خود اس میں سے بھی آگ کی بو آتی ہے جیسے بارود کی گولی ہی ہے۔"

آخر کار دستہ تیار ہو گیا اور آگ میں اچھی طرح تپایا گیا۔ پرتھ نے اسے بجھانے کے لیے پانی کے پیپے میں ڈالا تو کھولتی ہوئی بھاپ ایک دم سے اٹھ کر اہاب کے چہرے پر پڑی۔

اہاب تکلیف کے مارے بلبلا اٹھا اور بولا "پرتھ کیا تو میرے داغ لگانا چاہتا ہے؟ کیا میں نے یہ دستہ اسی لیے بنایا ہے کہ مجھے داغ دیا جائے؟"

"خدا کرے ایسا ہو لیکن کپتان اہاب۔ مجھے کچھ ڈر لگتا ہے۔ یہ برچھا سفید ویل کے لیے ہی بنا ہے نا؟"

"ہاں، اسی سفید موت کے لیے! اچھا اب یہ برچھے کے پھلوں کا معاملہ رہ جاتا ہے تو انھیں اپنے ہاتھ سے بنانے ہیں

اپنے اُسترے سے آیا ہوں۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے بس اپنے تیز پھل بنا دے جیسے برف کی سوئیاں۔

دم بھر تو وہ اوزار ساز ان کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے انہیں کام میں لانے کی ترکیب نہ جانتا ہو۔

تھلے کے یار! مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں تو اب جب تک ان کو نہ کھا لوں کھانا کھانے کا ارادہ بھی نہ کروں گا جب تک کہ ——— میرا یہ ——— کام شروع نہ کر دے!

آخر وہ پھل تیر کی شکل کے بن گئے اور یقہ نے انہیں دستے میں جڑ دیا اور انہیں پانی میں بجھانے سے پہلے آخری دفعہ آگ میں تپانے لگا اور ایہاب سے چپہ قریب لانے کو کہا۔

نہیں نہیں ——— اسے پانی میں نہ بجھاؤ۔ اس میں تو روح کا رنگ آنا چاہیے۔ ادھر چلو، ناش ٹیگو، کوئی کرنگ دیکھو! او داگو! کیا کہتے ہو؟ اتنا خون دو گے کہ ہم اس پھل کو بجھا لیں؟ ایہاب نے برچھا اوپر اٹھا دیا۔ سیاہ فام جنگلیوں نے سر ہلا کر جواب دیا ہاں۔ ان کافروں کے بدن میں تین سوراخ کیے گئے اور پھر ہتھیار سے سفید وہیل کا شکار ہونے والا تھا اسے ان کے خون میں بجھایا گیا۔

یہ خبیث دھاتیں بھی کر کے بپتسمہ کا خون پینے لگا تو ایہاب نے ایک ہذیانی جوش کے ساتھ کہا ——— "میں تجھے خدا کے نام پر نہیں، بلکہ شیطان کے نام پر بپتسمہ دیتا ہوں!"

اب پیچھے سے فالتو ڈنڈے منگوائے گئے اور ایہاب نے ایک اخروٹ کا ڈنڈا چھانٹ کر جس میں ابھی تک چھال لگی ہوئی تھی اسے دستے میں پھنسا دیا۔ اس کے بعد نئی ڈوری کی لچھی کھولی گئی اور کئی ہزار گز میں تھوڑے سے جا کر آنچ پر تان دی گئی۔ ایہاب نے اسے پیر سے دبا لیا اور رسی رباب کے تار کی طرح گھوں گھوں کرنے لگی۔ پھر وہ اس کے اوپر جھک کے دیکھنے لگا کہ کہیں کچھ تار الگ تو نہیں ہو گئے اور اس کے بعد چلا کر کہا ——— "ٹھیک! اچھا، اب ڈور باندھ دو۔"

رسی کو ایک طرف سے کھول دیا گیا اور الگ الگ تاروں کو برچھے کے خانے میں بٹ کے باندھ دیا گیا۔ پھر دستہ کو خانے میں اچھی طرح ٹھونک دیا۔ ڈنڈے کے نچلے سرے سے رسی کو آدھی دور تک لا کے سنبل سے کس دیا گیا۔ اب ڈنڈا، لوہا اور رسی ایسے لگنے لگے جیسے قسمت کی تین دیویاں جو ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکیں۔ ایہاب یہ ہتھیار لے کر کھٹ کھٹ کرتا چل دیا۔ اس کی ہاتھی دانت کی ٹانگ کی آواز اور اخروٹ کے ڈنڈے کی آواز، دونوں ہر تختے پر کھوکھلی سی بجنے لگیں لیکن ابھی اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک ہلکی سی غیر فطری، نیم تضحیک آمیز لیکن دردناک آواز سنائی دی۔ ہائے رے پپ تیرا منحوس قہقہہ! تیری ہل اور بے چین نظریں! اس اندوہناک جہاز کے تاریک المیے میں تیرا قہقہہ بھی بڑے معنی خیز طریقے سے شامل تھا اور اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

باب ۱۱۴

ملمع ساز

جاپانی نکتہ گاہ میں چنگیز آگے ہی بڑھتا چلا گیا اور بڑی جلدی شکار میں مصروف ہو گیا۔ اس معتدل اور خوشگوار موسم
میں ہماری ایک ساتھ بارہ دیدہ ور ... شمار ... اور ہم دن میں لگے تک اپنی کشتیوں میں بیٹھے رہتے کبھی ہم بادبان کے سہارے چلتے
کبھی پتوار کھینچتے، کبھی وہیلوں کا پیچھا کرتے کبھی ساحل یا مزرنشت تک چپ چاپ ان کے اوپر اٹھنے کا انتظار کرتے رہتے لیکن اتنی
مصیبت اٹھانے کے بعد بھی کوئی کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

جب دھوپ نرم نرم ہو، ہوا دھیمی آہستہ آہستہ جھکورے لے رہی ہو، لہریں ایسی ہلکی کشتی میں بیٹھا ہو جیسے کاغذ
کی ناؤ اور لہریں دیواروں سے اس طرح ٹکرا رہی ہوں جیسے بلیاں آگ کے پاس بیٹھ کر غرایا کرتی ہیں ——— تو یہ وقت
ایک خواب ناک سکون کا ہوتا ہے۔ سمندر کی چمکدار اور حسین کھال دیکھ کر آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے نیچے نیند دوسے کا دل
دھڑک رہا ہے اور اس مخملیں پنجے میں خوفناک ناخن چھپے ہوئے ہیں۔

ایسے وقت شکاری کشتی میں بیٹھے ہوئے آدمی کو سمندر کی طرف سے ایک فرزندانہ خم کا احساس محسوس ہونے لگتا ہے
وہ اسے سمندر نہیں بلکہ پھولوں بھری زمین لگتا ہے اور دور سے جس جہاز کے مستول نظر آ رہے ہیں وہ لہروں میں نہیں بلکہ
لمبی لمبی گھاس میں آگے بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— جیسے امریکہ کے مغربی علاقے میں گھوڑوں کے جسم تو سبزے میں چھپے رہتے
ہیں اور کان ہی کان دکھائی دیتے ہیں۔

جب ان لمبی لمبی ابھرتی وادیوں اور نیلی نیلی حسین پہاڑیوں پر ایک خاموشی اور لطیف شگفتگی طاری ہوتی ہے تو آپ یہ
سوچنے لگتے ہیں کہ ان تماشاؤں میں جنگلی پھول توڑنے جا رہے ہوں گے اور کھیل سے تھکے ہوئے بچے پڑے سو رہے ہوں گے۔ ان
خیالات کے ساتھ ساتھ آپ کے اوپر ایک استعجالی پُراسرار کیفیت چھا جائے گی اور حقیقت اور تخیل آپس میں گھل مل کر اس طرح
ایک ہو جائیں گے کہ دونوں میں تمیز بھی نہ ہو سکے گی۔

عارضی طور پر ہی سہی، مگر اس سکون آمیز ماحول کا اہاب کے دل پر اثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان پُراسرار سنہری کنجیوں نے
اس کے اندر کسی پُراسرار خزانے کے دروازے کھول دیے لیکن اہاب کے سانس سے خود یہ کنجیاں داغدار ہو کے رہ گئیں۔

آہ، زرخیز کے وہ سبزہ زار! وہ سدا بہار بہاریں! دنیاوی زندگی کی خشک سالی میں جب آدمی کے حلق میں کانٹے
پڑ جاتے ہیں، لیکن تماشائے اور وسائی بھری میں آرام کر سکتا ہے جیسے جوان گھوڑے صبح کی نم آلود گھاس میں چند گھڑیاں پڑے لیٹے
لافانی زندگی کی ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم اپنے اوپر محسوس کر سکتے ہیں، کاش کہ یہ سکون آمیز برکت لمحے کبھی ختم نہ ہوں لیکن زندگی
کے تانے بانے کی طرح ہیں ایک طرف سکون ہے، دوسری طرف طوفان۔ اور ہر سکون کے ساتھ ایک طوفان لگا ہوا ہے۔

تشنگی میں یہ نہیں جانتا کہ آدمی برابر آگے ہی چلتا رہے اور پیچھے نہ دیکھے۔ زندگی میں یہ نہیں جانتا کہ ہم بڑھ بڑھ کر بڑھتے جاتے ہیں اور آخر میں پہنچ گئے —— پہلے تو طفل کی طرح بے خبری آئے پھر لڑکپن کا لاابالی پن، پھر جوانی کا تشنگی بھرا بے چینی اور آخر میں ادھیڑ پن کا فکر انگیز اطمینان جس میں آدمی ٹھہر گیا —— اگر کتنا رہتا ہے لیکن جب ہم یہ چکر پورا کر لیتے ہیں تو ایک دفعہ پھر چل پڑتے ہیں اور ان سب ادوار سے مڑ کر گزرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ آخری بندرگاہ کدھر ہے جہاں پہنچنے کے بعد جہاز لنگر پھر نہیں اٹھائے گا؟ دنیا کس طلسمی فضا میں تیر رہی ہے کہ شکستہ دل سے شکستہ دل لوگ بھی اس سے کبھی نہیں نکلتے، ہر چیز مرگ پر پڑا ملا ہے اس کا باپ کہاں چھپ گیا ہے؟ ہماری روحیں ان بیٹوں کی طرح ہیں جن کی غیر شادی شدہ مائیں انہیں جنم دیتے وقت مر جاتی ہیں —— ہماری ولدیت کا راز ان کی قبر میں چھپا ہوا ہے اور اسے معلوم کرنے کے لیے ہمیں وہیں جانا پڑے گا۔

اسی دن کا ذکر ہے کہ میں کشتی کی دیوار پر سے اس سنہرے سمندر میں جھانکتے ہوئے اسٹاربک آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا ——۔

کتنا پُر اسرار حسن ہے، یہ دل کشی تو کسی عاشق کو اپنی نوجوان دلہن کی آنکھوں میں بھی نظر نہ آتی ہوگی —— لے حسن میرے سامنے اپنی شارک کے دانتوں والی شارک مچھلیوں اور اپنے آدم خوروں جیسی عادتوں کا ذکر نہ چھیڑ، عقیدہ حقیقت کو بے دخل کر دے، تخیل جاننے کو نکال باہر کرے۔ میں نے سمندر کی تہوں میں جھانک کر دیکھا اور ایمان لے آیا۔"

اور اسٹب نے اسی سنہری روشنی میں کہا ——۔

"میرا نام اسٹب ہے اور اسٹب نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے لیکن اسٹب قسم کھا کے کہتا ہے کہ اس نے اپنی زندہ دلی کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دی۔"

پیکوڈ کی بیچلر سے ملاقات

اہاب کا برچھا تیار ہونے کے چند ہفتے بعد کا ذکر ہے کہ ہوا ہماری طرف بڑی خوشگوار آوازیں اور بڑے دلچسپ نظارے اڑا کے لائی۔

یہ نین ٹکٹ کا ایک جہاز بیچلر تھا جس نے کوٹھری میں تیل کے اتنے پیپے بھر لیے تھے کہ اب تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ جہاز گھر لوٹنے سے پہلے اب یہ جہاز عید کے سے کپڑے پہنے جشن مناتا، لیکن ذرا اکڑ کے ساتھ، سمندر میں بکھرے ہوئے جہازوں سے ملتا پھر رہا تھا۔

تینوں مستولوں پر جو پہرے دار کھڑے تھے ان کی ٹوپیوں میں لمبے لمبے لال پھریرے لگے ہوئے تھے۔ جہاز کے پچھلی طرف ایک شکاری کشتی الٹی لٹکی ہوئی تھی اور ان لوگوں نے جو آخری وہیل ماری تھی اس کا جبڑا آگے بندھا نظر آ رہا تھا۔ رسیوں میں ہر طرف رنگ برنگ کے جھنڈے اور نشان لہرا رہے تھے۔ تینوں مستولوں میں رسیوں سے وہیل روغن کے پیپے بندھے ہوئے تھے اور ان کے اوپر بڑے مستول میں اسی بیش قیمت سیال کے دو پتلے پتلے کنستر لگے نظر آ رہے تھے۔ بڑے مستول کے اوپر تانبے کا لیمپ کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ بیچلر کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ چیز اس وجہ سے اور بھی حیرت انگیز تھی کہ بہت سے دوسرے جہازوں کو انھی سمندروں میں کئی کئی مہینے ایک مچھلی ہاتھ نہ آئی تھی۔ بیچلر والوں نے گوشت اور روٹی کے پیپے اٹھا کے دوسرے جہازوں کو دے دیے تھے تاکہ ان سے کہیں زیادہ بیش قیمت وہیل روغن کے لیے جگہ ہو سکے بلکہ دوسرے جہازوں سے اور پیپے بھی لے لیے تھے۔ یہ پیپے عرشے پر اور افسروں کے کمروں میں بھرے ہوئے تھے۔ کپتان کی میز تک آگ جلانے کے کام آ چکی تھی اور اب ایک تیل کا پیپہ کمرے کے بیچ میں رکھ دیا گیا تھا۔ افسر لوگ اسی پر کھانا کھانے لگے۔ عرشے کے اگلے تختے میں جہازیوں نے اپنے صندوقوں کی درازوں میں موم لگا کے ان میں تیل بھر لیا تھا۔ لوگ مذاق میں کہتے تھے کہ باورچی نے اپنے دیگچے میں روغن بھر رکھا ہے، داروغے نے قہوہ دانی میں اور برچھے بازوں نے اپنے برچھوں کے خول میں۔ غرض کپتان کے پتلون کی جیبوں کے سوا ہر چیز روغن سے بھری ہوئی تھی اور انھیں بھی کپتان نے اس لیے خالی رکھا تھا کہ ان کے اندر ہاتھ ڈال کے اپنی خود اطمینانی کا اظہار کر سکے۔

جب یہ خوش نصیب جہاز جشن مناتا افسردہ مزاج پیکوڈ کے قریب آیا تو ہمیں بڑے بڑے ڈھولوں کی وحشیانہ آواز سنائی دی۔ جہاز اور بھی نزدیک آیا تو ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا ہجوم روغن پگھلانے کے دیگ کے چاروں طرف کھڑا ہے جس پر کالی مچھلی کے پیٹ کی کھال منڈھی ہوئی ہے اور سب لوگ اسی ڈھول کو مکوں سے ڈھب ڈھب پیٹ رہے ہیں۔ پیکوڈ کے تختے

پریسٹ اور بریچھے باز زخموں کے رنگ کی لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہے تھے جو اپنے جزیروں سے ان کے ساتھ بھاگ آئی تھیں۔ دوستوں کے درمیان ایک سچی محبت کی شکل ہوئی تھی جس میں نیم وحشی دیہاتی کی بیٹی کی گانوں سے ساتھی ہوتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ باقی لوگ جھیلوں کی دیواروں کے پاس مل کر جا رہے تھے۔ ان کی چیخیں سن کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ پیرس کے انقلابی اپنے کا منحوس قلعہ گرا رہے ہیں۔ بیرچ اور ایلیٹس اب بیکار تھیں، لہٰذا انہیں وہ لوگ سمندر میں پھینکتے جا رہے تھے۔

چھوٹے عرشے کی منڈیر پر کپتان بادشاہ بنا کھڑا تھا۔ چونکہ یہ ساری رنگ رلیاں اسی کے سامنے منائی جا رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ صرف اسی کی تفریح طبع کے لیے یہ ہنگامہ برپا کیا گیا ہے۔

اہاب بھی اپنے چھوٹے عرشے پر کھڑا تھا —— بال بکھرے، رنگ اڑا ہوا، چہرے پر غم کی گھٹائیں۔ جب یہ دونوں جہاز قریب سے گزرے تو ایک جیتی ہوئی بازی پر خوشیاں منا رہا تھا اور دوسرا آنے والی آفتوں کے اندیشے میں مبتلا تھا۔ یہ دونوں کپتان اس تضاد کی بذاتِ خود نمائندگی کر رہے تھے۔

”ہمارے جہاز میں آؤ، ہمارے جہاز میں آؤ“ بیچلر کے کپتان نے ہوا میں گلاس اور بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کہیں سفید وہیل بھی نظر آئی؟“ اہاب نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں، میں نے صرف نام سنا ہے لیکن مجھے اس پر بالکل یقین نہیں“ دوسرے کپتان نے خوش طبعی کے ساتھ کہا۔ ”ہمارے جہاز میں آ جاؤ“

”تم لوگ تو خواہ مخواہ کھلکھلا کے ہنس رہے ہو، بس پھٹتے رہو۔ کوئی جان تو نہیں ضائع ہوئی؟“

”کوئی خاص نہیں —— بس دو جنگلی —— یار، آؤ، ہمارے جہاز میں آ جاؤ۔ ابھی سارے ولولے دور ہو جائیں گے۔ آجاؤ، زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ ہمارا جہاز بھرا ہوا ہے اور اب گھر جا رہا ہے۔

”اس لوگ بھی کیسے بے تکلفی پر اتر آتے ہیں“ اہاب نے بیچلر سے کہا، پھر زور سے بولا ”تم کہتے ہو کہ تمہارا جہاز بھرا ہوا ہے اور گھر کی طرف جا رہا ہے۔ اچھا تو میرے جہاز کو خالی اور گھر سے باہر جاتا ہوا سمجھو۔ تم اپنی راہ جاؤ، میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ جہازیو! سارے بادبان چڑھا دو اور جہاز کو ہوا کے رخ پر رکھو!“

غرض ایک جہاز تو ہنستا کھیلتا چل دیا اور دوسرا ہوا سے فرار ہو گیا۔ اس طرح دونوں جہاز ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ پیکوڈ کے جہازیوں نے دور ہوتے ہوئے بیچلر کو بڑی حسرت کی نظروں سے دیکھا لیکن بیچلر والے رنگ رلیوں میں ایسے منہمک تھے کہ انہیں پروا بھی نہ ہوئی۔ اہاب عرشے کے اوپر جنگلے کے گھر کی طرف جاتے ہوئے جہاز کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جس میں ریت بھرا ہوا تھا۔ کبھی تو وہ اس شیشی کو دیکھتا کبھی جہاز کو۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کوئی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ شیشی میں نینٹکٹ کا ریت تھا۔

باب - ۱۱۶

مرتی ہوئی وہیل

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی قسمت کا دھنی ہمارے پاس سے گزرے تو چاہے پہلے ہمارے بادبان پچکے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اب ان میں ہوا بھرنے لگتی ہے۔ یہی حال پیکوڈ کا ہوا کیونکہ زندہ دل بیچلر سے ملاقات کے اگلے دن وہیلیں نظر آگئیں اور چار کو مار گرایا گیا جن میں سے ایک اہاب نے ماری۔ شام ہو چلی تھی اور اس طرح شام تک ساری برچھے بازیاں ختم ہو چکی تھیں۔ سورج اور وہیل دونوں نے غروب آفتاب کے وقت والے حسین آسمان اور سمندر میں تیرتے ہوئے ایک ساتھ دم توڑا۔ اب گلابی فضا میں ایک ایسی شیریں گیت اور مناجات کی سی دھیمی آوازیں جیسے ان کی ہوا جزائر منیلا کی ہری بھری اور خانقاہوں جیسی وادیوں سے اٹھ کر جاری ہو گئی ہو اور شام کی مناجاتیں اپنے ساتھ لیے سمندر میں اتر گئی ہو۔

اہاب کو ایک عجیب راحت سی ملی لیکن ساتھ ساتھ اس کی افسردگی بھی گہری ہو گئی۔ اس نے وہیل کے پاس سے کشتی ہٹا لی تھی اور چپ چاپ بیٹھا وہیل کے عالم نزع کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ مرتی ہوئی زخمی وہیل میں ایک عجیب و غریب تماشہ نظر آتا ہے یعنی وہ سورج کی طرف منہ کر کے دم توڑتی ہے۔ شام کے اس سکون میں اہاب کو یہ نظارہ ہمیشہ سے زیادہ معنی خیز معلوم ہوا۔

"وہیل نے اپنا منہ سورج کی طرف کر لیا ہے —— نزع کی آخری ہچکیوں کے ساتھ اس کی بجھتی ہوئی پیشانی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال کے ساتھ اپنا خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔ وہیل بھی آگ کو پوجتی ہے۔ یہ سورج کی سب سے بڑی پرستار اور سب سے وفادار کنیز ہے! —— یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ میری آنکھوں نے ایسے نظارے دیکھے۔ دور دور تک جہاں دور دور تک خشکی کا پتا نہیں، انسانی مسرتوں اور غموں کا شور و غل ہزاروں میل پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ سمندر بالکل غیر جانبدار رہے ہیں۔ یہاں روایتوں کو چٹانوں کی تختیاں نہیں ملتیں۔ یہاں لاکھوں سال سے موجیں بالکل اسی طرح چل رہی ہیں۔ نہ تو انھوں نے کسی سے بات کی ہے اور نہ کوئی ان سے بولا ہے —— جیسے دریائے نائیجر کے نامعلوم منبع پر چمکنے والے ستارے۔ لیکن یہاں بھی زندگی یقین و ایمان کے ساتھ سورج کی طرف منہ کر کے مرتی ہے۔ مگر دیکھو تو مرتے ہی لاش کے چاروں طرف موت چکر لگانے لگتی ہے اور وہ لاش کا منہ کسی اور طرف ہو جاتا ہے۔"

"اے فطرت کے تاریک پہلو کی سیاہ دیوی! تو نے اس ویران سمندر کے سینے میں کسی جگہ ڈوبی ہوئی ہڈیوں سے اپنا ایک الگ تخت بنایا ہے۔ اے رانی! تو بے دین اور کافر ہے۔ مجھے ہلاکت خیز طوفانوں میں سے بھی تیری آواز سنائی دیتی ہے اور ان کے بعد کی جانکاہ خاموشی میں سے بھی۔ تیری یہ وہیل سورج کی طرف منہ کر کے مری ہے۔ اور پھر دوسری طرف مڑ گئی ہے۔ یہاں بھی مجھے ایک سبق ملا ہے۔"

ایک مضبوط اور گٹھا ہوا جسم ہے۔ وہ دھنک کی طرح جگمگاتا ہوا وارد گرد اونچا اٹھتا ہے! ـــــ لیکن اس جسم کی جدوجہد میں بیکار ہے اور فوارے کا حوصلہ بھی بے سود ہے، وہ بس، تو دنیا کو قوت بخشنے والے سورج کی شعاعیں خواہ مخواہ طلب کرتی ہے۔ یہ صرف ایک دھڑ زندگی کا اٹھاتا ہے۔ دوسری دفعہ نہیں لیکن اے سیاہ بادلو! تو مجھے ایک ایسے لفیفے کی گود میں جھلا رہی ہے جو تاریک سہی لیکن قابلِ فخر ہے۔ تیری ساری بے نام آمیزشیں، ہیں میرے نیچے تیرتی ہیں۔ جو چیزیں ایک زمانے میں زندہ تھیں ان کا سانس پہلے ہوا تھا اب پانی بن گیا ہے ـــــ اسی سانس نے مجھے پانی کے اوپر سنبھال رکھا ہے۔"

"مرحبا اے سمندر، مرحبا، وحشی پرندوں کو بس تیرے ہی ابدی اضطراب میں آرام ملتا ہے۔ میں پیدا تو ہوا ہیں خاک کو لیکن دور دور سمندر نے بلا لیا۔ پہاڑوں اور وادیوں نے مجھے پال پوس کے بڑا کیا لیکن اب میری دوڑ دھوپ یہیں ہیں!"

باب ۔ ۱۱۷

ڈیل کی نگرانی

اس شام جو چار وہیل کھیت رہیں وہ ایک دوسرے سے بہت دور دور مریں، ایک تو جہاز کے آگے کی طرف، ایک پیچھے کی طرف، ایک ہوا کے رخ دور جا کے اور ایک ہوا کی مخالف سمت میں ذرا جہاز کے قریب۔ تینوں وہیلوں کو رات ہونے سے پہلے ہی لوگ جہاز کے پاس لے آئے لیکن چوتھی ہوا کے رخ دور رہی تھی جو جہاز اس کے پاس رات سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا چنانچہ جس کشتی نے یہ وہیل ماری تھی وہ صبح تک اس کے قریب رہی اور یہ کشتی اہاب والی تھی۔

مردہ وہیل کے فوارے والے سوراخ میں جھنڈا گاڑ دیا گیا تھا اور اس کے اوپر لالٹین لٹک رہی تھی جس کی لرزتی ہوئی شعاعیں وہیل کی چکنی پیٹھ پر اور دور تک سمندر کی لہروں پر پڑ رہی تھیں۔ سمندر کی لہریں وہیل کے جسم سے اس طرح ٹکرا رہی تھیں جیسے کسی ساحل سے۔

اہاب کی کشتی کے سارے آدمی سو رہے تھے البتہ فیدالہ کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا شارک مچھلیوں کو دیکھ رہا تھا جو آس پاس وہیل کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور کشتی کے تختوں کو اپنی دم سے چھیڑ رہی تھیں۔ فضا میں ایک ایسی آواز تھرتھرا رہی تھی جیسے خدا کے غضب کے مارے ہوئے لوگ آہ و بکا میں مصروف ہوں۔

اہاب جو سوتے سوتے چونکا تو سامنے فیدالہ نظر آیا۔ چاروں طرف رات کی تاریکی کا حلقہ کھنچا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں سیلاب آ گیا ہو اور بس یہ دو آدمی باقی بچے ہوں۔ اہاب بولا: "مجھے پھر وہی خواب نظر آیا ہے۔"

"مُردوں کی گاڑی والا؟ بڈھے، میں تجھے بتا چکا ہوں یا نہیں کہ تجھے نہ تو مُردوں کی گاڑی نصیب ہوگی نہ تابوت؟"

"جو لوگ سمندر میں مرتے ہیں انھیں گاڑی کب نصیب ہوتی ہے؟"

"لیکن بڈھے، میں نے کہا تھا کہ اس سفر میں تو اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ سمندر میں مُردوں کی دو گاڑیاں نہ دیکھ لے، ایک گاڑی تو انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی نہ ہوگی اور دوسری گاڑی کی لکڑی امریکہ کے کسی پیڑ کی ہوگی۔"

"ہاں، ہاں، بڑا عجیب نظارہ ہوگا وہ، پارسی ـــــــ مُردوں کی گاڑی، اس کے اوپر لگے ہوئے پَر، سمندر پر لہراتے ہوئے اور موجیں یہ تابوت کندھے پر اٹھائے ہوئے۔ لیکن یہ نظارہ ہمیں ابھی جلدی نظر نہیں آئے گا؟"

"بڈھے، تجھے یقین آئے یا نہ آئے لیکن تو اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک کہ یہ نظارہ نہ دیکھ لے۔"

"اور تو نے اپنے متعلق کیا کہا تھا؟"

"چاہے آخری وقت ہی کیوں نہ آ پہنچے لیکن میں تیرے آگے آگے ہی رہوں گا اور رہنمائی کے فرائض انجام دوں گا۔"

"اگر یہ بات اسی طرح پیش آئی تو جب تو مجھ سے پہلے چل دے گا تو اس وقت بھی مجھے ایسا معلوم ہوگا کہ تو میری رہنمائی کر رہا ہے ـــــــ یہی ہوگا نا؟ وعدہ کر کر کے تو نے مجھے اب اس پر یقین دلا دیا۔ اچھا تو اب میں بھی دو باتوں کا عہد

کہا ہوں ——— میں جوان ڈنگ کو قتل کروں گا اور اس کے بعد بھی صحیح سلامت رہوں گا۔"

"بڈھے، ایک منتر اور سن" پارسی نے کہا اور اس کی آنکھیں اس طرح جگمگا اٹھیں جیسے اندھیرے میں جگنو۔ "تیری موت سن کی رسی کے ذریعے واقع ہوگی۔"

"تیرا مطلب ہے میں پھانسی پاؤں گا ——— تو پھر چاہے میں خشکی پر رہوں یا سمندر میں، مجھے موت کبھی نہیں آئے گی۔"

اہاب نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا، "چاہے میں خشکی پر رہوں یا سمندر میں مجھے موت کبھی نہیں آئے گی۔"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سویرا ہو گیا، اور سوتے ہوئے ملاح کشتی کے فرش پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دوپہر ہونے سے پہلے پہلے مردہ وہیل کو جہاز کے پاس لے آئے۔

مزولہ

آخر کار خط استوا کی طرف جانے کا موسم قریب آگیا۔ ہر روز جب اہاب اپنے کمرے سے نکلتا اور نظریں اوپر اٹھا کے دیکھنے لگتا، تو کشتی چلانے والا بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنا پہیہ پکڑ لیتا اور جہازی بے تابی سے دوڑ کر رسیوں کے پاس جا کھڑے ہوتے اور مستول پر لگی ہوئی اشرفی کی طرف دیکھنے لگتے۔ ان سب کو حکم سننے کی بے چینی تھی کہ جہاز کا رخ خط استوا کی طرف پھیر دیا جائے۔ آخر یہ حکم بھی صادر ہو گیا۔ اس وقت ٹھیک دوپہر تھی اور اہاب جہاز کے پہلو میں لٹکی کشتی کے اندر بیٹھا عرض البلد کو ناپا جانے کے لیے حسب معمول سورج کا زاویہ ناپ رہا تھا۔

جاپانی سمندر میں گرمیوں کے دن روشنی کے چشموں کی طرح ہوتے ہیں۔ سمندر کے ناپیدا کنار شیشے میں جاپان کا دمکتا ہوا سورج ایک نقطہ سا کے معلوم ہوتا ہے۔ آسمان ایسا لگتا ہے جیسے اس پر روغن کر دیا گیا ہو۔ بادل بالکل نہیں ہوتے۔ افق پھر کھلتا رہتا ہے۔ یہ بے پردہ چمک بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے عرش کا ناقابل برداشت نور۔ یہ بڑی اچھی بات ہوئی کہ اہاب کے مزولے میں رنگین شیشے لگے تھے اور وہ سورج کی آگ کو ان کے اندر سے دیکھتا تھا۔ غرض وہ جہاز کے ساتھ ساتھ جھکنے کا عادی تھا اور اپنا اصطرلاب جب آنکھ سے لگائے اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ سورج ٹھیک نصف النہار پر پہنچ جائے وہ توجہ میں گم تھا۔ ادھر فدا اللہ عرشے پر گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا اور اہاب کی طرح چہرہ اوپر اٹھائے سورج کو تک رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پپوٹوں کے نیچے آدھے آدھے چھپ گئے تھے۔ اور اس کے وحشیانہ چہرے سے ہر جذبہ کے آثار غائب ہو گئے تھے۔ آخر کار اہاب کا مشاہدہ ختم ہو گیا اور اس نے اپنی نقلی ٹانگ پر پنسل سے حساب لگا کے دیکھ لیا کہ اس وقت عرض البلد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ دم بھر کے لیے کسی خواب میں غرق ہو گیا۔ اور پھر سورج کی طرف دیکھتے ہوئے مزولے سے یوں بولا ——— "اے سمندری نشان! اے بلند و بالا رہنما! تو مجھے یہ تو بتا دیتا ہے کہ میں کہاں ہوں ——— لیکن کیا تو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں آئندہ کہاں ہوں گا؟ کیا تو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میرے سوا ایک اور چیز اس وقت کہاں ہوگی؟ ——— موبی ڈک کہاں ہے؟ اس وقت وہ ضرور تیری نظروں کے سامنے ہوگی۔ میری آنکھیں اس آنکھ کو دیکھ رہی ہیں جو اس وقت بھی موبی ڈک کو دیکھ رہی ہے ——— ہاں میں اس آنکھ کو دیکھ رہا ہوں جو ساتھ ساتھ تیرے دوسری طرف کے نامعلوم سرزمین کو بھی دیکھ رہی ہے۔ آہ، اے سورج!"

پھر اس نے اپنے مزولے کی طرف دیکھا اور اس کے پاس سارے پرزوں کو ادھر ادھر کرنے کے بعد کچھ سوچ میں پڑ گیا اور بولا ——— "بے کار کھلونا! محض بازیچہ اطفال ہیں پر مغرور کپتانوں کو ایسا ناز ہوتا ہے! اے مزولے، دنیا تیری بڑی قوت اور تیز مندی پر فخر کرتی ہے لیکن تو اس کے سوا کیا کر سکتا ہے کہ اتفاق سے جس جگہ موجود ہو اس حقیر نقطے کا پتا بتا دے؟ نہیں!

تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور تو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ پانی کا ایک قطرہ اور ریت کا ایک ذرہ کل دوپہر کے وقت کہاں ہوگا لیکن اپنی بے بسی کے باوجود تو سمندر کی توہین کرتا ہے اہم! اسے بے کار کھلونے، تجھ پر لعنت ہو ان سب چیزوں پر لعنت جو انسان کی نظروں کو اوپر آسمان کی طرف اٹھاتی ہیں، ایک تکہ آسمان کی چمک انسان کو جھلس کے رکھ دیتی ہے جیسے میری آنکھیں سورج کی روشنی سے جھلس گئی ہیں۔ فطرت نے انسان کی نظریں زمین کے متوازی بنائی ہیں، سر کے اوپر نہیں لگائیں۔ گویا خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان عرش کی طرف نہ دیکھے لعنت ہو تیرے اوپر مردے!" اسے عرشے پر پھینک دیتا ہے۔ "اب اس زمین پر میں تجھے اپنا رہنما نہیں بناؤں گا۔ اب تو میں جہاز کے رفتار پیما کی مدد سے چلوں گا اور زائچے کے ذریعے حساب لگاؤں گا کہ میں سمندر میں کس جگہ ہوں" کشتی میں سے اترا آتا ہے۔ "تو کتنی حقیر چیز ہے اور پھر بھی آسمان کی طرف اشارہ کرتا ہے، دیکھ میں تجھے پیروں سے روند رہا ہوں! دیکھ میں تجھے برباد کر رہا ہوں!"

جب یہ پاگل بڈھا اپنے اصلی اور نقلی پیر کے مردے کو روند رہا تھا تو فیض اللہ کے گنگ تھے اور سب کے چہرے پر ایک طنز آمیز اور فخر مندانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کا تعلق اہاب سے تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مایوسی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تعلق خود اس کی ذات سے تھا۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اپنے کپتان کی اس حرکت سے پریشان ہو کر جہاز کے سارے جہازی ایک جگہ جمع ہو گئے۔ آخر کار اہاب نے اضطراب کے عالم میں عرشے پر ٹہلتے ہوئے یہ حکم دیا۔

"رسیوں کی طرف چلو! سکان کھینچو! ——— جہاز کا رخ خط استوا کی طرف پھیر دو"

بادبانوں کی بلیاں ایک دم سے گھوم گئیں اور جب جہاز اپنے پیندے پر پیچھے کی طرف مڑا تو تینوں خوبصورت مستول متوازی اور سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے ایسے لگنے لگے جیسے ایک گھوڑے پر تین سرکس والے ناچ رہے ہوں۔

اسٹاربک ایک طرف کھڑا پیکوڈ کو موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اہاب عرشے پر لنگڑاتا لڑکھڑاتا چل رہا ہے۔

"میں اکثر کوئلوں کی دہکتی ہوئی آگ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ پہلے تو آگ بڑی بیتابی سے بھڑکی اور اپنی چمک دکھانے لگی۔ اور اس کے بعد مدھم پڑتی چلی گئی اور آخر بے جان راکھ بن کے رہ گئی۔ اسے سمندر سمندر پھرنے والے بڈھے! تیری یہ آتشیں زندگی بھی آخرکار راکھ کا ڈھیر بن کے رہ جائے گی!"

"ہاں" اسٹاربک نے کہا "لیکن سمندری کوئلوں کی راکھ ——— مسٹر اسٹاربک یہ بات یاد رہے ——— سمندری کوئلوں کی معمولی کوئلوں کی نہیں۔ خیر خیر! ایک دن میں نے سنا تھا کہ اہاب منہ ہی منہ میں کہہ رہا ہے ——— کسی نے میرے ہاتھ میں بیتاش کے پتے پکڑا دیے ہیں اور مجھے حکم دیا ہے کہ انہی سے اپنی چال چلوں، دوسرے پتوں سے نہیں۔ شاباش، اہاب! تو جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ ابھی کھیل میں زندہ رہ اور ابھی کھیل ہی میں مر!"

ہر طرف جھاگ اڑ رہا ہے۔
یہ آوارہ سمندر رنگ رلیاں منا رہا ہے۔
اور اس کی شراب میں جھاگ اٹھ رہے ہیں۔
سمندر بھی بڑا دل لگی باز، ٹھٹھولیا، اور مست قلندر ہے۔
بجلی سے جہاز برباد ہو رہے ہیں۔
لیکن سمندر ہونٹ چٹخا رہا ہے۔
اور اپنی شراب کے مزے لے رہا ہے۔
سمندر بھی بڑا دل لگی باز، ٹھٹھولیا، اور مست قلندر ہے۔

"تو بہ، اسٹب!" اسٹاربک بولا۔ "بس طوفان کو یونہی گزرنے دو۔ تم ذرا ہمت سے کام لو اور پیچھے بیٹھو۔"

"لیکن میں ہمت والا کب ہوں؟ میں نے کب کہا ہے کہ میں ہمت والا ہوں؟"

"میں تو بڑا بزدل ہوں میں تو اس لیے گا رہا ہوں کہ ہمت بندھی رہے۔ صاف بات ہے مسٹر اسٹاربک، اس دنیا میں میرا گلا روکنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ میرا گلا کاٹ دیا جائے اور گلا کٹنے کے بعد بھی میں چیختے چلاتے ایک مناجات سنا دوں گا۔"

"پاگل! اگر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تو میری آنکھوں سے دیکھ!"

"ہیں! اندھیری رات میں تو عقلمند آدمی کو بھی اتنا ہی نظر آئے گا جتنا احمق کو!"

"ادھر دیکھ!" اسٹاربک نے اسٹب کا کندھا پکڑ کر ہاتھ سے موسم کی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا دیکھ نہیں رہا کہ طوفان مشرق کی طرف سے آیا ہے، اور اہاب کو موبی ڈک کی تلاش میں اسی طرف جانا ہے؛ اسی طرف جدھر آج دوپہر جہاز کا رخ پھیرا گیا ہے۔ ذرا اہاب کی کشتی کو تو دیکھ بھلا یہ کس جگہ ٹوٹی ہے؟ پچھلے حصے کی طرف سے، جہاں اہاب کھڑا ہو اکرتا ہے۔ ارے پاگل، اہاب کے کھڑے ہونے کی جگہ ٹوٹ چکی ہے۔ اگر تجھ سے اب بھی گئے بغیر نہیں رہا جاتا تو سمندر میں کود پڑ اور گاتا رہ!"

"میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھا!"

"ہاں، ہاں، نین ٹکٹ کو سب سے چھوٹا راستہ راس امید کی طرف سے ہو کے جاتا ہے۔" اسٹاربک نے اسٹب کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی بات کہے چلا گیا۔ "یہ طوفان ہمیں برباد کر دینا چاہتا ہے، لیکن ہم اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے گھر جا سکتے ہیں۔ سامنے ہوا کی سمت ہلاکت کا اندھیرا ہے لیکن پیچھے کی طرف گھر کا راستہ ہے۔ ادھر روشنی دکھائی دے رہی ہے لیکن یہ بجلی کی چمک نہیں ہے۔"

بجلی چمکنے کے بعد ایک دم سے گھپ اندھیرا چھا گیا تو اسے اپنے قریب ایک آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ساتھ سر

کے اوپر بادل بڑی زور سے گرجا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں موت کا فرشتہ!" اہاب نے کہا۔ وہ تختوں کے سہارے راستہ ٹٹولتا ہوا اوپر آ رہا تھا جب اسے بجلی کا کوندا ہوا تو اسے راستہ نظر آگیا۔

جس طرح میناروں کے اوپر ایک سلاخ لگی رہتی ہے تاکہ بجلی گرے تو زمین میں اتر جائے بعض جہازوں میں بھی ہر مستول کے اوپر اسی طرح کی سلاخ ہوتی ہے جو بجلی کو پانی میں لے جاتی ہے لیکن اسے پانی میں بہت گہرا ڈالنا پڑتا ہے تاکہ نیچے سے رگڑ نہ کھائے۔ علاوہ ازیں اگر یہ ہر وقت لٹکی رہے تو اندیشہ رہتا ہے کہ رسیوں میں پھنس جائے گی یا کوئی اور حادثہ پیش آئے گا، اور یہ جہاز کے چلنے میں حارج ہوگی۔ لہٰذا ان سلاخوں کا نچلا حصہ ہر وقت پانی میں نہیں رہتا بلکہ اس میں لمبی لمبی کڑیاں ہوتی ہیں تاکہ ضرورت کے مطابق جب چاہیں اوپر کھینچ لیں اور جب چاہیں گرا دیں۔

"سلاخیں! سلاخیں!" اسٹاربک نے جہازیوں کو پکارا۔ بجلی کی ان شعلوں نے ہی اہاب کو راستہ دکھایا تھا۔ انہی سے اسٹاربک کو ایک دم سے ہوش آگیا تھا۔ "کیا سلاخیں ابھی اوپر ہیں؟ انہیں پانی میں ڈالو۔ آگے کی طرف بھی اور پیچھے کی طرف بھی جلدی کرو!"

"ٹھہرو بھی!" اہاب نے کہا۔ "ہم کمزور سہی لیکن اس معاملے میں انصاف سے کام لینا چاہیے۔ میرا بس چلے تو جیکسن اور ایتھنز کے پہاڑوں پر بھی بجلی کی سلاخیں لگوا دوں تاکہ ساری دنیا محفوظ رہے لیکن میں کسی قسم کی رعایت پسند نہیں کرتا! ان سلاخوں کو یوں ہی رہنے دو۔"

"ذرا اوپر کی طرف تو دیکھئے!" اسٹاربک نے کہا۔ "خدایا! آسمان پر تو پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں!"

سارے مستولوں کے ڈنڈوں میں آگ لگ گئی، اور ترسول کی شکل کی سلاخوں میں سے سفید شعلے اٹھنے لگے اس گرج کی گونج میں تینوں مستول چپ چاپ اس طرح جل رہے تھے جیسے قربان گاہ کے سامنے تین زبردست شمعیں۔

"ارے توبہ! کشتی کی تو بجلی چلنے دو!" اسٹب چلایا۔ وہ اپنی کشتی کو رسی سے باندھ رہا تھا کہ ایک زبردست اور تیکھی کڑک سے جھٹکا ہوا یا اس کا ہاتھ پھسل گیا۔ "لعنت!" ——— وہ عرشے پر واپس آگیا اور اوپر کی طرف دیکھا تو شعلے نظر آئے۔ اب اُسکے لہجہ بدل کے فوراً کہا ——— "خدا ہم سب پر رحم کرے!"

جہازیوں کے لیے گالیاں تو روزمرہ کی چیز ہیں۔ وہ پرسکون سمندر میں بھی گالیاں دیتے ہیں اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی جس وقت ان کا جہاز کھلے ہوئے سمندر میں ڈوبنے والا ہو اس وقت بھی وہ مستولوں کے اوپر سے گالیوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ لیکن میں نے جتنے بھی سفر کیے ہیں ان میں ایسی بات کبھی نہیں دیکھی کہ جہاز پر خدا کا غضب نازل ہو چکا ہے اور اس کے قہر کی علامتیں بادلوں اور رسیوں میں نظر آ رہی ہیں، مگر اس کے باوجود ایک دم گالیاں دیئے چلا جا رہا ہے۔

جب ریشیوں میں آگ بھڑک رہی تھی تو جو زندہ جہازی بالکل گم صم کھڑے تھے وہ سب کے سب جہاز کے اگلے حصے میں
جمع ہو گئے تھے اور اس زرد زرد روشنی میں ان کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے بجھتے ہوئے ستاروں کی لو جھلک۔
اس ہیبت ناک روشنی میں دیو قامت اور کالا بھجنگ جبشی ڈیگو بھی کچھ ایسا دکھائی دیتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ یہی وہ بادل ہے
جس میں سے بجلی چمک رہی ہے۔ مانس چنگھ کے کھلے ہوئے منہ میں سے شارک مچھلی کی طرح سفید دانت نظر آ رہے تھے اور اس
طرح جگمگا رہے تھے جیسے ان میں بھی آگ دہک گئی ہو۔ کوئی گریگ کے بدن پر گرے ہوئے نشان اس طرح دہک اٹھے تھے جیسے جسم
کے فیتے نیلے تھے۔

جب اوپر کی آگ ختم ہو گئی تو یہ جہاز کی نظر بھی غائب ہو گیا۔ ڈیگو اور تمام جہازیوں کو اندھیرے نے پھر اپنی آغوش
میں لے لیا۔ وہ چاروں طرف سے استارک آگے بڑھا کسی سے ٹکرا گیا۔ یہ اسٹب تھا۔ کہو میاں اب کیا خیال ہے؟ میں نے تمہاری چیخ
سنی تھی۔ وہ تمہارا ہاتھ کالا ہو گیا؟

"نہیں، نہیں، میں چلا کب تھا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ خدا ہم پر رحم کرے۔ اور واقعی خدا اپنا فضل کرے گا لیکن کیا خدا
بس ہر وقت ہم پر ہی رحم کرتا ہے؟ —— کیا اسے آفتیں پسند نہیں؟ اچھا، ادھر دیکھو، مسٹر اسٹارک —— لیکن اس اندھیرے
میں دکھائی کب دے گا؟ خیر میری بات سنو۔ میرا خیال ہے کہ مستولوں پر جو آگ لگی ہے یہ بڑا نیک شگون ہے۔ کیونکہ ان مستولوں
کی جڑیں اس کوٹھری تک پہنچتی ہیں جو اب وہیل روغن سے لدا لد بھرنے والی ہے۔ چنانچہ وہیل روغن بھی مستولوں میں اس طرح چڑھے
گا جیسے درخت میں رس۔ ہمارے تینوں مستول ایسے ہو جائیں گے جیسے روغنی شمعیں —— یہی بڑا اچھا شگون نظر آ رہا ہے۔"

اتنے میں اسٹارک نے دیکھا کہ اسٹب کا چہرہ اندھیرے میں سے آہستہ آہستہ ابھرتا آ رہا ہے۔ اس کی نگاہ اوپر کی طرف
گئی تو وہ چلا پڑا —— دیکھو! دیکھو! شعلے پھر اٹھنے لگے تھے اور ان کی زردی پہلے سے بھی زیادہ ہیبت ناک ہو گئی تھی۔

"خدا ہم سب پر رحم کرے۔" اسٹب چلایا۔

بڑے مستول کی جڑ کے پاس اشرفی اور شعلے کے ٹھیک نیچے فیض اللہ گھٹنوں کے بل اہاب کے سامنے جھکا ہوا تھا لیکن
اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ قریب ہی تو رسی نالیوں کے اوپر جہاں وہ مستول کو باندھ رہے تھے چند جہازی
اس چکاچوند سے گھبرا کر وہیں جم کے رہ گئے تھے اور اس طرح نیچے لٹک رہے تھے جیسے بے جان تھکے پنچھی ڈال میں۔ باقی
جہازیوں کی بھی یہ حالت تھی جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو اور جو جس طرح کھڑا تھا ویسے کا ویسا ہی رہ گیا ہو لیکن سب کی نظریں اوپر کی
طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"ہاں، ہاں میرے جہازیو!" اہاب چلایا۔ "اس آگ کی طرف دیکھو خوب غور سے دیکھو۔ یہ سفید شعلے ہیں سفید وہیل کی
طرف لے جا رہے ہیں اور مجھے وہ بجلی کی سوغات دے رہے جو بڑے مستول پر لگی ہوئی ہے۔ میں اس کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری اور
اس کی نبض ایک ساتھ دھڑکے گی۔ ایک طرف خون، دوسری طرف آگ۔ ٹھیک ہے۔"

وہ سوچ ہاتھ میں لے کے مڑا اور اپنا پیر فیض اللہ کے اوپر رکھ دیا پھر اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے داہنا ہاتھ پھیلا کے

شعلوں کے رقص کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آگ کی پاک و صاف رُوح، ایک زمانے میں آتش پرست کی حیثیت سے میں نے اپنی سمندروں میں تیری پوجا کی تھی لیکن اس عبادت کے دوران میں تو نے مجھے ایسا جھلسا کر آج تک نشان باقی ہے۔ اب میں تجھے جان گیا ہوں، میں سمجھ گیا ہوں کہ تیری پوجا کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تیرا انکار کیا جائے۔ تو دوستی سے خوش ہوتی ہے نہ تعظیم سے اور نفرت کے بدلے میں بھی ہلاک کر دیتی ہے۔ تو سب کو ہلاک کرتی ہے۔ اس وقت تیرے سامنے کوئی بے وقوف نہیں کھڑا ہے کہ دل میں تیرا خوف ہو۔ مجھے تسلیم ہے کہ تیری گونگی طاقت زمان و مکان سے ماوراء ہے لیکن اپنی مجبور و محکوم جیسی زندگی کے آخری دم تک میں اپنے اوپر تیرا مکمل قبضہ نہ ہونے دوں گا۔ اس مجبور و بے حقیقت وقت کے درمیان یہاں ایک انفرادی شخصیت کھڑی ہے۔ میں صرف ایک نقطہ ہی سہی میں جانے کہیں سے آیا ہوں اور کہیں جا رہا ہوں لیکن جب تک اس زمین پر زندہ ہوں، یہ شاہانہ شخصیت میرے اندر زندہ رہے گی اور اپنے شاہانہ حقوق جتاتی رہے گی لیکن فدائی میں لطیف ہے اور نفرت میں عذاب۔ اپنی کمترین شکل میں محبت کی روح اختیار کر کے آ تو میں تیرے سامنے جھک جاؤں گا اور تیرے قدم چوموں گا۔ یا پھر اپنی اعلیٰ ترین شکل اختیار کر اور ایک روحانی طاقت بن کے آ۔ چاہے تو نے اوری چندری دنیاؤں کے ہیرے کے ہیرے سمندر میں اتار دیئے ہوں لیکن میرے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو ان باتوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ اے صاف و شفاف رُوح تو نے مجھے اپنی آگ سے بنایا ہے اور آگ کے بچے بیٹے کی طرح میں ہر سانس کے ساتھ تیرے اوپر آگ پھینک رہا ہوں۔"

[اچانک بجلی بار بار کوندتی ہے تو شعلے پہلے کی بہ نسبت تین گنے اونچے اٹھتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ اہاب بھی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ان پر اپنا ہاتھ رکھ لیتا ہے]

"مجھے تسلیم ہے کہ تیری گونگی طاقت زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ میں نے کہا تھا نہیں؟ اور مجبور ہو کے بھی نہیں کہا تھا پھر میں یہ بجلی کی سلاخیں بھی ہاتھ سے نہیں پھینکوں گا۔ تو مجھے اندھا کر سکتی ہے پھر میں ٹٹول ٹٹول کے چلوں گا۔ تو مجھے جلا سکتی ہے لیکن میں راکھ کی شکل میں زندہ رہوں گا۔ میری ان آنکھوں اور ہاتھوں کا خراج عقیدت وصول کر لیکن میں دینے والا نہیں۔ بجلی کی چمک میری کھوپڑی کے آر پار ہوتی جا رہی ہے۔ میری آنکھوں کے ڈیلے دکھنے لگے ہیں جو تازہ چوٹوں سے میرے ذہن کی یہ حالت ہو گئی ہے جیسے میرا سر کٹ کے زمین پر لڑھکتا پھر رہا ہو۔ ہائے، ہائے، میری آنکھیں بند ہیں لیکن میں تجھ سے باتیں ضرور کروں گا۔ تو روشنی سہی لیکن اندھیرے میں سے نکلی ہے۔ میں اندھیرا سہی لیکن روشنی میں سے نکلا ہوں — تیرے اندر سے نکلا ہوں۔ اب بجلی کے نیزے آنے بند ہو گئے۔ آنکھیں کھول دو۔ دیکھوں یا نہ دیکھوں، شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آہ، اے تابناک شعلے! اس وقت مجھے اپنے سلسلۂ نسب پر فخر ہو رہا ہے۔ تو میرا آتشیں باپ ہے۔ میری پیاری ماں کون تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ اے ظالم تیرے ہاتھوں اس کا کیا حشر ہوا؟ یہ میرے وجود کی پہیلی ہے لیکن تیرے وجود کی پہیلی اور بھی گہری ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ تو کہاں سے آیا ہے۔ اس لیے کہتا ہے کہ میں بغیر باپ کے پیدا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی ابتدا معلوم نہیں۔ اس لیے کہتا ہے کہ میری کوئی ابتدا نہیں۔ مجھ میں ہزار طاقت سہی لیکن مجھے اپنے جانے

میں وہ بات معلوم ہے جو تجھے اپنے بارے میں معلوم نہیں۔ تجھ سے آگے ایک اور چیز موجود ہے جو کسی دوسری چیز میں جذب نہیں ہوتی —— جس کی نظروں میں تیری ابدیت وقت کی اسیر ہے اور تیری خلاقی محض خلا میں تیری بجھی ہوئی آنکھیں تیرے آتشیں وجود میں سے اس حقیقت کو دیکھ رہی ہیں اے چیتم و بیر شعلے اے ازل اب ہے تیرے وجود کی بھی ایک پہیلی ہے جو کسی کو بتائی نہیں جا سکتی۔ تیرے دل میں بھی ایک غم چھپا ہوا ہے جس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا اس معاملے میں بھی شکیبانہ اذیت کے ساتھ میں اپنے باپ کی پیروی کرتا ہوں، بلند ہو اے شعلے، بلند ہو اور آسمان کو چاٹ ڈال! میں بھی تیرے ساتھ اچھل رہا ہوں، میں بھی تیرے ساتھ جل رہا ہوں، جی چاہتا ہے کہ میں اور تو ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ میں تجھے پوجتا ہوں اور تجھ سے لڑتا بھی ہوں!"

"کشتی! کشتی!" اسٹاربک چلایا۔ "بڈھے، اپنی کشتی کو دیکھ!"

اہاب نے لوہار کی بھٹی میں جو برچھا بنایا تھا وہ کشتی میں اپنی جگہ بندھا ہوا تھا اور کنارے سے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ لیکن موج نے کشتی کو جیسے اوندھا دیا تھا جس سے برچھے کا غلاف گر گیا تھا۔ اس وقت برچھے کے تیز پھل میں سے ایک زرد زرد دو شاخوں کا شعلہ نکلا۔ برچھا سانپ کی زبان کی طرح جلنے لگا۔ اسٹاربک نے اہاب کا بازو پکڑ لیا اور بولا ——

"بڈھے، خدا تیرے خلاف ہے۔ اب بھی باز آ! یہ بڑا منحوس سفر ہے! غلط طریقے سے شروع ہوا اور غلط طریقے سے جاری ہے۔ بڈھے، اب بھی اجازت دے کہ میں جہاز کا رخ پھیر دوں، اور ہم ایک اچھے سفر پر گھر کی طرف چل پڑیں۔"

خوف زدہ جہازیوں نے اسٹاربک کی بات سنی تو فوراً رسیوں کی طرف لپکے —— حالانکہ ایک بادبان تک باقی نہ بچا تھا۔ اس وقت تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ جو اسٹاربک کی رائے ہے وہی ان کی رائے ہے چنانچہ انھوں نے ایک نیم باغیانہ قسم کا نعرہ لگایا لیکن اہاب نے بجلی کی کڑکڑاتی ہوئی سلاخ عرشے پر پھینک دی اور جلتا ہوا برچھا اٹھا کے جہازیوں کے درمیان مشعل کی طرح ہلانے لگا۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ اگر کسی نے رسی کو ہاتھ لگایا تو میں برچھا بھونک دوں گا۔ اس کا غضب دیکھ کر لوگ سہم گئے اور کچھ اس آتشیں برچھے سے ڈرے چنانچہ وہ ہراساں ہو کر پیچھے ہٹ گئے، اور اہاب بولا۔

"تم نے سفید وہیل کو مارنے کی قسم کھائی ہے۔ تم بھی اتنے ہی پابند ہو جتنا میں۔ اور بڈھے اہاب کا جسم، اس کی روح، اس کے پھیپھڑے، اس کی زندگی سب کچھ وقف ہو چکا ہے۔ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ میرے دل کی آواز کیا ہے تو ادھر دیکھو، میں یہ آخری خوف بھی ختم کیے دیتا ہوں!" اور اس نے پھونک مار کے شعلہ بجھا دیا۔

جس طرح بیابانوں میں طوفان آئے تو لوگ صنوبر کے زبردست پیڑ کے پاس سے ہٹ جاتے ہیں کیونکہ اس کے قد و قامت اور قوت کی وجہ سے اس پر بجلی ضرور گرتی ہے اور یہ پیڑ بہت خطرناک بن جاتا ہے۔ اسی طرح جہازیوں نے اہاب کے یہ آخری الفاظ سنے تو خوف زدہ ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گئے۔

باب — ۱۲۰

عرشہ

• رات کا پہلا پہرا ختم ہو رہا ہے

[داب سلمان کے پاس کھڑا ہے۔ اشارہ کرتے قریب آتا ہے۔]

"جناب آپ حکم دیں تو بڑے مستول کا ڈنڈا اتار دیں۔ اس کی رسی کھل گئی ہے۔ اور ٹیک بھی اکھڑ گئی ہے۔ اسے کاٹ ڈالوں؟"

"کوئی چیز مت کاٹو، باندھ دو۔ اگر میرے پاس اور بھی انگلیاں ہوتیں، تو اس وقت میں انھیں لگا دیتا۔"

"حضور؟ —— خدا کے لیے! —— حضور؟"

"ہوں!"

"لنگر ابھی پیچھے پڑے ہیں۔ کیا انھیں اوپر اٹھا لوں؟"

"کوئی چیز مت کاٹو۔ کسی چیز کو مت چھیڑو۔ ہوا چلنے لگی ہے، لیکن ابھی اتنی تیز نہیں ہوئی کہ مجھے منزل پر پہنچا دے۔ جاؤ جلدی سے سارا انتظام کرو —— سبحان اللہ! یہ تو مجھے کسی چھوٹے سے تجارتی جہاز کا کپتان سمجھتا ہے۔ بھلا بڑے مستول کا ڈنڈا کاٹ رہا ہے! واہ رے عقل! اچھے بادبان تو اس لیے ہوتے ہیں کہ کشتی ہواؤں کا مقابلہ کریں۔ میرے دماغ کا بادبان بھی ہواؤں کے جھاگ میں اڑ رہا ہے۔ کیا میں اسے بھی کاٹ ڈالوں؟ طوفان کے وقت تو بس بزدل ہی اپنے بادبان پھینکا کرتے ہیں۔ وہاں اوپر کیسا زور ہو رہا ہے! شاید یہ بھی کوئی عالی وقار شخص بات ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ کھینچ کی بیماری ہی ایسی ہے جس میں بڑا شور مچتا ہے۔ ارے، دوا پیو، دوا!"

آدھی رات کا وقت

جہاز کے اگلے حصے میں پشتوں کے قریب

[اسٹب اور فلاسک پشتوں پر چڑھے بیٹھے ہیں اور وہاں لٹکے ہوئے لنگروں میں رسیاں باندھ رہے ہیں۔]

"نہیں اسٹب۔ اس گانٹھ کو جتنا جی چاہے پیٹ لو لیکن مجھے پیٹ پیٹ کے وہ بات نہیں منوا سکتے جو تم ابھی کہہ رہے تھے اور ابھی تھوڑے دن ہوئے تم نے بالکل الٹی ہی بات کی تھی۔ کیا تم نے ایک مرتبہ یہ نہیں کہا تھا کہ اہاب جس جہاز میں سفر کرے اُسے بیمہ ذرا زیادہ کرانا چاہیے کیونکہ اس جہاز کی حالت تو ایسی ہوگی جیسے آگے پیچھے دونوں طرف بارود کے پیپے لدے ہوں۔ بولو کہا تھا کہ نہیں؟"

"اچھا فرض کرو کہا تھا تو پھر؟ جب سے کہا اب تک میرے بدن میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ آخر میری رائے کیوں نہ بدلے؟ پھر یہ بھی فرض کر لیا کہ جہاز میں بارود کے پیپے لدے ہوئے ہیں لیکن جھاگ کی اس بارش میں بارود آگ کیسے پکڑ سکتی ہے؟ یوں تو یار تمہارے بال بھی سرخ ہیں لیکن تمہارے آگ نہیں لگ سکتی۔ ذرا اپنے کپڑے تو جھاڑو۔ تم تو مجھے خاصے سقے معلوم ہو رہے ہو۔ کوٹ میں سے اتنا پانی ٹپک رہا ہے کہ گھڑا بھر لو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیمہ کی کمپنیاں ایسے خطروں کا بھی خیال رکھتی ہیں کی چھپے تو قریب نہ ہو فلاسک۔ ہم تو پانی نکالنے کا انجن بنے ہوئے ہیں۔ خیر سنو میں تمہاری دوسری بات کا جواب دیتا ہوں۔ اچھا، پہلے لنگر سے ٹانگ ہٹاؤ تاکہ میں ادھر سے رسی نکال دوں۔ اب سنو طوفان کے وقت بجلی کی سلاخ پکڑنے اور بغیر سلاخ والے مستول کے پیچھے کھڑے ہونے میں کون سا بہت بڑا فرق ہے۔ ارے کاٹھ کے الو اتنی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک مستول پر بجلی نہ گرے سلاخ پکڑنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ تم کدھر کی باتیں کر رہے ہو؟ سو میں سے ایک جہاز کے اندر بھی تو بجلی والی سلاخ نہیں ہوتی۔ میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ اس وقت اہاب کو اور ہم سب کو بس اتنا ہی خطرہ تھا جتنا اس وقت دس ہزار جہازوں میں چلنے والے لوگوں کو ہے۔ ہٹے بد تمیز کہیں ہو! شاید تم چاہتے ہو کہ دنیا میں ہر آدمی جب باہر نکلے تو ٹوپی میں پر کی طرح ایک چھوٹی سی سلاخ لگی ہو اور پیچھے پیچھے گھسٹتی چلے۔ فلاسک، ذرا عقل کی بات کیا کرو۔ اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں؟ پھر عقل کی بات کیوں نہیں کیا کرتے؟ آدمی میں ذرا سی سمجھ ہو تو عقل کی بات کر سکتا ہے۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں اسٹب۔ لیکن بعض اوقات تمہیں عقل کی بات کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔"

"ہاں! جب آدمی سر سے پیر تک پانی میں شرابور ہو تو عقل کی بات کرنا مشکل ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ اس پھوار نے تو مجھے ڈبو کے رکھ دیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ رسی ادھر سے نکالو اور مجھے پکڑاؤ۔ ہم تو لنگروں کو اس طرح باندھ رہے ہیں جیسے پھر کبھی استعمال ہی نہیں ہوں گے۔ ان دو لنگروں کو باندھنا تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی آدمی کے ہاتھ پیچھے باندھ رہے ہوں۔ اور یہ ہاتھ ہیں بھی کتنے بڑے بڑے! لوہے کے گھونسے ہیں۔ ان کی پکڑ بھی کتنی زبردست ہے۔ کیوں، فلاسک، کہیں دنیا بھی کسی جگہ لنگر

سے بندھی ہوتی تو نہیں، اگر بندھی ہوتی ہے تو اس کی رسی بہت دراز ہو گی۔ اور اس کا کھونٹا تھوڑے سے ٹھونک دو، اور بس کام ختم۔ ٹھیک، سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا ہے اور اس کے بعد کیا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ارے، ذرا میرا دامن آج پکڑ دو مگر یہ فلاسفک۔ لوگ لمبے دامن والے کوٹ پہنتے ہیں لیکن میرا تو خیال ہے کہ سمندر میں جانا ہو تو ان کے تو لمبا کوٹ ہی پہننا چاہیے سارا پانی دامنوں پہ سے بہہ کے بہہ جائے گا یعنی جل پڑے پیچھے کی ٹوپی کا ہے۔ مجھے میں پانی رنگ جاتا ہے اور منہ پہ بھی آئے گا۔ اب میں یہ چھوٹے چھوٹے کوٹ اور ترپال کی ٹوپیاں کبھی نہیں پہنوں گا۔ اگر کہ جہاز پہ آئی گا تو لمبے دامنوں والا کوٹ اور پیچھے دار ٹوپی پہن کے بس فیصلہ ہو گیا۔ چلو اٹھو اور میری ترپال کی ٹوپی پانی میں گی۔ اے خدایا، جو ہوائیں جنت سے آتی ہیں وہ اتنی ہنگامہ خیز کیسے ہوتی ہیں؟ یار۔ آج رات تو بڑا گڑبڑ موسم ہے۔

باب - ۱۲۲

آدھی رات ــــــ مستول کے اوپر

بجلی کی چمک اور کڑک

[بڑے مستول کے اوپر ــــ تاشتیگو ڈنڈے کو نئی رسیوں سے باندھ رہا ہے۔]

ہُوں، ہُوں، ہُوں۔ یہ کڑک بند کرو! یہاں تو بہت ہی زیادہ کڑک ہے۔ اس کڑک سے فائدہ؟ ہُوں، ہُوں، ہُوں۔ ہمیں کڑک نہیں چاہیے۔ ہمیں تو شراب چاہیے۔ بس ایک جام لے آؤ۔ ہُوں، ہُوں، ہُوں!

باب - ۱۲۳

بندوق

طوفان کے دوران میں سُکان کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا لیکن چونکہ اسے تھوڑا بہت ہلانا جلانا بھی ضروری تھا اس لیے زنجیریں ذرا ڈھیلی رکھی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سُکان ایسے لرزنے لگا جیسے تشنج کا مریض، اور جو آدمی اسے سنبھالے کھڑا تھا وہ ہوا کے زور سے کئی دفعہ لڑھک کے گرا۔

طوفان میں جب یہ جہاز گیند کی طرح اِدھر سے اُدھر اچھالے جاتے ہیں تو آپ اکثر دیکھیں گے کہ قطب نما کی سوئیاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد گول گھوم رہی ہیں۔ پیکوڈ کی قطب نما کا بھی یہی حشر ہوا۔ سُکان والا طوفان کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہی دیکھتا کہ سوئیاں آندھی کی سی تیزی کے ساتھ گول گھوم گئیں، اور یہ نظارہ ایسا ہے جسے دیکھ کر کوئی خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آدھی رات کے چند گھنٹے بعد طوفان میں اتنی کمی آگئی کہ اسٹاربک اور اسٹب کام میں لگ گئے اور انھوں نے سخت کھینچا تانی کے بعد بادبانوں کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں کو مستولوں پر سے کاٹ کے پھینک دیا۔ یہ ٹکڑے پانی میں گرداب بناتے ہوئے اس طرح بہتے چلے گئے جیسے طوفان میں اڑتی ہوئی چڑیا کے پَر ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔

اب نئے بادبان لگائے گئے اور پچھلی طرف طوفان سے حفاظت کے لیے ایک اور بادبان بھی چڑھا دیا گیا۔ چنانچہ اب جہاز کچھ قابو میں آگیا اور ٹھیک چلنے لگا۔ سُکان چلانے والے کو مشرق جنوب مشرق کا رخ بتا دیا گیا اور اسے حکم ملا کہ جس حد تک ہو سکے جہاز کو اس طرف ڈالو کیونکہ طوفان کی شدت میں اسے ہوا کی مرضی کے مطابق چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہ قطب نما دیکھ کر جہاز کو صحیح راستے پر لانے لگا تھے میں ایک بڑا اچھا شگون سامنے آیا یعنی ہوا کا رخ بدل گیا، اور اس کی شدت میں بھی کمی آگئی۔ اس طرح جو ہوا جہاز کے لیے ہلاکت خیز تھی وہی موافق ہو گئی۔

جہازی کام میں لگ گئے اور خوشی کے نعرے لگانے لگے کیونکہ جتنے برے شگون نظر آئے تھے وہ سب باطل ثابت ہوئے اور حالات اتنے خوشگوار ہو گئے۔

اہاب نے حکم دے رکھا تھا کہ جس وقت بھی عرشے پر کوئی تبدیلی نظر آئے مجھے اطلاع دی جائے۔ اسٹاربک نے بادبانوں کو تو نا بے دلی اور ہچکچاہٹ کے ساتھ ہوا کے رخ پر کھینچا لیکن پھر اس حکم کی تعمیل میں چپ چاپ کپتان اہاب کو اطلاع دینے چل دیا۔

اہاب کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے وہ غیر ارادی طور پر بھرے ہوئے بندوقوں کے سامنے رک گیا۔ کمرے کے اندر چراغ جلتے ہوئے تھا وہ تھا، اور بھڑک بھڑک کے جل رہا تھا۔ لیمپ کے ہلنے کے ساتھ ساتھ کبھی تو دروازے پر سایہ پڑتا کبھی ہٹ جاتا۔ کواڑ بالکل پتلا سا تھا اور اس میں اوپر کی طرف تختے کے بجائے جھلملیاں لگی ہوئی تھیں۔ حالانکہ چاروں طرف ہوا اور پانی کا

شور ہوتا تھا لیکن چونکہ کمرہ سب سے الگ تھلگ اور زیرِ زمین تھا اس لیے وہاں ایک گھُوں گھُوں کرتی ہوئی خاموشی مسلط تھی۔ بھری ہوئی بندوقیں دیوار سے لگی کھڑی تھیں اور جھلمل میں سے چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ اسمارٹ ایک راست باز اور ایماندار آدمی تھا، لیکن بندوقیں دیکھ کر اس کے دل میں ایک عجیب ناسمجھ خیال پیدا ہوا لیکن اس خیال میں چند ایسے بے ضرر مناسبات شامل تھے کہ لمحہ بھر کے لیے تو وہ اس کے ناسمجھ پہلو کو پہچان ہی نہ سکا۔

"ایک دفعہ وہ میرے گولی مارنا چاہتا تھا" اسمارٹ نے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "ہاں، یہی وہ بندوق ہے جو اس نے میری طرف تانی تھی —— وہ بندوق جس کے کندے پر نقش و نگار ہیں۔ ذرا اسے چھو کر تو دیکھوں —— ٹھنڈی۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ چاچا میرا ارور ڈ کا بچہ کیل ہے لیکن میں اس وقت کانپ رہا ہوں۔ بھری ہوئی ہے؟ ذرا دیکھوں تو ہاں، ہاں گولیاں اور بارود بھی ہے —— یہ تو کوئی ٹھیک بات نہیں۔ اسے پیچھے الٹ دو؟ —— ذرا ٹھہرو، میں ابھی اس کا علاج کرتا ہوں۔ میں اس بندوق کو بے دھڑک ہاتھ میں اٹھا کے سوچوں گا —— میں اسے یہ بتانے آیا ہوں کہ ہوا موافق ہے۔ کس کے لیے موافق ہے؟ موت اور ہلاکت کے لیے —— یہی ہوا ٹرنکٹ کے لیے ہے۔ ہوا صرف اس خونی پاگل کے لیے موافق ہے۔ —— یہ وہی نال ہے جو اس نے میری طرف تانی تھی! —— بالکل وہی ہے، یہی ہے وہ —— میں نے اسے ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ بندوق میرے ہاتھ میں ہے وہ مجھے اسی سے مارنے والا تھا —— اس کا بس چلے تو سارے جہازیوں کو مار ڈالنے دو کتا ہے میں کسی طوفان سے ڈر کر نہیں بھاگوں گا! اس نے اپنا مزہ ولد سمندر میں توڑ ڈالا کرتیں! وہ ان سمندروں میں حال رہتا کی مدد سے چل رہا ہے کہ جن میں ہزاروں خطیاں ہیں! وہ اسی طوفان میں اس نے قسم کھائی تھی یا نہیں کہ میں بجلی کی سلاخوں کو ستونوں پر نہیں لگا رہنے دوں گا! یہ پاگل جہاز کے پورے عملے کو موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔ کیا ہم یونہی چپکے بیٹھے دیکھتے رہیں اور دم نہ ماریں؟ —— اگر جہاز کو کوئی نقصان پہنچا تو اب تیس آدمیوں کے قتل عمد کا مرتکب ہوگا، اور اگر اب اپنی من مانی کرتا رہا تو میرا دل کہتا ہے کہ یہ جہاز تباہ ضرور ہوگا۔ لہٰذا اگر اس وقت اسے ٹھکانے لگا دیا جائے تو وہ اس جرم سے بچ جائے گا۔ ارے! یہ سوتے میں بول رہا ہے؟ ہاں، اندر ہے —— اندر سو رہا ہے۔ سو رہا ہے؟ ہاں لیکن ابھی زندہ ہے اور تھوڑی دیر میں جاگ اٹھے گا۔ بڈھے! اس وقت میں تیرے سامنے نہیں ٹھہر سکوں گا۔ تو نہ تو عقل کی بات سنتا ہے، نہ شکوہ شکایت، نہ التجائیں۔ تو ان سب چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بس یہی تو ڈھنگ ہے کہ ادھر تیرے منہ سے ایک لفظ نکلا اور ادھر تعمیل ہوئی۔ ہاں، اور تو کہتا ہے کہ سب جہازیوں نے وہی قسم کھائی ہے جو تو نے کھائی ہے۔ تو کہتا ہے کہ ہم سب اہاب ہیں۔ خدا نہ کرے! —— لیکن کیا کوئی اور طریقہ نہیں؟ کوئی قانونی طریقہ نہیں؟ —— اسے قید کر کے گھر لے جائیں؟ اسے اس بڈھے کے جیتے جاگتے ہاتھوں سے اس کی جیتی جاگتی ذات چھیننے کی امید؟ اس کی کوشش تو کوئی بے وقوف ہی کر سکتا ہے۔ فرض کرو اس کی مشکیں کس دیں، رسیوں میں جکڑ دیں اور زنجیروں میں باندھ کے ڈال دیں؟ پھر تو وہ پنجرے کے اندر بند چیتے سے بھی زیادہ خوفناک ہو جائے گا۔ میں تو اس نظارے کی تاب نہیں لا سکوں گا۔ اس کی چیخ پکار سے بچ کے بھاگوں گا بھی کہاں۔ پھر میری نیند، آرام اور عقل سب چیزیں رخصت ہو جائیں گی۔ پھر کیا کیا جائے؟ یہاں سے زمین سیکڑوں میل دور ہے۔ نزدیک ترین

حصہ گئے جاپان ہے انجن روم اور کے دروازے ہم پر بند ہیں۔ میں کھلے حصے میں اکیلا کھڑا ہوں۔ میرے اور تاؤں کے درمیان دو بحر اعظم اور ایک پورا براعظم ہے۔ ____ ہاں، ہاں، یہی بات ہے۔ اگر خدا کسی ایسے شخص کو جو قتل کا ارادہ رکھتا ہو سوتے میں بجلی گرا کے ہلاک کر ڈالے اور اس کے بستر اور کھال دونوں کو ایک ساتھ بھسم کر دے تو کیا ہم خدا کو قاتل کہیں گے؟ ____ کیا میں قاتل بن جاؤں گا اگر ____ پیچھے ہی پیچھے، آہستہ آہستہ اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس نے بھری ہوئی بندوق کی نال کواڑ سے لگا دی۔

اب کا جھونکا سامنے تک رہا ہے، اسی کا مرا اسی طرف ہے۔ بس لبلبی دبانے کی دیر ہے، اسٹاربک کی جان بچ جائے گی اور وہ اپنے بیوی بچوں سے جا ملے گا ____ خدایا، خدایا! ____ توبہ! توبہ! ____ لیکن، بڈھے، اگر میں تجھے موت کے گھاٹ نہ اتاروں تو کون جانے آج کے دن اسٹاربک کی گہرائیوں میں ڈوب چکا ہو اور سارے جہازیوں سمیت! خدایا تو کدھر ہے؟ لبلبی دبا دوں؟ لبلبی دبا دوں؟ ____ جناب، ہوا کم ہو گئی ہے اور اس کا رخ بھی بدل گیا ہے۔ بادبان چڑھا دیئے گئے ہیں اور آپ نے جو راستہ بتایا تھا جہاز اسی پر چل رہا ہے۔

"سب لوگ پیچھے کی طرف چلیں! آہ، موبی ڈک، آخر تو میری پکڑ میں آ گئی۔"

سوتے ہوئے بڈھے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی خوابیدہ نیند میں بھی اس نے اسٹاربک کی آواز سنی اور خواب دیکھتے دیکھتے بول پڑا۔

تنی ہوئی بندوق شرابی کے بازو کی طرح ہلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسٹاربک کسی فرشتے سے کشتی لڑ رہا ہے۔ آخر اس نے بندوق نیچے رکھ دی اور وہاں سے چلا گیا۔

"مسٹر اسٹب، وہ آرام کی گہری نیند سو رہے ہیں۔ تم نیچے جا کر انہیں جگا دو اور خبر پہنچا دو۔ میں ذرا عرشے کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ ان سے کیا کہنا ہے۔"

باب - ۱۲۴

سوئی

اگلے دن بھی سمندر کے بہاؤ میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ چاندی کی چادریں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی پیکوڈ کو غوطے کے پیچھے یوں دھکیل رہی تھیں جیسے کسی دیو کی پھیلی ہوئی ہتھیلیاں ہوں، مسلسل طور سے اتنی تند اور زور دار چل رہی تھیں کہ آسمان ایک پھولا ہوا بادبان لگتا تھا۔ ہوا کے شور سے ساری دنیا گونج اٹھی تھی۔ سورج نظر آ رہا تھا لیکن صبح کی ساری روشنی اس کے آس پاس مرکز ہو گئی تھی اور کرنیں سنگینوں کی طرح چل رہی تھیں۔ اسی شدید روشنی سے اس کی جگہ کا پتا چلتا تھا ہر چیز بابل کے بادشاہ کے لباس کی طرح قرمزی ہو گئی تھی۔ سمندر پگھلے ہوئے سونے کی کٹھالی بن گیا تھا جس میں سے روشنی اور حرارت ابل ابل کے اوپر جا رہی تھی۔

ایب بہت دیر سے بالکل الگ تھلگ، خاموش اور مغرور سا کھڑا تھا جب پچکولے کھاتا ہوا جہاز آگے کو جھک جاتا تو وہ سامنے کی طرف نظریں اٹھا کر سورج کی کرنوں کو دیکھنے لگتا اور جب جہاز پھر ٹھیک پیچھے لگتا تو وہ پیچھے کی طرف مڑ کر سورج کی زرد زرد کرنوں کو جہاز کے پچھلی طرف والی پانی کی دھاروں میں جذب ہوتے دیکھتا۔

"ہا ہا، میرے جہاز! اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے سورج کی سمندری رتھ ہو۔ ہو! سامنے کی طرف والے ٹکڑوں میں سورج کی سواری لے کے تو اسے پاس آ رہا ہوں! سامنے والی لہروں کو بھی جوت دو۔ میں جھاڑ کی لگا ڈوریں سمندر کی رتھ چلا رہا ہوں!"

لیکن ایک دم سے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ رک گیا۔ اور جلدی سے سکان کے پاس جا کے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا کہ جہاز کس رخ جا رہا ہے۔

"مشرق جنوب مشرق، جناب" سکان چلانے والے نے گھبرا کے کہا۔

"ایب نے اس کے ایک مکا دے دیا اور کہا، "جھوٹ بکتا ہے! جہاز صبح کے وقت مشرق کی طرف جا رہا ہے اور سورج پیچھے کی طرف ہے!"

یہ سن کر ہر آدمی کے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ ایب نے اس وقت جو بات دیکھی اس کا ابھی تک کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا لیکن یہ بات اتنی بدیہی تھی کہ شاید اسی وجہ سے لوگ اس بات سے غافل تھے۔

ایب نے جھک کر قطب نما کو دیکھا تو اس کا اوپر اٹھا ہوا بازو گر پڑا اور وہ دم بخود رہ گیا۔ اسٹاربک اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے بھی جھانک کر دیکھا تو دیکھتا ہے کہ سوئیوں کا رخ مشرق کی طرف ہے لیکن پیکوڈ مغرب کی طرف جا رہا ہے۔

لیکن یہ بات ابھی جہازیوں کو معلوم نہ ہونے پائی تھی کہ بڈھے نے ایک کرخت سا قہقہہ لگایا اور کہا میں سمجھ گیا، یہ بات

پہلے بھی ہو چکی ہے مسٹر اسٹاربک کل رات بجلی کڑکی تھی اس نے قطب نما کا رخ بدل دیا ہے ——— بس اور کچھ نہیں ایسے واقعات تو نے پہلے بھی سنے ہوں گے۔"

"جی، سنا تو ہے لیکن خود کبھی نہیں دیکھا" بیٹ نے سر پیٹتے ہوئے بڑی افسردگی کے ساتھ کہا۔

واضح ہو کہ زبردست طوفانوں میں اس قسم کے حادثات جہازوں کو اکثر پیش آتے ہیں۔ قطب نما کی سوئی میں جو مقناطیسی قوت ہوتی ہے بعض وہ آسمان کی بجلی سے ... لہٰذا اس طرح کی باتیں پیش آئیں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ ایسی شاید ہی ہیں کہ بجلی گری اور بادبانوں اور رسیوں کو جلاتی ہوئی گزر گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوئی کی مقناطیسی قوت زائل ہو گئی۔ اور یہ فولاد کا ٹکڑا اتنا ہی بے کار ہو گیا جتنی کسی بڑھیا کی بننے والی سلائی۔ لیکن چاہے یہ قوت بالکل ہی زائل ہو جائے یا کمزور پڑ جائے، سوئی میں مقناطیسی اثر خود بخود واپس نہیں آتا۔ اگر کبھی قطب نما خراب ہو جائے تو جہاز کی ساری قطب نماؤں کا یہی حشر ہوتا ہے چاہے کوئی کوٹھری میں ہی کیوں نہ رکھی ہو۔

اہاب قطب نما کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بازو پھیلا کر سورج کا ٹھیک ٹھیک رخ معلوم کیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سوئیاں بالکل الٹی ہو گئی ہیں تو حکم دیا کہ جہاز کا رخ بھی اسی حساب سے بدل دیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ اور اب پیکوڈ ایک مرتبہ پھر مخالف ہوا کا مقابلہ کر رہا تھا کیونکہ جس ہوا کو موافق سمجھا گیا تھا وہ تو اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔

اسٹاربک کے پوشیدہ خیالات چاہے کچھ بھی ہوں، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں بلکہ ضروری احکامات دیتا رہا۔ اسٹب اور فلاسک بھی ایک حد تک یہی احساسات رکھتے تھے، لیکن وہ بھی چپ رہے اور شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لائے۔ رہے جہازی تو ان میں سے بعض کچھ بڑبڑائے ضرور لیکن اتنے تو وہ تقدیر سے بھی نہ ڈرتے تھے جتنا اہاب سے۔ جنگل پر بچھے بالکل ایسے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اگر وہ کچھ متاثر ہوئے بھی تو اہاب کے اٹل ارادے سے، اور پہلے سے بھی زیادہ اس کے معتقد و پرجوش ہو گئے۔

تھوڑی دیر تو بڈھا اپنے خوابوں میں غرق عرشے پر ٹہلتا رہا لیکن اتفاق سے اس کی ہڈی والی ایڑی پھسل گئی تو اسے ٹوٹے ہوئے کچھ ٹکڑے پڑے نظر آئے جو اس نے کل ہی توڑا تھا۔

"اے بیچارے بھولے! کل میں نے تجھے توڑا تھا، اور شاید آج قطب نما مجھے توڑ دیتی۔ ٹھیک ہے، لیکن مقناطیس اب بھی اہاب کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مسٹر اسٹاربک ——— ایک نیزہ لاؤ، ایک ہتھوڑی اور ایک بادبان سینے کی سوئی۔ جلدی کرو!"

یہ کام ذرا عجیب سا ہی تھا لیکن اس میں کچھ دوراندیشی کو بھی دخل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ الٹی سوئیوں کو اپنے ہنر سے ٹھیک کر کے جہازیوں کا حوصلہ بڑھا دے۔ علاوہ ازیں بڈھے کو اچھی طرح معلوم تھا کہ الٹی سوئیوں کے ذریعے جہاز بڑا بھلا چل سکتا ہے لیکن ضعیف الاعتقاد جہازی اسے برا شگون سمجھیں گے اور خوف کے مارے لرزتے رہیں گے۔

بیٹ نے لے مطلوبہ چیزیں لا کر دیں تو اس نے جہازیوں کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "میرے جہازیو! بجلی نے بڈھے

اہاب کی سوئیوں کو بگاڑ دیا ہے، لیکن اہاب فولاد کے اس ٹکڑے سے اپنی سوئی خود بنا سکتا ہے جو بالکل ٹھیک طرح کام دے گی۔"

جہازی چپ چاپ تعجب اور حیرانی کی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، اور بے عزتی کی سی حالت میں انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں اب کیا معجزہ رونما ہوتا ہے لیکن اسٹاربک نے منہ پھیر لیا۔

اہاب نے ہتھوڑی مار کے نیزے کا پھل توڑ دیا اور لوہے کی جو لمبی سلاخ باقی رہ گئی اسے میٹ کو دے کر کہا کہ اسے سیدھا پکڑے رہو لیکن عرشے سے نہ لگنے پائے۔ پھر اس نے ہتھوڑی سے سلاخ کے اوپر والے سرے کو دو چار دفعہ پیٹ کر سوئی اس کے اوپر رکھ دی، میٹ سلاخ پکڑے رہا اور اہاب سوئی پر ہلکی ہلکی چوٹیں لگانے لگا۔ پھر اس نے سلاخ لے کر اسے دو چار دفعہ ایک عجیب طرح چلایا۔ نہ جانے یہ بات لوہے میں مقناطیسی قوت پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی یا وہ جہازیوں کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ خیر اس کے بعد اس نے تاگا منگایا اور قطب نما کے پاس جا کر الٹی سوئیاں نکال لیں، اور یہ بادبان سینے کی سوئی اندر لٹکا دی۔ پہلے تو سوئی گول گول گھومی اور دونوں طرف سے کانپتی رہی لیکن آخر کار اپنی جگہ قائم ہو گئی۔ اہاب تو اسی انتظار میں تھا۔ وہ قطب نما کے پاس سے ہٹ گیا اور بازو اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ——— "تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ مقناطیس اہاب کے قبضۂ قدرت میں ہے یا نہیں۔ سورج مشرق کی طرف ہے اور قطب نما بھی یہی بتا رہی ہے!"

ہر جہازی نے قطب نما کے اندر جھانک کے دیکھا، کیونکہ ان کی جہالت اس کے بغیر ایمان نہیں لا سکتی تھی، اور وہ پھر وہاں سے کھسک گئے۔

اس وقت اہاب کی آتشیں آنکھوں میں فتح مندی اور حقارت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنے ہلاکت خیز تکبر کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔

باب - ۱۲۵

رفتار پیما

بدنصیب پیکوڈ اتنے دنوں سے سفر کر رہا تھا لیکن رفتار پیما سے ابھی تک کام نہ لیا گیا تھا۔ چونکہ دوسرے ذرائع سے جہاز کا رخ اور مقام معلوم کرنے کا یقین ہو چکا ہے اس لیے بعض تجارتی جہاز اور بہت سے شکاری جہاز رفتار پیما سے کام ہی نہیں لیتے۔ حالانکہ رسمی طور پر جہاز کے رُخ اور گھنٹے کے حساب سے رفتار کی شرح کا اندراج تختی پر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال پیکوڈ کا تھا پچھلے جنگلے کے نیچے رفتار پیما لٹکا ہوا تھا لیکن کسی نے اُسے چھوا تک نہ تھا۔ بارش اور جھاگ سے میل گیا تھا، دھوپ اور ہوا سے بھر گیا تھا اور بے کار پڑے پڑے گل چکا تھا۔ یہ سب سہی لیکن مقناطیس والے واقعے کے چند گھنٹے بعد اس پر اہاب کی نظر پڑی تو اُسے ایک نئی سوجھی۔ اُسے یاد آیا کہ بیرامیٹر ختم ہو چکا ہے، اور میں نے اپنے پاگل پن میں رفتار پیما سے کام لینے کی قسم کھائی تھی۔ جہاز تھپیڑے کھا رہا تھا چل رہا تھا پچھلی طرف لہروں نے غدر مچا رکھا تھا۔ جہازیو ادھر آؤ۔ رفتار پیما کو چلاؤ!

جہازی آگے بڑھے۔ ایک تو سنہرے بالوں والا تاہیتی کا جنگلی اور دوسرا مینکس والا جس کے بال سفید تھے۔ تم دونوں میں سے ایک آدمی چرخی سنبھال لے، میں ڈور چھوڑتا ہوں۔"

یہ دونوں جہاز کے پچھلے حصے میں چلے گئے جہاں ہوا کے زور سے جھاگ اچھلتی ہوئی سفید لہروں میں دھنسا جا رہا تھا۔

مینکس والے نے چرخی اُٹھا لی جس پر ڈور لپٹی ہوئی تھی اور رفتار پیما کو لٹکا کے کھڑا ہو گیا۔ اہاب اس کی طرف بڑھا۔

اہاب نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر ڈور کے تیس چالیس پھیر کھول ڈالے تاکہ ہاتھ میں لچھا بنا کے پانی میں پھینک دے۔ مینکس والا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہمت کر کے بولا۔۔

"حضور، مجھے اس ڈور پر اعتبار نہیں۔ یہ تو گلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ گرمی اور پانی سے خراب ہو چکی ہے۔"

"نہیں، بڈھے، کام دے گی۔ کیا پانی اور گرمی سے تو بھی خراب ہو گیا ہے؟ تو ابھی تو کام دے رہا ہے یا شاید یوں کہنا چاہیئے کہ زندگی تجھ سے کام لے رہی ہے۔"

"حضور، میں تو چرخی پکڑے کھڑا ہوں، جیسا کہ میرے کپتان کا حکم ہے۔ مجھ بڈھے آدمی کو بحث میں پڑنے سے فائدہ؟ خاص طور سے ایک ایسے افسر کے ساتھ جو کسی کی سنتا ہی نہیں۔"

"یہ کیا کہا؟ یہ تو نکتہ رسی پر اتر آیا۔ لیکن خیر، تو معلوم ہوتا ہے۔ تو کہاں پیدا ہوا تھا؟"

"ڈھنڈوری، حضور جہاز کا ڈھنڈوری۔ کرم دھم کرم دھم! پپ! پپ! جو آدمی پپ کو پتا بتانے لگے تو ہی
کی سا اشرفیاں انعام میں ملیں گی۔ پانچ فٹ قد ـــــ شکل سے بزدل معلوم ہوتا ہے ـــــ یہ اس کی سب سے بڑی پہچان ہے!
کرم دھم کرم دھم کسی نے بزدل پپ کو دیکھا ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے اس جہاز میں کسی کے پاس دل نہیں۔ اسے سنگدل رہنا تو! اندر جہاں لب کے نیچے تو دیکھو، اس بد قسمت بچے کو
قیمتی سے خرید لیا گیا ہے اور اسے بے یار و مددگار یہیں چھوڑ دیا۔ تم کتنے گرے ہوئے ہو! ادھر دیکھو! دیکھو جب تک اہاب زندہ ہے،
اہاب کا کمرہ پپ کا گھر ہوگا۔ ویسے تیری طرح تو میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی ہیں اور تو ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے
ہیں جو میرے دل کے تاروں سے بندھا ہے۔ آ۔ پیچھے چلیں۔"

"یہ کیا ہے! بالکل مخمل معلوم ہوتی ہے!" پپ نے اہاب کے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے چھو کر کہا۔ "اگر یہ چاہے پپ
کے ہاتھ میں ہوتا تو شاید اسے بچا لیتا! تو شاید اس کی جان بچ جاتی! حضور مجھے تو یہ ہاتھ جان بچانے والی رسی کی طرح معلوم ہوتے ہیں
کمزور روحیں اس کا سہارا لے سکتی ہیں۔ حضور ملاح کو بلایئے کہ وہ ان دونوں ہاتھوں کو جوڑ دے۔ سفید ہاتھ اور کالے ہاتھ
دونوں کو جوڑ دے کیونکہ اب میں اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔"

"ٹھیک، میں بھی تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ البتہ اگر مجھے ایسی جگہ کھینچ لے جاؤ تو اور بات ہے جو جہاں کی بیٹی بیوں سے
بھی زبردست ہوں گی۔ اچھا آ میرے کمرے میں چل۔ دیکھو اے لوگو جو دیوتاؤں کو مکمل بے خبر سمجھتے ہو اور انسان کو مکمل شر، ذرا
دیکھو! علیم و بصیر دیوتا انسان کے دکھ کا ذرا خیال نہیں کرتے۔ انسان بیوقوف ہے اور اسے کچھ بھی خبر نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں
لیکن اس کے اندر محبت اور احسان مندی کے جذبات موجود ہیں۔ آ میرے ساتھ چل! تیرا کالا ہاتھ پکڑ کے میں اتنا فخر محسوس
کرتا ہوں جتنا کسی شہنشاہ کا ہاتھ پکڑ کے بھی محسوس نہ کروں!"

"وہ ایک سے دو پاگل ہوئے" بیکٹس کے بڈھے نے چپکے سے کہا۔ "ایک تو اپنی قوت کی وجہ سے پاگل ہوا ہے اور دوسرا
اپنی کمزوری کی وجہ سے۔ وہ بھی چل ہوں گے اور سارا کھیل ختم ہو گیا۔ سارے ڈھول میں جہاز جھکا لنگر گیا۔ اس کی مرمت ہوگی! میرا خیال ہے
کہ کچھ زور لگانا پڑے گا۔ میں چل کے مسٹر اسٹب سے کہتا ہوں۔"

باب ۔ ۱۲۹

جان بچانے والا پیپا

جہاز جنوب مشرق کی طرف جا رہا تھا اور اس کی منزل جہاں ایپ کی بیماری ختم ہوتی تھی اور ایپ کا رنگ نکھر رہا تھا۔
اس طویل بحری سفر میں انھیں ایک جہاز دکھائی نہ دیا۔ دو چار دن کے اندر ہی اندر یہ اتنی بیزار ہو گئیں کہ طبیعت اکتانے لگی۔ ہوا میں
بھی کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو رہی تھی۔ یہ ساری پر شگون چیزیں کسی ہلاکت خیز تماشے کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھیں۔

آخر کار جہاز جواسنز کی شکارگاہ کے مضافات میں آ پہنچا۔ صبح ہونے سے پہلے جو گہرا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اس میں چند پہاڑی
جزیروں کے قریب سے گزرتے ہوئے پہرے والوں نے ایک ایسی ہی شدید اور دردناک چیخ سنی جیسے ہیروڈیس کے قتل کئے
ہوئے شیر خوار بچے رو رہے ہوں۔ یہ چیخ سن کر سب کے سب چونک پڑے اور جتنی دیر وہ آواز سنائی دیتی رہی کھڑے یا بیٹھے
یا لیٹے ہوئے ملاح اسے کان لگا کے سنتے رہے۔ جنوبی ملکوں کے جہازیوں نے کہا کہ جل پریاں ہیں اور کانپنے لگے لیکن جنگلی ایپ پہلے
کو ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ سب سے زیادہ عمر کے جہازی جس کا نام ... والے نے کہا کہ یہ ان لوگوں کی آوازیں ہیں جو ابھی سمندر میں ڈوبے
ہوں۔

ایپ پہلے سو رہا تھا اُسے یہ خبر اُسی وقت ملی جب وہ صبح کو عرشے پر آیا۔ فلاسک نے اُسے ساری بات سنائی اور
اشارتاً یہ بھی کہا کہ اس میں نحوست کے بڑے معنی نکلتے ہیں۔ ایپ نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور اس عجوبے کی تشریح کر دی۔

جہاز جن پہاڑی جزیروں کے قریب سے گزر رہا تھا وہاں سیل مچھلیاں بہت بڑی تعداد میں رہتی تھیں۔ جن بچوں کی مائیں
مر گئی تھیں یا جن ماؤں کے بچے ضائع ہو گئے تھے وہ رات کو ابھر کے جہاز کے پاس آگئی ہوں گی اور انہی انسانوں جیسی آوازیں
روتی ہوئی چلا رہی ہوں گی۔ لیکن یہ سن کر بعض جہازی اور بھی ڈر گئے کیونکہ یہ لوگ سیل مچھلیوں کے بارے میں بڑے ضعیف الاعتقاد
معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل تو جب یہ مچھلیاں کسی مصیبت میں گرفتار ہوں تو انسانوں کی طرح روتی ہیں پھر جب جہاز کے پاس پانی
سے سر نکالتی ہیں تو ان کے گول گول سر انسانوں جیسے لگتے ہیں اور چہرے پر وحشت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ بعض حالات میں
اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگ سیل مچھلیوں کو انسان سمجھ بیٹھے۔

لیکن جہازیوں نے جو بُرا شگون لیا تھا اس کی تصدیق اُن کے ایک ساتھی کے انجام سے بھی ہو گئی۔ سورج نکلنے کے وقت
یہ شخص اپنے بستر سے اٹھ کر سیدھا مستول پر چڑھا۔ شاید یہ شخص ابھی اچھی طرح نہ جاگا ہو کیونکہ جہازی بعض اوقات آدھے سوئے آدھے
جاگتے اوپر چڑھتے ہیں۔ خدا جانے یہ بات تھی یا نہیں۔ بہرحال وہ ابھی ہوا کے جھونکے اوپر پہنچا بھی نہ ہوگا کہ ایک چیخ سنائی
دی اور کسی چیز کے گرنے کی سی آواز آئی۔ لوگوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو ایک آدمی گرتا نظر آیا جو پانی میں غائب ہونے کے بعد
بلبلوں کا ایک ڈھیر پیچھے چھوڑ گیا۔

اب جان بچانے والا پیپا پانی میں پہنچ گیا جو جہاز کے پچھلے حصے میں لٹکا رہتا تھا اور ایک کھڑکے کا بنا تھا لیکن اسے پکڑنے کے لیے کوئی ہاتھ باہر نہ نکلا اس پیپے کے تختے دھوپ میں پڑے پڑے سکڑ گئے تھے چنانچہ اس میں پانی بھرنے لگا اور سکڑے ہوئے تختوں کی درزوں میں سے بھی پانی اندر رسنے لگا چکر پیپے میں لوہے کی پتیاں بھی لگی ہوئی تھیں لہٰذا جہازی کے پیچھے پیچھے یہ بھی سمندر کی تہہ میں بیٹھ گیا۔ اب ایک تکیہ رہ گیا جو تخت سہی لیکن کام تو دے سکتا تھا۔

غرض سفید وہیل کے دائرے میں جو شخص سب سے پہلے اُسے تلاش کرنے کے لیے جہاز پر چڑھا تھا وہ سمندر کی نذر ہو گیا۔ لیکن شاید اس وقت یہ بات بہت کم لوگوں نے سوچی ہو گی کہ ایک شگون کی حیثیت سے انہیں اس واقعہ کا ذرا بھی افسوس نہ ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنے والی مصیبت کا پیش خیمہ نہیں کہہ رہے تھے بلکہ ایک ایسا حادثہ جس کی پیشین گوئی ہو چکی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ اب ہم سمجھ گئے رات وہ رونے کی آوازیں کیوں آئی تھیں لیکن پیکس والے نے پھر بھی کہا کہ نہیں۔

جان بچانے والا پیپا ضائع ہو چکا تھا۔ اب اس کی جگہ کوئی اور پیپا لگانا تھا۔ اسٹاربک کو ہدایت ملی کہ اس کا انتظام کرے لیکن کوئی ایسا ہلکا پیپا ملا ہی نہیں پھر جہازی تو اس مرحلے کے انتظار میں بیٹھے تھے جو انہیں درپیش تھا یعنی سفر کا خاتمہ چاہے کسی طرح بھی ہو، لیکن وہ کوئی ایسی محنت نہیں کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق سفر کے انجام سے نہ ہو۔ چنانچہ ان کا ارادہ ہوا کہ پیپے کے بغیر ہی گزارہ کیا جائے لیکن کوئی کوئیگ نے کچھ عجیب طرح ہاتھ ہلا کر اپنے تابوت کی طرف اشارہ کیا۔

"پیپے کے بجائے تابوت!" اسٹاربک چونک کے بولا۔

"یہ تو عجیب سی چیز ہو گی" اسٹب نے کہا "اس سے کام تو چل سکتا ہے۔" فلاسک نے کہا "بڑھئی اسے ٹھیک کر دے گا۔"

"اچھا اسے اوپر لاؤ۔ اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔" اسٹاربک نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا "بڑھئی، اسے ٹھیک کرو۔ میری طرف نہ دیکھو ــــــ میرا مطلب تابوت سے ہے۔ سن رہے ہو یا نہیں؟ اسے ٹھیک کر دو۔"

"ڈھکنے میں کیلیں لگا دوں؟" بڑھئی نے ہتھوڑے کی طرح ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"درزیں بھی بند کر دوں؟" اس نے پھر ایسے ہاتھ چلایا جیسے اوزار لیے ہو۔

"ہاں۔"

"اور اوپر سے تارکول بھی چڑھا دوں؟" اس نے ہاتھ سے تارکول چھڑکا۔

"بھاگ یہاں سے! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ تابوت کا پیپا بنا دے ــــــ بس اتنی سی بات ہے۔ مسٹر اسٹب مسٹر فلاسک، میرے ساتھ آؤ۔"

"یہ تو خفا ہو کے چل دیا۔ پوری مصیبت تو برداشت کر رہا ہے لیکن اس کے اجزا سے بدکتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں۔ میں نے کپتان اہاب کے لیے ٹانگ بنائی اور انھوں نے شریفوں کی طرح لگا لی لیکن میں نے کوئی کوئیگ کے لیے تابوت بنایا اور وہ اس میں لیٹا ہی نہیں۔ میں نے اس تابوت پر جتنی محنت کی ہے کیا وہ یونہی بے کار جائے گی؟ اور اب مجھے حکم ہوا ہے کہ

"ہاں، یہ اس وجہ سے کہ شاید ایک سہارا ہے۔ اور ہر چیز سہارا اس وقت بنتی ہے کہ جب پیچھے کچھ نہ ہو۔ یہی بات ہے جس میں داخل ہو کر بھی ایسی ہی آواز نکلتی ہے۔ بڑھئی کبھی تو کسی جنازہ کو کندھے پر رکھ کے چلا ہے اور گرجا میں داخل ہوتے وقت تابوت کو دروازے سے ٹکراتے سنا ہے؟"

"حضور، ایمان ———"

"ایمان، یہ کیا؟"

"جی، ایمان سے حضور، یہ تو یقین ایک قسم ہے ——— بس اور کچھ نہیں۔"

"ہوں، ہوں۔ آگے چلو۔"

"جی، میں یہ کہنے والا تھا کہ ———"

"کیا تو ریشم کا کیڑا ہے؟ ایک تو اپنا کفن خود اپنے اندر سے بنتا ہے۔ ذرا اپنے گریبان کی طرف دیکھ، بھاگ یہاں سے اس گور کو نکال کے پھینک۔"

"یہ چل دیا۔ ایک دم سے ہی اٹھ گیا تھا۔ لیکن گرم ملکوں میں طوفان بھی یک دم سے کہتے ہیں۔ سنتا ہے کہ ایک ساحل کے جزیرہ کو خواہ مخواہ ٹھیک بیچ میں سے کاٹتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑھئی کو بھی کوئی خواہ مخواہ بالکل بیچ میں سے کاٹتا ہے۔ یہ ہر وقت آگ کی طرح گرم رہتا ہے۔ ادھر دیکھو رہا ہے ——— ابھی، رسی، جلدی کر، کام پھر سے شروع کر دیں۔ یہ حضور، ایسا اضطراب ہے۔ اور میں موسیقی کا استاد ہوں ——— کھٹ، کھٹ!"

[اہاب اپنے آپ سے کہتا ہے۔]

"کیا عجیب منظر ہے! کیسی عجیب آواز ہے! سفید سر کا کھٹ بڑھئی کھوکھلے پیڑ پر ٹھونگیں مار رہی ہے۔ آدمی کا اندھا اور بہرہ ہونا ہی اچھا۔ ذرا دیکھو، یہ چیز دو نابینوں کے اوپر رکھی ہے جو ہیں اور بہری ہوئی ہے۔ یہ شخص بھی ڈائن کے جادو سے ایسی زہریلی ہنسی ہنستا ہے۔ کھٹ، کھٹ، آدمی کی زندگی کے لمحے بھی ایسے ہی کھٹ کھٹ گزرتے ہیں۔ آہ، مادی چیزیں بھی کتنی بے بنیاد ہوتی ہیں۔ حقیقی چیزیں تو بس خیالاتی ہیں۔ یہ خیالات ہیں۔ یہ چیز ہے تو گویا موت کی نشانی ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی کو ہلاکت کے منہ میں جاتے ہوئے آدمی کے آخری سہارے اور امید کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ تابوت سے جان بچانے والا پیپا بنایا ہے! کیا اس میں کچھ اور معنی بھی نکلتے ہیں؟ کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روحانی اعتبار سے تابوت ابدی زندگی عطا کرنے والا قرار پائے؟ میں اس پر غور کروں گا۔ لیکن نہیں، میں زندگی کے تاریک پہلو کا اتنا قائل ہو چکا ہوں کہ اس کا دوسرا یعنی نظریاتی اور روشن پہلو مجھے دھندلا دھندلا سا معلوم ہوتا ہے۔ بڑھئی، او منحوس کھٹ پٹ بند بھی کرے گا یا نہیں؟ میں تو نیچے جاتا ہوں۔ دیکھو جب میں واپس آؤں تو یہ چیز مجھے نظر نہ آئے۔ اچھا پپ، ہم دونوں اس چیز کے متعلق بحث کریں گے۔ مجھے تجھ سے بہت ہی عجیب و غریب فلسفے حاصل ہوتے ہیں۔ شاید نامعلوم دنیاؤں سے نامعلوم نہریں اگر تیرے اندر گرتی ہیں۔"

پیکوڈ اور ریشل کی ملاقات

اگلے دن ایک بہت بڑا جہاز ریشل نظر آیا، جو سیدھا پیکوڈ کی طرف چلا آرہا تھا۔ اس کے مستولوں پر آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت پیکوڈ پانی میں بڑی تیز رفتار سے جا رہا تھا لیکن جب یہ چوڑے پروں والا اجنبی جہاز قریب آیا تو گھمنڈ سے بادبان اس طرح ڈھلک گئے جیسے پھٹے ہوئے غبارے اور جیسے ہی دھکا ہوا لگا تو ساری اکڑ فوں غائب ہو گئی۔

”بری خبر ہے، یہ جہاز تو بری خبر لایا ہے۔“ بکتی والے نے کہا لیکن اس سے پہلے کہ اس جہاز کا کپتان جو منہ سے بھونپو لگائے اپنی کشتی میں کھڑا تھا، ہمیں پکارے، اہاب کی آواز گونج اٹھی۔

”کہیں سفید وہیل نظر آئی؟“

”ہاں، کل نظر آئی تھی۔ تم لوگوں نے کوئی شکاری کشتی سمندر میں بہتے دیکھی ہے؟“

اپنی خوشی کو زبردستی دباتے ہوئے اہاب نے اس غیر متوقع سوال کا جواب نفی میں دیا۔ وہ اجنبی جہاز کی طرف جانے ہی والا تھا کہ دیکھا اس کپتان نے اپنا جہاز روک دیا اور دیوار پر سے نیچے اتر رہا ہے۔ دو چار جھٹکوں میں اس کی کشتی کا آنکڑا پیکوڈ کی زنجیروں میں اٹک گیا، اور کپتان کود کے عرشے پر آگیا۔ اہاب نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو نین ٹکٹ کا رہنے والا اور میرا ملاقاتی ہے لیکن رسمی طور سے آپس میں سلام دعا نہیں ہوئی۔

”اُسے کہاں دیکھا تھا؟ ——— مارا نہیں! ——— مارا نہیں؟“ اہاب قریب آتے ہوئے چلایا، ”کیسے ہوا؟“

ایسا لگا، معلوم ہوا کل تیسرے پہر کے وقت اس جہاز کی تین کشتیاں وہیلوں کی ایک ٹکڑی کا پیچھا کر رہی تھیں جو جہاز سے چار پانچ میل دور نکل گئی تھی۔ کشتیاں ہوا کے رخ تیزی سے جا رہی تھیں کہ دوسری طرف نیلے پانی میں سے اچانک بہی ڈاگ کا سفید کوہان اور سر نکل آیا۔ اب چوتھی کشتی جو ایسے موقعوں کے لیے تیار رہتی تھی، فوراً سمندر میں اتار دی گئی۔ یہ کشتی سب سے تیز رفتار تھی چنانچہ ہوا کے رخ پر دوڑ پڑی اور سفید وہیل کے اندر برچھا اتارنے میں کامیاب ہو گئی ——— کم سے کم جہاز پر سے دیکھنے والے کا تو یہی خیال تھا۔ اس نے دیکھا کشتی دور ہوتے ہوتے ایک نقطہ سی رہ گئی پھر لپکتے ہوئے پانی کی ایک چمک سی دکھائی دی، اور اس کے بعد کچھ نظر نہیں آیا۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا گیا کہ جیسا اکثر ہوتا ہے، زخمی وہیل اپنے شکاریوں کو لے کے بھاگ گئی۔ اس سے کچھ خدشہ تو ضرور محسوس ہوا لیکن ابھی ڈرنے کی کوئی بات نہ تھی۔ کشتیوں کو واپس بلانے کے نشان رسیوں میں باندھ دیے گئے۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ اب چوتھی کشتی کی تلاش میں دوسری طرف جانے سے پہلے جہاز کو ان تینوں کشتیوں کی فکر کرنی پڑی جو ہوا کے رخ بہت دور نکل گئی تھیں۔ جہاز مجبور تھا کہ اس کشتی کو آدھی رات تک قسمت کے سہارے پر چھوڑ رکھے، بلکہ فی الحال اس سے اور دور ہو جائے لیکن جب باقی جہازی خیریت کے ساتھ عرشے پر پہنچ گئے تو سارے بادبان کھول لیے

گئے اور جہاز گم شدہ کشتی کے پیچھے چل پڑا۔ روغن کے ڈبوں میں آگ جلا دی تاکہ ان لوگوں کو جہاز نظر آ جائے۔ اور پھر دوسرا آدمی مچان پر جا پہنچا۔ کشتی جہاں آخری دفعہ نظر آئی تھی جہاز اس طرف بہت دور تک گیا۔ فالتو کشتیاں بھی نیچے اتار دی گئیں تاکہ آس پاس تلاش کریں۔ جب کشتی نظر نہ آئی تو جہاز تھوڑی دیر رکنے کے بعد پھر چل پڑا۔ ایک دفعہ پھر رکا۔ اور کشتیاں اتاریں۔ غرض صبح تک یہی تماشا ہوتا رہا لیکن گم شدہ کشتی کی جھلک تک نظر نہ آئی۔

یہ کہانی سنانے کے بعد اجنبی کپتان نے فوراً بتایا کہ میں پیکوڈ میں کیوں آیا ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ پیکوڈ بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اور دونوں جہاز چار یا پانچ میل کے فاصلے سے متوازی چل کے اس کشتی کو تلاش کریں۔

اسٹب نے فلاسک کے کان میں کہا ——— "میں شرط بدتا ہوں کہ اس کشتی میں کسی آدمی نے کپتان کا بہترین کوٹ پہن رکھا تھا یا شاید اس کی گھڑی لگا رکھی ہو۔ اب یہ اسی پریشانی میں ہے کہ کسی طرح میری چیز واپس مل جائے۔ بھلا کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ شکار کا موسم بہار پر ہو اور دو فرض شناس جہاز ایک کھوئی ہوئی کشتی کی تلاش میں نکلیں! دیکھو، فلاسک، دیکھو، یہ شخص کتنا پیلا پڑ گیا ہے ——— اس کی آنکھیں تک زرد ہو گئی ہیں ——— دیکھ ——— کوٹ نہیں تھا ——— کوئی اور چیز ہوگی شاید ——— "!

"میرا بیٹا، خود میرا بچہ اسی کشتی میں ہے۔ خدا کے لیے ——— میں تم سے التجا کرتا ہوں ——— تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ——— " کپتان نے اہاب سے کہا جو اس کی درخواست سن کر بھی بت بنا کھڑا تھا۔ "اڑتالیس گھنٹے کے لیے میں تمہارا جہاز کرائے پر لینے کو تیار ہوں ——— میں بڑی خوشی سے کرایہ ادا کروں گا اور نقد ادا کروں گا ——— کسی اور طرح دس گنا کرایہ دے دو ——— صرف اڑتالیس گھنٹے کے لیے ——— بس، مان جاؤ، مان جاؤ ——— یہ کام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔"

"اس کا بیٹا ہے!" اسٹب بولا۔ "ارے، اس کا بیٹا کھو گیا ہے! میں کوٹ اور گھڑی واپس لیتا ہوں ——— اہاب کی کیا رائے ہے؟ ہمیں اس لڑکے کی جان بچانی چاہیے۔"

"وہ تو کل رات باقی لوگوں کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔" نینٹکٹ والے نے پیچھے سے کہا۔ "میں نے سنا تھا۔ تم سب لوگوں نے ان کی روحوں کی آواز سنی تھی۔"

تھوڑی دیر میں ہمیں ایک اور بات معلوم ہوئی جس نے اس حادثے کو اور بھی المناک بنا دیا۔ گم شدہ کشتی کے ملاحوں میں کپتان کا ایک بیٹا تو ضرور تھا لیکن ایک اور کشتی میں جو اتفاقاً جہاز سے دور چلی گئی تھی اس کا ایک دوسرا بیٹا بھی تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک بیچارا باپ سخت پیچ و خم میں مبتلا رہا۔ چیف میٹ نے یہ مشکل اس طرح حل کی کہ ایسے حالات میں شکاری جہازوں کا جو عام قاعدہ ہے اسی پر عمل کیا یعنی جب دو کشتیاں خطرے میں ہوں اور دونوں کو مدد کی ضرورت ہو تو پہلے اس کشتی کو کمک پہنچائی جائے جس میں آدمیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ لیکن نہ معلوم کس وجہ سے کپتان نے اس بات کا ابھی تک ذکر ہی نہ کیا تھا۔ جب اہاب کی سرد مہری نے بالکل ہی مجبور کر دیا تو اس نے اپنے گم شدہ بیٹے کا تذکرہ کیا۔ یہ ایک بالکل ہی نو عمر بارہ سال کا لڑکا تھا۔

نیو انگلینڈ کے والدین کی محبت میں بھی ایک سنجیدگی اور سخت گیری ہوتی ہے۔ اسی محبت کے جوش میں کپتان بیٹے کو ساتھ لے آیا تھا کہ وہ اس پیشے کے خطرات اور مشکلات سے واقف ہو جائے جو ایک زمانے سے اس کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک عام دستور ہے کہ نیو انگلینڈ کے کپتان اپنے لڑکے کو تین چار سال کے سفر پر کسی اور جہاز میں بھیج دیتے ہیں تاکہ باپ کی فطری لیکن غیر مناسب رعایت یا احتیاط اور فکر مندی کی وجہ سے بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

کپتان تو ڈاپ کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اور ڈاپ کا یہ حال تھا جیسے ابرِ بہار —— جو مٹھی پڑ رہی تھیں لیکن اس کے اندر ذرا سی جنبش تک نہ ہو رہی تھی۔

اینجی بولا —— "جب تک تم یہاں رکو گے میں نہیں رکوں گا میرے ساتھ وہی سلوک کرو جس کی ایسے حالات میں تمہیں امید ہوتی۔ کیونکہ، کپتان ڈاپ، تمہارے بھی ایک بیٹا ہے۔ وہ تو ابھی ذرا سا بچہ ہے اور اطمینان سے ماں کی گود میں کھیل رہا ہے —— تمہارے بڑھاپے کی اولاد ہے —— ہاں، ہاں، تمہارا دل پسیج گیا، میں دیکھ رہا ہوں —— چلو، جاؤ اور جہاز کا رخ بدلنے کو تیار ہو جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔" ڈاپ چلایا۔ رسی کو اپنے تک نہ لگانا۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ کپتان گارڈنر، یہ نہیں ہوگا۔ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ۔ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے اور مجھے بھی معاف کرے لیکن مجھے جانا ہے بمشرا شارک۔ گھڑی دیکھو اور ٹھیک تین منٹ بعد اعلان کر دو کہ ہمارے جہاز میں کوئی غیر آدمی نہ رہنے پائے پھر بادبان اٹھاؤ اور جہاز کو پہلے کی طرح چلنے دو۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے مڑا، اور چہرہ دوسری طرف کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کپتان تو یہ دیکھ کر گم سم رہ گیا کہ میری امید کس بری طرح مسترد ہوئی ہے۔ پھر چونک کر جلدی جلدی دیوار کی طرف گیا اور اپنی کشتی میں کود نہیں بلکہ گر پڑا۔ اور واپس چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں جہاز الگ الگ ہو گئے۔ ابھی جہاز سرمئی رنگ نظر آ رہا۔ سمندر میں کوئی چھوٹا سا دھبہ نظر آتا تو وہ اسی طرف کو ہو لیتا —— کبھی ادھر کو چلا، کبھی ادھر کو۔ کبھی آگے کے بادبان چڑھائے جا رہے ہیں تو کبھی پیچھے کے۔ کبھی ہوا چلنے سے آتی ہوئی موج سے ٹکرا کر کبھی موج اسے ڈھکیلے لگتی۔ سارے مستولوں اور کھمبوں پر آدمی لدے ہوئے تھے جیسے لڑکے اونچے درخت پر ٹنگے سیر کر رہے ہوں۔

لیکن یہ جہاز چکر پھیریاں کرتا رک رک کر ابھی مرے چال سے چل رہا تھا اور جھاگ کے نیچے آنسو بہہ رہا تھا۔ آپ دیکھتے ہی سمجھ جاتے اسے ابھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ یہ گویا راشیل تھی جو اپنے بچوں کے لیے رو رہی تھی کیونکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔

کپتان کا کمرہ

[اہاب عرشے پر جانے کے لیے اٹھتا ہے۔ پپ اس کا ہاتھ پکڑ کے پیچھے چلنا چاہتا ہے۔]

"دیکھو لڑکے، میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اب تجھے اہاب کے ساتھ نہیں چلنا چاہیے۔ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ اہاب نہ تجھے اپنے پاس سے ہٹانا چاہے گا اور نہ اپنے قریب رکھنا چاہے گا۔ لڑکے، تیرے اندر کوئی ایسی بات ہے جو مجھے اپنے مرض کا علاج معلوم ہوتی ہے۔ علاج بالمثل کا صاحب ہے۔ لیکن اس شکار میں میرے لیے یہ بیماری ہی سب سے بڑی تندرستی ہے۔ لڑکے، تو یہیں بیٹھا رہ جہاں تیری اتنی خدمت گزاری ہوگی جیسے تو کپتان ہو۔ ہاں، لڑکے، تو پیچوں سے جڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا رہ، بلکہ تو ایک مزید پیچ بن جا۔"

"نہیں، نہیں، نہیں، حضور، آپ کا بدن پورا نہیں ہے۔ آپ مجھے کوئی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے بجائے ہی استعمال کیجیے۔ میری مدد سے چلیے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ آپ کا ایک حصہ بن جاؤں۔"

"اوہ، دنیا میں ہزاروں بدمعاش موجود ہیں، مگر اس کے باوجود یہ بات دیکھ کر انسان کی وفاشعاری پر میرا عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے! ——— اور یہ سیاہ فام حبشی ہے اور پاگل ہے! ——— لیکن میرا خیال ہے کہ علاج بالمثل والی بات اس پر بھی منطبق ہوتی ہے، یہ تو پھر سمجھدار ہو چلا ہے۔"

"حضور، سنا ہے کہ ایک مرتبہ اسٹب نے بچارے ننھے پپ کو سمندر میں یونہی چھوڑ دیا تھا۔ پپ کی کھال تو ضرور کالی تھی لیکن ڈوبنے کے بعد اس کی ہڈیاں سفید سفید چمکتی ہیں۔ لیکن حضور، میں آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا جیسے اسٹب نے پپ کو چھوڑ دیا تھا۔ میں تو آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"اگر تو مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتا رہا تو اہاب کا ارادہ متزلزل ہو جائے گا۔ میں نے تجھ سے کہہ دیا، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

"حضور، حضور، حضور!"

"اگر تو اسی طرح روتا رہا تو میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ ذرا ہوش میں رہ، دیکھ اہاب بھی پاگل ہے۔ کان لگا کے سن، اور عرشے پر میرے چلنے کی آواز اکثر سنائی دے گی، اور اس سے تجھے پتا چل جائے گا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اچھا اب میں جاتا ہوں، ہاتھ لا ——— ٹھیک ہے! لڑکے تو اتنا ہی وفادار ہے جتنا دائرہ اپنے مرکز کے ساتھ۔ اچھا ——— خدا تیرے اوپر اپنا فضل کرے، اور اگر حالات خراب ہو جائیں تو دوسروں کا چاہے کچھ حشر ہو، لیکن خدا کرے تو بچ جائے۔"

[اہاب چلا جاتا ہے، پپ ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔]

"کپتان صاحب ابھی یہاں کھڑے تھے، میں اس جگہ کھڑا ہوں جہاں انھوں نے سانس لیا تھا ——— لیکن میں اکیلا ہوں

اگر اس وقت بچارہ پچ یہیں ہوتا تو مجھے اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی۔ لیکن وہ تو غائب ہے۔ پچ، پچ! آگم، جو آگم، جو بھی کسی نے پچ کو دیکھا ہے؟ وہ کہیں اوپر ہوگا۔ لاؤ دروازہ کھول کے دیکھوں۔ ارے یہ تو بند ہے۔ زنگ لگا۔ زنگ آلود، لیکن پھر بھی دروازہ نہیں کھلتا۔ جادو کا اثر ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہیں رہنا۔ ہاں۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ پیچوں سے جڑی ہوئی کرسی تمہاری ہے۔ اچھا تو میں یہاں بیٹھا جاتا ہوں۔ میں اس وقت جہاز کے پچھلے حصے میں ہوں۔ اور اس کے تینوں مستول میرے سامنے کی طرف ہیں۔ بڑے سے جہازی سفر میں کہ بعض اوقات بڑے بڑے امیر البحر سیاہ لباس پہن کے میز پر بیٹھے ہیں اور بیسیوں کپتان اور لفٹننٹ ان کے سامنے دو زانو ہو کر حاضر ہوتے ہیں۔ آ گیا یہ کیا ہے؟ افسر وگ! افسر وگ! افسر وگ آرہے ہیں۔ شراب کی صراحی دور میں آ گئے۔ آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی حضرات! آپ جانے بھرئیے! یہ نام لوگ سے افسروں کی دعوت کرنے لوگ کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے! ـــــ حضرت کبھی آپ نے ایک شخص پچ کو دیکھا ہے؟ ـــــ وہ ایک حبشی لڑکا ہے۔ پانچ فٹ کا قد، بھیگی صورت، بزدلوں کی سی شکل۔ ایک مرتبہ کشتی میں سے کود گیا تھا ـــــ اسے دیکھا ہے؟ نہیں! اچھا تو حضرات اپنے پیالے دوبارہ بھریئے۔ کیجئے سارے بزدلوں پر لعنت بھیجیں! ابھی کسی کا نام نہیں لیتا۔ سارے بزدلوں پر لعنت! ایک پیر میز پر رکھ لیجئے۔ سارے بزدلوں پر لعنت! ـــــ ـــــ ارے! ادھر سے نتھی ٹانگ کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی ہے ـــــ او میرے آقا! میرے آقا! جب آپ اوپر چلتے ہیں تو میں ڈر کے مارے بے حس ہو جاتا ہوں۔ لیکن میں یہیں رہوں گا۔ چاہے جہاز چٹانوں سے ٹکرا جائے اور چٹانیں دیوار توڑ کر اندر آجائیں اور گھونگھے میرے پاس آ بیٹھیں۔"

ٹوپی

اسے پہلے جوڑے کے ابتدائی سفر کے بعد اہاب دوسری شکارگاہوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اپنے دشمن کو اصل ٹھیک وقت پر ایک تنگ گلی میں گھیر لایا تھا تاکہ اُسے قتل کرنے میں آسانی رہے۔ اب وہ ٹھیک اسی جگہ پہنچا تھا جہاں اس کے وہ اذیت ناک زخم لگا تھا پھر ایک ایسا جہاز بھی مل گیا تھا جس کی ابھی کل ہی دن ڈوبے سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اب تک جتنے جہازوں سے ملاقات ہو چکی تھی ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ چاہے سفید وہیل کو چھیڑا جائے یا نہ چھیڑا جائے لیکن وہ ایک بھیانک بے نیازی کے ساتھ اپنے شکاریوں کو پھر چاڑ ڈالتی ہے۔ چنانچہ اب جب اہاب کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک آ گئی تھی کہ دور ہی سے دیکھنے کی بھی تاب نہ لا سکتی تھیں، جس طرح قطب شمالی کی چھ مہینے کی رات میں بھی ستارہ کبھی غروب نہیں ہوتا بلکہ اس کی تیز مستقل اور مرکزی چمک برقرار رہتی ہے، اسی طرح افسردہ دل جہازیوں کے تاریک افق پر اہاب کا اٹل ارادہ اپنی جگہ جگمگا رہا تھا۔ یہ ارادہ ان لوگوں پر ایسی بری طرح حاوی تھا کہ ان کے شکوک و شبہات، خوف اور اندیشے سب اس کی روح میں جا چھپے تھے اور شکل دکھانے سے بھی گھبراتے تھے۔

یہ واقعہ آنے والے واقعات کی ابھی سے پیشین گوئی کر رہا تھا۔ فطری یا مصنوعی ہر قسم کی خوش طبعی رخصت ہو چکی تھی۔ اب جب لوگوں کو جتانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتا تھا اور نہ اسٹاربک جتنی دیر کے لئے کی اعمال اہاب کی آہنی روح کے دامن دستے میں خوشی اور غم، امید اور خوف سب پیس کر خاک ہو چکے تھے۔ وہ لوگ بھوتوں کی طرح چپ چاپ اِدھر سے اُدھر پھرتے رہتے اور انہیں ہر وقت یہ احساس رہتا کہ بڈھے کی بیدار آنکھ انہیں دیکھ رہی ہے۔

جب اہاب یہ سمجھ رہا ہو کہ بس ایک کے سوا اور کوئی آنکھ نہیں دیکھ رہی تو اگر آپ اپنے تخلیے کے وقت اس کا غور سے جائزہ لیتے تو معلوم ہوتا کہ جس طرح جہازی اہاب کی آنکھوں سے مرعوب تھے، اسی طرح اہاب بھی پراسرار فداللہ کی نظر سے مرعوب تھا —— کم از کم وقت ایک عجیب طرح متاثر ہو جاتا تھا۔ آجکل اس دبلے پتلے پارسی میں ایک نیا اور راز آسا لوگوں آ چلا تھا اس کے اوپر ہر وقت ایک کپکپاہٹ سی طاری رہتی تھی جہاز کے لوگ اسے شبہے کی نظر سے دیکھنے لگے تھے، انہیں پتا ہی نہ چلتا تھا کہ یہ واقعی کوئی فانی انسان ہے یا کسی غیر مرئی ہستی کا لرزتا سایہ ہے۔ اور یہ سایہ عرشے پر ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا کیونکہ رات کے وقت بھی کسی نے فداللہ کو سوتے یا نیچے جاتے نہ دیکھا تھا۔ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت کھڑا رہتا، انہیں نہ کبھی بیٹھتا اور نہ کبھی تکیے کا سہارا لیتا۔ اس کی زرد اور حیرت انگیز آنکھیں صاف یہ کہتی معلوم ہوتیں —— ہم دو پہرے دار ایسے ہیں جو کبھی آرام نہیں کرتے۔

دن ہو یا رات جہازی جس وقت بھی عرشے پر جاتے اہاب سامنے موجود ہوتا۔ یا تو وہ اپنے سوراخ میں ٹانگ اڑائے کھڑا ہوتا یا پھر وہ مستقل تختوں پر ٹہلتا جو انہیں دو مستولوں کے درمیان تھا رہتا یا پھر وہ اُسے اپنے کمرے کے زینے میں کھڑا پاتے —— اسی

کی زندہ لاش آگے کو کھلی ہوئی جیسے جوتے پہ اترتا چلا جا رہا ہو اور ویڈی آنکھوں کے اندر گھپتی ہوئی۔ حالانکہ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہتا اور اسے بستر پہ لیٹے بغیر معلوم کتنے دن اور راتیں گزر چکی تھیں لیکن اس کا چہرہ ٹوپی کے نیچے اس طرح چھپا رہتا کہ لوگ کبھی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتے کہ اس کی آنکھیں کبھی بند بھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ یا پھر یہ ہر وقت ہمارا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ زمین میں ایک ساتھ گڑے کھمبے جیسا کھڑا رہتا جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ اور اس کے کوٹ اور ٹوپی پر رات کی نمی اس کے قطروں میں تبدیل ہوتی رہتی۔ پھر کپڑے رات کو بھیگے رہ گئے دن کی دھوپ میں اپنے آپ خشک ہو جاتے۔ دن پہ دن اور رات پہ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن ایوب پیچھے رہتا جا رہا تھا۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی کمرے ہی سے منگوا لیتا۔

وہ کھانا بھی کبھی کبھار ہی کھاتا اور بس وہ وقت ——— ناشتہ اور رات کا کھانا اس کے علاوہ کھانے کو پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس نے ناڈا میں سونا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ چنانچہ بال بڑھتے بڑھتے الجھ گئے تھے جیسے اکھڑے ہوئے درختوں کی جڑیں جو نالیوں کے خشک جانے کے بعد وہ پیچھے کی طرف بڑھتی رہتی ہیں۔ حالانکہ اس کی پوری زندگی ایک مستقل پہرا بن کے رہ گئی تھی اور پارسی کے چہرے کا کا مسئلہ بھی نہ تو شنا تھا لیکن یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے بات نہ کرتے تھے کسی چھوٹے موٹے معاملہ میں بولنا پڑ جائے تو الگ رہ جاتے۔ حالانکہ انھیں کسی جادو نے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا تھا لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ اگر دن میں اتفاق سے ان کی ایک آدھ بات ہو جاتی تو رات کو دونوں بالکل گونگے بہرے ہو جاتے اور زبان سے ایک لفظ نہ نکالتے بعض اوقات وہ ستاروں کی روشنی میں گھنٹوں خاموش اور دور دور کھڑے رہتے ——— ایوب تو اپنے زمین میں اور پارسی بڑے مستول کے پاس لیکن دونوں برابر ایک دوسرے کو تکے جاتے گویا ایوب تو پارسی کے اندر اپنے مستقبل کو دیکھتا تھا اور پارسی ایوب کے اندر اپنا پرانا وجود۔

لیکن ایوب کے ملازمت نے ہر روز اور ہر لمحہ اس شکل میں دیکھتے تھے۔ اس میں تو وہ ایک خوف ناک نظر آتا تھا اور پارسی اس کا غلام۔ مگر وہ ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کی گردن پر ایک ہی جوا رکھا ہے اور کوئی غیر مرئی اور جابر آقا انھیں ہانک رہا ہے اور دوسرا تو ایک کا سایہ ایک ٹھوس جسم کے ساتھ چل رہا ہے۔ کیونکہ پارسی کچھ بھی سہی ایوب کا بدن بالکل ٹھوس تھا۔

پو پھٹتے ہی ایوب کی آواز گونج اٹھتی ——— "یہاں پہ چھوڑو!" اس کے بعد رات ہونے تک ہر گھنٹے کے ساتھ ساتھ یہ آواز آتی ——— "کچھ نظر آیا؟" ——— "غور سے دیکھو! غور سے دیکھو!"

لیکن جب بچوں کو ڈھونڈنے والے ریشل سے ملاقات کے بعد تین چار دن گزر گئے اور وہیل کا فوارہ دکھائی نہ دیا تو بوڑھے بڈھے کو اپنے جہازیوں کی وفاداری پر شک ہونے لگا ——— یعنی جنگلی پر بیچے بازوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں پر کیونکہ اسے تو یہ بھی شبہ ہوا کہ جس چیز کو ڈھونڈ رہا ہوں اسٹب اور فلاسک اسے جان بوجھ کے نظر انداز نہ کر دیں۔ اس کی حرکات سے تو ان شبہات کا پتا ضرور چل رہا تھا لیکن اس نے دانشمندی سے کام لیا اور زبان سے کچھ نہ کہا۔

ایک دن وہ کہنے لگا ——— "وہیل سب سے پہلے مجھی کو نظر آئے گی۔ ہاں، اشرفی ایوب کے ہاتھ لگے گی!" پھر خود اپنے ہاتھوں سے ڈوروں کی رسی نے ایک ٹوکری سی بنائی۔ اس کے بعد ایک آدمی کو مستول کے اوپر چڑھایا کہ ٹوکری کا کنڈا وہاں لگا دے اس

آدی نے اوپر سے رسی کے دونوں سرے لٹکائے اور اہاب نے ایک سرا اپنی ٹوکری میں باندھا اور دوسرے کو شکنجے میں باندھنے کے لیے ایک کھونٹی تیار کر دی۔ یہ کام ہو گیا تو رسی کا سرا ہاتھ میں پکڑ کر کھونٹی کے پاس کھڑا ہو گیا اور ایک ایک کر کے اپنے جہازیوں کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کی نظر گوریٹے پر جم کر رک گئی۔ ناشتی ٹیگو پر ٹھہری، لیکن فوراً ہی اللہ سے بچ کر نکل گئی اور آخر میں بڑے اعتماد کے ساتھ سیف جیٹ پر جا کے رک گئی۔ اہاب نے کہا — "اسٹاربک، یہ رسی پکڑو، میں تمہیں سونپتا ہوں۔" اب وہ ٹوکری میں بیٹھ گیا اور حکم دیا کہ رسی کھینچ کر مجھے مچان پر پہنچا دو۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور اسٹاربک شکنجے میں رسی باندھ کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ اہاب نے ایک ہاتھ سے مستول پکڑ لیا اور اتنی اونچائی پر سے جو میلوں چوڑا علاقہ نظر آ رہا تھا اس میں آگے پیچھے، دائیں اور بائیں دیکھنے لگا۔

اگر سمندر میں جہازی کو بہت اونچائی پر جا کر رسیوں کے درمیان کسی الگ تھلگ سی جگہ جہاں پیر ٹکانے کی بھی گنجائش نہ ہو ہاتھوں سے کام کرنا پڑے تو ایسے حالات میں چڑھنے پر رسی کا سرا ایک ایسے آدمی کے سپرد کیا جاتا ہے جو خاص طور سے اس کی نگرانی کرتا رہے کیونکہ عرشے پر کھڑے ہو کر یہ پتا چلانا مشکل ہوتا ہے کہ رسیوں کے اس جنگل میں ایک تار کا دوسرے تار سے کیا تعلق ہے۔ پھر ان رسیوں کے عرشے پر بندھے ہوئے سرے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر مستقل طور سے نگرانی نہ کی جائے تو بڑی آسان بات ہے کہ ملاحوں کی بے پروائی سے اوپر والا جہازی گر پڑے اور سیدھا سمندر میں جائے۔ چنانچہ اس معاملے میں اہاب کی حفاظتی تدابیر کچھ ایسی غیر معمولی نہ تھیں۔ اگر کوئی عجیب بات تھی تو یہ کہ اسٹاربک ہی ایک ایسا آدمی تھا جس نے ذرا جم کے اہاب کی مخالفت کی تھی۔ پھر وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی وفاداری پر اہاب کو شک تھا لیکن اہاب نے رسی کی نگرانی کے لیے اسی کو چھانٹا اور اپنی جان اس بے اعتبار آدمی کے سپرد کر دی۔

جس دن اہاب مچان پر پہلی دفعہ گیا تھا اسے وہاں پہنچے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ ایک لال چونچ والا سمندری عقاب آ پہنچا۔ اس علاقے میں پرندے اکثر مچان پر بیٹھنے والوں کے اتنے قریب آ جاتے ہیں کہ بڑی وحشت ہوتی ہے۔ خیر تو ایک عقاب نے آ کر اہاب کے سر کے چاروں طرف چکر لگانا اور چیخنا شروع کر دیا۔ پہلے تو ایک جال سا تنا رہا، پھر وہ سیدھا ہزاروں فٹ اوپر اٹھ گیا، اس کے بعد چکر کھاتا ہوا نیچے اترا اور دوبارہ اہاب کے سر کے گرد گھومنے لگا۔

لیکن اہاب کی نظر تو دھندلے افق پر گڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس وحشی پرندے کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی۔ پھر یہ کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی کہ دوسرے لوگ اسے کوئی اہمیت دیتے لیکن اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ بے پروا سے بے پروا آدمی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی پوشیدہ معنی دیکھنے لگا تھا۔

"حضور! آپ کی ٹوپی! آپ کی ٹوپی!" اسسلی کا جہازی ایک دم سے چلایا۔ وہ اہاب کے بالکل پیچھے اونچی مچان پر کھڑا تھا۔ لیکن اس کی مچان ذرا نیچی تھی اور دونوں کے درمیان ہوا کی ایک خلیج حائل تھی۔

لیکن اس وقت تک پرندے کے سیاہ پر اہاب کی آنکھوں کے سامنے پہنچ چکے تھے اور لمبی سی مڑی ہوئی چونچ نے ٹوپی کو پکڑ لیا تھا۔ عقاب نے ایک چیخ ماری اور اپنا مال غنیمت لے کر چل دیا۔

باب - ۱۳۱

پیکوڈ کی ڈلائٹ سے ملاقات

پیکوڈ اسی بےچینی کے عالم میں چلتا رہا۔ دن پر دن اور رات پر رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ قیامت کا جال پھیلانے والا جیسے آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ آخر ایک دوسرا جہاز نظر آیا جس کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق ڈلائٹ (مسرت) تھا۔ یہ جہاز قریب آیا تو سب لوگوں کی نظریں اس کے چوڑے شہتیروں پر گڑ کے رہ گئیں۔ بعض شکاری جہازوں میں یہ شہتیر آگے کے عرشے کی بلندی پر لگے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر فالتو یا الٹی ہوئی کشتیاں رکھی جاتی ہیں۔

اس جہاز کے شہتیروں پر ایک شکاری کشتی کے دو چار ٹوٹے ہوئے تختے اور سفید پسلیاں نظر آ رہی تھیں لیکن اس شکستہ کشتی میں سے آر پار دکھائی دے رہا تھا جیسے گھوڑے کے ٹوٹے ہوئے اور دھوپ میں تپتے ہوئے ڈھانچے کے اندر سے۔

"کہیں سفید ویل بھی دیکھی؟"

"یہ دیکھو!" پچکے ہوئے گالوں والے کپتان نے جواب دیا۔ اور اپنے جہاز پر سے ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے اسے مار گرایا؟"

"وہ برچھا ابھی تک بنا ہی نہیں جو اسے مار سکے۔" کپتان نے افسردہ نظروں سے عرشے پر ایک جھولے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جسے چند جہازی دونوں طرف سے سی کر بند کر رہے تھے۔

"بنا کیسے نہیں!" اہاب نے ترکھ کا بنایا ہوا برچھا اٹھا کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا ——— "میاں ننگ والے ذرا دیکھو۔ یہ رہی میرے ہاتھ میں اس کی موت! اس برچھے کو ایک دفعہ تو میں نے خون میں بجھایا ہے اور دوسری دفعہ آسمانی بجلی میں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے تیسری دفعہ اس کے سینے میں بجھاؤں گا جہاں اس کا دل ہے!"

"تو پھر بڈھے، خدا تیرے اوپر رحم کرے ——— ذرا ادھر تو دیکھو" کپتان نے جھولے کی طرف اشارہ کیا ——— "میں ان پانچ آدمیوں میں سے بس ایک کو دفن کر رہا ہوں جو ابھی کل تک زندہ تھے لیکن رات ہونے سے پہلے پہلے مر گئے ہیں۔ تو بس ایک ہی کو دفن کر رہا ہوں۔ باقی تو مرنے سے پہلے ہی دفن ہو گئے۔ تمہارا جہاز ان کی قبروں پر چل رہا ہے۔" پھر وہ اپنے جہازیوں سے بولا ——— "تیار ہو! تختے کو کٹہرے پر رکھ دو، اور لاش اٹھاؤ۔ ٹھیک ہے اچھا ——— خدایا!" وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر جھولے کی طرف بڑھا ——— "اس پر خدا کی رحمتیں ——— "

"جہاز آگے بڑھاؤ!" اہاب بادل کی طرح گرجا۔

لیکن پیکوڈ ایک دم سے چونک کر اتنا تیز نہ چل سکا کہ سمندر میں لاش کے گرنے سے جو چھپاکا ہوا تھا اس کی آواز سے بچ نکلے ——— اتنا تیز نہ چل سکا کہ اٹھتے ہوئے بلبلے اس کے پیندے پر چھینٹا مار کے اپنا ہولناک بپتسمہ نہ دے سکیں۔

جب ایلیٹ افسردہ منظر ذرا فاصلے سے دور ہٹا تو اسٹیکوڑ کے پیچھے لٹکا ہوا جان بچانے والا جیب اور بھی نمایاں ہوگیا۔

"آہا! ذرا دیکھو لوگو، سامنے دیکھو!" پیچھے سے ایک منحوس آواز آئی۔

"ایلیٹ، تم ہماری تجویز کی گئی میں سے خواہ مخواہ دور بھاگ رہے ہو، تم نے خود اپنا تابوت لٹکا رکھا ہے۔"

نغمہ

دن بڑا صاف و شفاف اور نیلا تھا۔ ہر طرف ایک ایسی نیلاہٹ پھیلی تھی کہ آسمان اور سمندر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اس ہوا اتنی لطیف اور پاکیزہ تھی جیسے کسی دوشیزہ کا چہرہ۔ تو سمندر اور مردانہ سمندر میں لمبی اور طاقتور موجیں اٹھ رہی تھیں جیسے نیند میں شہنشاہ کا سینہ ہل رہا ہو۔

آسمان پر ادھر ادھر برف کی طرح سفید اور بے داغ چھوٹی چھوٹی بدلیاں منڈلا رہی تھیں۔ یہ نسوانی ہوا کے نرم و نازک خیالات تھے لیکن نیچے کی طرف اتھاہ گہرائیوں میں زبردست دہیل، کفارہ مچھلیاں اور شارک مچھلیاں دوڑتی پھر رہی تھیں یہ مردانہ سمندر کے اذیت ناک، طاقتور اور ناقابلِ تسخیر تفکرات تھے۔

حالانکہ دونوں میں اندر کی طرف سے بے تکلف اور تضاد تھا لیکن یہ تضاد صرف پرچھائیوں اور سایوں میں تھا۔ یعنی دونوں ایک معلوم ہو رہے تھے۔ ان دونوں میں اگر فرق تھا تو بس جنس کا۔

اوپر سورج ایک شہنشاہ کی طرح بیٹھا تھا اور سورج دیر سمندر کو یہ لطیف ہوا بخشتا معلوم ہو رہا تھا جیسے دعا کو یہی دی جا رہی ہو۔ ان کے درمیان پر ایک ہلکی سی لرزش ہو رہی تھی۔ یہ گویا اس ہیجان خیز اور معصومانہ اتحاد، اس محبت بھرے خوف کی علامت تھی جس کے ساتھ کنواری دلہن اپنے آپ کو دولہا کی آغوش میں سمٹتے رہی تھی۔

بجرا جکڑا ہوا اور مڑا تڑا، مچھیروں کے مارے گانٹھ گٹھیلا، پچا کھچا، گر پڑا اور اس کی آنکھیں کوؤں کی طرح دیکھتی ہوئی ——— ان کوؤں کی طرح جو بربادی کی راکھ میں بھی دیکھتے ہیں ——— قدم مضبوطی سے جمائے ہوئے عرشے پر اب صبح کی صاف اور شفاف ہوا میں اس طرح کھڑا تھا اور اس نے اپنے ماتھے کا شکستہ خود آسمان کی دوشیزہ پیشانی کے سامنے اٹھا رکھا تھا۔

آہ! یہ آسمان کی لازوال نرمی اور معصومیت! جیسے نظر نہ آنے والی پریاں ہمارے گرد اٹکھیلیاں کر رہی ہوں! ہوا اور آسمان کا حسین بچپن! یہ دونوں اہاب کے تہ در تہ غموں سے کتنے بے خبر تھے! لیکن میں نے اسی طرح ننھی منی بچیوں کو دیکھا ہے کہ اپنے بوڑھے والد کے چاروں طرف بے فکری سے کھیلیں کر رہی ہیں اور اس کے جھلسے ہوئے بالوں کے حلقے سے کھیل رہی ہیں جو اس کے دماغ کے بجھے ہوئے آتش فشاں کے کنارے کنارے اگے ہیں۔

اہاب زینے سے چل کے آہستہ آہستہ عرشے کے دوسری طرف آ گیا اور دیوار پر جھک کے پانی دیکھنے لگا۔ وہ اس گہرائی میں جتنی دور تک نظر دوڑانے کی کوشش کرتا اس کا سایہ پانی میں دھنستے ہی نیچے ڈوبتا معلوم ہوتا لیکن سحر زدہ فضا میں جو خوشبو بسی ہوئی تھی اس نے لمحے بھر کے لیے اس کی روح کا سارا زہر نکال پھینکا۔ وہ مسرور ہوا اور وہ حسین آسمان آخر کار اسے تھپکنے اور پیار کرنے لگا۔ اس کی سوتیلی ماں یعنی زمانہ جو اتنے دن تک ظلم ڈھاتی رہی تھی، اس کی ضدی گردن میں اپنے پیار بھرے

بازو حوالے کر دیے۔ اور اُسے گلے لگا کر خوشی کے مارے سسکیاں لینے لگی جیسے اس کی خطا کاری اور ہٹ دھرمی معاف کر دی ہو اور اس کے ساتھ محبت سے پیش آنے کو تیار ہو۔ آنکھوں تک کھنچی ہوئی ٹوپی کے نیچے سے اہاب نے سمندر میں ایک آنسو ٹپکا دیا۔ سارے بحرالکاہل میں بھی اتنی دولت نہ ہوگی جتنی اس چھوٹے سے قطرے میں تھی۔

اسٹاربک نے دیکھا کہ بڈھا دیوار پر جھکا کھڑا ہے۔ اُسے بھی اپنے دل میں انھی سسکیوں کی آواز سنائی دی جو ہر طرف چھائے ہوئے سکون کے قلب سے نکل رہی تھیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا کہ اہاب اسے دیکھ نہ لے یا وہ اہاب سے چھڑ نہ جائے۔ بہرحال وہ اہاب کے قریب کھسک آیا، اور وہیں کھڑا ہو گیا۔

اہاب نے گھوم کے دیکھا۔

"اسٹاربک!"

"جی۔"

"آہ، اسٹاربک کیسی لطیف ہوا ہے! آسمان کیسا لطیف معلوم ہو رہا ہے! بالکل ایسا ہی دن تھا ـــــ فضا میں بالکل ایسی ہی شیرینی تھی ـــــ اس روز میں نے اپنی پہلی وہیل ماری تھی ـــــ میں اٹھارہ سال کا لڑکا تھا اور برچھے باز بن چکا تھا! چالیس ـــــ چالیس ـــــ چالیس سال ہو چکے! ـــــ ہو چکے! چالیس سال سے برابر وہیل کا شکار کھیل رہا ہوں! چالیس سال سے تکلیفوں، خطروں اور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہوں! اس بے رحم سمندر کے سینے پر چالیس سال سے مونگ دل رہا ہوں! اہاب کو زمین کی پُرامن زندگی چھوڑے چالیس سال ہو گئے! وہ چالیس سال سے سمندر کے خطروں سے لڑ رہا ہے! ہاں، اسٹاربک، ان چالیس سال میں سے میں نے تین سال بھی خشکی پر نہیں گزارے۔ اب سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے بھی ایک غلام کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ اس میں کتنی ویرانی اور تنہائی ہے کپتان اس طرح بند پڑا رہتا ہے جیسے دیواروں سے گھرا ہوا شہر جہاں انسانی ہمدردی بار نہیں پا سکتی ـــــ آہ، یہ کتنی بوجھل اور تھکا دینے والی زندگی ہے! حکم رانی بھی غلامی کے برابر ہے! ـــــ پہلے تو مجھے اس کا خیال بھی نہ آیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ چالیس سال سے خشک اور نمکین کھانا کھا رہا ہوں ـــــ یہ خشکی بڑی مناسب علامت ہے میری روح بھی سوکھ کے کھانے کھا رہی ہے! ـــــ خشکی پر غریب سے غریب آدمی کو روز تازہ پھل میسر ہوتے ہیں اور وہ تازہ روٹی کھاتا ہے لیکن مجھے پھپھوندی لگے ہوئے خشک ٹکڑے ملتے ہیں ـــــ میں اپنی نوجوان بیوی سے ہزاروں میل دور ہوں جس سے میں نے پچاس سال کی عمر میں شادی کی تھی اور اگلے ہی دن راس امید کی طرف چل پڑا اور اپنے شادی کے تکیے میں بس ایک گڑھا پیچھے چھوڑا ـــــ بیوی؟ بیوی؟ ـــــ وہ تو ایک ایسی بیوہ ہے جس کا شوہر زندہ ہے! ہاں، اسٹاربک، میں نے جس دن اس سے شادی کی وہ بیچاری تو اسی دن بیوہ ہو گئی۔ پھر بڈھے اہاب نے ہزاروں دفعہ اپنے شکار کا پیچھا کس پاگل پن اور جنون کے ساتھ کیا ہے ـــــ خون کھول رہا ہے، ماتھا چمک رہا ہے، منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں ـــــ وہ آدمی نہیں بھوت ہے! ـــــ ہاں، ہاں! یہ چالیس سال کا احمق ہے ـــــ احمق ـــــ بڈھا اہاب بڑا احمق ہے! شکار میں اس جدوجہد کی کیا ضرورت تھی! برچھا اور بھالا چلاتے چلاتے

بازو کیوں شل کر لیے؟ کیا اب کچھ دور تیرنا چلنے سے بہتر ہوگا! اسٹاربک، ذرا مجھے دیکھو۔ میں ایک تو ہوں ویسے ہی اپنا بوجھ اٹھاتے
اٹھاتے تھک گیا ہوں اور پھر ایک ٹانگ بھی گئی ہے۔ ناقضب! ذرا میرے بال پیچھے کو ہٹا دے۔ یہ اس بری طرح میری آنکھوں
میں گر رہے ہیں کہ میں روتا ہوا معلوم ہوتا ہوں۔ اتنے سفید بال تو بس راکھ سے ہی نکل سکتے ہیں۔ لیکن اسٹاربک، کیا میں بہت
بوڑھا لگتا ہوں؟ بہت ہی بوڑھا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے مجھ میں جان باقی نہ رہی ہو اور میری کمر ٹوٹ گئی ہو ——— گویا میں
آدم ہوں اور صدیوں کا بار سر پر اٹھائے ہوئے ہوں۔ خدایا! خدایا! خدایا! ——— میرے دل کو پھٹ جانے دے! ——— میری
کھوپڑی توڑ دے! ——— کیا مذاق ہے ایک مذاق ہے! یہ سفید بالوں کا بھی کتنا تلخ اور جان لیوا مذاق ہے۔ کیا مجھے اتنی خوشیاں
حاصل ہو چکی ہیں کہ اب میرے بال سفید ہو جائیں اور میں بڈھا لگنے لگوں؟ قریب آجا! اسٹاربک، ذرا قریب آجا۔ ذرا میں
تیری انسانی آنکھ میں جھانک کر دیکھوں۔ یہ سمندر یا آسمان کو دیکھنے سے بہتر ہے۔ خدا کو دیکھنے سے بہتر ہے۔ سبزہ زاروں کی قسم!
گھر بار کی قسم! یہ تو جادو کا آئینہ ہے۔ مجھے تیری آنکھوں میں اپنی بیوی اور اپنا بچہ نظر آ رہے ہیں۔ نہیں نہیں۔ تو جہاز پر رہ۔ جہاز پر
رہ! ——— جب میں کشتی میں اتروں تو تو جہاز پر رہ۔ جو قسمت کا مارا اب میری ٹانگ کا پیچھا کرے تو اس وقت تو کشتی میں نہ اتر۔
مجھے اس مہلکے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ نہیں، نہیں! تیری آنکھ میں تو مجھے اس دور دراز گھر کی تصویر دکھائی دے رہی ہے!"

"آہ، میرے کپتان! میرے کپتان! عظیم روح! جو ہے کچھ بھی ہو آپ کا دل بڑا زبردست ہے۔ لیکن اس منحوس
مچھلی کا پیچھا کرنے سے فائدہ! آئیے، میرے ساتھ چلئے! آئیے، اس ہولناک سمندر سے بھاگ چلیں اور گھر کا رخ کریں! اسٹاربک
کے بھی بیوی اور بچے ہیں ——— بیوی اور بچے جو ساتھ کھیلے ہوئے ہیں اور جوانی میں بھی بڑھاپے سے لگتے تھے حضور!
آپ کی بھی بیوی ہے اور ایک بڑھاپے کا بچہ ہے جس کی یاد آپ کو ستاتی ہے ——— آئیے چلیں! ——— میں ابھی جہاز کا
رخ بدلے دیتا ہوں۔ میرے کپتان! ہمیں اپنے وطن نین ٹکٹ کی طرف جاتے ہوئے کتنی خوشی ہوگی! میرا خیال ہے کہ نین ٹکٹ میں بھی
ایسے ہی نیلے اور چمکیلے خوبصورت دن ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہیں، ہوتے ہیں! میں نے خود دیکھے ہیں ——— خصوصاً گرمیوں میں صبح کے وقت۔ ہاں، اب وہ دوپہر کو سویا ہوا
سو رہا ہوگا۔ وہ اس وقت جھنجھلا کر جاگ پڑا ہے۔ بستر پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی ماں اسے مجھ وحشی کی باتیں سناتی ہے۔ وہ
کہتی ہے کہ تمہارے ابا سمندر کے سفر پر گئے ہوئے ہیں لیکن جلدی ہی واپس آ کر تمہارے ساتھ کھیلا کریں گے۔"

"میری بیوی بھی یہی کہتی ہے! اس نے وعدہ کیا تھا کہ میرے بچے کو روز پہاڑی پر لے جایا کرے گی کہ وہ اپنے باپ کا
جہاز آتا دیکھ سکے۔ ہاں، ہاں! بس ختم! فیصلہ ہو گیا! ہم نین ٹکٹ کی طرف جا رہے ہیں! آئیے، ذرا نقشہ دیکھئے پھر ہم گھر چلتے
ہیں! وہ دیکھئے، وہ دیکھئے! ایک بچے کا چہرہ کھڑکی میں سے نظر آ رہا ہے! دوسرے بچے کا ہاتھ تو پہاڑی پر سے دکھائی دے رہا
ہے ———!"

لیکن اہاب کی نگاہیں دوسری طرف تھیں۔ وہ پالا مارے درخت کی طرح کانپا اور اپنا آخری اور سڑا ہوا سیب
زمین پر گرا دیا۔

"یہ کوئی بے نام، پُراسرار، غیر زمینی چیز ہے، یہ کون سا پوشیدہ اور فریبی آقا ہے، کون سا بے درد اور سنگدل شہنشاہ ہے جو مجھ پر حکم چلا رہا ہے، تمام فطری جذبوں اور تمناؤں کے برخلاف میں ہر وقت اندھا دھند آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہوں، بالکل بے تکلف ہو کر وہ باتیں کر جاتا ہوں جن کی فطری طور پر مجھے جرأت بھی نہیں پڑ سکتی۔ کیا اہاب، اہاب ہے؟ خدایا، اس بازو کو میں اٹھاتا ہوں یا کوئی اور؟ اگر سورج خود حرکت نہیں کرتا، بلکہ محض ایک غلام ہے، اگر کوئی ستارہ اس وقت تک گردش نہیں کر سکتا جب تک کہ ایک غیر مرئی قوت اسے نہ چلائے تو پھر یہ چھوٹا سا دل بھی نہیں دھڑک سکتا، یہ چھوٹا سا دماغ کوئی خیال نہیں سوچ سکتا جب تک کہ میں نہیں، بلکہ خدا دل کو نہ دھڑکائے، دماغ کو سوچنے پر مجبور کرے اور میرے ساتھ ساتھ زندہ نہ رہے۔ خدا کی قسم، اسٹاربک! اس دنیا میں ہم تو اسی طرح گول گول گھوم رہے ہیں جیسے آبخیز اور تقدیر اسے چلانے والی سلاخ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ سکون کا ابر آسمان اور یہ اتھاہ سمندر بھی موجود ہے۔ ذرا دیکھو، اس سامنے والے عقاب کو دیکھو! اسے یہ بات کس نے سکھائی کہ اڑتی ہوئی مچھلی کو جھپٹ کے پکڑ لے؟ قاتل کہاں جاتے ہیں؟ جب منصف خود عدالت میں گھسیٹ کے لایا جا رہا ہو تو سزا دینے والا کون باقی رہ گیا؟ لیکن ہوا بڑی لطیف ہے، اور آسمان بڑا پیارا لگ رہا ہے، ہوا میں ایسی خوشبو ہے جیسے یہ کسی سبزہ زار پر سے چل کے آ رہی ہو۔ اسٹاربک، اینڈیز کی وادی میں اس وقت لوگ گھاس کاٹ رہے ہوں گے اور پھر لوگ تازہ کٹی ہوئی گھاس میں سو گئے ہوں گے۔ سو گئے ہوں گے؟ ہاں، چاہے ہم کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں، لیکن آخر کار ہم سب میدان میں پڑ کے سو جاتے ہیں۔ سو جاتے ہیں؟ ہاں، اور اس سبزہ زار کے درمیان ہمیں زنگ لگ جاتا ہے جیسے ان پچھلے سال کی درانتیوں میں جنہیں آدھی کٹی ہوئی گھاس میں پھینک دیا گیا ہو ————— ہاں، اسٹاربک!

لیکن مایوسی کے مارے اسٹاربک کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ پہلے ہی کھسک چکا تھا۔

اہاب عرشے کی دوسری طرف جنگلے کی دیوار پر سے نیچے جھانکنے لگا، لیکن یہ دیکھ کر ایک دم سے چونک پڑا کہ پانی میں دو گھورتی ہوئی آنکھوں کا عکس نظر آ رہا ہے۔ فیض اللہ بھی بے حس و حرکت اسی جنگلے پر جھکا کھڑا تھا۔

باب-۱۳۳

شکار —— پہلا دن

اس دن آدھی رات کے وقت بڈھا حسب معمول اپنے سوکھے پیر سے بچل کے اس سوراخ کی طرف گیا جس میں ٹانگ اڑا کر کھڑا ہو جاتا تھا، تو اچانک وحشت میں آ کے اپنا چہرہ آگے کو جھکایا اور سمندر کی ہوا کو ایسے سونگھنے لگا جیسے وحشی جزیروں کے قریب پہنچ کر جہاز کے سمجھدار کتے سونگھا کرتے ہیں۔ اس نے اعلان کیا کہ ضرور کوئی وہیل جہاز کے آس پاس ہے۔ بعض اوقات وہیل کی مخصوص بو خاصی دور تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ پہرے داروں نے تھوڑی ہی دیر میں یہ بو محسوس کر لی اور جہازیوں کو اس بات پر بھی تعجب نہ ہوا کہ اہاب نے پہلے قطب نما دیکھی، پھر ہوا کا رخ بتانے والا آلہ، اس کے بعد کی سمت متعین کی اور حکم دیا کہ جہاز کا رخ تھوڑا سا بدل دیا جائے اور بادبان چھوٹے کر دیے جائیں۔

ان احکامات میں جو مصلحت پیش نظر تھی اس کا ثبوت دن نکلنے کے وقت مل گیا۔ یعنی سمندر میں جہاز کے ٹھیک سامنے کی طرف ایک لمبی لکیر دکھائی دی جو تیل کی طرح چکنی تھی اور پانی کی ایک دوسرے میں گندھی ہوئی جھریوں کے درمیان ایسی لگتی تھی جیسے کسی تیز اور گہرے چشمے کے دہانے پر ہموار ہو جانے کے دھات کی طرح چمکدار نشان۔

”مچان پر آدمی چڑھاؤ! سب لوگوں کو جگاؤ۔“

ڈیگو نے تین سلاخیں باندھ کر جوشیلے پن سے کھٹ کھٹ شروع کر دی اور وہ قیامت برپا کی کہ سارے سونے والے جاگ اٹھے اور کپڑے ہاتھ میں لیے اس طرح اوپر آ گئے جیسے عرشے میں سے بھاپ بن کے نکلے ہوں۔

”کیا دکھائی دیا؟“ اہاب نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کے پکارا۔

”کچھ بھی نہیں، حضور، کچھ بھی نہیں۔“ اوپر سے جواب ملا۔

”سارے بادبان چڑھا دو!“

جب سارے بادبان چڑھ گئے تو اہاب نے وہ ڈور کھولی جس کی مدد سے وہ مچان پر جایا کرتا تھا۔ جہازیوں نے اور کھینچ کھینچ کر اسے اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے کوئی دو تہائی بلندی طے کی ہو گی کہ وہ بادبانوں کے درمیان سے خلا کی طرف گھورتے گھورتے وہ ایک دم سے چیخ اٹھا —— ”وہ سامنے فوارہ چھوڑ رہی ہے! —— فوارہ چھوڑ رہی ہے! کوہان بالکل ایسا ہے جیسے برف کی پہاڑی! یہ موبی ڈک ہے!“

اہاب کے ساتھ ساتھ تینوں نگہبانوں نے بھی یہی نعرہ بلند کیا جو جہازی اتنے جوش میں آ گئے کہ وہ رسیوں پر چڑھ گئے اور اس مشہور وہیل کو دیکھنے لگے جس کو وہ لوگ اتنے دن سے تلاش کر رہے تھے۔ اہاب اپنی مچان پر جا پہنچا تھا جو دوسری مچانوں سے کئی فٹ اونچی تھی۔ طاش ٹیگو اس کے نیچے مستول پر کچھ یوں کھڑا تھا کہ اس کا سر اہاب کے پیروں کے برابر آتا تھا۔

اب اس بلندی پر سے وہیل چند میل آگے کی طرف دکھائی دینے لگی۔ وہ چپ چاپ ہوا میں اپنا فوارہ چھوڑ رہی تھی اور جب سمندر کروٹ لیتا تو اس کا اونچا سا چمکدار کوہان نظر آنے لگتا۔ ضعیف الاعتقاد جہازیوں کو خیال تھا کہ وہی خاموش فوارہ ہے جو ایک عرصہ ہوا انھوں نے بحر اٹلانٹک اور بحر ہند کی چاندنی راتوں میں دیکھا تھا۔

”تم لوگوں کو پہلے سے دکھائی نہیں دیا؟“ اہاب نے مچان والوں کو پکار کر کہا۔

”میں نے بھی اسی وقت دیکھا تھا جس وقت کپتان اہاب نے، اور میں چیخ پڑا تھا“ ٹاشٹیگو بولا۔

”نہیں، میرے ساتھ ساتھ نہیں۔ اسی وقت نہیں ———— اشرفی میری ہوگی۔ یہ قسمت نے میرے نام لکھ دی تھی۔ اسے تو صرف میں نے دیکھا تھا۔ سفید وہیل کو تم میں سے کوئی مجھ سے پہلے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ سامنے فوارہ چھوڑ رہی ہے! فوارہ چھوڑ رہی ہے! ———— پھر چھوڑا! ———— پھر چھوڑا!“ وہ ٹھہر ٹھہر کے اور کھینچ کھینچ کے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بول رہا تھا اور فوارے کی دھار کے ساتھ تال ملا رہا تھا۔ ”ارے، اب یہ پانی میں بیٹھنے والی ہے! بادبان چڑھاؤ! تینوں کشتیوں کے پاس تیار ہو، مسٹر اسٹاربک ادھر دیکھو، تم یہیں رہو اور جہاز کی نگرانی کرو۔ سکان والے، جہاز کو تھوڑا سا ہوا کے رخ پر لاؤ! ٹھیک ہے سنبھل کے۔ ذرا سنبھل کے۔ ارے، اس نے دُم لگا دی! نہیں، نہیں، صرف سیاہ پانی ہے! کشتیاں تیار ہیں؟ ٹھہرو، میں آتا ہوں، مسٹر اسٹاربک، مجھے نیچے اتارو ———— جلدی! اور وہ ہوا میں جھولتا ہوا عرشے پر آ گیا۔

اسٹب نے کہا: ”وہیل تو ہوا کے مخالف سمت میں ہم سے دور جا رہی ہے۔ شاید اس نے ابھی تک جہاز کو نہیں دیکھا۔“

”چپ رہو جی! رسیوں کے پاس چلو، سکان سنبھالو! ———— بادبان کھول دو، اور جہاز ذرا تیز چلاؤ! ٹھیک ہے! کشتیاں، کشتیاں!“

اسٹاربک کی کشتی کے سوا باقی سب کشتیاں اتار دی گئیں، بادبان چڑھا دیے گئے اور چپّو چلنے لگے۔ غرض کشتیاں ہوا کی مخالف سمت میں وہیل کی طرف بھاگنے لگیں۔ اہاب آگے آگے تھا۔ فیض اللہ کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک زرد زرد موت کی سی روشنی چمک رہی تھی اور اس کا منہ کچھ اس طرح بھنچا ہوا تھا کہ مسخ ہو کے رہ گیا ہو۔

ہلکی ہلکی کشتیاں چپ چاپ سیپیوں کی طرح پانی میں اتری چلی جا رہی تھیں اور آہستہ آہستہ دشمن کے قریب آ رہی تھیں۔ جب وہ کچھ اور نزدیک پہنچیں تو سمندر پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گیا۔ پانی اتنا پُرسکون تھا جیسے لہروں پر قالین بچھا ہو یا کسی چراگاہ میں دوپہر کا وقت ہو۔ آخر کار شکاری اتنا اپنے شکار کے قریب پہنچ گیا جو اس طرف سے بالکل بے خبر تھا۔ اب اس کا چمکدار کوہان سمندر میں چلتا ہوا صاف نظر آنے لگا جیسے ہر چیز سے الگ تھلگ ہو۔ کوہان کے چاروں طرف ہرے ہرے ملائم جھاگ کا ایک حلقہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اہاب کو باہر نکلے ہوئے سر کے اوپر جھرّیوں کی گل جھٹیاں بھی نظر آئیں۔ پانی کے نرم نرم قالین پر آگے کی طرف وہیل کے چوڑے اور سفید ماتھے میں سے ایک سفید سفید سایہ بھی اوپر اٹھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ لہروں کا نغمہ بھی سنائی دے رہا تھا۔ وہیل اپنے پیچھے ایک گہری لکیر چھوڑتی چلی جا رہی تھی جو نیلے پانی میں گھل مل جاتی تھی۔ اس کے دونوں طرف چمکدار بلبلے ناچ رہے تھے۔ سمندر کے اوپر سیکڑوں رنگ برنگ پرندے منڈلا

دیتے تھے جو کبھی نظر آتے گئے اور کبھی جھوں پر بیٹھ کے انھیں لرزتے سفید ویل کی کمر میں ایک بھالا لگی لٹا ہوا نیزہ لگا تھا جیسے
کسی زبردست جہاز کے اوپر اس کا جھنڈا تھوڑی تھوڑی دیر بعد ویل کے اوپر چھپکے کی طرح چھائے جھپٹتے پرندوں میں سے کوئی
ایک اس جھنڈے پر بیٹھنے کے بجائے لگا اور اس کے پر جھنڈیوں کی طرح لہرانے لگے۔

تیرتی ہوئی ویل کی تیزی میں ایک زبردست سکون تھا اور اس کی تندہ روی میں ایک ملائمت تھی لیکن تو بھی تیز بھی
سفید ویل کا روپ دھارے ایسا کرنے جا رہا تھا اور جب وہ سمندر میں تیر کے ایک سحر انگیز پھرتی کے ساتھ اپنے چاند جیسی
کی طرف جا رہا تھا تو جیسے وہ جزیرہ اس کے شانوں پر سینگوں سے لپٹی ہوئی تھی اور ویل کی تحیر آمیز اور پیاری پیاری آنکھیں
اسے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی جا رہی تھیں لیکن دیوتاؤں کے دیوتا میں بھی وہ شان اور حسن نہیں ہوگا جو سفید ویل میں تھا۔
ویل آگے بڑھتی تو سمندر کی لہریں پھٹ جاتیں اور وہ لکیریں بڑی دور تک پھیلتی چلی جاتیں۔ وہ اپنے تلاطم اور دہشت
چھوڑوں کے دونوں طرف ایک طلسمات کا سماں پیدا کر دیتی تھی۔ یہ بھی کوئی تعجب نہیں کہ بعض شکاری یہ حسن دیکھ کر اسے دیدہ
ہی کہ اس پر حملہ کر بیٹھے لیکن موت کے منہ میں جا کر انھیں پتا چلا کہ اس خاموشی اور سکون کے پردے میں طوفان چھپے
ہوئے ہیں۔ چاہے اس نے سیکڑوں آدمیوں کو اسی طرح لپکا کر ہلاک کر ڈالا ہو لیکن جو شخص سفید ویل کو پہلی دفعہ تیرتے
دیکھتا اسے وہ نہایت پُرسکون اور دلکش معلوم ہوتی۔

غرض اس گرم ملکوں کے سمندر کی خاموشی اور سکون کے درمیان ہوا ویل آگے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ موجوں پر
ایسا عالم جذب طاری ہو رہا تھا کہ وہ تالیاں بجانا بھی بھول گئی تھیں لیکن ویل کا دھڑ ابھی تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے
ابھی تک اپنی اوری دہشت ناک شکل نہیں دکھائی تھی اور اپنا بہت بڑا جبڑا بھی چھپا رکھا تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد اوپر کا دھڑ پانی
سے باہر نکل آیا۔ اس کا سنگ مرمر کا سا جسم ایک محراب کی طرح نمودار ہوا اور اسی دم کے پھریرے ہواؤں میں اڑ کر
خطرے کا اعلان کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ سمندر کی دیو پیکر لہروں میں ڈوب گئی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس کے پیچھے بس
ایک متلاطم تالاب سا رہ گیا۔ سمندر کی سفید چڑیاں اس کے اوپر ٹھہر کے منڈلانے لگیں اور اشتیاق کی نظروں سے نیچے کی
طرف دیکھنے لگیں۔

کشتی والوں نے چپو نیچے رکھ دیے اور بادبانوں کی مدد سے چپ چاپ چلنے لگے۔ انھیں ہوئی ویل کے دوبارہ
اوپر آنے کا انتظار تھا۔

"پورا گھنٹہ ہو گیا" اہاب نے کہا۔ وہ اپنی کشتی کے پچھلے حصے میں ایک جگہ جا کھڑا تھا اور جہاں ویل غائب ہوئی تھی اس
سے آگے نیلی فضاؤں اور لہجانے والی خلاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن افق کا جائزہ لیتے لیتے اس کی آنکھیں ایک دم سے
چکر کھانے لگیں۔ اب ہوا میں تازگی آ چلی تھی اور سمندر زوروں میں آ گیا تھا۔

"چڑیاں! — چڑیاں!" ٹاشٹیگو چلایا۔

سفید چڑیاں لمبی اور سیدھی قطار بنائے اہاب کی کشتی کی طرف اڑی چلی آ رہی تھیں کشتی سے دو چار گز کے فاصلے

پر آگے وہ پھر پھڑپھڑائے اور خوشی سے چیخ چیخ کر گول گول چکر لگانے لگیں۔ ان کی بینائی انسان کی بینائی سے تیز تھی۔ اہاب کو سمندر میں وہیل کے آثار کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے لیکن وہ پانی کی گہرائیوں میں جھانک ہی رہا تھا کہ ایک دم سے ایک چھوٹا سا گول سفید دھبہ نظر آیا جو بس اُدبلاؤ کے برابر تھا۔ یہ بڑی تیزی سے اوپر اٹھ رہا تھا اور بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں دھبے کا رخ بدل گیا اور پانی کی گہرائیوں میں سے سفید چمکدار دانتوں کی دو لمبی لمبی خوفناک قطاریں ابھرتی دکھائی دیں۔

یہ موبی ڈک کا کھلا ہوا منہ اور اس کا چیرا ہوا جبڑا تھا۔ اس کا زبردست جسم ابھی تک سمندر کے نیچے پانی میں غائب تھا۔ یہ چمکدار منہ کشتی کے نیچے اس طرح جھانک رہا تھا جیسے کوئی سنگ مرمر کا مقبرہ۔ اہاب نے پتوار کا ایک زبردست ہاتھ مارا اور کشتی کو اس ہولناک بھوت سے دور ہٹانے لگا۔ پھر اس نے فیض اللہ کو پکار کے اپنی جگہ بدل لی اور پھر چلّا اٹھا اور چلا کر ملاحوں کو کہا کہ ہتھیار استعمال کے لیے تیار ہو جائیں۔

اہاب نے بالکل بر وقت کشتی کو گھما لیا چنانچہ وہیل ابھی پانی کے نیچے ہی تھی کہ کشتی کا بیچ وہیل کے سر کے مقابل آ گیا لیکن موبی ڈک اپنی اسی کینہ پرور ذہانت کے سبب یہ چال بھانپ گئی اور ایک دم سے تڑپ کر اپنا جھریوں دار سر کشتی کی پوری لمبائی کے نیچے اڑا دیا۔

کشتی کا ایک ایک تختہ لرز اٹھا۔ وہیل اپنی کمر کے بل ٹیڑھی لیٹی تھی جیسے کانٹے والی شارک مچھلیاں لیٹتی ہیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ پورا کا پورا اپنے منہ میں لے لیا چنانچہ اس کا لمبا اور پتلا منقش نچلا جبڑا اہاب اوپر ہوا میں اٹھ گیا اور ایک دانت پتوار کے کنڈے میں پھنس گیا۔ جبڑے کے اندر کا نیلگوں سفید حصہ اہاب کے سر سے بس چھ انچ کے فاصلے پر تھا اور اہاب کے قد سے بھی اونچا پہنچ گیا تھا۔ اس انداز سے موبی ڈک کشتی کو یوں ہلکے ہلکے جھنجھوڑ رہی تھی جیسے بلی اپنے چوہے کو۔ فیض اللہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوا اور بس تماشا دیکھتا رہا لیکن زرد رو بحری گرتے پڑتے کشتی کے پچھلے حصے میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

وہیل اس بدقسمت کشتی سے گویا ہولناک کھیل کھیل رہی تھی۔ کشتی کی چمکدار دیواریں کبھی اندر ہو جاتیں کبھی باہر نکل آتیں۔ وہیل کا جسم کشتی کے نیچے دبا ہوا تھا اور کشتی وہیل کے منہ میں تھی چنانچہ یہاں سے اس کے اوپر برچھا نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔ دوسری کشتیاں ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہ گئی تھیں جیسے یہ خوفناک منظر دیکھا نہ جا رہا ہو۔ مراقی اہاب یہ دیکھ کر غضب ناک ہو گیا کہ میرا دشمن مجھ سے بالکل قریب آ گیا ہے لیکن میں اس کے جبڑوں کے اندر بے بس پھنسا ہوں۔ اسے اتنا جوش آیا کہ دونوں ہاتھوں سے وہیل کا جبڑا پکڑ لیا اور کشتی کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی وحشیانہ کوشش کرنے لگا۔ وہ اس فضول کوشش میں مصروف ہی تھا کہ جبڑا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کمزور دیواریں اندر کو بیٹھ گئیں اور کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ کیونکہ دونوں جبڑوں نے ایک زبردست قینچی کی طرح آگے بڑھ کر کشتی کے دو ٹکڑے کر دیے اور سمندر میں جا کے پھر بند ہو گئے۔ کشتی کے دونوں ٹکڑے الگ الگ تیرنے لگے اور پانی میں ڈوبتے معلوم ہوتے۔ بحری دیواروں سے چپک گئے اور پتواروں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

اہاب نے کشتی کے ٹوٹنے سے پہلے ہی وہیل کا ارادہ بھانپ لیا تھا کیونکہ موبی ڈک نے اپنا سر بڑی تیزی سے اوپر اٹھایا تھا اور ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس وقت اہاب نے کشتی کو باہر نکالنے کی ایک آخری کوشش کی تھی، لیکن وہ وہیل کے منہ میں اور بھی اندر کو دھنس گیا اور ایک طرف کو ٹیڑھا ہو گیا۔ اتنے میں کشتی کو جھٹکا لگا تو اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ منہ کے بل سمندر میں گرا۔

موبی ڈک سمندر میں اپنے شکار کے پاس سے ہٹ آئی تھی اور کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔ وہ اپنے مستطیل سفید سر کو موجوں میں اوپر نیچے ہلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنا سارا طویل جسم آہستہ آہستہ گھما رہی تھی۔ چنانچہ جب اس کا جھریوں دار زبردست ماتھا پانی میں سے کوئی بیس فٹ اوپر اٹھا تو چمکدار موجیں ایک ساتھ مل کر اس سے ٹکرانے لگیں اور انتقاماً اپنے جھاگ ہوا میں اور بھی اونچے اچھالنے لگیں۔ اسی طرح طوفان میں آبنائے کی لہریں گھوم کر چٹان کے پاس سے ہٹ آتی ہیں اور اس کے بعد اپنے جھاگ ایک تحقیر کے ساتھ اس کی چوٹی سے بھی اونچے اڑانے لگتی ہیں۔

لیکن تھوڑی دیر بعد موبی ڈک پھر سیدھی لیٹ گئی اور تیرتے ہوئے جہازیوں کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ وہ اپنے پیچھے پانی کو ایسے منتقمانہ انداز سے ہلا رہی تھی جیسے ایک اور بھی خوفناک حملے کی تیاری کر رہی ہو۔ الٹی ہوئی کشتی کو دیکھ کر وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ وہیل کی گستاخ دم نے جو جھاگ اڑائے تھے اہاب ان میں دب کے رہ گیا تھا۔ وہ تیرنے سے تو معذور تھا، لیکن اس بھنور میں بھی اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچا سکتا تھا۔ اس کا سر ایک اچھلتے ہوئے بلبلے کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتا ہے۔

فیض اللہ کشتی کے ایک ٹکڑے پر بیٹھا اسے بڑی بے نیازی اور لاپروائی سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے جہازی جو کشتی سے چھٹکے ہوئے تھے اہاب کو ذرا بھی مدد نہیں پہنچا سکتے تھے۔ انہیں تو اپنے آپ کو ہی بچانا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ چکر کھاتی ہوئی سفید وہیل بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھی، اور اس کے دائرے بڑی تیزی سے چھوٹے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں یہ لگتا تھا کہ وہ کسی دم میں ان پر آن پڑے گی۔ دوسری کشتیوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا تھا، اور وہ آس پاس منڈلا رہی تھیں لیکن یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ بھنور کے اندر آ کے برچھے چلائیں کیونکہ ممکن تھا وہیل ناراض ہو کے اہاب اور دوسرے تیرنے والوں کو فوراً ہلاک کر دے۔ اس حالت میں تو خود کشتی والے بھی نہیں بچ سکتے تھے چنانچہ وہ اس ہولناک حلقے کے باہر کھڑے تھے جس کا مرکز بڈھے کا سر تھا۔

ادھر جہاز کے پہرے دار یہ سارا تماشا دیکھتے رہے تھے چنانچہ جہاز بادبان چڑھا کے اس طرف روانہ ہو گیا اور اتنے قریب آ گیا کہ اہاب نے پانی میں سے چلا کے کہا ——— "وہیل کی طرف ———" کہتے ہی موبی ڈک کی طرف سے ایک زور کی لہر آئی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے پانی میں ڈوب گیا لیکن ہاتھ پیر مار کے پھر نکل آیا۔ اتفاق سے ایک بلند ہوتی ہوئی موج نے اسے اوپر اٹھایا تو اس نے چلا کر کہا ——— "وہیل کی طرف چلو! ——— اسے بھگا دو۔"

پیکوڈ اس طرف چلنے لگا اور اس جادو کے حلقے کو توڑ کر سفید وہیل کو اس کے شکار سے الگ کر دیا۔ وہیل پیچیدہ

سی ہو کے دوڑ چلی گئی کشتیاں فوراً مدد کو پہنچیں۔

جب ایاب کا اسسٹنٹ کشتی میں اوپر کھینچا گیا تو اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں اور اسے بالکل نظر نہ آ رہا تھا۔ نمک کا دانہ اس کی جھریوں میں جمنے لگا تھا کھنچاؤ کے مارے اس کا بدن تڑخ سا رہا تھا چنانچہ وہ بے بس ہو کے بالکل ڈھے گیا اور تھوڑی دیر تک کشتی میں مردہ سا پڑا رہا جیسے ہاتھیوں نے اسے پیروں سے گوندا ہو۔ اس کی آہیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں جیسے وادیوں میں سے کوئی گونج اٹھ رہی ہو۔

لیکن جسمانی بے بسی کی شدت نے اسے تھوڑی ہی دیر بعد بھلے چنگے دکھ کر دیا۔ آدمیوں کی پوری زندگی میں پھیلے ہوتے ہیں۔ انھیں بڑے دل والے ایک شدید بے بسی کی شکل میں صرف ایک لمحے کے اندر یکجا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بیاسے کبھی ایک تکلیف سے بڑی جلدی گزر جاتے ہیں لیکن اگر دیوتاؤں کی مرضی یہی ہو تو اپنی عمر میں غم کی پوری صدیاں بسر کر دیتے ہیں جو لمبے لمبے بھری شدید اذیتوں پر مشتمل ہوتی ہیں کیونکہ ان لوگوں کا ایک نقطہ کم تر درجے کی روحوں کے پورے دائرے کے برابر ہوتا ہے۔

ایاب نے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے ایک بازو کے سہارے اٹھ کر کہا ـــــ۔

"برچھا صحیح سلامت ہے یا نہیں؟"

"جی حضور! کیونکہ یہ تو پھینکا ہی نہیں گیا تھا یہ رہا" اسسٹنٹ نے برچھا دکھاتے ہوئے کہا۔

"اسے میرے سامنے رکھ دو ـــــ کسی کی جان تو ضائع نہیں ہوئی؟"

"ایک، دو، تین، چار، پانچ ـــــ پانچ پتواریں تھیں، اور پانچ آدمی موجود ہیں۔"

"ٹھیک ہے ـــــ ذرا مجھے سہارا دو، میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ او وہ وہیل دکھائی دے رہی ہے! وہ وہی اُدھر۔ اب بھی ہوا کے خلاف جا رہی ہے۔ اس کا فوارہ کتنے زور سے اچھل رہا ہے! ـــــ ہاتھ ہٹا لو! ایاب کی ہڈیوں میں ابھی بڑی قوت باقی ہے! بادبان چڑھاؤ، پتواریں نکالو، سکان سنبھالو!"

جب کشتی ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے ملاحوں کو ایک اور کشتی آ کے اٹھا لیتی ہے تو یہ لوگ دوسری کشتی چلانے میں مدد دینے لگتے ہیں اور شکار پھر جاری ہو جاتا ہے اس وقت بھی یہی ہوا لیکن کشتی کی مزید قوت وہیل کی مزید قوت کا مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ معلوم ہوتا تھا وہیل کی طاقت پہلے سے تین گنی ہو گئی ہے۔ اس کی تیز رفتاری سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ان حالات میں شکار جاری رکھا گیا تو کبھی ختم ہونے میں نہ آئے گا۔ پھر جہازی ہی اتنے عرصے تک تیز رفتار چلانے کی شدید محنت برداشت نہ کر سکتے تھے، اتنی مشقت تو بس تھوڑی ہی دیر ہو سکتی ہے۔ مچھلی تک پہنچنے کا دوسرا اور سب سے مناسب ذریعہ تو جہاز ہی تھا چنانچہ کشتیاں اس طرف چل پڑیں اور چرخیوں کے ذریعے اوپر چڑھا لی گئیں ـــــ ٹوٹی ہوئی کشتی کے دونوں ٹکڑے پہلے ہی باندھ لیے گئے تھے۔ اب بادبان چڑھا دیے گئے اور جہاز سمندری چڑیا کی طرح پر پھیلائے ہوئے وہیل کے پیچھے چل پڑا۔ وہیل حسبِ عادت باقاعدہ وقفوں کے ساتھ فوارہ چھوڑ رہی ہے چنانچہ پہرے والے اس کا برابر اعلان کرتے

رہے۔ جب یہ خبر ملی کہ مچھلی پھنس گئی تو اب وہ ذرا ذرا دیر دیکھتا اور گھڑی ہاتھوں میں سے کے ٹہلنے لگتا۔ جتنا وہ وقت ختم ہوتے ہی اس کی آواز آتی ——— اب کے اشری کس کی ہے؟ وہیل دکھائی دی؟ اگر جواب ملتا کہ نہیں، تو وہ فوراً حکم دیتا کہ مجھے مچان پر پہنچاؤ۔ اس طرح دن گزرتا چلا گیا۔ اہاب کبھی تو مچان پر بے حس و حرکت کھڑا ہوتا، کبھی بے چینی سے عرشے پر ٹہلنے لگتا ———

وہ بالکل چپ چاپ عرشے پر ٹہل رہا تھا۔ اگر بولتا بھی تو مچان والوں کو پکارتا یا انھیں حکم دیتا کہ فلاں بادبان اونچا کر دو یا پھیلا دو۔ اپنی ٹوپی پیچھے تک کھینچے اسی طرح ٹہلتے ہوئے وہ ہر بار اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کے پاس سے گزرتا تھا جو چھوٹے عرشے پر الٹی پڑی تھی۔ آخر کار وہ اس کے سامنے آکے رک گیا اور جس طرح بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان پر بھی بعض دفعہ نئے بادلوں کی پوری قطار آجاتی ہے، اسی طرح بڈھے کے چہرے پر بھی ایک نیا غم چھا گیا۔

اسٹب نے اُسے وہاں کھڑے ہوئے دیکھا اور اپنی بہادری جتانے اور کپتان کے دل میں جگہ پیدا کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ پھر ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرف دیکھ کے بولا ——— "یہ وہ کانٹا ہے جو گدھے سے کھایا نہیں گیا۔ منہ میں رکھے زور سے چبھتا تھا۔ ہا ہا!"

"یہ کون بزدل ہے جو ٹوٹی ہوئی کشتی کے سامنے ہنس رہا ہے؟ ارے کم بخت! میں جانتا ہوں کہ تو تنور کی آگ کی طرح بہادر ہے اور کمال آدمی، ورنہ میں قسم کھا کے کہتا کہ تو ڈرپوک ہے۔ شکستہ چیزوں کے سامنے تو قہقہے نہیں بلکہ آہیں مناسب رہتی چاہییں۔"

"جی، حضور!" اسٹاربک نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بڑی گمبھیر چیز ہے۔ شگون ہے اور وہ بھی برا۔"

"شگون؟ شگون؟ ——— یہ تو لغت ہوگئی۔ اگر دیوتا انسان سے کوئی بات کرنا چاہیں گے تو معقول طریقے سے صاف صاف بات کریں گے۔ بڑھیوں کی طرح سر ہلا کے اشاروں میں نہیں بولیں گے ——— جاگ جاؤ! تم دونوں ایک ہی چیز کے دو رُخ ہو۔ اسٹاربک، اسٹب کا اُلٹا ہے، اور اسٹب اسٹاربک کا۔ تم دونوں ساری انسانیت ہو لیکن اہاب اس بھری دنیا میں اکیلا کھڑا ہے۔ اس کے پڑوس نہ تو انسان ہیں نہ دیوتا! سردی لگ رہی ہے، بڑی لگ رہی ہے ——— میں تو تھر تھر کانپ رہا ہوں! ——— اب کیا حال ہے! مچان والو! وہیل نظر آئی! اچھا ہے وہ پل بھر میں دس دفعہ فوارہ چھوڑے لیکن تم ہر دفعہ بتاؤ؟"

دن قریب قریب رخصت ہو چکا تھا۔ بس اس کے سنہرے لباس کے دامن کی سرسراہٹ باقی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا، لیکن پہرے والے اپنی جگہ جمے رہے۔

"اب تو فوارہ دکھائی نہیں دیتا، حضور ——— اندھیرا بہت ہو گیا" ——— اوپر ہوا میں سے ایک آواز آئی۔

"جب تم نے وہیل کو آخری دفعہ دیکھا ہے تو وہ کس رُخ جا رہی تھی؟"

"پہلے کی طرح حضور ـــــ ہوا کے خلاف۔"

"ٹھیک! اب رات ہو گئی ہے تو وہ آہستہ چلے گی۔ بڑے بادبان اتار دو مسٹر اسٹاربک۔ ہمیں صبح سے پہلے اس کے قریب نہیں پہنچنا چاہیے۔ اب وہ سیدھی جا رہی ہے شاید تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رک جائے۔ سکان والے! جہاز کو ہوا کی مخالف سمت ہی چلاتے رہو ـــــ نگہبان والو! نیچے آجاؤ! ـــــ مسٹر اسٹب بڑے مستول پر کسی نئے آدمی کو چڑھاؤ۔ دیکھو، صبح تک وہاں پہرا رہے" ـــــ پھر وہ بڑے مستول پر گڑی ہوئی اشرفی کی طرف بڑھا ـــــ "جہازیو! یہ اشرفی میری ہے کیونکہ میں نے اسے جیتا ہے لیکن جب تک سفید وہیل نہ مرے میں اسے یہیں رہنے دوں گا۔ جس دن وہ ماری جائے گی اس روز جو شخص سب سے پہلے اسے دیکھے گا یہ اشرفی اسی کی ہو جائے گی۔ اگر اس دن بھی سب سے پہلے میں ہی دیکھوں تو اس اشرفی کی دس گنی رقم تم سب میں بانٹ دی جائے گی! اچھا اب جاؤ ـــــ عرشہ آپ کا ہے، حضور۔"

یہ کہہ کر وہ مورچے میں چلا گیا اور ٹوپی نیچے کھینچ کر صبح تک وہیں کھڑا رہا۔ بس تھوڑی دیر بعد چونک کر یہ دیکھ لیتا تھا کہ رات کس طرح گزر رہی ہے۔

جہاز سمندر کا سینہ چیرتا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے پانی میں ایسی لکیریں بن رہی تھیں جیسے توپ کا گولا غلط جگہ پڑ کے اور ہموار میدان کو کھود کے پھینک دے۔

"زمینوں کی قسم!" اسٹب کہنے لگا۔ "جہاز اتنا تیز چل رہا ہے کہ ٹانگیں لڑکھڑائی جاتی ہیں اور دل تھرتھرا رہا ہے۔ یہ جہاز تم اور میں، یہ جہاز اور میں ——— ہا! ہا! کوئی مجھے اٹھا کے فرش کی طرح سمندر میں ڈال دے ——— کیونکہ مستول کی قسم! میری کمر بھی پورا جہاز ہے۔ ہا، ہا! ہم اس طرح چل رہے ہیں کہ زور اگر دیتیں اُڑتی!"

"فوارہ چھوڑ رہی ہے ——— فوارہ چھوڑ رہی ہے! ——— فوارہ چھوڑ رہی ہے! ——— بالکل سامنے کی طرف!" مچان پر سے آواز آئی۔

"ہاں، ہاں!" اسٹب بولا۔ "میں تو جانتا تھا ——— اری تو بھاگ کے نہیں جا سکتی ——— چاہے تو فوارہ چھوڑ چھوڑ کے اپنا پیٹ پھاڑ دے لیکن بھاگ نہیں سکتی! خود شیطان تیرے پیچھے پڑا ہوا ہے! اتنی زور سے فوارہ چھوڑ کر تیرے پھیپھڑوں میں آبلے پڑ جاتے ہیں! ——— تیرے زخموں کا خون آ رہا ہے جیسے بچی کی دال جاگ لگ کے چشمے کا پانی روک دیتا ہے!"

بہرحال اسٹب نے زبان سے کہی وہ سارے جہازیوں کے دل میں تھی۔ شکار کی گرمی میں ایسا جوش آگیا تھا جیسے پرانی شراب اُبل پڑی ہے۔ پہلے وہ چاہے کتنا ہی ڈرتے اور جھجکتے رہے ہوں، لیکن اہاب کے رعب نے ان سارے خوفوں کو اس طرح بھگا دیا تھا جیسے گھاس کے میدان کے ڈرپوک خرگوش بھینسے کے حملے سے بھاگ جاتے ہیں۔ قسمت نے ان کی روحوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ کل کے ہیجان انگیز خطرات، پچھلی رات کے انتظار کی اذیت، ان کے وحشی جہاز کا بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے بے دھڑک اور اندھا دھند چلنا ——— ان سب چیزوں نے ان کا دل چھین لیا تھا۔ ہوا نے ان کے بادبان پھلا دیئے تھے اور جہاز کو غیر مرئی اور ناقابل تسخیر بازوؤں سے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ یہ ہوا گویا اسی ان دیکھی قوت کی علامت تھی جو انہیں غلاموں کی طرح دوڑا رہی تھی۔

یہ لوگ تیس آدمی نہیں تھے بلکہ ایک آدمی۔ یہ سب جس جہاز میں بیٹھے تھے وہ بھی بلوط، میپل، ناریل، سن اور طرح طرح کی دوسری چیزوں کو جمع کر کے بنایا گیا تھا ——— لیکن یہ سب چیزیں مل کر ایک جہاز بن گئی تھیں جو اپنے سینے کی ہدایت کے بموجب سمندر میں اڑا چلا جا رہا تھا۔ اسی طرح جہازیوں کی انفرادی خصوصیات، یعنی اس آدمی کی بہادری، اس آدمی کے خوف اور جرم، یہ سب چیزیں گھل مل کر ایک ہوگئی تھیں اور اس مہلک منزل کی طرف جا رہی تھیں جس کی طرف ان کے واحد آقا اہاب نے اشارہ کیا تھا۔

رسیاں بالکل جیتی جاگتی معلوم ہوتی تھیں۔ مستولوں پر کھجور کے درختوں کی طرح بازوؤں اور ٹانگوں کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ بعض لوگ ایک ہاتھ سے بلی پکڑے بڑی بے چینی سے دوسری بلی کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ کچھ لوگ سورج کی تیز روشنی سے اپنی آنکھیں محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھوں کا سایہ کر کے مستول کے جھکے ہوئے ڈنڈوں پر بیٹھے تھے۔ غرض ساری بلیوں پر انسان پھل لدے ہوئے تھے جو اپنے انجام کے لیے بالکل تیار تھے۔

آہ! اس لامحدود نیلی فضا میں وہ اس چیز کی تلاش میں کتنے سرگرم تھے جو انھیں موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی!

جب پہلے نعرے کے بعد کئی منٹ گزر گئے اور کوئی آواز نہ آئی تو اہاب نے پکارا —— "اگر وہیل نظر آ رہی ہے تو آواز کیوں نہیں لگاتے پیچھے؟ ورنہ جہازی نہیں دھوکا ہوا ہے۔ موبی ڈک کا یہ دستور نہیں کہ ایک آدھ دفعہ فوارہ چھوڑے اور غائب ہو جائے۔"

واقعی یہی بات تھی۔ اب پتا چلا کہ جہازیوں نے اپنے اشتیاق اور جوش میں کسی اور چیز کو وہیل کا فوارہ سمجھ لیا تھا۔ اہاب چٹان پر کھڑا ہی تھا اور رسی سے ٹیک لگائے بیٹھا ہی تھا کہ اس کے نعرے کے ساتھ ساتھ اتنا زبردست شور ہوا کہ جہاز تھرا اٹھا۔ جیسے بہت سی بندوقیں ایک ساتھ چھوڑ دی گئی ہوں۔ جہازی پیچھے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے کیونکہ موبی ڈک اس فرضی فوارے کی بہ نسبت جہاز سے بہت قریب یعنی ایک میل بھر سے بھی کم فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ اس وقت وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنا فوارہ نہیں چھوڑ رہی تھی بلکہ سفید وہیل نے اپنی موجودگی کے اظہار کا وہ عجیب غریب طریقہ اختیار کیا تھا جسے قلابازی کہتے ہیں۔ وہ وہیل جس وقت سمندر کی تہہ سے پوری قوت کے ساتھ اچھلتی ہے اور ہوا میں اپنا پورا جسم اچھال دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چمکتے ہوئے جھاگ کا ایک پہاڑ بن جاتا ہے جو سات میل سے بھی نظر آتا ہے۔ اس وقت وہیل غضب ناک لہروں کو اس طرح دور ہٹاتی ہے کہ وہ اس کی اپنی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ بعض اوقات اس قلابازی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہیل مقابلے کی دعوت دے رہی ہے۔

"قلابازی کھا رہی ہے! قلابازی کھا رہی ہے!" نعرہ بلند ہوا۔ سفید وہیل بہت اونچائی کے آسمان کی طرف اچھل رہی تھی جیسے سمندر اور آسمان سے بھی نیچے آسمان کے مقابل وہ اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جھاگ اچھلتے تو تھوڑی دیر تک یہ جگمگاتے رہتے جیسے برف کا پہاڑ۔ شروع میں تو ان کی چمک نہایت تیز ہوتی لیکن دھندلی پڑتے پڑتے آخر میں وہ جال جیسے وادی میں بکھر گئے۔

"ہاں، موبی ڈک! آخری دفعہ سورج کی طرف جتنی چاہے قلابازیاں لگا لے!"

اہاب چلایا۔ "تیری موت کا وقت اور قریب آ پہنچا! —— نیچے اترو تو! سب لوگ پیچھے آ جاؤ۔ بس ایک آدمی اوپر رہے۔ کشتیاں تیار رکھو!"

جہازیوں نے بادبانوں میں لگی ہوئی رسیوں کی سیڑھیوں کی پروا بھی نہ کی۔ وہ رسی ہاتھ میں تھامے اس پر سے پھسلتے ہوئے ٹوٹتے ستاروں کی طرح عرشے پر آ رہے۔ اہاب کو بھی اس طرح اترنا تھا تو نہیں، لیکن تیزی سے نیچے اتار لیا گیا۔

کل شام اس کے لیے ایک خاص کشتی تیار کر لی گئی تھی۔ اس میں پہنچتے ہی وہ چلایا —— "کشتیاں اتار دو —— مسٹر اسٹاربک، اب جہاز تمھارا ہے —— کشتیوں سے دور ہی رہنا لیکن کہیں آس پاس۔ کشتیاں اتار دو!"

ان لوگوں کو ڈرانے کے لیے موبی ڈک پہلے ہی حملے کا ارادہ کر چکی تھی۔ چنانچہ وہ مڑی اور ان تینوں کشتیوں کی طرف چل دی۔ اہاب کی کشتی بیچ میں تھی۔ اس نے اپنے ملاحوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ہم سیدھا وہیل کے ماتھے کی طرف چلا ہوں۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ اگر یہ ترکیب استعمال کی جائے تو ایک خاص حد کے اندر وہیل سامنے کی طرف سے حملہ کرنے

والوں کو دکھ میں لگی لیکن ابھی کشتیاں اس حد کے اندر داخل بھی نہ ہونے پائی تھیں اور وہیل کافی ہی اچھل اچھل کر غوطے لگا رہی تھیں
جیسے جاگ کر سفید وہیل پانی کو چیرتی ہوئی تیزی میں آگئی۔ وہ آنکھ جھپکتے ہی جزیرے کے کونے اور دم والی کشتیوں کی طرف لپکی اور چکر
کاٹنے لگی۔ اس پر ہر طرف سے برچھے برس رہے تھے لیکن اسے پروا بھی نہ تھی۔ اسے تو بس یہ معلوم ہوتی تھی کہ ان کشتیوں
کا ایک ایک تختہ توڑ کے رکھ دوں۔ مگر کشتیوں والے بھی بڑی ہوشیاری سے کام لے رہے تھے اور اپنی کشتیوں کو سدھے ہوئے
گھوڑوں کی طرح گول گول چلا رہے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک کشتیاں وہیل کو چکر دے کر نکلتی رہیں ——— گو ہر دو تین لمحے
کے برابر فاصلہ رہ جاتا تھا۔ اُدھر اہاب کا غلغلہ تخلف تھا اس طرح گونج رہا تھا کہ اس کے مقابلے میں اور کوئی آواز سنائی
نہ دیتا تھا۔

لیکن سفید وہیل نے ابھی چکر پھیریاں لگائیں اور اس کے اندر جو برچھے گڑ گئے تھے ان کی تینوں ڈوروں کو اس بری طرح
اُلجھا کر وہ چھوٹی ہوگئیں اور کشتیوں کو اپنے حلقہ گوشوں کی طرح وہیل میں گڑے ہوئے برچھوں کی طرف کھینچ کے لے گئیں۔ اب
وہیل دم بھر کے لیے پیچھے کو ہٹ گئی جیسے ایک نئے زبردست حملے کی تیاری کر رہی ہو۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اہاب نے ڈور
کو ڈھیل دے دی۔ پھر اسے جلدی جلدی واپس کھینچنا شروع کر دیا تاکہ ڈور الجھاوے میں سے نکل آئے ——— اتنے میں ایک
ایسی چیز نظر آئی جو خونخوار شارک مچھلیوں کے دانتوں سے بھی زیادہ خوفناک تھی!

جو برچھے اور تیر سے وہیل کے بدن میں گڑے ہوئے تھے وہ ڈور کی بھول بھلیوں میں الجھ گئے تھے اور اب تنے ہوئے سیدھے
اہاب کی کشتی کی طرف آ رہے تھے۔ اب صرف ایک ہی بات ہو سکتی تھی۔ اہاب نے چاقو اٹھایا اور تین بار تقدیر ہو کے اندر باہر
ہر طرف چاقو چلانے لگا۔ اس نے ڈور کے کچھی اور سکان چلانے والے کو تھما دی پھر رسی کو دو ٹکڑے کاٹ کے برچھوں
کے اس گچھے کو سمندر میں گرا دیا۔ اب جا کے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا مگر اتنے میں سفید وہیل نے دوسری الجھی ہوئی ڈوروں
کے درمیان جو ابول بدا ستب اور فلاسک کی کشتیاں اور بھی زیادہ الجھی ہوئی تھیں۔ وہ بے اختیار وہیل کی دم کی طرف کھینچی
چلی گئیں۔ وہیل نے ان دونوں کو آپس میں اس طرح ٹکرا دیا جیسے ساحل پر موجیں دو پتھروں کو لڑا دیتی ہیں۔ اس کے بعد سمندر
میں غوطہ مار گئی اور ایک ابلتے ہوئے بھنور میں غائب ہو گئی۔ اس گرداب میں ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے خوشبو دار ٹکڑے اسی طرح
اچھلتے رہے جیسے شراب کے پیالے میں جائفل۔

دونوں کشتیوں کے ملاح پانی میں گول گول چکر لگانے لگے۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر ناویں پتوار اور دوسری تیرتی
ہوئی چیزیں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلاسک خالی شیشی کی طرح ڈبکیاں لگا رہا تھا اور شارک مچھلیوں کے خوفناک
جبڑوں سے بچنے کے لیے اوپر کی طرف ٹانگیں چلا رہا تھا۔ سٹب شور مچا رہا تھا کہ اسے کوئی آکے پانی میں سے نکالے۔ بیچے
اہاب کی ڈور آدھی کٹی تھی اور وہ اس ذرہ ذرہ جیسے سفید تالاب میں جا کر ڈوبنے والوں کی جان بچا سکتا تھا۔ یوں لگتا
تھا جیسے ہزاروں خطرے مجسم ہو کر ایک ساتھ سامنے آگئے ہوں۔ اتنے میں ایسا معلوم ہوا جیسے اہاب کی صحیح سلامت کشتی
کو کسی نے غیبی تاروں سے آسمان کی طرف کھینچ لیا ہو۔ سفید وہیل پانی میں سے تیر کی طرح سیدھی نکل آئی تھی اور اپنا چوڑا ماتھا

کشتی کے سینے میں دبے سارا اٹھا۔ کشتی ہوا میں قلابازیاں کھانے لگی اور پھر الٹی گر پڑی۔ ایاب اور اس کے ساتھی اس کے نیچے سے یوں ہاتھ پیر مارتے ہوئے نکلے جیسے سمندر کے غاروں میں سے ہیل مچھلیاں۔

وہیل پوری طاقت سے اُبھری تھی اور اسی جھونک میں اوپر تک پہنچتے پہنچتے اس کا رخ بدل گیا تھا چنانچہ وہ بے بس ہو کر اپنی تباہ کاری کے منظر سے تھوڑی دور کے فاصلے پر کشتی کے پاس آ کے ٹھہری۔ اور کوئی لمحہ بھر اپنی دم سے چاروں طرف ٹٹولتی رہی۔ اگر کوئی چپو، یا تختہ، یا ٹوٹی ہوئی کشتیوں کا ذرا سا ٹکڑا بھی اس کے بدن سے چھو جاتا تو وہ دم چلاتی اور پانی کو پیٹنے لگتی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد گویا اسے اطمینان ہو گیا کہ انتقام کا کام ختم ہوا۔ اور اس نے اپنا جھریوں دار ماتھا پانی کے اندر کھینچ لیا، پھر وہ ابھی ہوئی لہروں میں اپنے پیچھے کھینچی ہوئی رسیوں کی سی باقاعدہ رفتار کے ساتھ چل پڑی۔

جہاز نے یہ لڑائی پوری توجہ کے ساتھ دیکھی تھی، وہ پھر مدد کے لیے آ پہنچا۔ اور ایک کشتی اتار کے تیرتے ہوئے ملاحوں کو، نامیدوں کو، چپوؤں کو، اور جو چیز بھی ہاتھ آ گئی اسے اٹھا کے عرشے پر کھینچ لیا۔ بعض لوگوں کے کندھے نکل گئے تھے، کلائیاں اور پسلیاں اتر گئی تھیں، بعض لوگوں کے بھیتری چوٹ لگی تھی۔ کچھ نیزے اور برچھے ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ رسیوں کی گانٹھیں الجھ گئی تھیں، چپو، اور تختے ٹوٹ گئے تھے۔ یہ ساری باتیں تو تھیں، مگر نہ تو کوئی جان ضائع ہوئی تھی اور نہ کسی کو سخت چوٹ آئی تھی۔ کل جو حالت فیض اللہ کی تھی وہ آج ایاب کی ہوئی یعنی وہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کے آدھے ٹکڑے سے لپٹا ہوا اور اگرچہ اس کے اوپر بیٹھ کے تیرنے میں اتنا خطرہ نہ تھا، پھر وہ اتنا خستہ حال بھی نہ ہو رہا تھا جتنا کل کے حادثے میں۔

لیکن جب اسے سہارا دے کر عرشے پر پہنچا دیا گیا تو سب کی نظریں اس پر لگ کے رہ گئیں کیونکہ ٹانگ کٹ جانے کے بعد وہ ہمیشہ اسٹاربک کے کندھے پر آدھا لٹکا ہوا تھا جس نے اس کی مدد سب سے زیادہ کی تھی۔ ایاب کی نقلی ٹانگ ٹوٹ کے گر گئی تھی، اور بس ایک چھوٹی سی کھپچی کی طرح باقی رہ گئی تھی۔

"ہاں، ہاں، اسٹاربک، بعض وقت جھکنا بھی بڑا اچھا لگتا ہے، چاہے جھکنے والا کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ کاش کہ بڈھا ایاب اپنی زندگی میں بار بار جھکا ہوتا۔"

"حضور، یہ ٹانگ پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔" بڑھئی نے اوپر آتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑی محنت سے بنائی تھی۔"

"لیکن شاید کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی۔" اسٹاربک نے خلوص کے ساتھ کہا۔

"ہاں! بالکل ریزہ ریزہ ہو گئی، اسٹاربک! ——— دیکھتے ہو ——— لیکن چاہے ہڈی ٹوٹ گئی ہو، بڈھا ایاب پھر بھی ویسے کا ویسا ہی ہے۔ جس طرح یہ مردہ ٹانگ جو ضائع ہو گئی ہے میرے جسم کا حصہ نہیں تھی۔ اسی طرح میں اپنی کسی زندہ ہڈی کو بھی اپنا ایک حصہ نہیں سمجھتا۔ بڈھے ایاب کا جو اصلی وجود ہے وہاں تک کسی کی دسترس نہیں۔ اسے نہ تو سفید وہیل چھو سکتی ہے، نہ انسان، نہ شیطان۔ کیا کوئی غوطہ خور اس سامنے والے فرش کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے، کوئی مستول سامنے والی چھت کو چھو سکتا ہے؟ ——— نگران والو! وہیل کس طرف جا رہی ہے؟"

"ہوا کی مخالف سمت، حضور۔"

"اچھا، تو اسی طرف چلو۔ سارے بادبان چڑھا دو! نالو کشتیاں اندر کے تیار کرو ——— مسٹر اسٹاربک جاؤ اور کشتیوں کے ملاحوں کو جمع کرو۔"

"حضور، چلیے میں آپ کو کشتی کے پاس تک پہنچا دوں۔"

"اوہ، اوہ، اوہ! یہ کرچ تو مجھے بڑی تکلیف دے رہی ہے! کیسی منحوس قسمت ہے میری بھی! جلاد روح کے اندر والے کپتان کا ساتھی ایسا بزدل ہو!"

"حضور؟"

"میں اپنے جسم کی بات کر رہا تھا، تمہاری نہیں۔ مجھے کوئی چھڑی دے دو ——— وہ ٹوٹا ہوا نیزہ ٹھیک رہے گا۔ سب لوگوں کو جمع کرو۔ میں نے اُسے ابھی تک نہیں دیکھا۔ خدا نخواستہ کچھ ہو تو نہیں گیا! ——— کیا غائب ہے؟ ——— جلدی کرو! سب لوگوں کو بلاؤ۔"

بڈھے کا خیال درست نکلا۔ سب لوگ جمع ہوئے تو پارسی غائب تھا۔

"پارسی!" اسٹب بولا ——— "شاید وہ ڈور میں الجھ گیا ہو ———"

"تیرے اوپر خدا کی لعنت! ——— چلو تم سب جہاز کے اوپر نیچے، میرے کمرے میں، ہر جگہ ڈھونڈو ——— ڈوب تو نہیں گیا ——— ڈوب تو نہیں گیا!"

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لوگ یہ خبر لے کر آئے کہ پارسی کا کہیں پتا نہیں۔

"اسٹب نے کہا ——— "حضور، وہ آپ کی ڈور میں الجھ گیا تھا ——— شاید میں نے اُسے وہیل کے ساتھ ساتھ تُند کی لہر میں جاتے دیکھا تھا۔"

"میری ڈور! میری ڈور؟ چلا گیا! ——— چلا گیا! یہ چھوٹا سا فقرہ کیا معنی رکھتا ہے؟ ——— اس میں تو موت کی گھنٹیاں سی بجتی ہیں، کیونکہ یہ فقرہ سن کر بڈھا اہب تو لرز اٹھا۔ برچھا بھی گیا! ——— وہ برچھوں کا گٹھا اٹھا کے پھینک دو ——— دیکھ رہے ہو؟ ——— میں نے جو برچھا بنایا تھا، سفید وہیل کے لیے جو برچھا بنایا تھا ——— نہیں، نہیں، نہیں ——— میں بھی کتنا الو ہوں! میں نے اسی ہاتھ سے تو پھینکا تھا! ——— وہ تو مچھلی کے اندر ہے! ——— مچان والو! وہیل کو نظر میں رکھنا ——— جلدی کرو! ——— سب لوگ مل کے کشتیاں تیار کرو ——— چپو اٹھا کر جمع کرو ——— برچھے والو! برچھے لاؤ! ——— بڑے بادبان اور اوپر چڑھاؤ ——— سارے بادبانوں کو کھینچو! ——— سکان والے! جہاز ٹھیک طرح چلانا! چاہے مجھے دنیا کے گرد دس دفعہ چکر لگانا پڑے، اور خواہ مجھے اس کے آر پار جانا پڑے، لیکن میں سفید وہیل کو مار کے رہوں گا!"

"خدایا! ایک لمحے کے لیے تو ظاہر ہو جا!" اسٹاربک چلایا۔ "بڈھے، تو اُسے کبھی نہیں پکڑ سکے گا ——— خدا کے لیے، بابا، اب تو بات پاگل پن کی حدوں سے بھی گزر گئی ——— دو دن سے ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں، دو دفعہ تیری کشتی کے پرخچے اڑ چکے

شکار —— تیسرا دن

تیسرے دن کی صبح نہایت حسین اور تر و تازہ تھی۔ رات کو نیوبری میں ایک آدمی نے چوراہا تھا۔ اب وہ تو پیچھے اتر آیا اور اس کے بجائے ایک بوڑھا آدم جو اپنا چشمہ بستی اور ہری سی بڑی پر کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

"وہیں نظر آتی ہو؟" اہاب نے پوچھا۔ لیکن وہیل ابھی تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"بہرحال وہ اپنے راستے پر جا رہی ہے۔ بس اسی طرف چلے چلو۔ شکاری والے! اسی طرح چلتے رہو جیسے اب تک چلتے رہے ہو۔ کیا خوبصورت دن ہے۔ اگر دشمنوں کی تفریح کے لیے ایک نئی دنیا بنائی گئی ہوتی اور آج صبح اس کا افتتاح ہوتا تو بھی اس دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت دن نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ دن اس قابل ہے کہ اس کے متعلق سوچا جائے —— بشرطیکہ اہاب کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہو۔ لیکن اہاب کبھی نہیں سوچتا۔ وہ تو بس محسوس کرتا ہے، محسوس کرتا ہے، محسوس کرتا ہے۔ یہ بھی انسان کے لیے صبر آزما چیز ہے۔ سوچنا تو ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ یہ حق اور امتیاز تو بس خدا کو حاصل ہے۔ سوچنے میں تو ایک سکون اور ٹھنڈک ہونی چاہیے لیکن ہمارے دل اور ہمارے دماغ اس بری طرح دھڑکتے ہیں کہ بس۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ بہرحال مجھے اکثر خیال آیا ہے کہ میرا دماغ بہت ہی پرسکون ہے —— منجمد اور پرسکون —— یہ کھوپڑی اس طرح چٹخ گئی ہے جیسے گلاس کے اندر پانی برف بن گیا ہو اور کٹ کٹ رہا ہو۔ لیکن یہ بال تو برابر بڑھ رہے ہیں۔ اس وقت بھی بڑھ رہے ہیں اور گرمی سے ہی بڑھتے ہوں گے۔ لیکن نہیں۔ یہ تو ویسی ہی گھاس ہے جو گرین لینڈ کے برف میں بھی اگ سکتی ہے اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں بھی۔ میرے بالوں کو ہوا کس بری طرح اڑا رہی ہے —— جیسے پھٹے ہوئے کپڑے ہوئے جہاز پر بادبانوں کے چیتھڑے۔ بڑی گندی ہوا ہے۔ یہ قید خانے کے دالانوں اور کوٹھڑیوں اور ہسپتالوں میں سے ہو کے آ رہی ہے اور اب ایسی اٹکھیلیاں کرتی چلی آ رہی ہے جیسے بچوں کی طرح معصوم ہو۔ اس ہوا پر لعنت ہے —— یہ تو واقعہ ہے۔ اگر میں ہوا ہوتا تو ایسی بدمعاش اور گندی دنیا پر کبھی نہ چلتا۔ میں تو کسی غار میں جا چھپتا۔ اس کے باوجود ہوا بڑی زبردست اور دلاور چیز ہے۔ آج تک کوئی اسے فتح کر سکا ہے؟ ہر لڑائی میں اس کا وار سب سے آخری اور سب سے سخت ہوتا ہے۔ آپ اس پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹیں تو آپ اس کے اندر سے صاف گزر جائیں گے۔ یہ ہوا بھی کتنی بزدل ہے کہ ننگے آدمیوں کو مارتی ہے لیکن مقابلے پر ایک دفعہ بھی نہیں آتی۔ ہوا سے تو اہاب ہی زیادہ بہادر ہے، زیادہ شریف ہے۔ کاش کہ ہوا کے جسم ہوتا۔ لیکن جتنی چیزیں انسان کو تنگ کرتی ہیں، جتنی چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں، وہ سب بے جسم ہوتی ہیں مگر اشیا کی حیثیت سے بے جسم ہوتی ہیں، قوت عاملہ کی حیثیت سے نہیں۔ ان دونوں میں نہایت خاص بڑا ہی پرکار اور انتہائی مکاری کا فرق رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود میں پھر قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ہوا ایک لحاظ سے بڑی حسین

اور شاندار چیز ہے سمندر کی لہریں کبھی ادھر جاتی ہیں کبھی اُدھر، زمین کا بڑے سے بڑا دریا ایک لڑیاں سا نا چلتا ہے، اسے چکنیں ہوتا کہ آخر مجھے کس طرف جانا ہے۔ لیکن یہ گرم گرم ہوائیں صاف آسمان پر بالکل سیدھی چلتی ہیں، ان کے استقلال میں فرق نہیں آتا اور وہ جدھر کا رُخ کر لیتی ہیں ادھر سے نہیں ہٹتیں۔ ازلی وابدی تکلیفیں کی قسم، جو ہوائیں میرے جہاز کو آگے چلا رہی ہیں، وہی میری روح کی کشتی کو بھی دھکیل رہی ہیں! جہاز سی کوئی امی کی طرح کی غیر تغیر پذیر اور طاقتور چیز ہوگی، پہرے والو! کیا نظر آیا؟"

"کچھ بھی نہیں، حضور۔"

"کچھ بھی نہیں! اور وہ پھر ہونے کو آگیا۔ اشرقی تیمیں پکار رہی ہے! ذرا سورج کو تو دیکھو! ہاں، یہی بات ہے۔ میں چلتے چلتے وہیل سے آگے نکل آیا ہوں، وہ پیچھے کیسے رہ گئی؟

ہاں! اب میں اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ وہ میرا تعاقب کر رہی ہے ——— یہ تو بڑی بات ہے مجھے پہلے ہی معلوم ہو جانا چاہیے تھا، میں بھی کیسا احمق ہوں! وہ اپنے ساتھ ڈوریں اور رسے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ ہاں، ہاں، میں رات اس سے آگے نکل آیا۔ جہاز پھیرو! جہاز پھیرو! میرے واروں کے سوا باقی سب لوگ نیچے آجائیں، جہاز کو پیچھے کھینچو۔"

اب تک جہاز جس طرح چلتا رہا تھا اس میں تو ہوا کچھ موافق رہی تھی لیکن جب رُخ پھیر دیا گیا تو ہوا مخالف ہو گئی اور جہاز اس جھاگ کو توڑتا ہوا پچھلے لگتے پیچھے پھر آیا تھا۔

"جہاز ہوا کے خلاف جا رہا ہے اور وہیل کے کھلے ہوئے منہ کی طرف۔" اسٹاربک رسی کھولتے ہوئے منہ ہی منہ میں بولا۔ "خدا اپنا فضل کرے، لیکن مجھے تو اپنی ہڈیاں ابھی سے بھی معلوم ہوتی ہیں اور اپنا گوشت اندر سے گیلا گیلا لگ رہا ہے۔ مجھے تو شبہ ہوتا ہے کہ آہاب کی فرمانبرداری کر کے میں اپنے خدا کی نافرمانی کر رہا ہوں!"

"مجھے اوپر چڑھاؤ!" آہاب نے اپنی ٹوکری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اب اس سے بڑی جلدی ملاقات ہو گی۔"

"جی ہاں، حضور۔" اسٹاربک نے فوراً آہاب کا حکم بجا لایا اور آہاب اوپر پہنچ گیا۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن معلوم ایسا ہو رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں، کچھ ایسا تعطل تھا کہ وقت نے بھی اپنا سانس روک لیا تھا لیکن آخر کار کچھ دور کے فاصلے پر آہاب کو فوارہ پھر دکھائی دیا، تینوں مچانوں سے ایک ساتھ نعرے بلند ہوئے جیسے شعلوں کی زبانیں پکار اٹھی ہوں۔

"موبی ڈک! اب تجھ سے تیسری بار دُو بدُو مقابلہ ہونے والا ہے! عرشے والو! ——— بادبان چڑھاؤ، جہاز کو لے جا کر ہوا سے لگاؤ، مسٹر اسٹاربک! ابھی وہیل اتنی دور ہے کہ کشتیاں نہیں اتاری جا سکتیں، بادبان پل رہے ہیں، سکان چلانے والے کے سر پر موگری لے کے کھڑے ہو جاؤ! ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب یہ تیز چل رہا ہے، مجھے اترنا چاہیے۔ لیکن سمندر کو ایک نظر اور دیکھ لوں، ابھی تو وقت ہے، یہ منظر بڑا پرانا ہے، لیکن نہ معلوم کس طرح نیا نیا سا بھی ہے، میں

رہا ہوں۔ ذرا چاول تو دیکھ —— دھڑک رہا ہے یا نہیں؟ —— استاد بک، جوش میں آ —— اپنے آپ کو سنبھال
—— تھوڑا سا تامل از درست ہاں! —— بھیاں والا! چادروں پر میرے بیٹے کا ہاتھ تو نظر نہیں آ رہا؟ کیا پاگل پن کی بات ہے
—— بھیاں والا! —— کشتیوں کو نظر میں رکھنا —— وہیل کو دیکھتے رہنا! —— ارے رسو! —— اس عقاب کو اڑاؤ!
ذرا دیکھو تو! تھوتھنی مار رہا ہے —— جھنڈے کو پھاڑے ڈال رہا ہے!" —— اس نے بڑے مستول پر اڑتے ہوئے لال جھنڈے
کی طرف اشارہ کیا —— "آہ! وہ جھنڈا اتار کے اڑا —— بڈھا کہاں ہے؟ او بے! تو نے یہ تماشا دیکھا —— کانپ
اٹھ، کانپ اٹھ!"

کشتیاں زیادہ دور نہیں گئی تھیں کہ بھیاں والے نے داہنے بازو پھیلا کے اشارہ کیا، اب سمجھ گیا کہ وہیل پانی میں بیٹھ گئی لیکن
وہ چونکا تھا کہ وہیل اگلی دفعہ ابھرے تو ہمیں قریب رہیں۔ چنانچہ وہ جہاز سے ذرا ہٹ کر چپ چاپ رہا۔ کشتی کے ملاح ایسے خاموش تھے
جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اور سامنے کی طرف سے لہریں آ آ کر کنارے پر جھنڈوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔

"ارے او رجستی کہیں جا رہا ہو تو کھو! او ب! ایسی طرح ٹھوکو، تم ایک ایسی چیز میں کیل ٹھونک رہے ہو جس میں ڈھکنا ہے
ہی نہیں۔ مجھے زندگی بات بیشتر ہوگا نہ جانے کی گاڑی —— میں تو صرف توپ کے ذریعے ہلاک ہو سکتا ہوں! ہا! ہا!"

اچانک ان کے چاروں طرف پانی اٹھ آیا اور بڑے بڑے دائرے بننے لگے۔ پھر سمندر ایک دم سے اوپر کو اٹھا جیسے
کوئی برف کا پہاڑ نیچے سے ابھر کے آ رہا ہو۔ اور اس کے چاروں طرف پانی پھیلا، پھر اب پانی کے اندر سے ایک بجلی سی گڑگڑاہٹ
کی آواز آئی۔ سب لوگ سانس کھینچ کے بیٹھ گئے۔ اب سمندر میں سے ایک بہت بڑا نیلا تڑپتا جھلکا جس میں برچھے اور نیزے
گڑے ہوئے تھے اور رسیوں کے پھندے کے گچھے ساتھ کھنچتے چلے آ رہے تھے۔ یہ نیلا دھند کے پردے میں چھپا ہوا تھوڑی دیر تو
قوس قزح کی طرح جھلکتا ہوا فضا میں منڈلاتا رہا، اور پھر سمندر میں گر پڑا۔ اس چوٹ سے پانی کوئی تیس فٹ اوپر اچھلا اور
ہوا میں فوارے سے اڑتے نظر آئے۔ پھر یہ فوارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھاگ کی بوچھاڑ کی طرح نیچے گر پڑے، اور وہیل کے سنگ مرمر
جیسے جسم کے چاروں طرف جھاگ کھاتی ہوئی سطح تازہ دودھ جیسی ہو کے رہ گئی۔

"بڑھو! آ!" اہاب نے پتوار چلانے والوں سے کہا اور کشتیاں حملہ کرنے کے لیے لپکیں، لیکن وہیل کے جسم میں گڑے ہوئے
برچھے اسے بڑی تکلیف دے رہے تھے۔ یوں لگتا ہے اس وقت بالکل پاگل ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے بھوت
اس کے سر پر سوار ہیں۔ وہ ایک کمان کے بیچ اس کی چوڑی اور سفید پیشانی پر پھیلا ہوا رسوں کا جال ایک جگہ جمع ہو کر گتھ گیا
تھا۔ وہ سیدھی کشتیوں کے بیچ میں پہنچی اور پانی کو دم سے جو تنے لگی جہاں تک کہ ان کشتیوں کو مار کے ایک دوسرے سے
الگ کر دیا۔ اس نے میٹوں کی کشتیوں میں ایسی ٹکر دی کہ برچھے پانی میں گر پڑے لیکن اہاب کی کشتی کا بال تک بیکا نہ ہوا۔
ڈیگو اور کوئی گرینگ تڑپتے ہوئے تختوں کو ٹھیک کرنے لگے۔ وہیل ان میں سے نکل کر ان کے پاس سے
گزری تو اس کو ایک پورا پہلو نظر آیا۔ اتنے میں ایک بڑے زور کا نعرہ بلند ہوا۔ کل رات وہیل کا اس طرح دول ہی تھی کہ دیا
بار بار اس کے بدن کے گرد بندھی ہوئی تھیں، انھی گل جیسوں میں پارسی کی کٹی پھٹی لاش جکڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے

سیاہ کپڑوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور بجھی بجھی آنکھیں سیدھی بڑے اہاب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
اہاب کے ہاتھ سے برچھا گر پڑا۔
"میں اڑ رہ گیا، اڑ ہی گیا!" —— وہ ایک لمبا سانس کھینچ کے بولا —— "ہاں، پارسی! میں نے تجھے پھر دیکھ لیا۔ ہاں، اور تو مجھ سے پہلے بھی گیا ہے، اور یہ وہ جنازے کی گاڑی ہے جس کی تو نے پیشین گوئی کی تھی لیکن میں تو تیری ایک ایک بات کی تصدیق چاہتا ہوں جنازے کی دوسری گاڑی کہاں ہے؟ اچھا تم دونوں میٹ جہاز پر جاؤ، یہ کشتیاں تو بیکار ہو چکی ہیں۔ اگر جلدی مرمت ہو سکے تو کرو اور پھر میں واپس آجاؤ اگر نہ آسکو تو کوئی بات نہیں۔ مرنے کے لیے اہاب کافی ہے —— جاؤ، میٹ جاؤ! میں جس کشتی میں کھڑا ہوں اگر اس میں سے کسی نے کودنے کا ارادہ کیا تو میں برچھا بھونک دوں گا۔ تم دوسرے آدمی نہیں ہو بلکہ میرے بازو اور ٹانگیں ہو۔ اس لیے میرا حکم مانو —— وہیل کہاں ہے؟ پھر نیچے چلی گئی؟"

لیکن اہاب کشتی کے بہت قریب دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ موبی ڈک تو پھر آگے کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی گویا وہ لاش کو اٹھائے بھاگ جانا چاہتی ہو، اور جس جگہ آخری حملہ ہوا تھا اسے اپنے سفر کی بس ایک منزل سمجھتی ہو وہ تو جہاز کے پاس سے بھی گزر چکی تھی جو اب تک مخالف سمت میں چلتا رہا تھا لیکن فی الحال ٹھہر گیا تھا۔ وہیل پوری طاقت اور رفتار سے تیر رہی تھی اور اسے بس آگے بڑھنے کی دھن سوار تھی۔

"آہ! اہاب!" اسٹاربک نے کہا۔ "حالانکہ آج تیسرا دن ہے، لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ اب بھی باز آ۔ ذرا دیکھ! موبی ڈک تیرا پیچھا نہیں کر رہی۔ تو اپنے پاگل پن میں آ کے اس کا پیچھا کر رہا ہے؟"

ہوا تیز چلنے لگی تھی چنانچہ بادبان ہوا کے رخ پر کر دیے گئے اور چپو اور بھی چلنے لگے۔ غرض کشتی ہوا کی مخالف سمت میں روانہ ہو گئی۔ جب اہاب جہاز کے اتنے قریب آ گیا کہ اسٹاربک کو پہچان سکے تو پکار کے حکم دیا کہ جہاز کا رخ پھیرو اور کچھ فاصلے سے میرے پیچھے پیچھے آؤ لیکن زیادہ تیز نہیں۔ اہاب نے اوپر کی طرف دیکھا تو تاشتیگو، کوئیکویگ اور ڈیگو بڑی بے تابی سے مچانوں پر چڑھتے نظر آئے۔ دونوں ٹوٹی ہوئی کشتیاں اوپر کھینچ لی گئی تھیں اور چپو چلانے والے ان میں بیٹھے تختوں کی مرمت کر رہے تھے۔ جہاز کے پاس سے گزرتے ہوئے اہاب نے یکے بعد دیگرے سوراخوں میں سے دیکھا کہ اسٹب اور فلاسک ٹوٹنے برچھیوں اور برچھوں کے گچھے کھول رہے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سے ہتھوڑوں کی آواز آ رہی تھی لیکن اس کے دل میں کچھ اور ہی ہتھوڑے چل رہے تھے مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اب اس نے دیکھا کہ مستول پر سے جھنڈا غائب ہے تو اس نے تاشتیگو کو پکار کے کہا کہ مچان سے اتر آؤ اور دوسرا جھنڈا لا کر ہتھوڑے سے مستول پر ٹھونک دو۔

شاید تین دن کے تعاقب سے وہیل تھک چکی تھی پھر بدن پر لپٹی ہوئی رسیوں کی وجہ سے بھی تیرنے میں دقت ہو رہی تھی یا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی دھن کے بازی اور کینہ پروری دکھائی ہو۔ بہرحال سفید وہیل کی رفتار کم ہو گئی اور کشتی ایک مرتبہ پھر قریب آنے لگی۔ حالانکہ اس دفعہ وہیل کو اتنی چھوٹ نہیں ملی تھی کہ کوئی تو بے رحم شارک مچھلیاں اب بھی اہاب کے ساتھ ساتھ تھیں اور کشتی کے پاس سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ انہوں نے چپوؤں کو اتنا کاٹا تھا کہ ان میں دانتے نکل

آتے تھے اور کرچیں بھرنے لگی تھیں۔

"ان کی پرواہ مت کرو! مچھلیوں کے دانتوں سے تو تمہاری پتواروں کو چلنے میں اور بھی آسانی ہوتی ہے۔ کھینچتے رہو! مچھلیوں کے جبڑے پر پتوار لگا کے چلاؤ۔ یہ بہت اچھا ہے۔ اس کے مقابلے میں پانی تو پلپلا ہے۔"

"لیکن حضور! مچھلیوں کے کاٹنے سے ہماری پتواریں چھوٹی ہوتی جا رہی ہیں!"

"خیر! ابھی تو بہت کام دیں گی! کھینچتے جاؤ! لیکن خدا جانے یہ مچھلیاں وہیل کو اپنا لقمہ بنانے کے لیے جا رہی ہیں یا اہاب کو ——— مگر کھینچے جاؤ! او ہم وہیل کے قریب آ گئے۔ سکان سنبھالو۔ مجھے آگے جانے دو۔" اس نے یہ کہا ہی تھا کہ دو آدمیوں نے سہارا دے کر اسے کنارے میں پہنچا دیا۔

آخر کار کشتی سفید وہیل کے پہلو میں پہنچ گئی لیکن وہیل کشتی کی موجودگی سے بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھی۔ اہاب بالکل اس دھوئیں کے حلقے میں آ گیا تھا جو وہیل کے فوارے سے نکل کر کوہان کے گرد پھیلا ہوا تھا چنانچہ اس نے اس کی طرح پیچھے کو جھک کر اور اپنا آخری نشانہ لگانے کے لیے دونوں بازو اوپر اٹھا کے اپنا خوفناک برچھا اور اس سے بھی خوفناک گالی سفید وہیل کے اندر اتار دی۔ برچھا اور گالی دونوں وہیل کے اندر اس طرح بیٹھ گئے جیسے دلدل میں اتر گئے ہوں۔ موبی ڈک چونک کر تڑپی اور پھر اپنے پہلو سے کشتی میں ایسا دھکا مارا کہ کشتی میں سوراخ تو نہیں ہوا لیکن وہ ایک دم سے ٹیڑھی ہو گئی۔ اگر اہاب دیوار کا سہارا نہ پکڑ لیتا تو ایک مرتبہ پھر سمندر میں جا پڑتا۔ ملاحوں کو معلوم نہ تھا کہ اہاب نے برچھا چلا دیا ہے چنانچہ وہ اس کے نتائج کے لیے تیار نہ تھے۔ اتفاق سے تین آدمی پانی میں گر پڑے لیکن دو آدمیوں نے فوراً کشتی کی دیوار پکڑ لی اور ایک موج کے ساتھ اٹھ کر پھر کشتی میں آ گرے۔ تیسرا آدمی گرتے ہی بے بس ہو گیا تھا لیکن اب وہ بھی تیر رہا تھا۔

سفید وہیل بھی ساتھ ہی ساتھ ایک زبردست قوت ارادی اور پوری شدت کے ساتھ چکر کھاتے ہوئے پانی میں دوڑ پڑی۔ اہاب نے پتوار چلانے والوں کو حکم دیا کہ ڈور کو ذرا ڈھیل دیں اور ضبط سے تھامے رہیں۔ اور باقی لوگوں سے کہا کہ اپنی جگہوں پر گھوم جائیں اور کشتی کو وہیل کی طرف لے چلیں۔ لیکن رسّے میں بے دریغ جھٹکے پر زور پڑا تو وہ کٹ سے ٹوٹ گئی!

"میرے اندر کیا چیز ٹوٹی؟ کوئی رگ پھٹ گئی! ——— خیر! پھر ٹھیک ہو گئی۔ پتوار چلاؤ! پتوار چلاؤ! چڑھ دوڑو!"

پانی میں کشتی کا زبردست شور سن کر وہیل گھوم گئی اور اپنا زبردست ماتھا سامنے کر دیا۔ لیکن چکر کھاتے وقت اسے جہاز کا سیاہ ڈھانچا قریب آتا دکھائی دیا۔ شاید وہ سمجھی کہ میرے اوپر جو مصیبتیں پڑی ہیں ان کا اصل بانی یہی ہے یا ممکن ہے کہ اسے کوئی اور بھی زبردست دشمن خیال کیا ہو۔ بہر حال وہ سیدھی جہاز کی طرف لپکی اور جھاگ کی بوچھاڑ میں جبڑے مارنے لگی۔

اہاب لڑکھڑا گیا اور ماتھا پیٹنے لگا: "میں تو اندھا ہو گیا! ہاتھ آگے بڑھاؤ تاکہ میں ٹٹول کے اپنا راستہ تلاش کر سکوں۔ کیا رات ہو گئی ہے؟"

"وہیل! جہاز!" پتوار چلانے والے ڈر کے مارے چیخنے لگے۔

"پتوار چلاؤ! پتوار چلاؤ! اے سمندر، تو ابھی گر! اور ابھی کہ پھٹ جا، اور اہاب کو آخری دفعہ اپنے شکار تک

پہنچ جانے دے، ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے! ارے ۔ اب یہ نظر آیا جہاز! جہاز! جلدی چل جہاز! او میرے جہاز کہیں بچھڑ جاؤ گے؟"

ابھی دونوں طرف سے ہتھوڑے چلا رہی تھیں لیکن تیر چلانے والے اپنی کشتی کو زبردستی گھسیٹ لے چلے۔ وہ تختوں پر پہلے ہی ویل کا دھکا پڑ چکا تھا۔ اب وہ پانی کے زور سے پھٹ گئے۔ کشتی کی حالت بے کار ہو کے رہ گئی اور لہروں کی سطح کے برابر آ گئی۔ ملاح آدھے تو چل رہے تھے اور آدھے تیر رہے تھے۔ بہرحال وہ سوراخوں کو بند کرنے اور پانی باہر نکالنے کی جان توڑ کوشش کرنے لگے۔

ادھر ناش ٹیگو مستول کے اوپر جھنڈا گاڑ رہا تھا۔ یہ تماشہ دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ہتھوڑا اس کے ہاتھ میں رکا رہ گیا۔ لال جھنڈے نے پہلے تو اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر کھل کے اڑنے لگا ــــ جیسے خود ناش ٹیگو کا دل۔ اسٹاربک اور اسٹب نیچے کنارے پر کھڑے تھے۔ اسی وقت ان کی نظریں سامنے کی طرف سے آتے ہوئے عفریت پر پڑیں۔

"ویل، ویل! سکان اٹھاؤ، سکان اٹھاؤ! اے خدا کے بندو آ، مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ اگر اسٹاربک کو مرنا ہی ہے تو عورتوں کی طرح غش کھا کے نہ مرنے دو۔ سکان اٹھاؤ ــــ ارے بے وقوفو، وہ جبڑا دیکھو! جبڑا آ گیا! میری التجاؤں کا یہی انجام ہے؟ میری عمر بھر کی وفاداری کا یہی انعام ہے؟ آہاب، او آہاب، اے آہاب! دیکھو! سکان والے! ذرا سنبھل کے۔ نہیں! سکان پھر اٹھاؤ، ویل گھوم کے ہماری طرف آ رہی ہے۔ یہ خوفناک عفریت اس تختے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے جیسے اس کا فرض اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا۔ میرے خدا! اس وقت میری مدد کر!"

"تو میری مدد کرنا چاہتا ہے کوئی بھی سہی، میرے پاس نہ کھڑا ہو بلکہ میرے پیروں کے نیچے کھڑا ہو کیونکہ اسٹب بھی یہیں کھڑا رہے گا۔ ویل تو میرا مذاق اڑاتی ہے تو میں تیرا مذاق اڑاتا ہوں! اسٹب کی مدد کس نے کی؟ اسٹب کو بیدار کس نے رکھا؟ اسٹب کی کبھی بند نہ ہونے والی آنکھوں نے اور کس نے؟ اب بیچارہ اسٹب ایک ایسے گدے پر سونے جا رہا ہے جو بہت زیادہ نرم ہے۔ کاش کہ اس میں لکڑیاں ہی بھری ہوتیں! ویل، تو میرا مذاق اڑاتی ہے تو میں بھی مذاق اڑاتا ہوں۔ اے سورج، اے چاند، اے ستارو، ادھر دیکھو، ایسا نہیں آدمی تو کبھی پیدا نہ ہوا ہوگا جسے تم قتل کر رہے ہو۔ مگر اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ مل کے دو چار جام چڑھانے کو تیار ہوں، لے آؤ پیالہ! اوہو! اوہو! یہ ویل تو بہت جسیم ہے، پھر ابھی تو خوب دعوت اڑے گی! آہاب، تو بھاگ کیوں نہیں رہا؟ میں تو اپنے جوتے اور کوٹ اتارے دیتا ہوں۔ اسٹب تو اپنا جانگیہ پہنے مرے گا! بڑی نمکین اور چھچھوری موت ہوگی ــــ رس بھری لاؤ! رس بھری، رس بھری! خلاصہ، مرنے سے پہلے ایک رس بھری تو کھا لیں!"

"رس بھری! میری آرزو یہ ہے کہ ہم وہاں ہوتے جہاں رس بھری اگتی ہے، اسٹب۔ خدا کرے میری بیچاری ماں نے میری تنخواہ کا کچھ حصہ وصول کر لیا ہو، ورنہ اسے تو اب ایک کوڑی نہیں ملے گی کیونکہ سفر تو ختم ہو چکا۔"

تقریباً سارے جہازی جہاز کے کنارے پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ وہ مختلف کام چھوڑ کے بھاگ آئے تھے چنانچہ

ان کے ہاتھ میں ہتھوڑے، تختے، نیزے اور برچھے لٹک رہے تھے۔ سب کی نظریں وہیل کے اوپر گڑی ہوئی تھیں جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اور وہیل اپنا جلالت خیز سر ادھر سے ادھر ہلا کے پھن گرد جھاگ کی ایک قوس پھیلاتی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اس کی شکل سے اتنی کینہ پروری اور انتقام ٹپک رہا تھا، وہ کسی فانی انسان کے بس میں آنے والی نہ تھی۔ آخر اس کے ماتھے کا پہاڑ جہاز سے ٹکرا ہی گیا اور جہاز کی آر جاری۔ جہاز ایک ایک تختے کو گھن لگی جیسی زنگ کھاتے بل گر پڑے، چٹان پر برچھے بازوں کے سر پل کی سی گردن پھٹنے لگے جیسے لکڑی کے کندے۔ سمندر میں جو شگاف ہو گیا تھا اس میں پانی اس طرح گرنے لگا جیسے پہاڑی چشمے خندق میں گرتے ہیں۔

"جہاز! جہاز سے کی گاڑی! —— یہ دوسری گاڑی ہے!" اہاب اپنی کشتی میں سے چلایا۔ "اس کی لکڑی بس امریکہ کی ہی ہو سکتی ہے۔"

وہیل ٹھہرے ہوئے جہاز کے نیچے غوطہ لگا گئی اور تھرتھراتی ہوئی پورے سینے سے کھلے کر گئی۔ اس کے بعد وہ پانی کے اندر ہی اندر دوسری طرف باہر نکل آئی۔ اہاب کی کشتی چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

"میں اپنا جسم سورج کی روشنی میں سے ہٹائے لیتا ہوں۔ اوے! رہ نشان دیکھو! مجھے اپنے ہتھوڑے کی آواز تو سنا۔ آہ! میری تینوں مینار بھی ابھی تک فتح نہیں ہو سکیں، جھنڈا ابھی تک نہیں چھپا، عرشہ جو تختہ اور پائیدار نکلا سکان جو ابھی تک تنا کھڑا ہے، پیشانی جس کا رُخ قطب شمالی کی طرف ہے، جہاز جیسے بس خدا ہی زیر کر سکتا ہے —— وہ جہاز جس کی شان مرتے وقت بھی باقی ہے! کیا تو تباہ ہو جائے گا۔ اور میرے بغیر؟ معمولی سے معمولی کپتان بھی اس بات پر فخر کرتا ہے کہ جب جہاز ڈوبا تو میں اس کے اندر موجود تھا۔ کیا میں اس فخر سے بھی محروم رہ جاؤں گا؟ زندگی بھی تنہائی میں گزری اور تنہائی میں ہی مروں گا! آہ، اب مجھے پتا چلا کہ میری سب سے زیادہ عظمت میرے سب سے بڑے غم کے اندر پنہاں ہے۔ جو چیز مجھے اپنی عمر میں جتنی بھی لہروں سے واسطہ پڑا ہے، سب چلی آؤ، دور دور سے آؤ، اور موت کی جو لہر مجھے ڈبونے والی ہے اس کی مدد کرو! اے وہیل، تو نے سب کو تباہ کیا ہے، لیکن تو فتح نہیں پا سکتی۔ میں تیری طرف آ رہا ہوں، میں آخر تک تجھ سے دست و گریباں رہوں گا۔ میں جہنم کے اندر سے بھی تیرے اوپر برچھا پھینکوں گا۔ مجھے تجھ سے اتنی نفرت ہے کہ مرتے مرتے بھی تیرے اوپر تھوک رہا ہوں۔ سارے تابوتوں اور جنازے کی گاڑیوں کو جہاں چاہے لے جا کے ڈبو دے! کیونکہ یہ دونوں میرے مقدر میں نہیں۔ میں تیرے ساتھ بندھا ہوا بھی ہوں اور تیرا پیچھا بھی کر رہا ہوں۔ اے منحوس وہیل! میں تیرے ٹکڑے اڑا دوں گا۔ لے دیکھ، میں برچھا چلاتا ہوں!"

اس نے برچھا چلا دیا۔ وہیل زخمی ہو کے آگے کو اچھلی۔ ڈور اتنی تیزی سے گھر گھر کھلنے لگی کہ چرخی پر سے الجھ نکل آئیں —— لیکن ڈور انگوٹھے میں سے نکل گئی۔ اہاب اس سے بچنے کے لیے جھکا اور بچ بھی گیا لیکن ڈور نے جھٹکا کھایا تو اہاب کی گردن پکڑ میں آ گئی جیسے مشرقی ملکوں میں گونگے غلام کسی کو کمند سے پھانسی دیتے ہیں۔ ملاحوں کو پتا بھی نہ چلا کہ ہو کیا گیا ہے۔ اور اہاب کشتی سے باہر جا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ ڈور کا بھاری پھندا خالی ناند میں سے نکلا اور ایک ملاح کو گراتا ہوا سمندر

کی نظروں میں غائب ہو گیا۔

ملاح بھرے ہوئے کشتی کے ملاح کھڑے کے کھڑے رہ گئے جیسے تھکے ہی آگئے ہوں، پھر ڈوب گئے ہوئے ۔۔۔ جہاز اُلٹ گیا! جہاز کہاں ہے؟ تھوڑی دیر بعد سر جھکا دینے والی چاپ اور دھند میں سے ایفیں جہاز غائب ہوتا نظر آیا۔ صرف مستولوں کا اوپر والا حصہ پانی میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔ جنگی بیڑے بازیاف محو ہو کے رہ گئے تھے۔ یا پھر یہ ان کی وفاداری کی انتہائی صداقت کا عمل۔ بہرحال وہ اپنی جگہوں پر اسی طرح پیر اڑائے رہے تھے۔ اب جہاز کے پاس سے چلنے والے بڑے بڑے دائروں نے اس بچی کھچی کشتی کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کشتی کے ملاح، سمندر میں تیرتی ہوئی ہر پتوار، ہر برچھا، ہر جاندار اور بے جان چیز ایک بھنور میں گول گول گھومنے لگی۔ اور آخر پیکوڈ کا ایک ایک ٹکڑا نظروں سے غائب ہو گیا۔

جب یہ سمندر کی آبشاریں ایک دوسرے میں گھل مل کر بڑے مستول پر چڑھے ہوئے ریڈ انڈین کے ڈوبتے ہوئے سر کے اوپر گر رہی تھیں تو مستول کا بس دو چار انچ کا ٹکڑا پانی سے باہر دکھائی دے رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ وہ لال جھنڈا بھی ایک عجیب طنز اور سکون کے ساتھ ان ہلاکت خیز موجوں کے اوپر لہرا رہا تھا ۔۔۔ اتنے میں ایک سرخ سرخ بازو اور ہتھوڑا ہوا میں ابھرا اور جھنڈے کو ڈوبتے ہوئے مستول پر جلدی جلدی گاڑنے لگا۔ جب مستول نیچے جا رہا تھا تو ایک عقاب ستاروں کے درمیان اپنے گھر سے اُتر کے جھنڈے پر ایک عجیب تکنیک کے ساتھ ٹھونگیں مارنے لگا تھا اور ٹاشٹیگو کو کام نہ کرنے دے رہا تھا۔ اتفاق سے عقاب کا پھڑپھڑاتا ہوا پر ہتھوڑے اور مستول کے بیچ میں آگیا۔ پانی میں ڈوبتے جنگلی نے ایک عجیب تھرتھری سی محسوس کی اور اپنی آخری ہچکی کے ساتھ ہتھوڑا وہیں کا وہیں روک لیا۔ چنانچہ یہ آسمانی پرندہ فرشتوں کی طرح چیختا ہوا اپنی شاہانہ چونچ آگے کو جھکائے، اہاب کے جھنڈے میں لپٹا ہوا اس کے جہاز کے ساتھ ساتھ پانی کی تہوں میں چلا گیا ۔۔۔ اس جہاز کے ساتھ جو شیطان کی طرح اس وقت تک جہنم میں نہیں گیا جب تک کہ آسمان کا ایک ٹکڑا اپنے ساتھ نہ لے لیا اور اسے اپنی کلغی میں نہ لگا لیا۔

پانی میں ایک غار سا بن گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں چیختی ہوئی اس کے اوپر منڈلانے لگیں اور ایک بے جان سفید موج اس کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرانے لگی۔ پھر یہ دیواریں گر پڑیں اور سمندر ایک زبردست سفید کفن کی طرح بہنے لگا جیسے پانچ ہزار سال پہلے بھی بہہ رہا تھا۔

حرفِ آخر

"اور یہ کہانی سنانے کے لیے بس میں زندہ بچا ہوں"

ناٹک ختم ہو گیا، پھر آگے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ —— اس لیے کہ ایک آدمی اس تباہی سے بچ نکلا۔ اسے قسمت کی خوبی سمجھیے کہ جب پارسی غائب ہو گیا تو اہاب کی کشتی میں پتوار چلانے والے نے اس کی جگہ سنبھالی اور میں پتوار چلانے والے کی جگہ آ گیا۔ پھر جب آخری دن ڈگمگاتی ہوئی کشتی میں سے تین آدمی اچھلے تو میں پیچھے کی طرف گرا۔ میں لکڑی کی طرح پانی میں تیرتا رہا۔ یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ جہاز کے ڈوبنے سے جو بھنور پیدا ہوا تھا جب وہ میرے قریب آیا تو اس کی طاقت کم ہو چکی تھی۔ بلکہ میں بند ہوتے ہوئے گرداب کی طرف آہستہ آہستہ کھنچنے لگا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو بھنور بس ایک سفید تالاب سا رہ گیا۔ ایک دائرہ گول گول چکر لگا رہا تھا اور اس کے بیچ میں ایک سوئی کی طرح کا سیاہ بلبلا تھا۔ میں اس نقطے کی طرف بڑھنے لگا اور خود بھی گول گول گھومنے لگا۔ میں اس کے قریب آیا ہی تھا کہ بلبلا اوپر کو پھٹ گیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ پانی میں سے وہ تابوت کا جان بچانے والا پیپا پورے زور سے ابھرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک تو یہ خود بھی ہلکا تھا، دوسرے جلدی چھوٹا تو اسپرنگ کے زور سے یہ آزاد ہو گیا اور اوپر آ کے میرے قریب تیرنے لگا۔ اس پیپے کے سہارے میں پورے ایک دن اور ایک رات اس ملائم اور ماتمی سمندر کے اوپر تیرتا رہا۔ شارک مچھلیاں میرے پاس سے یوں گزر جاتیں جیسے ان کے منہ میں تالا پڑا ہو اور وحشی عقاب اس طرح اڑتے چلے جاتے جیسے چونچ پر غلاف چڑھا ہو۔ دوسرے دن مجھے ایک بادبان نظر آیا جو قریب آتا چلا گیا اور آخر اس جہاز نے مجھے پانی میں سے نکال لیا۔ یہ وہی ریچل جہاز تھا جو اپنے کھوئے ہوئے بچوں کی تلاش میں ناک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا اور آخر میں اسے ملا بھی کیا؟ ایک اور یتیم۔

قسطنطنیہ

تصنیف : ایرلڈیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

اس کتاب میں قسطنطنیہ کے تاریخی شہر کی دل آویز تصویر کشی کے علاوہ زوال روم سے عہد جسٹینین تک کی تاریخ بھی ہے۔ لیکن آدھی سے بھی زیادہ کتاب اسلامی عہد کے متعلق ہے جسے فاضل مترجم نے خود لکھ کر اس میں شامل کیا ہے۔

صفحات : ۲۵۶ قیمت : ۸ روپے

فتح قسطنطنیہ

تصنیف : برنڈین کیلی
ترجمہ : رئیس احمد جعفری

صفحات : ۲۷۲ قیمت : ۵ روپے

جنگ — میکیاولی سے ہٹلر تک

تصنیف : ایڈورڈ میڈ ارل
ترجمہ : بریگیڈیر گلزار احمد

شاید ہی کوئی دوسری کتاب جدید جنگی مسائل پر ایسی زور رس اور سیر حاصل بحث کرتی ہو جیسی اس کتاب میں جنگی داؤ پیچ کے بیس عظیم ترین ماہروں اور مؤرخوں نے پیش کی ہے۔ جنگ کے بیشتر شعبوں —— نقل و حمل، محاذ و دفاع، اقتصادیات، سیاست، بری، بحری و ہوائی جنگ کی ہمہ گیر تصویر۔ صفحات : ۴۷۲ قیمت : ۹ روپے

ایران قدیم

تصنیف : اے۔ ٹی۔ اومسٹیڈ
ترجمہ : سید عابد علی عابد

اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ قدیم ایرانیوں کے مذہب، علوم و فنون، زبان، ادب، صنعیات وغیرہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے پیدا ہوئے۔

صفحات : ۴۶۷ قیمت : ۵ روپے

غازیان تہذیب

تصنیف : جوزف کولز
ترجمہ : مولانا سید ہاشمی فریدآبادی

ان لوگوں کے حالات جنھوں نے انسانی تہذیب کو ترقی دی۔

صفحات : ۶۸۰ قیمت : ۵ روپے

آزادی کے جنم دن

تصنیف : جین ویو وسٹر
ترجمہ : مولانا عبدالمجید سالک
مولانا غلام رسول مہر

اس کتاب میں تاریخ کے ان بڑے اہم ایام کی باتصویر کہانی پیش کی گئی ہے جب انسان نے بہیت جہالت اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے انگریزی کتاب کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے اسلام اور پاکستان کے متعلق مفید اضافے بھی کیے ہیں اور اس کو ابتدا سے یوم آزادی تک پہنچا دیا ہے۔ نیز مولانا غلام رسول مہر نے مفید حواشی لکھ کر کتاب کے مطالب سمجھنے میں مزید آسانی بہم پہنچائی ہے۔

صفحات : ۶۸۰ قیمت : ۴ روپے

ایڈیسن

تصنیف : ہنری ٹامس
ترجمہ : محمود سعید

دنیا کے سب سے بڑے موجد ٹامس ایلوا ایڈیسن کی زندگی اور اس کی ایجادات کے دلچسپ اور سبق آموز حالات۔

صفحات : ۱۸۸ قیمت : ۳/۵۰ روپے

چند عظیم علمائے جراثیم

تصنیف : ڈاکٹر پال ڈی کرائف
ترجمہ : پروفیسر عبدالمجید قریشی

ان شہرۂ آفاق سائنس دانوں کے سوانح جنھوں نے جراثیم کے متعلق تحقیق کر کے اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنا لیا۔

صفحات : ۲۴۰ قیمت : ۱۰ روپے

سو بڑے آدمی (جلد چہارم)

تصنیف : ولیم اے ڈیوٹ
ترجمہ و تلخیص : مولانا عبدالمجید سالک

ابتدائے تہذیب سے دورِ حاضر تک کی سو عظیم شخصیتوں کے مختصر سوانحی مرقعے جو بڑوں اور بچوں کے لیے

[illegible] مطبوعات فرینکلن ، پوسٹ بکس ۷۹۶ ، لاہور

یکساں دلچسپ ہیں۔

صفحات : ۱۰۴ قیمت : ۲ روپے

عظیم علمائے نفسیات ○ تصنیف : ایس بیٹرفیلڈ سارجنٹ
ترجمہ : پروفیسر عبدالحمید قریشی

مغرب کے مشہور ماہرین نفسیات کے نظریات، انکشافات اور تجربات پر سیر حاصل بحث

صفحات : ۶۰۰ قیمت : ۱۲ روپے

غریب لڑکے جو نامور ہوگئے (جلد دوم) ○ تصنیف : سارہ کے۔ بولٹن
ترجمہ : شاہد محمود ہاشمی

مشرق و مغرب کی ان عظیم شخصیتوں کے حالات زندگی جنھوں نے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرکے اپنا ماحول خود پیدا کیا اور انسانیت کو فیض پہنچایا۔ اصل کتاب میں پندرہ مشرقی مشاہیر کے سوانح کا اضافہ کیا گیا ہے۔

صفحات : ۲۵۶ قیمت : ۶ روپے

لڑکیاں جو نامور ہوئیں (جلد دوم) ○ تالیف : سارہ کے۔ بولٹن
ترجمہ : اختر عزیز احمد

دنیا کی ان مشہور خواتین کے سوانح جنھوں نے تعلیم، تیمارداری، فنون لطیفہ، ہوابازی، مصوری، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نام پیدا کیا۔ اس کتاب کے لیے دس مشرقی نامور خواتین کے سوانح خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں۔

صفحات : ۲۲۰ قیمت : ۵ روپے

بابر : (شیر ببر) ○ تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : سید ہاشمی فرید آبادی

مشہور مصنف ہیرلڈ لیم تاریخ کو افسانوی انداز میں پیش کرتا ہے لیکن اس کی صداقت میں فرق نہیں آنے دیتا۔ بابر کی اس مستند سوانح عمری میں بھی ناول کی سی دلفریبی ہے۔

صفحات : ۶۰۴ قیمت : ۸ روپے

چنگیز خاں

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : عزیز احمد

شہرۂ آفاق فاتح کے حالات زندگی جس نے جہاں سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی وہاں ایک پائیدار تہذیب کی بنیاد بھی رکھی تھی سے بے حد دلچسپ اور سبق آموز داستان۔

صفحات : ۳۴۴ — قیمت : ۶ روپے

سلطان صلاح الدین ایوبی (جلد دوم)

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : یوسف عباسی

اسلام کے جلیل سلطان صلاح الدین ایوبی کے جاہدانہ کارناموں، درویشانہ زندگی اور بارھویں صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی آویزشوں کا جامع اور ولولہ انگیز مرقع۔

صفحات : ۴۸۰ — قیمت : ۱۲/۵۰ روپے

سکندر اعظم

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

سکندر اعظم کو دنیا جابر اور فاتح کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس کتاب میں اس کے کردار کے بشری پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات : ۳۲۴ — قیمت : ۱۰/۵۰ روپے

سلیمان عالیشان (جلد دوم)

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

سلیمان عالیشان ـــــ حقیقی معنوں میں ایک عالی شان سلطان اور قابل جرنیل تھا، وہ میدان جنگ میں کیا تھا اور حرم کی دیواروں کے پیچھے کیا؟ اس کا جواب اس تصنیف میں ملتا ہے۔

صفحات : ۵۲۰ — قیمت : ۹/۵۰ روپے

عمر خیام

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : جمیل نقوی

سحر انگیز رباعیات کے خالق کے حالات زندگی افسانوی اسلوب میں خیام کی ہمہ گیر شخصیت

اور اس کے عہد کے تمدن کا دلآویز مرقع

صفحات : ۵۱۴ قیمت : ۱۰ روپے

نور محل (جلد دوم)

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : شبلی ایم۔ کام
حکیم حبیب اشعر

وہ حسین و جمیل ایرانی لڑکی جو صحرا میں پیدا ہوئی اور سلطنتِ مغلیہ کے عین عروج کے زمانے میں اس کی بے تاج فرمانروا بن گئی۔ لیکن جہانگیر کی وفات کے بعد اس پر کیا بیتی؟ ایک دلآویز مرقع

صفحات : ۳۵۱ قیمت : ۵۰/۷ روپے

استقلال کے پیکر

تصنیف : رابرٹ میرل بارٹلیٹ
ترجمہ : حکیم حبیب اشعر دہلوی

دورِ حاضر کے ان چند عظیم انسانوں کے بہت آفریں حالاتِ زندگی جنھوں نے استقلال کی شاہراہ پر گامزن رہ کر اپنے اپنے فن اور پیشے میں کمال حاصل کیا مگر خدمتِ انسانیت کے لیے وقف ہو گئے۔ یہ حضرات نسل اور مذہب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر جہاں تک انسانیت کی خدمت و اعانت کا تعلق ہے ان سب کی کوششیں یکساں ہیں۔

صفحات ۲۰۸ قیمت : ۶/۷۵ روپے

رفقائے عظیم

تصنیف : جیکس ماریٹین
ترجمہ : پروفیسر محمد حامی الدین خاں

اس کتاب میں مصنف نے اپنے ہم عصر مشاہیر سے اپنی ملاقاتوں کا حال نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان ملاقاتی مرقعوں میں دوسروں کے لیے بھی سرمایۂ بصیرت اور دلچسپی موجود ہے

صفحات : ۲۷۲ قیمت : ۱۰ روپے

آئن سٹائن کی کہانی

تصنیف : ے بیکر فریمین
ترجمہ : رئیس احمد جعفری

دنیائے سائنس میں شاید ہی کسی شخص نے آئن سٹائن کی طرح دنیا سے عظمت اور تحسین

کا خراج حاصل کیا ہو۔ اس عظیم سائنس داں کے حالات زندگی کا انتہائی دلآویز مرقع۔

صفحات : ۲۲۸ قیمت : ۴ روپے

سُقراط (طبع دوم)

○ تصنیف : کورا میسن
ترجمہ : آنسہ بیگم حسن
تعارف : ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

خوشی خوشی زہر کا پیالہ پینے والے عظیم فلسفی اور معلم کی زندگی کی داستان اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ سوانح عمری پر ایک دل چسپ ناول کا گمان گزرتا ہے۔

صفحات : ۲۰۸ قیمت : ۲/۵۰ روپے

پاکستان کی پہلی کتاب

○ تصنیف : جین بوتھرویل
ترجمہ : سید ہاشمی فرید آبادی

اس کتاب میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں شہری اور دیہاتی زندگی پر فاضل مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ آفسٹ کی چھپائی اور تصاویر سے مزین۔

صفحات : ۸۰ قیمت : ۳/۷۵ روپے

عرب اور اہل عرب

○ تصنیف : رچرڈ ایچ سینگر
ترجمہ : مولانا غلام رسول مہر

جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی اور ترقیاتی معلومات کا مجموعہ

صفحات : ۳۸۴ قیمت : ۶ روپے

قُطبی برفستان (طبع دوم، باتصویر)

○ تصنیف : رسل اوون
ترجمہ : مرتضیٰ احمد خاں میکش

قطب شمالی و جنوبی کی تسخیر کے دلچسپ اور ولولہ انگیز حالات

صفحات : ۲۴۰ قیمت : ۴/۵۰ روپے

عالمی ادب کی نئی کتابیں

(1) ڈلاری (ٹونی موریسن کے ناول Beloved کا اردو ترجمہ)

مترجم: سید سعید نقوی

(2) معصومیت کا قتل (To Kill a mockingbird)

مصنف: ہارپر لی اردو ترجمہ: شوکت نواز نیازی

(3) عورت کتھا

(عالمی ادب سے خواتین ادیبوں کے افسانوں کا انتخاب)

انتخاب و ترتیب: یاسر حبیب

(4) بھوک (ناول) اشاعتِ نو

مصنف: کنوت ہامسن مترجم: مخمور جالندھری

(5) کرامازوف برادران (فیودر دوستو ئیفسکی کا مشہور ناول)

مترجم: حمید شاہد (اشاعتِ نو)

ETHAN HAWKE

DONALD SUTHERLAND

WILLIAM HURT

MOBY DICK

BASED ON THE CLASSIC NOVEL
BY HERMAN MELVILLE

THE EPIC STORY OF THE BLUE SEA,
THE WHITE WHALE, AND A DARK SOUL.

Herman Melville
MOBY-DICK
DOVER THRIFT EDITIONS